

دیرین

مئی 2015

مئی 20

پٹھان

کتاب

www.kitaabdost.com

چاندنگ روپ اف پبلیکیشنز

اگر

رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی  
رکن نیشنل آف پاکستان نیوز پیپر ایسوسی ایشن  
MEMBER  
APNS  
CPNE

بانی ————— محمود باقر فیصل  
نگران ————— محمود ریاض  
مدیر ————— نادرہ خاتون  
مدیر اعلیٰ ————— عامر محمود  
نائب مدیر ————— شعاع عمیر  
مدیرہ خصوصی ————— امکت الصبوری  
اشتہارات ————— خالدہ جیلانی



حمد 11 عبید اللہ علیہ السلام  
نعت 11 آصف راز

### بیادِ محمودِ گیارہ

بات سے بات، محمود ریاض 12  
دُور تمہارا دلیس ہے، ساجدہ بانو 14

### انٹرویو

### مکمل ناول

184 میں کمان نہیں، نسیلا بر راجہ  
90 شام مسکرائے لگی، مریم عزیز

### ناولٹ

68 شاید، فائزہ افتخار  
144 ڈھول سا نول، تازیہ جمال  
216 سحر کو، قراۃ العین فیصل چنا

### افسانے

129 میں اور تم، صدف آصف  
209 گانٹھ، سمیرا غزل  
60 بد مزاج، راشدہ رفعت  
247 مسافت، آشا تھ کنول

| ذمہ سالانہ بذلیعہ رجسٹری |           |
|--------------------------|-----------|
| پاکستان (سالانہ)         | 700 روپے  |
| ایشیاء، افریقہ، یورپ     | 5000 روپے |
| امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا | 6000 روپے |

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ویب سائٹ پر ڈراما، ڈرامائی تخیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔



|     |             |                 |     |              |                   |
|-----|-------------|-----------------|-----|--------------|-------------------|
| 272 | خالہ جیلانی | کرن کار سترخوان | 262 | شعاع عمیر    | کرن کرن خوشنوا    |
| 281 | ادارہ       | حسن و محبت      | 268 | بشری محمود   | یاد دل کے دیکھ سے |
| 283 | ذوالقرنین   | نہلے یہ دہلا    | 270 | شگفتہ سیماں  | مجھے شعر لپیٹتے   |
| 284 | مدیر و کرن  | نامہ منیکر نام  | 277 | ہو بیسہ شریف | مُسکراتی کرنیں    |
|     |             |                 | 266 | ادارہ        | موتی پختے ہیں     |

مئی 2015

جلد 38 شمارہ 2

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ

کرن

37 - اردو بازار کراچی

خط و کتابت کا پتہ: 37 - اردو بازار کراچی

پبلشر: زر ریاض نے ابن حسن پر مشنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

صاحبی کا شمار آپ کے ہاتھوں میں ہے۔  
مٹی کا تھوڑا ذرہ میں آتے ہی بھر پور گرمی اور حرارت زدہ ماحول کا نقشہ نظروں کے سامنے سے گھوم  
جاتا ہے۔ موسم کی یہ اچانک تبدیلی کی گروٹ رقم روزگار اور قدیمت کا حسین کرشمہ ہے۔ پھولوں کا خن مرچا  
رہا ہے اور پودے بار آد ہو کر بیج یا پھل بنانے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ آسمان پر بھی ہلکی بدلیاں موسمِ برسات  
کی آمد کی خبر دیتی ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ کسانوں کی محنت ٹھکانے لگتی ہوئی نظر آرہی ہے۔ سیاست کے  
سمندر میں گرچہ تلاطم خیز موجیں نہیں ہیں۔ پھر بھی کبھی کبھار ہلکی طوفانی کاسماں پیدا ہوتا ہے اور پھر جلد ختم ہو  
جاتا ہے۔ وطن عزیز کو اللہ تعالیٰ نے خصوصی سترینجک اہمیت سے نوازا ہے۔ عالم اسلام میں پاکستان  
کی حیثیت ایک دولِ ماڈل بلکہ ایک قائد کی سی ہے۔ لہذا ہمیں اپنی پالیسیاں انتہائی سمجھ داری اور دانش مندی  
سے ترتیب دینی چاہئیں تاکہ ہمارے دشمنوں کو ہمارے خلاف سازش کا موقع نہ مل سکے اور وہ اپنے مذموم مقاصد  
میں کامیاب نہ ہو سکے۔

### محمود ریاض صاحب،

حیات و موت کا سلسلہ روزِ ازل سے جاری ہے۔ جو اس جہان میں آیا اس نے جانا بھی ضرور ہے۔  
محمود ریاض صاحب کو جسے پچھلے ماہ برس کا عرصہ بیت گیا ہے۔ مگر ان کی یاد آج بھی ہمارے دلوں پر نقش  
ہے۔ یہ ادارہ انہی کا لگایا ہوا ایک پورا ہے جو آج تناور درخت بن چکا ہے۔ محمود ریاض صاحب انتہائی  
شفیق سیرت انسان تھے۔ وہ اپنی ذات میں ایک ادب و ادب تنظیم تھے۔ بلاشبہ وہ ایک ہر جہت شخصیت کے  
مالک تھے۔ ان سے پچھڑ جانے سے ہونے والا شاید کبھی پُر مدہ ہو سکے گا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی  
مغفرت فواکرا نہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔ تاریخ سے بھی دعاؤں کی پُر زور التجا ہے۔

### فائزہ افتخار کا ناولٹ،

اس ماہ سے آپ کی پسندیدہ معنی فائزہ افتخار کا دس ناولٹ شاید پیش کر رہے ہیں۔ امید ہے  
کہ فائزہ کی اور تحریروں کی طرح ان کی یہ تحریر بھی آپ کو پسند آئے گی۔  
خطوط کے ذریعے آپ کی رائے کے منتظر ہیں۔

### اس شمارے میں،

- ، "بہاد محمود ریاض"
- ، "ماں نادھن ہو جائے تو" شاہین رشید کا ماں کے حوالے سے خصوصی سروے،
- ، اداکارہ عائشہ جہانگیر سے شاہین رشید کی ملاقات، اداکارہ "مافدا" کہتی ہیں "میری جی، نیٹے"،
- ، اس ماہ "ستارہ آئین کوئل" کے مقابل ہے "آئینہ"
- ، "اک ساگر ہے زندگی" نفیسہ سعید کا ناول، "روائے وقار" فرحین اظفر کا سلسلے وار ناول،
- ، "میں گمان نہیں یقین ہوں" نبیلہ ابرار کا مکمل ناول، "شام سکر لے لگی" مریم عزیز کا مکمل ناول،
- ، اس ماہ کی خصوصی پیشکش ہے فائزہ افتخار کا ناولٹ "شاید"
- ، صدف آصف، "ماثرہ رفعت"، آسانہ کنول اور سمیرا عززل کے افسانے اور مستقل سلسلے،

### مفت،

اچار، چٹنیاں، سلاوا اور دلیٹے کی تراکیب پر مشتمل کرن کتاب "ہمارے" کرن کے ہر شمارے کے ساتھ علیحدہ  
سے مفت پیش خدمت ہے۔



میرے خدائے وہ تاب نے نوائی دے  
میں چپ رہوں بھی تو نغمہ مرا سنانی دے  
گدائے کوئے سخن اور تجھ سے کیا مانگے  
یہی کہ مملکتِ شعر کو خدائی دے

نگاہِ دہر میں اہلِ کمال ہم بھی ہوں  
جو کھ رہے ہیں وہ دنیا اگر دکھائی دے

چھلک نہ جاؤں کہیں میں وجود سے اپنے  
بُسر دیا ہے تو پھر ظرفِ کبریائی دے

مجھے کمالِ سخن سے نوازنے والے  
سماعتوں کو بھی اب ذوقِ آشنائی دے

عبد اللہ علیم



تعلق اُن سے بنا لیا تو بہشتِ رستوں ڈال دے گا  
وہی تعلق تمہارے دل سے تمام کانٹے نکال دے گا

وہ جس طائف میں کھا کے پتھر عطا و بخشش کی دُش  
وہ کھلی دلا ہمارے بھی اپنی رحمت کی مثال دے گا

کسی بھی حصے میں زندگی کے کسی بھی شعبے میں بندگی کے  
اگر ضرورت پڑی جہاں کو وہ آپ ہی کی مثال دے گا

دُرود پڑھ کر سلام پڑھنا سلام پڑھ کر دُرود پڑھنا  
یہ وردِ ایسا ہے تیرے دل کو سربدن کو جال دے گا

یہ آرزو تھی کہ میں بھی آصفِ شناعیر الانام اکھوں  
خدا نے برتر مجھے بھی اک دن سخنوری کا کمال دے گا

آصفِ راز

محمود ریاض صاحب نے اپنی قلمی زندگی کا آغاز ناول نگاری سے کیا تھا اس کے بعد کالم لکھنا شروع کیے۔ امروز اخبار میں ان کے کالم شائع ہوتے تھے۔ بعد میں پبلشنگ اور پھر رچوں کی مصروفیت کی بنا پر یہ سلسلہ جاری نہ رکھ سکے۔ 1978ء میں کرن کا اجرا ہوا تو محمود با بر فیصل کے اصرار پر کالم نگاری کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا۔ وہ ہر ماہ کرن میں کالم لکھتے تھے۔ وہ شگفتگی اور بر جستگی جو ان کے مزاج کا حصہ تھی ان کالموں میں نمایاں نظر آتی ہے۔ ذیل میں ان کا ایک کالم دیا جا رہا ہے۔



بیاد محمود ریاض

بات سے بات

محمود ریاض

فنانس کمپنی کے ایک صاحب کا ایک پرچے کے ہر صفحے پر ذکر بد ہے، ان ہی صاحب کا ایک دوسرے پرچے میں ذکر خیر ہے۔

دروغ بر گردن راوی فنانس کمپنی کے ایک صاحب نے ستر ہزار روپے دے کر ایک پرچے کے سرورق پر پار رنگی تصویر اس جگہ چھپوائی ہے جہاں ایک ماڈل کی تصویر چھپنی تھی۔

پچھلے ہفتے ہم لاہور گئے۔ پی آئی اے والوں کو ہم نے فون کر کے بتایا کہ وہ دیکھو تمہارے جہاز سے ایک بہت اہم شخصیت سفر کرنے والی ہے۔ لہذا فوراً ایک سیٹ بک کرلو۔

انہوں نے پوچھا۔ ”وہ اہم شخصیت کون ہے؟“ ہم نے بتایا ”وہ اہم شخصیت ہم خود ہیں اور تم کیسے پڑھے لکھے ہو کہ ہمارا نام بھی نہیں جانتے۔“ وہ بولے۔ ”سیٹ نہیں ہے۔“

ہم نے کہا۔ ”بھئی۔ وہ وی آئی پی والی سیٹ ہے۔ دو۔ کیونکہ ہم ایک کھیلوں کے مقابلے میں جج تھے تو سب نے ہمیں وی آئی پی کہا۔“

وہ بولے۔ ”جی مارسل لاء ایڈ منسٹریٹر کی سیٹیں بھی نہیں ہیں۔“

حال ہی میں کسی پرچے میں ایک لطیفہ تھا۔ کہ امریکا کے ایک دور دراز مقام پر ایک صاحب نے بینک کھولا۔ بینک نہایت کامیابی سے چل نکلا۔ ایک صاحب نے پوچھا کہ ”تمہیں یہ کامیابی کیسے ملی؟“

اس نے جواب دیا کہ ”میں یہاں بنایا آیا تو میں نے گھر کے دروازے پر بورڈ لکھوا کر لگا دیا ”بینک“ پہلے ہی دن اس میں تین آدمی پندرہ سو ڈالر جمع کروا گئے۔ دوسرے دن تین ہزار۔ اب تو میری ہمت بندھی اور میں نے اپنے بھی باچ سو ڈالر جمع کروا دیے۔“

یہ لطیفہ سنانے کی اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ ہمیں بوئے بے وقوف بنانے کے لیے روزنت نئے حربے استعمال ہوتے ہیں۔

پہلے فلیٹوں والے آئے۔ وہ گئے تو زمینوں والے پلاٹوں والے آگئے۔ ان سے جان بچی تو یہ فنانس کمپنیوں والوں نے ہمارا گھیراؤ شروع کر دیا۔

کراچی کی تو ہمیں زیادہ خبر نہیں کہ کتنے لوگ اس میدان میں ہیں۔ ہاں لاہور میں جگہ جگہ بورڈ نظر آ رہے ہیں۔

کسی کے گھر یہ بورڈ ہے کسی کی دکان پر۔

ہم نے سوچا کہ اب تو ممکن ہی نہیں ہے۔  
ہم اسی سوچ میں بیٹھے تھے کہ ایک خاتون آگئیں  
اور بولیں۔

”یہ چہرہ کیوں اتر اہوا ہے؟“

ہم نے کہا۔ ”لاہور جانا تھا۔“

انہوں نے ٹیلی فون کیا اور کہا کہ ”میں لی آئی اے  
کے فلاں آفسر کی بیگم ہوں۔ لاہور کے لیے ایک سیٹ  
بک کر اؤ۔ میں پیسے بھجوا رہی ہوں۔“  
وہ بولے۔ ”بھجوا دیں۔“

اور آٹھ گھنٹے بعد ٹکٹ ہمارے ہاتھ میں تھا۔

تو اے مارشل لاء اینڈ منسٹر صاحب! اور وی آئی  
پی محمود ریاض کچھ عرصہ اس کا بھی ہے کہ نہیں؟

لاہور گئے تو سب سے ملے حمیدہ جیس سے بھی  
ملے کہ ادب ہیں، پندرہ سو۔ ناولوں کی مصنفہ اور ہاٹ  
کیک کے بجائے لوگ ان کے ناول لے جاتے ہیں۔

آج کل ناول نگاری تو ترک کر رکھی ہے، البتہ

زمینیں بچ رہی ہیں، پلاٹ بچ رہی ہیں، بیگم بچ رہی

ہیں۔ لاہور میں اس دن 116 گرمی تھی اور ان

کے کمرے میں 122۔ افسانہ نگار سیمماں اور حمیدہ

جیس آکس کریم سے گرمی کو دھوکا دینے کی کوشش

کر رہی تھیں کہ ہم بھی جاپیچے اور ہمارے ساتھ ہی

قسمت گھیر گھار کر ایک اور صاحب کو لے آئی کہ نام

ہے ان کا خاور۔

وہ وہاں بیگم خریدنے آئے تھے اور بغیر دیکھے بغیر

کچھ جانے انہوں نے اٹھارہ لاکھ کے چار بیگلوں کی

خریداری منظور کر لی۔ حمیدہ جیس نے ہمارا ان سے

تعارف کروایا۔ خاور صاحب کے بارے میں پتا چلا کہ

وہ کسی فنانس کمپنی کے بڑے صاحب ہیں۔

سیسٹم سے وقت لے کر ملنا پڑتا ہے۔

ایئر کنڈیشن کمرہ ہے اور ملاقات کے لیے پرچی اندر

بھجوانی پڑتی ہے۔ ہم نے کہا کہ۔

”خاور صاحب! ہمارے پاس وقت تو زیادہ نہیں

ہے۔ لائیے ذرا آپ سے ان فنانس کمپنیوں کے

بارے میں دو دو ہاتھ ہو جائیں۔“



خاور صاحب تھوڑی دیر تک جواب دیتے رہے۔

اس کے بعد آپے سے باہر ہو گئے۔ پھر اپنی برہمی پر قابو

پاکر جلد واپس کھال میں آگئے اور اعتراف کیا کہ

90 فیصد فنانس کمپنیاں فراڈ ہیں، لیکن ہمارا شمار ان

میں نہیں، بلکہ وہ اپنے کھاتے تک چیک کروانے کو تیار

ہو گئے اور اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے یہ بھی بتایا

کہ جس کسی کے پاس بورڈ لکھوانے کے پیسے تھے

اس نے فنانس کمپنی کھول دی ہے۔

حمیدہ جیس کے پاس پروفیسر صاحب بیٹھے تھے۔

انہوں نے مرے پر سو درے والی شکل پوری کر دی اور

بتایا کہ چھانٹ چھانٹ کر لڑکیاں رکھتے ہیں، اور کسی

لڑکی کو تین ہزار ماہوار سے کم نہیں دینا پسند کرتے۔“

ہم نے اپنا پرس دیکھا تو اس میں دو سو روپے تھے۔

لہذا ہم نے ”ریاض فنانس کمپنی“ کا بورڈ لکھنے کو دے

دیا ہے جو لوگ دوسری جگہوں پر بے وقوف بننے سے رہ

گئے ہیں وہ اپنی رقومات ہمارے ہاں جمع کروائیں۔

(جولائی 1979 میں لکھا گیا)

# دُور تمہارا دِل ہے مجھ سے

سَلجہ بَالُو

عجیب منزل دلکش عدم کی منزل ہے  
مسافران عدم لوٹ کر نہیں آئے  
نہ تو میں نے بھی ان کو دیکھا نہ سنا نہ ملی لیکن پھر  
بھی نہ جانے کیوں میرا دل ان کے بارے میں لکھنے کو  
چاہتا ہے۔ میں ان کے بارے میں صرف اتنا ہی جانتی  
ہوں جتنا کہ خواتین اور شعاع میں ان کے بارے میں  
رائٹر خواتین نے چھوٹے چھوٹے شخصی خاکوں کے  
اندر لکھا۔ ان خاکوں میں بھی محمود ریاض صاحب کے  
بارے میں کم اور ان سے اپنی ملاقاتوں کا احوال زیادہ  
ہوتا ہے۔

آسمان اوب پر روشن ستارے کی طرح چمکنے والے ان  
کے بڑ بھائی تو دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں ابن انشا جیسے  
ذہین، خوب صورت علم دوست بھائی اس دنیا سے  
رخصت ہوئے ہوں گے تو محمود ریاض کے دل پر کیا  
گزری ہوگی اس وقت ان کی عمر کیا ہوگی ان کے  
گھرانے کا کیا حال ہوگا کیا یہ وہی لمحہ تو نہ تھا جب  
بڑے بھائی کی تمام تر ذمہ داریاں محمود ریاض صاحب  
کے کندھوں پر آن پڑی ہوں گی اور انہوں نے یہ ذمہ  
داریاں اٹھانے کے لیے اپنی ہمت مضبوط کی ہوگی۔ اور  
انہوں نے وہ تمام ذمہ داریاں نہایت خوشی اسلوبی سے  
نبھانا شروع کیں۔ میں نہیں جانتی کہ وہ اس دوران  
کن مسائل سے گزرے۔ کیونکہ میں تو کراچی سے  
بہت دور رہتی ہوں اور جیسا کہ میں نے بتایا میں ان کو  
ان کے چند ایک شخصی خاکوں کی حد تک جانتی ہوں۔  
پھر بھی نہ جانے کیوں میرا دل کہتا ہے کہ محمود ریاض  
صاحب نے سب فرائض خوش اسلوبی سے نبھائے  
ہوں گے۔

جب انسان زندگی کے کچھ معاملات میں یہ سمجھنے  
لگ جاتا ہے کہ یہ صرف اور صرف اسی کی ذمہ داری  
ہیں تو پھر میرے خیال کے مطابق اللہ ضرور اس شخص  
کی مدد کرتا ہے۔

کچھ ایسا ہی محمود ریاض صاحب کے ساتھ بھی ہوا  
کیوں کہ جس طرح سے انہوں نے ایک جریدے  
سے کام شروع کیا اور اللہ کی کرم نوازی سے ایک پورا  
ادارہ وجود میں آیا تو اس سب میں انسان کی نیت اور اللہ  
کی کرم نوازی ساتھ ساتھ موجود ہوں تو ہی انسان اس  
قدر کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔

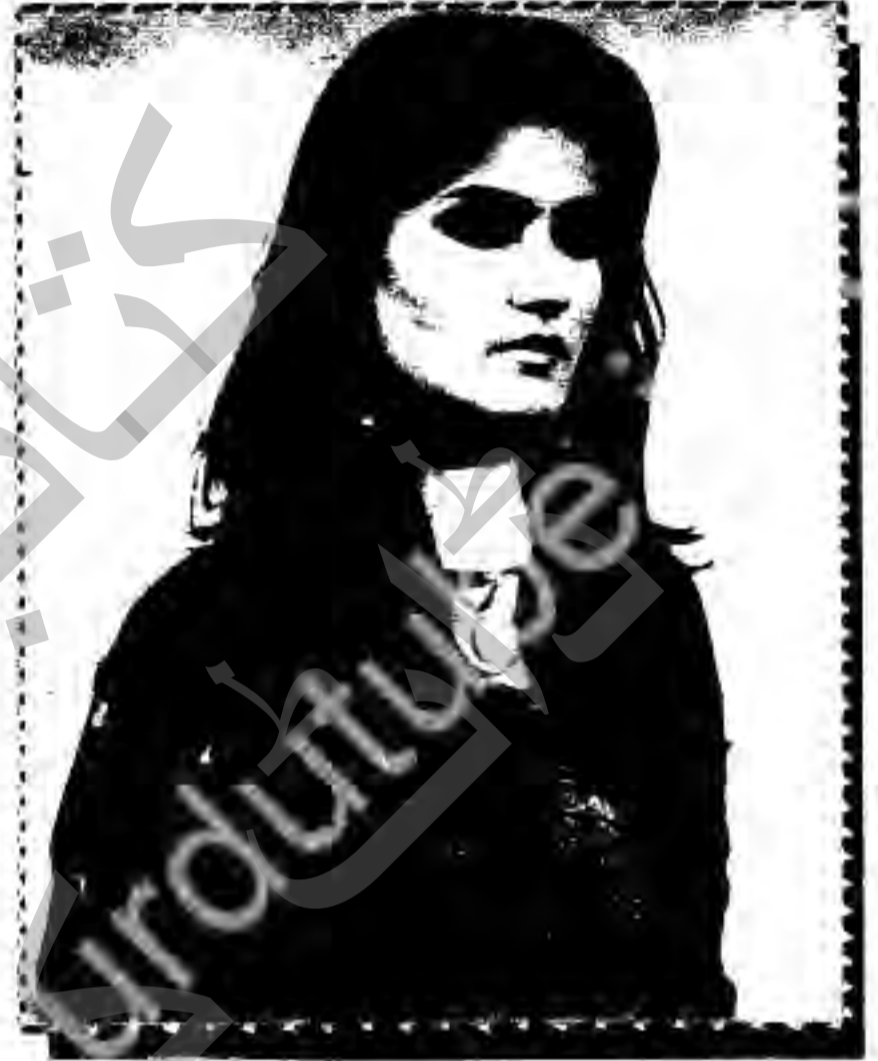
اور پھر جب انسان اس حد تک کامیاب ہو جاتا ہے  
جہاں تک وہ چاہتا ہے وہ یقیناً "خوش ہوتا ہے اور خوش  
ہو کر سوچتا ہے کہ خدا کا شکر ہے میری محنت رنگ لائی۔  
میں اس مقام پر موجود ہوں۔ اب میرے بچوں کو  
وہاں سے شروع کرنے کی ضرورت نہیں جہاں سے  
میں نے شروع کیا تھا بلکہ میرے بچوں کو ایک ایسا پلیٹ  
فارم میسر ہے جہاں سے وہ آگے اور آگے کی طرف دیکھ  
سکتے ہیں اور زندگی میں عظیم کامیابیوں کے بارے میں  
سوچ سکتے ہیں پر زندگی ہو تو پھر ناں جب زندگی ہی ختم  
ہو جائے تو پھر کون سوچے گا کامیابیوں کے بارے میں یا  
پھر عظیم کامیابیوں کے بارے میں۔

کچھ ایسے ہی سانچے محمود ریاض صاحب کی زندگی  
میں بے دریغ آتے رہے اور وہ جوان مردی سے ان کا  
قابلہ کرتے رہے، لیکن نہیں جس انسان کے دو جوان  
بیٹے اس کی زندگی میں اس کی آنکھوں کے سامنے  
رخصت ہو جائیں، دنیا سے ناپا توڑ لیں اس انسان کے  
دل پر کیا گزرے گی یہ تو وی شخص جان سکتا ہے جس  
کے ساتھ ایسا سانحہ ہو گزرا ہو۔ دوسرا کوئی اس درد کو  
محسوس نہیں کر سکتا یا یوں کہتے کہ اس قدر تکلیف  
محسوس نہیں کر سکتا جس قدر درد کا کوئی سانچھی  
محسوس کر سکتا ہے۔

جب اس طرح کے پہاڑوں جیسے غم انسان کے سینے  
میں سما جائیں تو وہ اندر سے بھر بھری ریت کی طرح  
ہو جاتا ہے کہ نہ جانے کب ڈھے جائے کچھ ایسا ہی  
محمود ریاض صاحب کے ساتھ بھی ہوا۔ یہ سب تقدیر  
کی بازی گری ہے جس کے سامنے یہ پوری کی پوری  
دنیا بے بس ہے۔

# عاصمہ جہانگیر سے ملاقات

شاہین رشید



ہی آتا جا ہیے، ہر وقت اسکرین پہ رہنے سے دیکھنے والے بھی بہت بور ہو جاتے ہیں اور میں کم کام لیتی ہوں مگر اچھا کام لیتی ہوں اور میں وہی کام لیتی ہوں جس کے لیے میں سمجھتی ہوں کہ ناظرین کو نظر آئے گا اور وہ مجھے یاد رکھیں گے۔

★ ”آج کل کیا مصروفیات ہیں؟“

✱ ”جو پروجیکٹ ختم ہونے تھے وہ تو ہو گئے۔ اب نیا کام لیا ہے جو کہ انڈر پروڈکشن ہے۔ نام ڈیپانڈ نہیں ہوا اور ”الوداع“ تو آپ دیکھ ہی رہی ہیں۔“

★ ”کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟ پھر آگے چلتے ہیں؟“

✱ ”جی میں 28 جنوری کو کوئٹہ میں پیدا ہوئی، نام والدین نے رکھا اس لیے اپنے نام سے بہت پیار ہے۔ ہم دو بہنیں اور ایک بھائی ہے اور تعلیمی قابلیت

گریجویشن ہے اور سائنیکلوجی اور سوشیالوجی میں گریجویشن کیا ہے شادی ابھی نہیں کی کہ جب اللہ کا حکم ہو گا ہو جائے گی۔ بہن بھائی دونوں شادی شدہ ہیں۔“

★ ”فیملی بیک گراؤنڈ؟“

✱ ”امی پنجابی ہیں۔ رانیوت ہیں۔ ابو پٹھان ہیں۔ کوئٹہ سے ان کا تعلق ہے۔ (بلوچستان سے) تو بنیادی طور پر ہم پٹھان اچکزئی ہیں۔“

★ ”اس فیلڈ میں آپ ہی ہیں کسی اور کوشش نہیں کیا؟“

✱ ”اس فیلڈ میں میری ممانے بہت کام کیا ہے۔“

آمنہ خان ”ان کا نام ہے اور ڈرامہ سیریل ”چھاؤں“ سے انہیں بہت زیادہ شہرت ملی تھی اور اب میں اس فیلڈ میں ہوں۔ دونوں بہن بھائی میں کسی کو شوق نہیں اس فیلڈ میں آنے کا۔“

نہایت بردبار اور دھیمے لہجے میں بات کرنے والی فنکارہ عاصمہ جہانگیر نے اب تک جتنے بھی ڈراموں میں کام کیا ہے بہت عمدہ کیا ہے ڈرامہ سیریل ”کاش میرا بھی گھر ہوتا“ اور ”کھلا ہے دل کا دروازہ“ ان کے مقبول ترین ڈراموں میں شمار ہوتے ہیں۔ آج کل آپ انہیں ڈرامہ سیریل ”الوداع“ میں دیکھ رہے ہیں۔

★ ”کیا حال ہیں جی۔ اور بہت مصروف رہتی ہیں؟“

✱ ”جی اللہ کا شکر ہے۔ بس کیا کروں۔ گھر کی مصروفیات بھی اتنی زیادہ ہو جاتی ہیں کہ مزید کاموں کے لیے وقت ہی نہیں ملتا۔“

★ ”عاصمہ آپ بہت اچھی پرفارمر ہیں اسکرین پہ کم کیوں آتی ہیں؟“

✱ ”میرا نہیں خیال کہ میں کم آتی ہوں۔ فنکار کو اتنا

★ ”کھلا ہے دل کا دروازہ“ میں آپ نے ”بنک نو اولڈ“ رول کیا مشکل تو ہوئی ہوگی؟“  
 \* ”نہیں کوئی خاص مشکل نہیں ہوئی، کیونکہ شروع سے ہی میرا کردار بہت سوہرا تھا اور اس سے پہلے کہ سیریل ”کاش میرا بھی گھر ہوتا۔“ میں بھی میرا کردار سوہرا ہی تھا اور میری پرسنلٹی ایسی ہے کہ مجھ میں سنجیدگی ہے، شرارتی بھی ہوں مگر اتنی نہیں اس لیے مجھے پر فارم کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ باقی میرے ساتھی فنکار بھی بہت اچھے تھے۔“  
 ★ ”میڈیا میں آنے کا پلان تو ہو گا اپنی ماما کی وجہ سے؟“

\* ”میرا میڈیا میں آنے کا کوئی پلان نہیں تھا بلکہ مجھے بہت آگے تک پڑھنا تھا۔ مجھے سائیکولوجی یا سوشیالوجی دونوں میں سے کسی ایک میں ماسٹرز کرنا تھا۔ لیکن ماما کے ساتھ بھی تو ایک پروجیکٹ مل گیا تو میں نے کہا کہ چلو کر لیتے ہیں اس کے بعد آفرز ملنا شروع ہو گئیں تو پڑھنے کا ٹائم نہیں ملا تو اداکاری کے ساتھ ساتھ ایک بینک میں جاب بھی کر لی۔ مگر پھر بینک سے استعفیٰ دے کر باقاعدگی سے اداکاری کو جوائن کر لیا۔ اور میں اس فیلڈ میں اپنے والدین کی اجازت سے آئی ہوں۔ دونوں کی حوصلہ افزائی نے ہی مجھ میں شوق بھی ڈالا اور میں ڈسینٹ کام کر رہی ہوں اس لیے پوری فیملی مجھ سے خوش ہے اور میرا خیال ہے کہ اگر لڑکیاں ڈسینٹ طریقے سے کام کریں تو کوئی بھی ان کے اس فیلڈ میں آنے پر اعتراض نہ کرے گا۔“

★ ”پہلا سیریل کونسا تھا؟“

\* ”پہلا سیریل نہیں سوپ تھا مومل پروڈکشن کا“  
 ”مجھے روٹھنے نہ دینا“ اور اس سے مجھے پہچان ملی۔ حالانکہ وہ سوپ تھا اور لوگ سوپ اتنے شوق سے دیکھتے نہیں ہیں لیکن میرا کردار اس میں اتنا اچھا تھا کہ سب نے نوٹ کیا اور اس کے بعد سے ہی مجھے مزید آفرز آئیں۔ اس سوپ کی کاسٹ بھی بہت اچھی تھی۔“

★ ”فیلڈ کا ماحول اچھا ہے؟“  
 \* ”میں تو ماما کے ساتھ آتی جاتی رہتی تھی۔ مجھے ایسا کچھ نظر نہیں آیا اور لوگوں نے میڈیا کے لیے ایک ایجنٹ بنا دیا ہے اس کی وجہ سے لوگ اس فیلڈ سے نہ تعلق رکھتے ہیں اور نہ ہی اچھا سمجھتے ہیں۔ مگر ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے ہر فیلڈ میں برائی تو ہوتی ہی ہے۔ بس سب کچھ انسان پر منحصر ہے اور مجھے یہی بات بری لگتی ہے کہ ہم کام بھی کر رہے ہوتے ہیں اور ہمارے سامنے لوگ اس کی برائی بھی کر رہے ہوتے ہیں۔“

★ ”گھر میں ہوتی ہیں تو کس طرح ٹائم گزارتی ہیں؟“  
 \* ”میں اپنی فیملی کے بہت قریب ہوں۔ گھر میں ہوتی ہوں تو اپنی فیملی کے ساتھ ادھر ادھر کہیں گھومنے پھرنے نکل جاتی ہوں۔ ماما کو کہیں لے کر جانا ہو یا پھر



مما کے ساتھ گھ کے کاموں میں ہاتھ بٹاتی ہوں۔“  
 ☆ ”مطلب فرینڈز کے ساتھ وقت گزارنے کا شوق نہیں ہے؟“

☆ ”میری دوستوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے اور نہ ہی گھر سے باہر وقت گزارنے کا شوق ہے بس بچپن کی دو تین دوست ہیں جو میری فیملی فرینڈز ہیں وہ بہت اچھی ہیں۔ فیملی کے ساتھ وقت گزارنا اچھا لگتا ہے۔“

☆ ”اپنی آمدنی کے لیے اپنا اکاؤنٹ ہے یا مما کے اکاؤنٹ میں سب کچھ جاتا ہے؟“

☆ ”اکاؤنٹ تو میں نے ہمیشہ ہی کھولا ہے۔ چھوٹی تھی تو مما کے ساتھ جو اسٹ اکاؤنٹ تھا اور جب بڑی ہوئی تو اپنا پرسنل اکاؤنٹ کھولا لیا کیونکہ ہر انسان کی اپنی ایک پرائیویسی بھی ہوتی ہے۔ مگر چونکہ میں اپنی فیملی کے ساتھ بہت کلوز ہوں تو مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے کہ سنگل ہو یا جو اسٹ ہو۔“

☆ ”تعریف تو سب کو ہی پسند ہوتی ہے۔ تنقید پر کیا رد عمل ہوتا ہے؟“

☆ ”مجھے تنقید پہ کوئی اعتراض نہیں ہے بشرطیکہ تنقید میں کوئی لوجک ہو۔ بلاوجہ کی تنقید تو کوئی بھی برواشت نہیں کر سکتا۔ اور تنقید بھی اگر کوئی پیار سے کرے ڈانٹ کے نہیں تو میں ضرور سنتی ہوں۔ اور تعریف تو تعریف ہی ہوتی ہے۔“

☆ ”کافی آرٹسٹوں کے ساتھ آپ کام کر چکی ہیں کوئی آرٹسٹ جس کے ساتھ کام نہ کیا ہو اور خواہش ہو؟“

☆ ”نعمان اعجاز کے ساتھ ابھی تک کام نہیں کیا اور ان کے ساتھ کام کرنے کی خواہش ہے۔ ان سے ملاقات بھی ہے بات چیت بھی مگر اداکاری نہیں کی۔ شہود علوی اور نعمان اعجاز دونوں ہی میرے پسندیدہ ہیں۔ شہود علوی کے ساتھ تو ایک سیریل میں کام کر رہی ہوں ان شاء اللہ نعمان اعجاز صاحب کے ساتھ بھی موقع مل جائے گا۔“

☆ ”کوئی کردار جو ابھی تک نہ کیا ہو؟“

☆ ”جس کردار کی مجھے خواہش تھی وہ میں نے ابتدا میں ہی کر لیا تھا اور زیادہ تر میں نے ایسے ڈرامے کیے ہیں جو رونے دھونے والے ہوتے ہیں۔ شاید ایسے ہی کردار مجھ پر سوٹ بھی کرتے ہیں۔ خیر میں اپنے کردار کے بارے میں آپ کو بتا رہی تھی کہ میں نے ایک اینارمل لڑکی کا کردار کیا تھا اور اس کردار کو کرنے کا مجھے شوق بھی تھا یہ ایک ایسا رول تھا جس میں ایک بگڑی ہوئی سائیکو لڑکی ہوتی ہوں اور اپنی ماں کے خلاف ہوتی ہوں۔ اس طرح ایک اور پروجیکٹ میں میں نے ”قوی خان“ صاحب کی بیوی کا رول کیا تھا بڑا اچھا لگا تھا اور ابھی حال ہی میں ایک پنجابی لڑکی کا کردار کیا تھا وہ بھی بہت عمدہ تھا۔ ایسے کردار جو میری پرسنلٹی سے مختلف ہوں مجھے پسند ہیں۔ جس میں مجھے کوشش کرنی پڑے محنت کرنی پڑے۔“

☆ ”قوی صاحب کی بیگم؟“  
 ☆ ”جی وہ کردار کچھ ایسا تھا کہ میرا باپ مجھے بیچ دیتا ہے اور میں صرف پندرہ سولہ سال کی ہوتی ہوں اور قوی خان سے میری شادی ہو جاتی ہے۔ تو یہ بھی ایک اچھا رول تھا۔“

☆ ”کونسا کردار کر کے بچھتا میں اور کونسا بہت ہٹ ہوا؟“  
 ☆ ”نہیں ایسا کوئی کردار نہیں ہے کیونکہ میں بہت سوچ سمجھ کر اور اسکرپٹ کو بڑھ کر کردار لیتی ہوں اور جہاں تک ہٹ کی بات ہے تو کافی سارے کردار پسند کیے گئے ہیں۔“

☆ ”اداکاری آسان کام ہے؟“  
 ☆ ”نہیں۔۔۔ ایسا نہیں ہے کہ کوئی کردار ملا اور کر لیا۔ بلکہ ہر کردار کو اپنے اندر اتارنا پڑتا ہے اور جب تک آپ کردار کو اپنے اوپر طاری نہیں کریں گے آپ کبھی بھی اس کو حقیقت کا رنگ نہیں دے پائیں گے۔“

☆ ”شہرت نے کبھی پریشان کیا؟۔۔۔ کبھی مسئلہ ہوا؟“



- \* ”شہرت پریشان نہیں کرتی، شہرت خراب کرتی ہے۔ اگر آپ سمجھیں کہ جتنی آپ عزت کی مستحق ہیں اور اتنی عزت آپ کو نہیں مل رہی تو پھر ایسا ہوتا ہے۔ اور اگر لوگ آپ کو عزت دیں اور آپ بھی انہیں عزت دیں تو میرے خیال سے پھر کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔“
- \* ”کامیابی کا کیا پیمانہ ہے آپ کی نظر میں؟“
- \* ”میرے خیال میں اگر آپ والدین کی مرضی ان کی اجازت اور ان کی خوشی سے کسی کام کا آغاز کرتے ہیں تب کامیابی آپ کے قدم چومتی ہے۔ میرا تو یہی خیال ہے۔ باقی لوگوں کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔“
- \* ”موبائل فون کی زندگی میں کیا اہمیت ہے؟ اس کی اہمیت کم ہوئی ہے یا زیادہ؟“
- \* ”ارے بہت زیادہ۔ کال وغیرہ کرنے کی ضرورت ہو تو جہاں ہیں یا آسانی کر لیتے ہیں۔ لیکن اب اور بھی سہولتیں آگئیں تو پہلے جیسی ایکسٹنشن نہیں رہی۔ اس لیے میرے خیال میں جب موبائل سروس
- آف ہوتی ہے تو لوگوں کو کچھ زیادہ محسوس نہیں ہوتا۔ ویسے بھی اب کال کی ضرورت کم ہی ہوتی ہے app whats ”فیس بک۔ بہت کچھ ہے لوگوں سے رابطہ کرنے کے لیے۔“
- \* ”ویسے ہم ان چیزوں میں وقت ضائع نہیں کرتے کیا؟“
- \* ”ارے بھی بہت وقت ضائع کرتے ہیں ہم سب ایک دوسرے پر بھروسہ کر کے، ایک دوسرے کی غیبت کر کے، دوسروں کے بارے میں باتیں کر کے۔ اللہ کا شکر ہے کہ مجھے ایسی کوئی عادت نہیں ہے۔ میں تو ٹو وی پوائنٹ باتیں کرتی ہوں۔“
- \* ”گویا گپ شب نہیں کرتیں؟“
- \* ”بالکل نہیں۔ میں تو جب فارغ ہوتی ہوں تو اپنے کاموں میں ہی مصروف رہتی ہوں۔ یا پھر اپنے پسندیدہ گانے سنتی رہتی ہوں۔“
- \* ”ہوں۔ گڈ۔ آج کل حجاب کا بہت فیشن چل پڑا ہے کیا یہ فیشن ہے یا ضرورت؟“
- \* ”میرا خیال ہے کہ ہر کوئی اسے اپنے ماحول کے

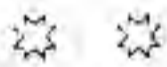
کمرے سے باہر آتی ہوں اور یہ سب کچھ میں نے اپنی ماں سے سیکھا ہے۔“

★ ”اپنے ڈرامے شوق سے دیکھتی ہیں؟“  
 \* ”ہاں جی۔ بہت شوق سے دیکھتی ہوں۔ اور موقعہ نکال کر ضرور دیکھتی ہوں اور یہ بھی دیکھتی ہوں کہ لوگوں کو کیا پسند آ رہا ہو گا اور کیا نہیں اور غور سے اس لیے دیکھتی ہوں کہ لوگ کیا نوٹس کریں گے کہ کہاں اچھا کیا کہاں نارمل کیا۔“

★ ”بہت سارا پیسہ ہاتھ آجائے تو کیا کریں گی؟“  
 \* ”اپنے گھر والوں کو دے دوں گی وہ اس پیسے کو جیسے چاہیں استعمال کریں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔“  
 ★ ”کن چیزوں کی شاپنگ آپ زیادہ کرتی ہیں؟“  
 \* ”مجھے پرفیومز کا بہت شوق ہے تو شاپنگ بھی اس کی زیادہ کرتی ہوں۔“

★ ”عاصمہ میں نے اس انٹرویو سے اندازہ لگایا کہ آپ اپنی والدہ کے بہت نزدیک ہیں ان کی کئی ہوئی کوئی بات جو آپ بتانا چاہیں؟“  
 \* ”ہاں ایک بات کہ میری امی کہتی ہیں کہ اچھائی تو ہم انسان میں دیکھتے ہیں آپ انسان کے اندر برائی کو بھی دیکھیں اور کوشش کریں کہ وہ برائی آپ کے اندر نہ آنے پائے۔“

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے عاصمہ جہانگیر سے اجازت چاہی۔



حساب سے ہی لیتا ہے اگر فیشن ہو تا تو ہر لڑکی حجاب میں ہی نظر آ رہی ہوتی۔“

★ ”شاپنگ کے لیے آپ کا انتخاب کوئی خاص جگہ ہوتی ہے؟“

\* ”نہیں کوئی خاص جگہ نہیں جہاں سے مجھے میری پسند کی چیزیں مل جائیں وہیں سے شاپنگ کر لیتی ہیں۔“

★ ”ماشاء اللہ آپ جہاں جاتی ہیں لوگ آپ کو پہچان لیتے ہیں تو کبھی ڈر لگتا ہے کہ اگر شہرت نہ رہی تو؟“

\* ”نہیں ایسا کچھ نہیں سوچتی۔ مجھے یقین ہے کہ لوگ مجھے اچھے لفظوں کے ساتھ یاد رکھیں گے اور میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ میری شہرت کو ہمیشہ برقرار رکھے اور ختم بھی کرے تو عزت کے ساتھ۔“

★ ”ماڈلنگ کی آپ نے؟“

\* ”ماڈلنگ کا مجھے بالکل شوق نہیں ہے۔ بہت لوگ کر رہے ہیں اور بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ مجھے بھی آفرز ہیں مگر میں خود ہی نہیں کرتی ماڈلنگ ایک ”بولڈ“ کام ہے اور میں اتنی بولڈ نہیں ہوں۔“

★ ”اور پھر تو بولڈ رومانٹک رول بھی مشکل لگتے ہوں گے؟“

\* ”بالکل جی۔ رومانٹک رول میں بھی بالکل بھی ایزی فیل نہیں کرتی شاید اس لیے مجھے سنجیدہ اور روئے دھونے والے رول ملتے ہیں جنہیں میں آسانی سے کر لیتی ہوں۔“

★ ”گھر کے کاموں سے لگاؤ ہے؟“

\* ”بہت زیادہ شوق ہے اگر میں کہوں کہ پاگلوں کی طرح تو غلط نہ ہو گا بھائی ستھرائی کو کنگ۔ کا بے انتہا شوق ہے۔ جب سے ہوش سنبھالا ہے ماما کے ساتھ کام کرواتی ہوں۔ اور لڑکی کا پرسنلٹی میں نکھار ہی گھر داری سے آتا ہے۔ آپ خود تو صاف ستھری ہیں مگر گھر صاف نہیں تو میری نظر میں یہ بہت ہی بری بات ہے۔ میں جب صبح اٹھتی ہوں تو میرا پہلا کام یہ ہوتا ہے میں اپنا کمرہ صاف کروں۔ اپنا کمرہ صاف کر کے میں

### سرواق کی شخصیت

ماڈل ----- عفرا  
 میک اپ ----- روز بیوٹی پارلر  
 فوٹو گرافر ----- موسیٰ رضا

# مَآں ناراض ہو جاتے تو

شاہین رشید



ہوں کہ ماں کو منانا کونسا مشکل کام ہے۔  
(2) مائیں تو ہر وقت نصیحتیں کرتی رہتی ہیں۔  
بٹیوں کو سکھاتی رہتی ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب میری  
شادی ہونے لگی تھی تو میری ماں نے کہا کہ اپنی ساس کو  
ساس نہیں سمجھنا بلکہ ماں سمجھنا۔ میں نے اکثر دیکھا  
ہے کہ مائیں اپنی بیٹیوں کو سسرال کے ماحول سے ڈرا  
دیتی ہیں ہماری ماں نے کبھی ایسا نہیں کیا بلکہ یہ ہی کہا  
کہ اپنے سسرال کو اپنا گھر سمجھنا سب کی عزت کرنا  
تب ہی تمہاری عزت ہوگی ورنہ نہیں۔

فاخرہ گل : (رائٹر + شاعرہ)

صباحت بخاری : (آرٹسٹ)

(1) تمہیں ناراض کرنے کا تصور کیسے کر لوں ماں  
کہ تم سے ہی تو میری زندگی کی سانس چلتی ہے  
تمہارے دم سے ہی تو زندگی کے ساز میں دھن ہے  
تمہاری ہی دعاؤں سے بلا ہر ایک ملتی ہے

(1) میری ماں بہت دیر تک مجھ سے ناراض رہی  
نہیں سکتیں کیونکہ وہ مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں اور  
میری کسی بات سے وہ ناراض ہوتی ہیں تو میں منالیتی

## Mother's Day

نخت راستوں میں بھی آسان سفر لگتا ہے  
یہ مجھے ماں کی دعا کا اثر لگتا ہے  
اک مدت سے میری ماں سوئی نہیں تابش  
میں نے اک بار کہا تھا ماں مجھے ڈر لگتا ہے

کائنات کی سب سے خوب صورت اور حسین چیز ”ماں“ ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ جو ”ماں“ کہلاتی ہیں۔ کہتے  
ہیں کہ عورت مکمل ہی تب ہوتی ہے جب وہ ”ماں“ بنتی ہے۔ ماں دنیا کی وہ واحد ہستی ہے جس کی لغت میں اولاد  
سے ناراضی کا لفظ ہی موجود نہیں ہے۔ اس کی ناراضی میں بھی پیار پوشیدہ ہوتا ہے اور کوئی اچھالی ہوتی ہے۔ اولاد  
تو پیار سے بلائے تو ماں ”نہال“ ہو جاتی ہے۔

مدرزؤں کے موقع پر ایک سروے حاضر ہے کہ

(1) ماں ناراض ہو جائے تو آپ کس طرح مناتے ہیں / مناتی ہیں۔

(2) ماں کی کوئی نصیحت جو آپ نے گرہ سے باندھ لی ہو۔

کسی بھی عمل سے شو نہیں کرنا کہ بہت بڑی چیز ہوں۔  
 سب باتیں اب تک ذہن میں زندہ بھی ہیں اور  
 شخصیت کا حصہ بھی۔ اللہ ہم سب کے والدین کو  
 صحت و ایمان کے ساتھ لمبی عمر عطا فرمائے۔ (آمین)



آفاق وحید : (آرٹسٹ)

(1) میں ایک بہت Expressive انسان ہوں۔  
 لیکن جہاں اعتماد کے رشتے ہوں مجھے لگتا ہے کہ وہاں یہ  
 لفظ بعض اوقات ختم ہو جاتے ہیں اور اظہار ختم ہو جاتا  
 ہے۔ تو امی جب ناراض ہوتی ہیں تو امی اور مجھے چتا ہوتا  
 ہے کہ ایک دو دن بعد یا چند گھنٹوں کے بعد ہم دونوں  
 میں سے کوئی بھی ایک دوسرے سے بات کر لے گا۔  
 کبھی کبھار تو ایسا ہوتا ہے کہ میں گاڑی ڈرائیو کر رہا  
 ہوں اور امی سے کسی بات پہ میری بحث ہو گئی تو ہم  
 دونوں خاموش ہو جاتے ہیں اور پھر جب میں باج منٹ  
 کے بعد انہیں فون کروں گا تو وہ بالکل نارمل طریقے  
 سے مجھے جواب دیں گی اور وہ فون کر لیں گی تو میں نارمل  
 طریقے سے بات کروں گا۔

(2) ایک نصیحت جو ابھی تک کرتی ہیں اور بار بار  
 کرتی ہیں کہ ہمیشہ بڑوں کا ادب کرو اگر میں کہیں جا رہا  
 ہوتا ہوں تو اور محسوس کرتا ہوں کہ کوئی بڑا مسئلہ پیدا  
 کر رہا ہے یا جس کی وجہ سے میں ٹربل میں ہوں یا وہ  
 ٹربل پیدا کر رہا ہے روڈ پہ۔ تو اس وقت مجھے ان کی

تم ہی تو ہو کہ جیسے جس میں اک نرم سا جھونکا  
 تمہاری مسکراہٹ سے غموں کی دھوپ ڈھلتی ہے  
 اعائے گل ہے میری ماں کہ رب تم سے رہے راضی  
 تمہاری ہی محبت میں مثل اس کی بھی ملتی ہے  
 جب سے آپ کا سوال پڑھا ہے تب سے سوچ رہی  
 ہوں کہ ”امی“ مجھ سے کب ناراض ہوئی تھیں؟ اور  
 میں نے انہیں کیسے منایا تھا؟ لیکن باوجود کوشش کے  
 میرے ذہن ایسا کوئی سین نہیں آ رہا جب امی مجھ سے  
 ناراض ہوئی ہوں۔ جس بھی زاویہ سے ان کو سوچاں ان کا  
 چہرہ مسکراتا ہوا ہی تصور میں آیا ویسے بھی میں اپنی امی  
 سے ”فیشن“ مذہب ”سیاست“ سے لے کر اپنی ذات  
 کے ہر گوشے تک ایک دوست کی طرح ڈسکس کرتی  
 ہوں ہم ماں بٹی کا تعلق بڑا جمہوری ہے یعنی کسی بات  
 پر اختلاف ہو بھی تو ایک دوسرے کی رائے کا احترام کیا  
 جاتا ہے اور ناراضی تو ہوتی ہی ہے جب کوئی

نا پسندیدہ فیصلہ یا بات تھوپی جا رہی ہو الحمد للہ میرے  
 ساتھ ایسا کوئی ایٹو نہیں ہوا اب تک اس لیے امی کا  
 مجھ سے ناراضی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ میں  
 ایک اچھی بچی ہوں۔

(2) میرا تو خیال ہے کہ ماں کا ہر عمل بہ ذات خود  
 اولاد کے لیے نصیحت ہوتا ہے ضروری نہیں کہ وہ  
 نصیحت الفاظ کے ذریعے اولاد تک پہنچائی جائے اور امی  
 نے ہمیں کچھ بھی کہنے کی بجائے اپنے عمل سے کر کے  
 دکھایا ہے اور میری کسی بھی عادت کو اگر کوئی خوبی کے  
 طرز پر بیان کرتا ہے تو وہ والدین سے ہی لی گئی ہے البتہ  
 خامیاں سب میری اپنی ہیں۔ آپ نے کسی ایک  
 نصیحت کا پوچھا ہے تو بتائی چلوں کہ ”امی“ نے ہمیشہ  
 ”عاجزی“ اور ”خوش اخلاقی“ اختیار کرنے کی تاکید کی  
 ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ہم گرمیوں کی چھٹیوں میں  
 حیدر آباد سے گاؤں دیکھنے کے شوق میں پنجاب جایا  
 کرتے تھے اور امی خاص سمجھایا کرتی تھیں کہ گاؤں جا  
 کر جہاں سب بیٹھے ہوں وہاں ہی بیٹھنا ہے۔ کھانے  
 میں خرا نہیں کرنا بہت زیادہ فرمائشیں نہیں کرنی اپنے

نصیحت دیا د آجاتی ہے۔



مدیکہ رضوی : (آرٹسٹ)

کیا کسی غیر کو بھی خفا ہونے کا موقع نہیں دیتی تھیں،  
ہاں کبھی انہیں خاموش یا اداس دیکھتی تو ڈھیروں باتیں  
کیا کرتی تھی اور جب تک ان کا موڈ نہیں بدلتا،  
ہزاروں قصے سنا دالتی تھی، ایک بات البتہ خالص ہے  
ای کو کوئی بھی معمولی تحفہ اس لیے خوش کر دیتا تھا کہ  
میں انہیں صاف کہتی تھی کہ میں آپ کو مکھن لگا رہی  
ہوں اور اس مکھن لگانے پر میری ماں فوراً "راضی ہو  
جاتی تھیں۔

(2) جیسا کہ میں نے کہا میری امی ایک صابروشا کر  
خاتون تھیں، انہوں نے ہم سب بہنوں کو ہمیشہ تحمل،  
رواداری اور درگزر کرنے کی ہی تلقین کی اور باخدا میں  
نے ان تینوں حالتوں کو اپنا کر اپنی زندگی میں بے حساب  
خوشیاں اور محبت پائی ہے۔ اللہ میری امی کو آخرت  
میں بلند درجات پر فائز کرے اور ان سے ہمیشہ خوش  
رہے۔



علی عباس : (آرٹسٹ)

(1) میں ذرا Expressive قسم کا انسان ہوں تو  
جب والدہ ناراض ہوتی ہیں تو میں ان کے پاس جاتا  
ہوں۔ انہیں گلے لگاتا ہوں۔ انہیں چومتا ہوں۔  
انہیں پیار کرتا ہوں۔ انہی غلطی کی معافی مانگتا ہوں۔  
کوشش کرتا ہوں کہ ان کی پسند کا انہیں تحفہ دوں۔  
(2) بچپن سے ہی ہم چاروں بہن بھائیوں کو

(1) ماں ناراض ہو تو پھر ایک دن تو ناراضی میں گزر  
ہی جاتا ہے۔ پھر چاکر انہیں گلے لگاتی ہوں۔ ماں میں تو  
آسانی سے مان جاتی ہیں۔

(2) جب میں اس فیلڈ میں قدم رکھ رہی تھی تو  
انہوں نے مجھے ایک ہی بات کہی تھی کہ بیٹا پیسے کی اپنی  
اہمیت نہیں ہوتی، اچھے کام کی اور عزت کی اہمیت ہوتی  
ہے۔ یہ دونوں چیزیں ہاتھ سے مت جانے دینا، کیونکہ  
میں نے بھی اپنی زندگی میں کمپروماز نہیں کیا تو پیسہ  
بھلے نہ ہو مگر عزت ضرور ہو، تو اسی نصیحت کو میں نے  
پلے سے باندھا ہوا ہے۔

شمع حفظ : (شاعرہ + نثر نگار)

(1) میری  
امی کو گزرے ہوئے کئی سال گزر چکے ہیں، ان کو منانا  
ممکن ہی نہیں رہا۔ ہاں میرے بچے میری خفگی کی بہت  
فکر کرتے ہیں اور اس وقت تک میرے سامنے سے  
نہیں ہٹتے جب تک میں انہیں دیکھ کر مسکرا نہ دوں۔  
اللہ تعالیٰ سب ماں باپ کو میرے بچوں جیسی اولاد  
دے۔ میری امی عام عورتوں سے تھوڑی مختلف نیچر  
رکھتی تھیں۔ وہ بہت صابروشا کر خاتون تھیں، ہمیں تو



انہوں نے یہی سکھایا ہے کہ اپنے والد کی بہت عزت کرنی ہے اور آپس میں بہت پیار محبت سے رہنا ہے کیونکہ اس سے خاندان مضبوط ہوتے ہیں اور آنے والی نسلوں کی بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں اور جناب اس نصیحت کو میں نے گھر میں باندھا ہوا ہے۔



جادو کا کام کرتی ہے۔

(2) مجھے یاد ہے کہ ہم جب بھی اسکول سے آتے تھے اور ڈرائیور ہمیں لے کر آتا تھا تو اگر کبھی اتفاق سے گھر میں کھانا کم ہو تو امی کہتی تھیں کہ پہلے ڈرائیور کو کھانا دے دو تم لوگ بعد میں کھا لینا۔ تو وہ جو ”احساس“ کی تربیت ہے وہ میں نے ہمیشہ اپنے پیلے سے باندھ کر رکھی کہ جو لوگ ہمارے ساتھ کام کر رہے ہوتے ہیں اور جو لوگ ہمارے لیے کام کر رہے ہوتے ہیں ان کی Care بہت ضروری ہے اور وہ میں ہمیشہ کرتا ہوں۔

عنیزہ سید : (افسانہ نگار + ڈرامہ رائٹر)

(1) میری ”ماں“ تو مجھ سے ایسی دور گئیں کہ روٹھنا منانا سب خواب بن کر رہ گیا ہے جب وہ حیات تھیں اور ناراض ہو جاتی تھیں تو میں کانوں کو ہاتھ لگا کر معافی مانگتی تھی اور انہیں منالیتی تھی۔

(2) امی کی ساری نصیحتیں گھر سے ہی باندھی رکھی ہیں۔ ایک نصیحت تو یہ کہ جب بھی کسی کو چیز پکڑاؤ تو سیدھے ہاتھ سے پکڑاؤ اور یہ نصیحت میں کبھی نہیں بھولتی اور ایک بات اور کہ میری امی جب بھی دیکھتیں کہ ہم کسی کام میں سستی دکھا رہے ہیں تو وہ ہمارے ارد گرد چلتے پھرتے یہ شعر پڑھا کرتی تھیں کہ۔ یہ صوفے تیرے افرنگی یہ قالین تیرے ایرانی

تحریک منیبہ : (نعت خواں + آرج)

(1) امی جب ناراض ہو جائیں تو میں گھر کا کام کرنا شروع کر دیتی ہوں۔ کچن میں کوئی کام کر دیا۔ کیونکہ عام طور پر میں نہیں کرتی۔ تو پھر وہ سمجھ جاتی ہیں کہ تحریک مجھے منانے کی کوشش کر رہی ہے اور بس پھر اس طرح ہماری دوستی ہو جاتی ہے۔

(2) امی ہمیشہ سے یہی کہتی ہیں کہ بیٹا کسی سے کچھ مانگنا نہیں۔ ایسی خواہش نہیں رکھنا کہ کسی سے کچھ مانگنا پڑے اور اگر خواہش بہت مضبوط ہے تو پھر خود اسے حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ ہاتھ نہیں پھیلاتا کبھی۔

بلال قریشی : (آرٹسٹ)

(1) میرے خیال میں اس دنیا میں سب سے آسان کام ماں کو منانا ہے ایک ”جیہی“ اور ایک ”بہی“ ہی بہت ہوتی ہے۔ یہ تو ہم لوگ ہی ہیں جو خیرے دکھاتے ہیں اور منہ بناتے ہیں۔ ماں کے لیے تو یہی اور جیہی



اور مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی یہ تن آسانی  
اور یہ کہ کچھ کر لو نو جوانوں کہ اٹھتی جوانیاں ہیں۔  
امی کی یہ باتیں ایسی نصیحتیں ہیں کہ جو آج بھی پلو  
سے باندھ رکھی ہیں بلکہ میں اپنے بچوں کو بھی یہی  
نصیحتیں کرتی ہوں۔



### مکمل زیدی : (آرٹسٹ)

ہے تو نہیں جاپاتی تو پھر ایک دن ان کے ساتھ گزارتی  
ہوں۔ انہیں شائنگ لے جاتی ہوں۔ انہیں گھومتی  
پھراتی ہوں۔ کھانا کھلاتی ہوں تو وہ خوش ہو جاتی ہیں۔  
(2) مائیں تو ہر وقت ہی نصیحت کرتی رہتی ہیں اور  
میری ماں بھی کرتی رہتی ہیں۔ ہم بھی کوشش کرتے  
ہیں کہ ان کے تجربات سے کچھ سیکھ لیں۔ کچھ  
نصیحتوں پہ عمل نہیں بھی کر پاتی تو بعد میں افسوس ہوا  
کہ ماں نے جو کہا تھا کھلک کہا تھا۔ تو یہ سب چیزیں تو  
زندگی کے ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں۔ امی تو ابھی بھی  
نصیحتیں کرتی رہتی ہیں جو کہ بہت کام آتی ہیں اور آ  
رہی ہیں۔ اللہ امی کو صحت دے اور ان کا سایہ ہمارے  
سر پہ برقرار رہے۔ (امین)

(1) امی ناراض ہو جائیں تو انہیں ایسے مناتی ہوں  
جیسے وہ ہمارے بچپن میں ہمیں مناتی تھیں۔  
(2) امی کی نصیحت جو ہمیشہ یاد رکھتی ہوں کہ  
”اخلاق کا دامن نہیں چھوڑنا اور کسی کے برا ہونے سے  
اپنی اچھائی نہیں گنوا دینا۔“

### حناء عباس : (آرٹسٹ)

(1) ”ماں“ تو وہ ہستی ہے کہ جس کا ظرف سمندر  
سے بھی زیادہ بڑا ہوتا ہے اولاد کی بہترین دوست بھی  
وہی ہوتی ہے اور بہترین نقاد بھی یہ وہ ہستی ہے جو  
ہمارے تمام عیب جانتی ہے مگر کبھی شرمندہ نہیں  
کرتی۔ میری ماں بھی میری ایسی ہی دوست ہے جو  
میرے تمام عیب و خسر سے آشنا ہیں۔ دنیا میں شاید ہی  
کوئی بیٹی اپنی ماں سے اتنی فری ہوگی جتنی میں ہوں۔  
ان کی ناراضی بھی ان کے پیار کا اظہار ہے جب کبھی

### فضیلہ قیصر : (آرٹسٹ)

(1) اول تو مائیں ناراض ہوتی ہی نہیں ہیں، لیکن  
اگر ناراض ہو بھی جائیں تو میں سمجھتی ہوں کہ ماں کو  
منانا دنیا کا آسان ترین کام ہے اور کوئی بھی اولاد اپنی ماں  
کو بہت آسانی سے مناسکتی ہے۔ دو لفظ پیار کے بول  
کے۔ ان کے گلے میں باہیں ڈال کے ”ماں کو منالیتی  
ہوں۔ دور ہوتی ہوں تو فون کر کے سوری کر لیتی ہوں۔  
ویسے وہ اب تو ناراض ہوتی بھی نہیں ہیں۔ پہلے پھر بھی  
کبھی ہو جایا کرتی تھیں۔ ان کی ناراضی یہی ہوتی ہے  
کہ تم اتنے دن سے آئیں کیوں نہیں تو کام زیادہ ہوتا

کروتی ہیں۔  
(2) ماں کی سب سے بڑی نصیحت تو یہ ہے کہ زندگی میں بہت مشکلات آئیں گی، مگر کبھی بھی ہمت مت ہارنا اور ہمیشہ اپنے خدا پر یقین اور بھروسہ رکھنا۔



بیمار ہو جاؤں تو اس ناراضی کا اظہار خاموشی کی صورت میں کرتی ہیں اور پھر باخدا راضی بھی ہو جاتی ہیں۔ مجھے کبھی منانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔  
(2) نصیحت تو یہی ہوتی ہے کہ جو بھی کرو، جہاں بھی جاؤ، اپنے ابو کی عزت کا خیال رکھنا، بیٹیاں نازک آگینہ ہوتی ہیں اور ماں باپ کی عزت کی محافظ تمہارے ابو تم پر اندھا اعتماد کرتے ہیں اس لیے ان کے اعتماد کو ہمیشہ قائم رکھنا۔

### یا سرشورو : (آرٹسٹ)

- (1) جب بھی والدہ ناراض ہوتی ہیں تو میں ان کے پیر پکڑ کر معافی مانگ لیتا ہوں۔ کیونکہ ماں جیسی ہستی تو پوری دنیا میں کوئی نہیں ہے۔
- (2) سب کو عزت دینی چاہیے۔ سب کے ساتھ اخلاق سے پیش آنا چاہیے اور آپ کی سوچ مثبت ہونی چاہیے۔ اور میں اس کو فالو کرتا ہوں۔

### رابعہ الہم : (نیوز کاسٹر)

- (1) امی جب بھی ناراض ہوتی ہیں تو ان کو منانے کا بہت آسان طریقہ ہے ان کو مسکرا کر رکھتی ہوں۔ چھوٹا سا سوری بولتی ہوں اور گلے سے لگا لیتی ہوں تو وہ فوراً "مان جاتی ہیں۔"
- (2) ان کی ایک نصیحت جو ہمیشہ یاد رہتی ہے۔ کہ جب مجھے نیا نیا فیشن کا شوق ہوا تو انہوں نے کہا کہ بے شک فیشن کرو جو دل میں آئے کرو، مگر یاد رکھنا کہ "فیشن اوپر بے حیائی" میں بہت باریک گیر ہوتی ہے یہ



### عادل مراد : (آرٹسٹ)

- (1) اگر والدہ کبھی ناراض ہوتی ہیں تو ان کے پاس جا کر سوری کہتا ہوں اور گلے سے لگا لیتا ہوں تو وہ معاف

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے  
بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

| کتاب کا نام                | مصنفہ             | قیمت  |
|----------------------------|-------------------|-------|
| بہا دل                     | آمنہ ریاض         | 500/- |
| زرد موسم                   | راحت جبین         | 750/- |
| زندگی ایک روشنی            | رخسانہ نگار عدنان | 500/- |
| خوشبو کا کوئی گھر نہیں     | رخسانہ نگار عدنان | 200/- |
| شہر دل کے دروازے           | شازیہ چودھری      | 500/- |
| تیرے نام کی شہرت           | شازیہ چودھری      | 250/- |
| دل ایک شہر جنوں            | آسیہ مرزا         | 450/- |
| آئینوں کا شہر              | فائزہ انصار       | 500/- |
| بہول بھلیاں تیری گلیاں     | فائزہ انصار       | 600/- |
| پھلاں دے رنگ کالے          | فائزہ انصار       | 250/- |
| یہ گلیاں یہ چوہا رہے       | فائزہ انصار       | 300/- |
| بہن سے عورت                | غزالہ عزیز        | 200/- |
| دل اُسے ڈھونڈ لایا         | آسیہ درازی        | 350/- |
| بکھرتا جاگم خواب           | آسیہ درازی        | 200/- |
| رنگ کوہِ قمر تھی سہجائی سے | فوزیہ یاسمین      | 250/- |
| امداس کا چاند              | بشری سعید         | 200/- |
| رنگ خوشبو ہوا ہمارا دل     | انٹاش آفریدی      | 500/- |
| درو کے قافلے               | رضیہ جمیل         | 500/- |
| آج مگن پر چاند نہیں        | رضیہ جمیل         | 200/- |
| درو کی منزل                | رضیہ جمیل         | 200/- |
| میرے دل میرے مسافر         | نسیم عرقیشی       | 300/- |
| حیرتی راہ میں زل زلی       | میونہ خورشید علی  | 225/- |
| شام آرزو                   | ایم سلطانہ فخر    | 400/- |



نہ تو لے ٹیشن میں۔ یہی اس کو کرا اس کر جاؤ۔ تو اب جب  
بہنیں کچھ خریدنے جاؤں تو اس بات کو اس نصیحت کو  
مد نظر رکھتی ہوں۔



صائمہ قریشی : (آرٹسٹ)

(1) امی ناراض ہوں تو ایک اچھا سا گفٹ دے دیتی  
ہوں اور مسلسل بات کرتی رہتی ہوں تو پھر مان جاتی  
ہیں۔

(2) نصیحت یہ کرتی ہیں کہ زندگی میں کوئی بھی  
فیصلہ کرو تو بہت سوچ سمجھ کر کرو کیونکہ میں بہت جلد  
باز ہوں اور جلد بازی میں ہی فیصلہ کرتی ہوں تو اس سے  
نقصان بھی ہوتا ہے۔ تو اب تو یہ گرہ سے باندھ لی ہے  
کہ میں جو بھی فیصلہ کروں بہت سوچ سمجھ کر کروں گی۔

# مّاوَرّا

شاہین رشید

1 "میرا نام؟"

"ماورا۔"

2 "پیارے کیا بلاتے ہیں؟"

"پیارے کے بہت نام ہیں جو کامن ہیں وہ ہیلو اور چٹکی ہے۔"

3 "میری عمر؟"

"1992ء کی پیدائش ہوں تو بتائیے کہ کتنے سال"

کی ہوں؟"

4 "میری سالگرہ کا دن؟"

"28 ستمبر۔"

5 "میرا ستارہ؟"

"لبرا۔"

6 "بہن بھائی؟"

"میں اور عروہ اور ایک بھائی۔ میں سیکنڈ نمبر ہوں۔"

7 "میری تعلیم؟"

"فیشن ڈیزائننگ میں گریجویٹ ہوں۔"

8 "شادی؟"

"ابھی نہیں۔ کچھ کرنا چاہتی ہوں۔"

9 "مجھے شہرت کی بلند یوں پہ پہنچایا؟"

"ڈرامہ سیریل "میرے حضور" اور "یہاں پیار نہیں ہے۔"

10 "پریکٹیکل لائف میں کب آئی؟"

"جب 9th گریڈ میں تھی۔ ایک شو ہو سٹ کیا تھا تو سولہ ہزار ملے تھے بہت خوشی ہوئی تھی۔ بس پھر اس کے بعد کچھ نہ کچھ کرتی رہتی تھی۔"

11 "جب خوش ہوتی ہوں تو؟"

"تو پھر سب کو گفٹ دیتی ہوں بہت اچھے اچھے۔"

12 "میری ماں کی ایک پیاری عادت؟"

"میری ماں مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں۔ گرمیوں میں صبح ہی صبح ٹھنڈی لسی دے کر اٹھاتی ہیں اور سردیوں میں گرما گرم بیڈنی دے کر۔ ایسی ماں کسی کی نہیں ہوگی۔"

13 "فارغ وقت میں کیا کرتی ہوں؟"



”فیس بک سے بہت لگاؤ ہے۔ پھر اچھی میوزک سننے کا بہت شوق ہے اور گھر والوں کے ساتھ گھر سے باہر نر کرنے کا شوق ہے اور اچھا بھی لگتا ہے۔“

14 ”ایس ایم ایس کرنا بہتر ہے یا کال؟“

”کال۔ کون لکھنے کی زحمت کرے۔ ٹائم بھی تو

ضائع ہوتا ہے اور سچی بات ہے اب ٹائم کی بہت قلت

ہے۔“

15 ”میرے پاس ذخیرہ ہے؟“

”کیڑوں کا اور جوتوں کا۔ پیگنز کا بھی شوق ہے مگر

بہت زیادہ نہیں۔“

16 ”میں حیران ہوتی ہوں؟“

”ان لوگوں پر جو وقت کی قدر نہیں کرتے۔ میں

وقت کی بہت زیادہ پابندی کرتی ہوں۔“

17 ”ایک شخصیت جس سے میں ملنا چاہتی تھی؟“

”ارفع کریم سے۔ مگر اسے زندگی نے مہلت نہیں

دی اور مجھے وقت نہ۔“

18 ”مجھ میں گڑبے کد؟“

”کہ گھر میں کسی کا موڈ خراب ہو تو میں ٹھیک کر دیتی

ہوں۔ بہت اچھی فنکارہ ہوں۔ سچ میں۔“

19 ”مجھے بن مانگے جو ملا؟“

”بہت کچھ۔ اگر اس فیلڈ کی بات کروں تو شہرت

میں تو شوقیہ آئی تھی۔ کامیابیاں اور شہرت سے اللہ نے

جھولی بھر دی۔“

20 ”کوئی لڑکا Misbehave کرے تو؟“

”تو پوچھ لیتی ہوں کہ پر اہلم کیا ہے؟ سنا دیتی ہوں۔

ڈرتی نہیں کسی سے۔“

21 ”چھٹی انجوائے کرتی ہوں؟“

”کراچی میں عروہ کے ساتھ اور اسلام آباد میں ماما

کے ساتھ شاپنگ گھومنا پھرنا اور اچھا ساؤنڈ کر کے اپنی

چھٹی گزارتی ہوں۔“

22 ”میں کام کرنا چاہتی ہوں؟“

”عظمیٰ گیلانی صاحبہ کے ساتھ، صابحہ صاحبہ کے

ساتھ سکیئر سموں، بدر خلیل صاحبہ اور دیگر سینئر

فنکاروں کے ساتھ۔“

23 ”گھر سے نکلتے وقت کیا چیزیں لازمی لیتی ہوں؟“

”سیل فون، والٹ اور اپنا بیگ جس میں مزید

ضرورت کی چیزیں ہوتی ہیں۔“

24 ”گھر میں میری آئیڈیل شخصیت؟“

”میں اور عروہ میری پیاری بہن۔“

25 ”گھر آتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟“

”کہ بس کھانا مل جائے۔“

26 ”دنیا میں خدا کی حسین تخلیق؟“

”مور۔ مجھے بہت پسند ہے۔“

27 ”کب زیادہ کھانا کھاتی ہوں؟“

”جب غصے میں ہوتی ہوں تاکہ طاقت آجائے اور

اپنا دفاع اچھی طرح کر لوں۔“ (تمسک)

28 ”جھوٹ کب بولتی ہوں؟“

”نہیں بولتی۔ کیونکہ میں کسی بھی بات کے لیے

دوسروں کے آگے جواب دہ نہیں ہوں۔ کسی کو یقین

کرنا ہے میری بات کا تو کرے۔ نہیں تو نہ کرے۔“

29 ”شاپنگ کے لیے میری پسندیدہ جگہ؟“

”کراچی اور دبئی۔ شاپنگ تو میری کمزوری ہے۔“

30 ”ہیڈ پیہ کب جاتی ہوں؟“

”جب فینڈ کا غلبہ طاری ہونے لگتا ہے۔ ورنہ تو گھر

والوں کے ساتھ گپ شپ ہوتی رہتی ہے۔“

31 ”کب فریش ہوتی ہوں؟“

”شام کے وقت۔ اور جب گھر جانے کا وقت ہوتا

ہے۔“

32 ”کونسا ملک بہت پسند ہے؟“

”اپنے ملک کے علاوہ جرمنی۔ مگر سنا ہیٹ اپنے

پاکستان میں ہی چاہوں گی۔“

33 ”رونے لگتی ہوں؟“

”جب گر جاؤں اور چوٹ لگ جائے تو۔“

34 ”کب مشکلات کا شکار ہوتی ہوں؟“

”جب گھر والوں کے ساتھ کہیں گھومنے پھرنے

نگلوں یا دوستوں کے ساتھ نگلوں اور کوئی پہچان لے اور

ارد گرد لوگ اکٹھے ہو جائیں تو بس پھر بڑے مسئلے ہو

جاتے ہیں۔“



- 35 ”پڑپڑی ہو جاتی ہیں؟“  
 ”جب بہت بھوک لگی ہو اور کچھ کھانے کو نہ ہو تو“
- 36 ”لوگ بھولتے جا رہے ہیں؟“  
 ”اپنی روایات کو۔ مثلاً“ اب 14 اگست میں وہ جوش و خروش نہیں ہوتا جو بچپن میں ہم دیکھتے تھے اب عید کی وہ ایک سائنٹسٹ نہیں ہوتی جو بچپن میں ہوتی تھی۔ ہم تو اپنے بچپن میں عید بھی بہت انجوائے کرتے تھے آج کل کے بچے تو بہت جلدی بڑے ہو گئے ہیں۔“
- 37 ”مجھے انتظار رہتا ہے؟“  
 ”اپنی برتھ ڈے کا۔ حالانکہ زندگی کا ایک سال کم ہو جاتا ہے۔ مگر پھر بھی مجھے سالگرہ منانا اچھا لگتا ہے۔“
- 38 ”میرے اٹھنے کے اوقات؟“  
 ”چھٹی کے دن کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ شوٹ کے حساب سے اٹھتی ہوں جلدی ہو تو جلدی دیر سے ہو تو
- دیر سے اور جب یونیورسٹی جاتی تھی تو لازمی سات بجے اٹھنا پڑتا تھا۔“
- 39 ”گھر میں کس کا غصہ تیز ہے؟“  
 ”میری سوئیٹ بسن عروہ کا۔“
- 40 ”میں اکثر آئینہ دیکھ کر سوچتی ہوں؟“  
 ”کہ کاش میں تھوڑی لمبی ہوتی۔“
- 41 ”میرے لیے سربراہ تھا جب؟“  
 ”جب میری ممانے نئی زبرد میٹر گاڑی کی چابی میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا کہ اب تم یونیورسٹی گاڑی میں جاؤ گی۔“
- 42 ”میں شوقین ہوں؟“  
 ”کھانے پینے کی ادکاری کی۔“
- 43 ”کسی وجہ سے یہ فیلڈ چھوڑنی پڑی تو؟“  
 ”تو پھر اپنی تعلیم کو کام میں لاؤں گی۔ فیشن ڈیزائننگ میری اصل فیلڈ ہے۔“
- 44 ”اپنے ملک کی کیا بات بری لگتی ہے؟“  
 ”کہ سارے قوانین غریبوں کے لیے ہیں۔ امیروں



ڈے ہو یا پھر ویلنٹائن ڈے سے۔ اور ویلنٹائن ڈے منانا تو بہت ہی اچھا لگتا ہے۔

56 ”اپنے لیے کہنا چاہوں گی کہ؟“

”کہ میں بہت خوش قسمت ہوں کہ جسے اللہ تعالیٰ نے بہت سی نعمتوں سے نوازا ہوا ہے۔“

57 ”سکون کہاں ملتا ہے؟“

”جب میں اسلام آباد اپنی ماما کے گھر جاتی ہوں اور ان کی گود میں سر رکھ کر ڈھیروں باتیں کرتی ہوں۔“

58 ”پسندیدہ لباس؟“

”وہ جو ہماری روایات کے مطابق ہو اور مجھ پر اچھا لگے۔“

59 ”میں خرچ کرتی ہوں؟“

”اے گھر والوں کے لیے اپنی ماما کے لیے اپنی بہن اور بھائی کے لیے۔“

60 ”جب تھک جاتی ہوں تو؟“

”تو ماما کی گود میں سر رکھ کر سو جاتی ہوں۔“



کے لیے نہیں، جبکہ دوسرے ممالک میں سب کے لیے ایک جیسے قوانین ہیں۔“

45 ”گھر میں کھانے کے لیے میری پسندیدہ جگہ؟“

”ڈائننگ ٹیبل۔“

46 ”دنیا میں سب سے قیمتی چیز کیا ہوتی ہے؟“

”میرے خیال میں خونی رشتے، کیونکہ دنیا میں آپ کو سب کچھ آسانی سے مل جاتا ہے۔ مگر خونی رشتوں کا کوئی نعم البدل نہیں۔“

47 ”میری چیخیں نکل جاتی ہیں؟“

”بب میں لال بیگ، پھپھکی اور رینگنے والے کیزے مکڑیوں کو دیکھتی ہوں۔“

48 ”کس قسم کے لوگ بہت برے لگتے ہیں؟“

”بھوئے، منافق اور غیبت کرنے والے لوگ۔“

49 ”شادی میں پسندیدہ ریمیں؟“

”ساری ریمیں ہی بہت مزے دار ہوتی ہیں۔ بہت انجوائے کرتی ہوں۔“

50 ”مجھے شرم محسوس نہیں ہوتی؟“

”اپنی غلطی پہ سوری کرتے ہوئے۔“

51 ”میری ایک عادت جو اچھی بھی ہے اور بری بھی؟“

”دوسروں کے ساتھ فریڈی ہونا۔ کچھ لوگ اچھا سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگ اس کا غلط مطلب لے لیتے ہیں۔“

52 ”کوئی گہری نیند سے جگا دے تو؟“

”تو نہ صرف غصہ آتا ہے بلکہ رونا بھی آ جاتا ہے۔“

53 ”زندگی میں change آیا؟“

”جب میں شو بزم میں آئی نہ صرف اپنی صلاحیتیں دکھانے کا موقع ملا بلکہ عزت و شہرت بھی بہت ملی۔“

54 ”بیز کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا رکھتی ہوں؟“

”ڈھیروں چیزیں ہوتی ہیں۔ جیسے فون چارجر، فون، پانی اور اپنی تصویر بھی۔ فریم میں۔“

55 ”کون سا تہوار منانا اچھا لگتا ہے؟“

”مجھے سب تہوار منانا اچھا لگتا ہے۔ خواہ عید، ہومدر

## ستارہ آمین کوئل

ادارہ

س ”آپ کا پورا نام گھر والے پیار سے کیا پکارتے ہیں؟“

ج ”ستارہ آمین کوئل گھر والے ستارہ اور دوست احباب کوئل بلاتے ہیں۔“

س ”کبھی آئینے نے آپ سے یا آپ نے آئینے سے کچھ کہا؟“

ج ”آئینہ کہتا ہے۔ گلاب چہرے پہ مسکراہٹ چمکتی آنکھوں میں شوخ جذبہ۔“

س ”آپ کی سب سے قیمتی ملکیت؟“

ج ”میرا قلم، میرا علم، میرے تمنائیں کے ساتھی، کتابیں، ڈائجسٹ، میری فلمی میری تحریریں، میری شاعری، میری سب سہیلیوں کی محبت میرا قیمتی اثاثہ ہے۔“

س ”آپ اپنی زندگی کے دشوار لمحات بیان کریں؟“

ج ”زندگی کا ہر لمحہ دشوار ہے۔ سبے شمار ہیں۔ چائے دیں جو گزر گیا سو گزر گیا۔“

س ”آپ کے لیے محبت کیا ہے؟“

ج ”اے محبت تو انداز بدل لے اپنا۔ حسین جذبہ جو رشتوں کو جوڑتی بھی ہے اور توڑتی بھی۔ اے محبت ترے انداز نرا لے دیکھے۔“

س ”مستقبل قریب کا کوئی منصوبہ جس پر عمل کرنا آپ کی ترجیح میں شامل ہے؟“

ج ”لکھنا بہت سارا اچھا لکھنا۔ قلم کا حق ادا کرنا۔“

س ”پچھلے سال کی کوئی کامیابی جس نے آپ کو مسرور و مطمئن کیا ہو؟“

ج ”پچھلا سال دکھوں پریشانیوں کا سال رہا۔ بہت زخم وے گیا۔“

س ”آپ اپنے گزرے کل، آج اور آنے والے

کل کو ایک لفظ میں کیسے واضح کریں گی؟“

ج ”اللہ پاک پر توکل۔“

س ”آپ اپنے آپ کو بیان کریں؟“

ج ”حساس، نڈر، سادہ سی، باوقار، صاف گوشت کی جسے

محبت ہو تو بے حد ہو، نفرت ہو تو بے پایاں۔“

س ”کوئی ایسا ڈر جس نے آج بھی اپنے بچے آپ میں گاڑے ہوئے ہیں؟“

ج ”اب کیسا ڈر کیسا خوف؟ جس کا یارم اللہ ہو اسے کسی کا ڈر خوف نہیں۔“

س ”آپ کی کمزوری اور طاقت کیا ہے؟“

ج ”کمزوری کوئی خاص نہیں، طاقت خاص الخاص ہے میرا اللہ جو میرے ساتھ ہے۔“

س ”آپ خوش گوار لمحات کیسے گزارتی ہیں؟“

ج ”اللہ جی کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنی دوستوں کے ساتھ شیر کر کے۔“

س ”آپ کے نزدیک دولت کی اہمیت؟“

ج ”اتنی تو ہو کہ بندہ گزارہ کر سکے اور اللہ کی راہ میں دونوں ہاتھوں سے لٹائے۔“

س ”گھر آپ کی نظر میں؟“

ج ”میرا گھر میری جنت۔ ہر عورت کا خواب میرا گھر ہو۔“

س ”کیا آپ بھول جاتی ہیں اور معاف کر دیتی ہیں؟“

ج ”جی معاف بھی کر دیتی ہوں اور بھول بھی جاتی ہوں۔ اسے بھول جاتا ہے بھول جا۔“

س ”اپنی کامیابیوں میں سے حصہ دار ٹھہراتی ہیں؟“

ج ”ماں کی دعاؤں۔ اللہ پاک کی رحمت و کرم کو۔“

یہ کامیابیاں یہ عزت یہ نام تم سے ہے خدا نے جو بھی دیا ہے مقام تم سے ہے

س ”سائنسی ترقی نے ہمیں مشینوں کا محتاج کر کے

کابل کر دیا یا واقعی ترقی ہے؟“

ج ”اس ترقی کے مثبت اثرات بھی ہیں پر منفی

کے ہیں زیادہ ہیں۔“

س ”کوئی عجیب خواہش؟“

ج ”آج سے چودہ سو سال پہلے کے وقت میں پلی جاؤں کاش۔“

س ”برکھارت کیسے انجوائے کرتی ہیں؟“

ج بارش کی رم جھم ہو یا اشکوں کی ہو دھار میرے پاگل من کی خاطر دو دھاری تلوار بارش برے رات کی رات اور دل روئے برسات من کی کشتی آر لگے نہ پار پھنسے بیچ منجدھار اداس ہو کر سب اپنے پھڑے دوستوں کو یاد کرتے ان کے لیے دعا کرتے۔

س ”آپ جو ہیں وہ نہ ہوتیں تو کیا ہوتیں؟“

ج ”ارے ستارہ آئین کو مل تو میں ہر حال میں ہوتی۔ بابا۔“

س ”آپ بہت اچھا محسوس کرتی ہیں جب؟“

ج ”محفل نعت میں حاضری ہو۔ صائمہ اکرم چوہدری کے اسٹینس پر نظر پڑے۔“

س ”آپ کو کیا چیز متاثر کرتی ہے؟“

ج ”پر خلوص رویہ، بناوٹ سے پاک شخصیات، سادگی اور پھول کلیاں۔“

س ”کیا آپ نے اپنی زندگی میں وہ سب پایا ہے جو آپ پانا چاہتی تھیں؟“

ج ”میں کیا پانا چاہتی تھی؟ جو اللہ نے دیا اس کا لالچوں بار شکر جو نہ دیا اس پہ کوئی شکوہ نہیں۔“

س ”آپ کی ایک خوبی یا خای جو آپ کو مطمئن یا مایوس کرتی ہے؟“

ج ”میں کسی سے حسد نہیں کرتی اپنا دل صاف رکھتی ہوں۔ خای یہ کہ دیر تک سونا۔“

س ”کوئی ایسا واقعہ جو آج بھی آپ کو شرمندہ کر دیتا ہے؟“

ج ”اللہ کا خاص کرم ہے ایسا کوئی واقعہ نہیں ہے۔“

س ”ایسا آپ مقابلہ انجوائے کرتی ہیں یا خوف زدہ ہو جاتی ہیں؟“

ج ”مقابلہ کیا ہو تو بتاؤں نا۔“

س ”متاثر کن کتاب مصنف ”مہودی“؟“

ج ”اشفاق احمد سے برہ کر کوئی متاثر کن نہیں۔ کتاب جو سب کتابوں کی سردار ہے یعنی قرآن پاک

ترجمہ کے ساتھ پڑھنا عمل کرنا پسند ہے۔“

س ”آپ کا غرور؟“

ج ”بندہ خاکی بہ غرور جچتا نہیں۔“

س ”کوئی ایسی شکست جو آج بھی آپ کو رلاتی ہے؟“

ج ”مجھے تو چھوٹی سی بات بھی رلا دیتی ہے۔ رویے کا بدلنا، لہجہ میں آنے والی تبدیلی بہت دکھ دیتی ہے۔ پھر

میں خود میں مزید سمٹ جاتی ہوں۔ اپنی ذات میں تنہا لڑکی، شکرے شکست کوئی نہیں نہ مالک دے۔“

س ”کوئی شخصیت یا کسی کی حاصل کی ہوئی کامیابی جس نے آپ کو حسد میں مبتلا کیا ہو؟“

ج ”شکرے مولا تیرا تو مجھے حسد میں مبتلا نہیں کرتا نہ ہی کرنا کبھی بھی۔“

س ”مطالعہ کی اہمیت آپ کی زندگی میں؟“

ج ”میں تو زندہ ہوں اس مطالعہ کی وجہ سے مجھے کھانے کو کچھ نہ دو بس اک اچھی کتاب ضرور دو جس سے میری روح کو تسکین ملے۔“

س ”آپ کی پسندیدہ شخصیت؟“

ج ”بے شمار ہیں ڈاکٹر مجید نظامی۔ یہ دور حاضری میری پسندیدہ شخصیت میں خود بھی ان کو فالو کرتی ہوں۔ دعا گو ہوں اللہ پاک مجھے بھی مجید نظامی جیسا اچھا

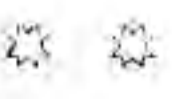
انسان بنائے۔ قائد اعظم کا سپاہی، غلام محمد اقبال کا شاہین بنائے۔ پیارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم کا غلام خاص بنائے۔ آمین۔“

س ”ہمارا پیارا ملک سارا کا سارا خوب صورت ہے آپ کا کوئی خاص پسندیدہ مقام؟“

ج ”اے وطن پیارے وطن پاک وطن، پاک وطن پاکستان میری جان، آن، شان، میری زندگی، سارا

ہی خوب صورت ہے، ہر جگہ پسندیدہ ہے، ہر مقام بہشت ہے۔“



# اگساگر ہے ریکی

ملک صاحب اپنے گھر والوں کو بے خبر رکھ کر اپنے کم سن بیٹے ایشال کا نکاح کر دیتے ہیں جبکہ ایشال اپنی کزن عریشہ میں دلچسپی رکھتا ہے اور سن بلوغت تک پہنچتے ہی وہ اس نکاح کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا ہے، ملک صاحب ہار مانتے ہوئے اس کی دوسری شادی عریشہ سے کر دیتے ہیں جس کی شرط صرف اتنی ہے کہ وہ اپنی پہلی منکوحہ کو طلاق نہیں دے گا۔

بیبہ تعلیم حاصل کرنے کراچی آئی ہے جہاں وہ شاہ زین کے والد کے آفس میں جاب کرنے لگتی ہے جس دوران شاہ زین بیبہ میں دلچسپی لینے لگتا ہے مگر حبیبہ کا رد عمل اس معاملے میں خاصا عجیب و غریب ہے وہ شاہ زین کو اپنا دوست تو مانتی ہے مگر اس کی محبت کا مثبت جواب نہیں دے پاتی۔

فرہاد تین بھائی ہیں اس کے دونوں بڑے بھائی معاشی طور پر مستحکم ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی بیوی بچوں کی ضروریات بھی کھلے دل سے پوری کرتے ہیں جبکہ فرہاد اس معاملے میں خاصا کجسوس ہے یہ ہی سبب اس کی بیوی زینب کو فرہاد سے بدظن کرنے کا باعث بن جاتا ہے۔

فضا زینب کی جھڑپ ہے جو اس کی خوب صورتی سے حسد کرتی ہے اور اپنی اس حسد کا اظہار وہ اکثر و بیشتر اپنے رویہ سے کرتی رہتی ہے۔ سالار صباست کا گھر ہے جو شادی شدہ ہونے کے باوجود زینب کو پسند کرنے لگتا ہے اسی لیے وہ بہانے بہانے اسے قیمتی تحائف سے بھی نوازا کرتا ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

۱۱

## گیارہویں قسط



”شاہ زین“

وہ جیسے ہی سیڑھیوں کی جانب بڑھا، حبیبہ تیزی سے بھاگ کر اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔  
”اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو مجھے ہوٹل چھوڑ دیں گے۔“  
اسے خاصی حیرت ہوئی شاید اتنے عرصہ دوستی میں پہلی بار حبیبہ نے اس کے ساتھ جانے کا خود کہا تھا۔  
”وائے ناٹ شیور۔“

وہ آگے کی جانب بڑھ گیا۔

”ایک سیکنڈ۔“

اس کے ساتھ چلتی حبیبہ کو جیسے پھر سے کچھ یاد آگیا۔

”کل سنڈے ہے نا؟“

پہلے کی طرح اس کا یہ سوال بھی خاصا غیر معقول سا تھا۔

”نہاں ہے آج اگر یسٹریڈے ہے تو یقیناً کل سنڈے ہی ہوگا۔“

”تو پھر ٹھیک ہے مجھے دوپہر میں پک کر لینا میں کل لچ آپ کی فیملی کے ساتھ کروں گی۔“  
اس نے تیزی کے ساتھ اپنی بات مکمل کی، آج کی اس کی ساری گفتگو ہی خاصی غیر متوقع تھی۔ شاہ زین چلتے چلتے رک گیا۔

”میری ٹک چڑھی ماما کے ساتھ لچ کرتے ہوئے تمہیں عجیب سا محسوس نہیں ہوگا۔“

حبیبہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے اپنی بات مکمل کی۔

”اب کیا کروں مجبوری ہے۔“

حبیبہ کندھے اچکاتے ہوئے ہنس دی۔

”تمہاری ناراضی سے بہتر ہے تمہاری ٹک چڑھی ماما کے ساتھ لچ کر لیا جائے۔“

”بائی داوے تم انہیں آنٹی کہہ سکتی ہو۔“

”اوکے ویسے گھر میں تمہاری ماما کے علاوہ اور کون کون ہوگا۔“ شاہ زین کے ساتھ چلتے چلتے اس نے دریافت

کیا۔

”کوئی بھی نہیں صرف میں اور ماما کیوں کہ پاپا تو تم جانتی ہو آج کل شہر میں نہیں ہیں شاید ایک دو دن تک

آجائیں۔“

”اچھا اور تمہاری بہن۔“

”بہن۔“ اس نے حبیبہ کی جانب دیکھ کر دہرایا۔

”شاید تم جاؤ یہ آپا کی بات کر رہی ہو۔“

”ہاں ہاں وہ ہی۔“

”وہ میری بہن نہیں کزن ہیں، آج کل اپنے سرال میں ہیں۔“

”اوہ اچھا تم ہمیشہ ایسے ذکر کرتے تھے کہ مجھے لگا وہ تمہاری سگی بہن ہیں۔“

”میرے لیے تو وہ سگی بہن سے بھی بڑھ کر ہیں ویسے بھی ان کے والدین کی وفات کے بعد ان کی زیادہ تر پرورش

میری ماں نے ہی کی ہے، سمجھ لو کہ میری ماما نے ہی انہیں پالا ہے ان کی شادی بھی ہمارے ہی گھر سے ہوئی تھی۔“

”اوہ گڈ یہ سب جان کر تو مجھے یقیناً آنٹی کے بارے میں اپنی رائے کو مکمل تبدیل کرنا ہوگا۔“

حبیبہ کا لہجہ ستا سکی تھا۔

”ہاں جب تم ان سے ملو گی تو مجھے یقین ہے کہ تمہارے تمام سابقہ خیالات غلط ثابت ہو جائیں گے کیوں کہ میری ممانہ صرف ایک بہترین ماں بلکہ ایک عظیم ترین عورت بھی ہیں۔“

”شاید ہر اولاد اپنی ماں کے بارے میں ایسے ہی خیالات رکھتی ہے۔“

حبیبہ نے پلٹ کر اسے دیکھتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

”یقیناً“ کیوں کہ ماں ایک ایسا رشتہ ہے جو ہر غرض سے پاک ہے۔“

”بے شک۔“

حبیبہ نے صرف اتنا کہا اور خاموش ہو گئی۔

”بہر حال میں ممانہ سے بات کر کے تمہیں فون پر بتا دوں گا اگر وہ کل گھر پر ہوئیں اور ان کی کوئی اور مصروفیت نہ ہوئی تو میں تمہیں بارہ بجے تک یک کر لوں گا۔“

”تھک ہے میں انتظار کروں گی۔“

ہوشل آیا تھا وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔



”میرا نام زینب ہے۔“

سامنے فرش پر بیٹھی لڑکی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے وہ دھیرے سے بولی۔

”زینب بنت ہاشم۔“

وہ لڑکی ہاتھ میں کاغذ قلم تھا اسے مکمل طور پر اس کی جانب متوجہ تھی اور چاہتی تھی کہ زینب اپنی بات دوبارہ شروع کرے مگر وہ اس طرح خاموش ہوئی جیسے الفاظ ختم ہو گئے ہوں۔ ”آپ کچھ کہہ رہی تھیں۔“

بالآخر ایک طویل خاموشی سے اکتا کر وہ لڑکی بول اٹھی۔

”ہاں میں کہہ رہی تھی کہ تم میرا نام صرف زینب لکھنا یا پھر ام مریم لکھ دینا ویسے بھی ہمارے مذہب میں عورت کی شناخت اس کے باپ یا شوہر کے نام سے نہیں ہوتی ہر عورت اپنی شناخت خود ہے اور میں بھی صرف زینب ہوں اپنی بچیوں کی ماں زینب اس کے علاوہ میری اور کوئی پہچان نہیں۔“

اپنی بات ختم کر کے وہ سانس لینے کے لیے رکی۔

”تمیں چاہتی ہوں تم میری کہانی لکھو بالکل سچ سچ جو میں تمہیں بتاؤں ماکہ دنیا جان سکے کیا صحیح تھا اور کیا غلط۔ وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ میں ایک لاپچی خود غرض اور عیاش عورت ہوں جس نے اپنے شوہر کے اعتماد کو دھوکا دیا اور اپنے شوہر کی قدر نہ کی اسے دنیا میں رسوا کر دیا وہ جان سکیں کہ سچ کیا تھا۔“

اتنا کہہ کر وہ رونے لگی۔

”دیکھیں پلیز آپ رو میں مت اور مجھ سے وہ سب کچھ کہہ دیں جو آپ کے دل میں ہے وہ سب کچھ جس نے آپ کو آج یہاں اس مقام پر لاکھڑا کیا ہے کہ اپنی اولاد کی جدائی بھی آپ کا مقدر نہ ہو گئی۔ آپ دنیا کو بتائیں کہ کن حالات کے تحت آپ نے یہ انتہائی قدم اٹھایا کیونکہ میں جانتی ہوں آپ ایک ماں بھی ہیں اور کسی بھی ماں کے نزدیک اس کی اولاد سے بڑھ کر کوئی اہم نہیں ہوتا۔“

لڑکی نے گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے زینب کا سر اپنے کندھے سے لگاتے ہوئے اسے تسلی دی۔

”میں تمہیں جو کچھ بتاؤں گی اسے من و عن لکھ دینا ماکہ دنیا یہ فیصلہ کر سکے کہ کون صحیح تھا اور کون غلط اور شاید اسی طرح میرے ماتھے پر لگی عیاشی اور بدکردار عورت کی مہر مٹ جائے۔“

وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے آہستہ آہستہ بولی۔  
 ”ٹھیک ہے بس اب آپ مجھے سب کچھ بتائیں وہ سب جو سچ ہے۔“  
 لڑکی اس کے قریب ہی بیٹھ گئی، اس نے اپنا کاغذ اور قلم ایک بار پھر سے سنبھال لیا اب وہ پوری طرح متوجہ تھی  
 کہ زینب جو کچھ کہے اسے پوری طرح اپنے پاس محفوظ کر سکے۔



”مما آپ پورے ٹائم پر اریشہ کو ایئر پورٹ سے پک کر لیجئے گا کیونکہ وہ اکیلے آتے ہوئے ویسے بھی کافی گھبراہٹی  
 ہے۔“

’فون کے دوسری طرف ایشال تھا۔  
 ”کیوں کیا تم اس کے ساتھ نہیں آ رہے؟“  
 ”مما کو ایشال کی بات سن کر حیرت کا جھٹکا لگا۔  
 ”میں تو ڈرائیٹ آؤں گا مجھے ابھی چھٹی نہیں ملی۔“  
 ”بیٹا ضرور آ جانا تم اچھی طرح جانتے ہو جیسا مجھے بھی کی اکلوتی بیٹی ہے اور تم تو پچھلے سال حذیفہ کی شادی پر بھی  
 نہیں آئے تھے اسے لے کر بھی وہ تم سے ناراض ہیں۔“  
 ”ممانے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”میں جانتا ہوں ممما کہ انٹی مجھ سے ناراض ہیں اس سلسلے میں میری حنظلہ اور حذیفہ دونوں سے بات ہوئی  
 ہے میں نے ان سے وعدہ کیا ہے۔ ان شاء اللہ شادی سے ایک ہفتہ قبل پہنچ جاؤں گا آپ آج پلیرزات نو بجے  
 تک اریشہ کو پک کر لیجئے گا بھولیے گا۔“  
 ”تم فکر مت کرو میں ڈرائیور کے ساتھ اسے خریدنے جاؤں گی بس تم شادی تک پہنچ جانا۔“  
 ”ان شاء اللہ ممما ضرور اللہ حافظ اپنا خیال رکھیے گا۔“



”میری تیسری بیٹی کی پیدائش نے ہی شاید میری زندگی کو یکسر تبدیل کر دیا، میں جو اپنی ماں کے گھر سے ایک ایسی  
 خوشگوار اور مکمل زندگی کا تصور لے کر اس گھر میں آئی تھی جہاں شاید سب کچھ میرے ایک اشارے کا منتظر ہو گا،  
 میں سمجھی تھی کہ وہ تمام خواہشات جو میری ماں پوری نہیں کر سکی، شوہر کے گھر یا کسی مشکل کے میرے حصول  
 میں ہوں گی مگر شادی کے بعد بتا چلا زندگی وہ نہیں ہے جس کا تصور ہمیشہ یہ رہا کہ شوہر کے گھر جا کر ہر خواہش پوری  
 کرنا یہاں تو شاید زندگی ماں کے گھر سے بھی زیادہ مشکل تھی۔

جہاں یہ سمجھا گیا کہ عورت ایک بے جان کٹھ پتلی ہے جس کی اپنی کوئی خواہشات نہیں ہوتیں، بلکہ اس کی  
 ذوری ایک مرد کے ہاتھ میں ہے وہ اسے جیسے چاہے اپنی مرضی کے مطابق چلائے۔ مجھے دوسرے مردوں کا نہیں پتا  
 مگر فرہاد ایک ایسا ہی مرد تھا جو مجھے اپنی مرضی کے رنگ میں ڈھالنا چاہتا تھا وہ چاہتا تھا کہ میرا سونا، باگنا، کھانا، پینا،  
 غرض کے پسنا اور زہنا بھی اس کے مرضی کے تابع ہو، بازار جا کر اپنی مرضی کی شاپنگ کرنا میری ایک ایسی خواہش  
 تھی جو گزرتے وقت کے ساتھ دم توڑ گئی۔ میں وہ ہی پہنتی جو مجھے فرہاد لادیتا، چاہے وہ مجھے ناپسند ہی کیوں نہ ہو، مگر  
 میں انکار کا حق نہ رکھتی تھی یہاں تک بھی ٹھیک تھا میں اپنی بچیوں کی خاطر سب کچھ برداشت کرنے کو تیار تھی مگر  
 جیسے ہی میں تیسری بار ماں بنی سب کچھ ایک دم تبدیل ہو گیا۔

میں تین دن اسپتال رہی، فرہاد ایک بار بھی مجھے یا بچی کو دیکھنے نہ آیا حتیٰ کہ اس نے میری خیریت دریافت کرنے

کے لیے ایک فون بھی نہ کیا شاید بیٹی کی پیدائش میری ایسی خطا تھی جس کی میں واحد ذمہ دار تھی۔  
صباح بھا بھی کے ساتھ ساتھ مجھے صدمہ بھائی نے بھی فون کیا دونوں نے ہی مجھے بیٹی کی پیدائش پر مبارکباد دی، فضا بھا بھی اور ان کے بچے بھی اسپتال آئے، میرے بھائی بھا بھی سب آئے، نہ آیا تو فرہاد نہ آیا، ڈیپارچ ہونے کے بعد اماں نے چاہا کہ میں ایک ماہ کے لیے ان کے ساتھ گھر چلی جاؤں مگر میں نے صاف انکار کر دیا مجھے اپنی بچی کے ساتھ اپنے ہی گھر جانا تھا میری ضد کے آگے اماں خاموش ہو گئیں اور مجھے احسان کے ساتھ آکر گھر چھوڑ گئیں وہ گھر جہاں میرا استقبال کرنے کے لیے کوئی بھی نہ تھا۔

فرہاد دکان پر تھا، اس نے مجھے آتے دیکھا ضرور مگر گھر آنے کی زحمت نہ کی۔ البتہ سادیہ میرے ساتھ ہی آگئی، دونوں بچیوں کو کھانا بنا کر دینے کے علاوہ اس نے میرے لیے بھی پرہیزی کھانا تیار کیا، گھر کی صفائی میں میری مدد کی اس کے جانے کے بعد میں رات تک منتظر رہی کب فرہاد دکان بند کر کے آئے اور میں اس کے تاثرات جان سکوں جو مجھے امید تھی کہ اچھے نہ ہوں گے، مگر میرے لیے اس دنیا میں سب سے زیادہ اہم وہ ہی ایک شخص تھا کیونکہ وہ میرے بچوں کا باپ ہونے کا اعزاز رکھتا تھا۔



مندى کے فکشن میں ہر طرف بکھرا گرین کھرا ایشال کو وہ سب کچھ یاد کروا رہا تھا جو وہ یاد کرتا نہ چاہتا تھا۔ اسے رہ رہ کر آج وہ ہرے پھلے والی لڑکی یاد آرہی تھی جو جانے کہاں اور کس حال میں تھی۔ اس نے تو ایشہ سے شادی کے بعد سے لے کر آج تک اپنی ماں سے بھی اس کا ذکر نہ کیا۔

وہ جب سے پاکستان آیا تھا پایا کارویہ اس سے خاصا ریزرو تھا، اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ انہوں نے اسے اور ایشہ کو اپنے گھر رکھنے کی اجازت دے دی تھی ورنہ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ پاکستان میں قیام کا تمام عرصہ اسے ماموں کے گھر رہنا ہو گا۔

مگر آج اس تقریب نے جانے کیوں اسے کئی سال پیچھے ماضی میں پہنچا دیا۔ آج اسے احساس ہوا اس نے جو کچھ کیا شاید اس لڑکی کے ساتھ زیادتی تھی اسے ایک دفعہ اس لڑکی سے ملنا ضرور چاہیے، یقیناً وہ لڑکی ابھی تک اس کے نام پر بیٹھی تھی کیونکہ طلاق اس نے دی نہ تھی اور خلع اس لڑکی نے لی نہ تھی۔

”مجھے بچہ سے بات کرنی چاہیے جو بھی ہو اس دفعہ میں اس سے مل کر اسے طلاق دے کر جاؤں گا تاکہ وہ اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کے لیے کسی بھی دوسری جگہ شادی کر سکے۔“

یہ سوچ کر اس نے ایک نظر کچھ دور بیٹھی ایشہ پر ڈالی جو زور و شور سے گانے گانے میں مصروف تھی۔  
”کبھی کبھی تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرے یہاں اولاد کا نہ ہونا بھی شاید اسی لڑکی کے دل سے نکلی کسی بددعا کا نتیجہ ہے۔“

اپنے سامنے کھڑے حنظلہ کے چھوٹے سے بیٹے کو دیکھتے بے اختیار اس کے دل میں یہ خیال آیا جس کی اس نے تردید نہ کی، حنظلہ کی شادی اس کی شادی کے صرف دو ماہ بعد ہوئی تھی اور آج وہ دو بچوں کا باپ تھا جبکہ اس کا آنگن ابھی تک سونا تھا۔

”بس تو طے سے اب میں اس لڑکی سے ضرور ملوں گا تاکہ پایا کی شرط کے مطابق اسے طلاق دے دوں اور وہ کہیں اور شادی کر سکے شاید اسی طرح میرے گھر کے سونے آنگن میں بہار آجائے۔“ پایا پر نظر ڈالتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا۔



”مجھے علم تھا تیسری بھی بیٹی ہی پیدا ہوگی۔“

فرہاد کا لہجہ خاصا تنگ آمیز تھا یا شاید مجھے ایسا محسوس ہوا میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا وہ فون کان سے لگائے غالباً اپنی بہن سے مصروف گفتگو تھا جس کی تصدیق اگلے ہی پل ہو گئی۔

”آپا میری ذمہ داری تو صرف دولا کر دینا تھی اب مجھے علم نہیں کہ اس نے کھائی یا نہیں۔“

یہ کہہ کر اس نے میرے چہرے پر ایک نظر ڈالی جہاں پھیلی ناگواری صاف محسوس کی جاسکتی تھی وہ اپنی آپا سے میرے بارے میں بات کر رہا تھا جبکہ یہ سب مجھے سخت ناپسند تھا۔

”نہیں آپا طبیعت تو نہیں خراب بس یہ بچی ساری رات روتی ہے اور مجھے بالکل بھی سونے نہیں دیتی اور صبح دکان پر جانا ہوتا ہے۔“

مجھے قطعی نظر انداز کر کے وہ آپا سے مصروف گفتگو تھا مجھے صرف فرہاد کی آواز سنائی دے رہی تھی دوسری طرف آپا کیا کہہ رہی تھیں میں وہ سب سننے سے قاصر تھی۔

”ہاں میں بھی یہ ہی سوچ رہا تھا چلیں ٹھیک ہے اللہ حافظ۔“

آپا نے مجھ سے بات کرنے کی زحمت نہ کی اور فون بند کر دیا۔

”تم ذرا فارغ ہو کر ساتھ والا کمرہ صاف کرو دینا میں آج سے وہاں سونا شروع کروں گا کیونکہ یہ ساری رات بہت روتی ہے اور میری غیند خراب ہونے کے باعث صبح مجھ سے دکان پر بیچ کام نہیں ہوتا۔“

یقیناً یہ وہ ہدایت تھی جو ابھی آپا نے چند پل قبل ہی اسے دی تھی اور اب اس پر عمل درآمد فرہاد کی زندگی کا اولین مقصد تھا۔

”ٹھیک ہے۔“

میرا موڈ اس سے کوئی بحث کرنے کا نہ تھا اور پھر شام تک کمرہ صاف ہو گیا اور اس رات جو فرہاد اس کمرے میں تنہا سویا تو اس نے پھر کبھی رات اٹھ کر یہ بھی دیکھنے کی زحمت نہ کی کہ مجھے اس کی ضرورت ہے یا نہیں دوسرے معنوں میں وہ دیگر تمام باتوں کے ساتھ ساتھ میری ہر ضرورت سے فارغ ہو گیا۔



آپا کا فون کب سے بج رہا تھا ایشال نے دیکھا وہ کمرے میں نہ تھے وہ اپنا فون صوفہ پر ہی بھول گئے تھے جب تک ایشال نے فون اٹھا لیا وہ بند ہو چکا تھا ایشال ان کا سیل ہاتھ میں لیے ماما کی جانب آ گیا۔

”آپا کہاں گئے ان کا فون کتنی دیر سے بج رہا ہے۔“

”جہاں کی شادی میں شرکت کے لیے سالار آ رہا ہے وہ اسے ریسیو کرنے ایئر پورٹ گئے ہیں اب کال آئے تو ریسیو کر لو کہیں کوئی ضروری فون نہ ہو۔“

ماما کی بات ختم ہی ہوئی تھی کہ فون ایک بار پھر سے بج اٹھا سالار نے دیکھا نمبر کسی بھی نام سے محفوظ نہ تھا اس نے ایس کا بٹن دبا کر سیل اپنے کان سے لگا لیا۔

”السلام علیکم انگل۔“

ایک نہایت خوب صورت آواز اس کے کان سے ٹکرائی۔

”وعلیکم السلام کون بات کر رہی ہیں آپ۔“

اس نے ماما کی جانب دیکھتے ہوئے دھیرے سے سوال کیا۔

”سوری کیا یہ ملک انگل کا نمبر نہیں ہے؟“

ایشال کی آواز سن کر وہ لڑکی، تذبذب کا شکار ہو گئی۔  
 ”جی یہ ان کا ہی نمبر ہے مگر اتفاق کی بات ہے بیبا اپنا فون گھر بھول گئے ہیں۔“  
 ”آپ کون بات کر رہے ہیں؟“

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد وہ لڑکی قدرے جھجکتے ہوئے بولی۔  
 ”میں ان کا بڑا بیٹا ایشال بات کر رہا ہوں اور آپ؟“

جانے کیوں ایشال کا دل چاہا وہ اس لڑکی سے اس طرح بات کرتا رہے اس کی آواز نہایت ہی مدھرا اور ریلی تھی  
 بالکل دل میں اتر جانے والی۔  
 ”ایشال۔“

لڑکی نے زیر لب دہرایا، ایشال اس کے جواب کا منتظر تھا مگر دوسری طرف مکمل خاموشی طاری تھی ایسے جیسے  
 لائن پر کوئی تھا ہی نہیں شاید دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا تھا۔  
 ”ہیلو۔“

ایشال نے اپنے خیال کی تصدیق چاہی اب دوسری طرف کوئی بھی نہ تھا۔ لائن ڈسکنیکٹ تھی۔  
 ”کون تھا؟“

ممانے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔  
 ”پتا نہیں۔“ وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔  
 ”میں نے نام پوچھا تھا مگر اس کے بتایا نہیں۔“  
 بیبا کا سیل ممانے کے حوالے کر کے وہ باہر نکل گیا۔



شاہ زین نے ایک نظر ممانے کے قریب بیٹھی حبیبہ پر ڈالی اسے یہ منظر بالکل مکمل لگا، ممانے کے پاس بیٹھی کسی بات پر  
 مسکراتی حبیبہ اور اس کی جانب شفقت سے دیکھتی ممانے کا دل یہ منظر پسند نہیں کرتا اور حبیبہ کو بھی اپنے گھر واپس  
 نہ جائے۔

بے اختیار ہی اس کے دل سے دعا نکلی، گرے اور ہنگ فرائک میں ملبوس حبیبہ آج پہلے سے کئی گنا حسین دکھائی  
 دے رہی تھی۔

شاہ زین محویت کے عالم میں اسے تک رہا تھا جب ممانے کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔  
 ”شینز کی۔۔۔“  
 ”جی ممانے۔“

وہ یک دم چونک اٹھا۔

”بیبا دیر ہو گئی ہے اسے ہوشل چھوڑ آؤ۔“

ممانے کی بات سننے ہی حبیبہ اٹھ کھڑی ہوئی، شاہ زین کا دل چاہا وہ اسے روک لے، کم از کم آج ایک رات کے لیے  
 وہ یہاں رک جائے ویسے بھی بیبا یہاں نہ تھے وہ اور ممانے گھر میں اکیلے تھے مگر وہ صرف یہ سوچ سکتا تھا کہ نہیں سکتا  
 تھا کیونکہ جانتا تھا حبیبہ اس کی ایسی چکانہ خواہش کبھی ماننے پر آمادہ ہونے والی نہ تھی۔  
 ”اچھا آنٹی اللہ حافظ۔“

وہ بڑے پیار سے ممانے کے گلے لگی۔

”اللہ حافظ بیٹا۔“

اس کے ساتھ ہی ممانے ایک خوب صورت چھوٹا سا پیکٹ اس کی جانب بڑھایا۔  
”یہ کیا ہے؟“

حبیبہ ہاتھ بڑھاتے بڑھاتے رک گئی۔

”کچھ بھی نہیں ایک معمولی سا تحفہ ہے، تم آج پہلی بار میرے گھر آئی ہو اسی لیے دے رہی ہوں۔“  
ممانے اسے ایک بار پھر خود سے لگاتے ہوئے وضاحت دی۔

”مگر آئی۔ تو خاصا قیمتی ہے۔“

حبیبہ نے بائس ہاتھ میں تھامتے ہی کھول کر دیکھا۔

”ہاں مگر تم سے زیادہ نہیں۔“

”لیکن آئی۔“

”کوئی لیکن لیکن نہیں تم میری بیٹی ہو اور بیٹیاں کبھی بھی ماں کا دیا ہوا لینے سے انکار نہیں کرتیں۔“

اس کی بات درمیان سے کاٹ کر وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولیں۔

جب کہ اس سراسر گفتگو کے دوران شاہ زین بالکل خاموش کھڑا تھا۔

”اور ویسے بھی تم میرے گھر آج پہلی بار آئی ہو اور ہماری روایت ہے کہ پہلی بار اپنے گھر آنے والے مہمانوں

کو خالی ہاتھ نہیں جانے دیتے۔“

وہ اس کے کندھے پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔

”او کے آئی اللہ حافظ آئی تھیں آپ کا گفٹ بہت خوب صورت ہے۔“

”ہاں اور میں ایک بار پھر کہوں گی تم سے ریاں نہیں۔“

جواباً وہ ہلکا سا ہنستے ہوئے بولیں۔

حبیبہ ان سے مل کر شاہ زین کے قریب سے گزرتے ہوئے آگے کی جانب بڑھ گئی اس کے لباس سے اٹھتی

کلون کی مہک نے شاہ زین کو مبہوت سا کر دیا اور وہ جانے کتنی دیر اپنی جگہ ساکت کھڑا رہتا اگر ممانے سے آواز دے  
کرنہ پکارتیں۔

”کہاں گم ہو جاؤ اسے چھوڑ کر آؤ آٹھ بجنے والے ہیں۔“

وہ ٹیبل پر رکھی گاڑی کی چابی اٹھا کر خاموشی سے اس کے پیچھے چل دیا۔



”السلام علیکم یارب۔“

ملک صاحب نے اپنے سامنے پھیلا اخبار سرکاتے ہوئے ایک ہلکی سی نظر ایشال پر ڈالی جو کرسی کھینچ کر عین ان

کے سامنے بیٹھ چکا تھا۔

”وعلیکم السلام۔“

سلام کا جواب دیتے ہی انہوں نے اخبار ایک بار پھر سے اپنے چہرے کے سامنے کر لیا، ایشال کی سمجھ میں نہ آیا

وہ آگے بات کیسے شروع کرے۔

”پاپا۔۔۔ آپ مجھ سے ابھی تک ناراض ہیں؟“

اپنی ساری ہمت مجتمع کرتے ہوئے وہ ایک بار پھر سے بول اٹھا۔

”نہیں تو۔“

نہایت ہی مختصر جواب وہ اخبار میں بری طرح مصروف تھے۔

”پاپا پلیز ہو سکے تو مجھے معاف کر دیں اس نا فرمانی پر جو مجھ سے سرزد ہوئی“

وہ لندن واپس جانے سے قبل اپنی ہر غلطی کا ازالہ کرنا چاہتا تھا۔

”کس بات کی معافی ایشال شاید تم نے سنا نہیں میں نے ابھی کہا تھا کہ میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔“

ملک صاحب نے نہایت نرمی سے جواب دیتے ہوئے اخبار پلیٹ کر اپنے سامنے موجود ٹیبل پر رکھ دیا۔

”بلکہ مجھے تو افسوس ہے میرا ایک غلط فیصلہ انجانے میں کسی معصوم کی زندگی برباد کرنے کا سبب بنا، معافی مجھ

سے نہیں اس سے مانگو جس کی زندگی تمہارے نام پر خراب ہوئی۔“

”ہاں پاپا کبھی کبھی تو مجھے بھی ایسا فیمل ہوتا ہے جیسے یہ سب اسی کی بددعا کا نتیجہ ہے جو میں آج تک اولاد جیسی

نعمت سے محروم ہوں۔“ وہ دھیرے سے بولا۔

”شاید اولاد کی کمی نے تمہیں تمہاری زیادتی کا احساس دلادیا اسی لیے کہا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں

مصلحت پوشیدہ ہے ورنہ آج اگر تم صاحب اولاد ہوتے تو کبھی مجھ سے معافی مانگنے کی زحمت نہ کرتے صحیح کہہ رہا

ہوں نا۔“

اپنی بات ختم کر کے انہوں نے ایشال سے تائید چاہی جو جواب میں بالکل خاموش، سر جھکائے بیٹھا رہا۔

”بہر حال اولاد کا ہونا نہ ہونا اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے اور یہ سب کچھ کسی کی بددعا کا نتیجہ نہیں ہوتا، ہمیں ہر چیز اپنے

ظالم پر اسی وقت ملتی ہے جب وہ ہمارے نصیب میں لکھ دی جاتی ہے تمہاری اولاد جب تمہارے نصیب میں ہوگی

تمہیں ضرور مل جائے گی تم بلا وجہ غلط سوچوں کو اپنے دماغ میں جگہ مت دو۔“ وہ آہستہ آہستہ اسے سمجھاتے

ہوئے بولے۔

”پاپا مجھے آپ سے ایک اور بات بھی کرنی ہے۔“

ملک صاحب کی بات ختم ہوتے ہی وہ جلدی سے بول اٹھا۔

”پاپا میں آپ کی عائد کردہ شرط کے مطابق اس لڑکی سے ملنے کو تیار ہوں مگر اس سے مل کر اسے طلاق دے

سکوں میں چاہتا ہوں پاپا آپ اس کی شادی کسی اور اچھی جگہ کر دیں مگر وہ بھی اپنی زندگی سکھ کے ساتھ گزار سکے

مجھ سے انجانے میں جو حق تلفی ہوئی اس کا ازالہ اس طرح ہی ممکن ہے کہ ہم اسے ایک خوشگوار زندگی دینے کی

کوشش کریں۔“

وہ جب تک بولتا رہا ملک صاحب اس کا چہرہ تکتے رہے۔

”فی الحال یہ ناممکن ہے۔“

ایشال کی بات ختم ہوتے انہوں نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

”کیونکہ وہ آج کل یہاں نہیں ہے اس کی ماں کی بری سے اور ہر سال وہ ان دنوں لاہور جاتی ہے یہ وہ دن ہیں جو

اسے خاصا ڈپریشن کر دیتے ہیں لہذا ان دنوں اس سے اس قسم کی کوئی بات نہیں ہو سکتی بہر حال وہ جیسے ہی واپس

آتی ہے میں کوشش کروں گا تمہاری اس سے ملاقات کروا سکوں۔“

ملک صاحب نے ہر بات تفصیل سے بتائی۔

”ایک بات پوچھوں پاپا۔“

ایشال آج ان سے ہر بات کر لیتا چاہتا تھا۔

”ہاں پوچھو۔“

”ماں تو وہ مریم آپا اور جاذیہ کی بھی ہیں تو پھر برسی وہ اکیلی کیوں مناتی ہے یہ دونوں اپنی بہن سے کیوں نہیں ملتیں۔“

”بہت سارے سوال ایسے ہوتے ہیں جن کا کوئی جواب نہیں ہوتا یا شاید کچھ فیصلے ہم اپنی عدالت میں خود ہی کر کے دوسرے فریق کو سزا بھی سنا دیتے ہیں تمہاری ماں کی طرح شاید ان دونوں کو بھی ایسا لگتا ہے جیسے وہ ان کی بہن نہیں ہے میری بات سمجھ رہے ہوں نا تم۔“

”جی میں سمجھ گیا آپ کیا کہنا چاہتے ہیں مگر پاپا اگر یہ سب سچ نہیں ہے تو آپ نے کیوں ان دونوں کو سب کچھ سچ سچ نہیں بتایا۔“

”کیا بتاتا بیٹا تم تو جانتے ہی ہو کہ ایک کی ساس فضا بھابھی ہیں اور دوسری کی تمہاری والدہ محترمہ اور ان دو خواتین کے ہوتے ہوئے تم امید کر سکتے ہو کہ ان دونوں بچیوں کو صحیح بات بتانے کا موقع مل سکے تمہاری طرح ان کے بریں بھی واش کر دیے گئے ہیں، تمہیں تو شاید اریشہ کی محبت نے کچھ صحیح سننے نہ دیا اور ان دونوں کو دنیا کی باتوں نے بہر حال وقت نے ان دونوں کے ساتھ بھی کافی زیادتی کی پھر بھی میں واہوں گا۔“

تمہاری ماں اور تانی کو جنہوں نے مریم اور جاذیہ کو نہ صرف ماں بن کر لالا بلکہ بہو کا رشتہ جوڑ کر ساری زندگی اپنی آنکھوں کے سامنے بھی رکھا تمہاری ماں نے مریم اور جاذیہ کو ہمیشہ اپنی سگی اولاد سے بڑھ کر چاہا یہ ہی سبب تھا جو تمہارا نکاح کرتے ہوئے میں نے یہ نہ سوچا کہ معاملہ اس قدر خراب ہو جائے گا مجھے امید تھی کہ تھوڑا غصہ کرنے کے بعد تمہاری ماں اس بچی کو قبول کر لے گی مگر ایسا نہ ہوا جس پر مجھے افسوس ضرور ہے غصہ نہیں بہت ساری باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ہمیں درست فیصلہ نہیں کرنے دیتیں یا شاید قسمت میں جو جیسے لکھا ہو ویسا ہی ہو کر رہتا ہے اور اس سلسلے میں ہم سب بے اختیار ہیں۔“

ملک صاحب نے اپنی بات ختم کر کے ٹیبل پر رکھا اخبار ایک بار پھر سے اٹھا لیا جس کا مطلب تھا وہ کسی ٹاپک پر مزید بات کرنا نہیں چاہتے۔

”اوکے بابا۔“

ایشال اٹھ کھڑا ہوا۔

”پلیز آپ میری بات یاد رکھیے گا اور کوشش کیجئے گا کہ اگر وہ میرے واپس جانے سے قبل آجائے تو میری اس سے ملاقات ضرور کروا دیجئے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“

ملک صاحب نے ایشال کی جانب دیکھے بنا جواب دیا اور اخبار کے مطالعہ میں کھو گئے۔

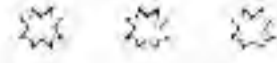


پتا نہیں میرے اور فرہاد کے درمیان اتنا فاصلہ کیسے آیا کہ میں صرف اس کی ضرورت بن کر رہ گئی، محبت تو جانے کہاں گئی وہ محبت جو میاں بیوی کے رشتہ کا لازمی جزو ہے ہم دونوں کے درمیان سے بھاپ بن کر اڑ گئی، وہ محبت جو ایک شوہر اپنی بیوی سے کرتا ہے میرے لیے صرف ایک خواب بھی نہیں مانتی ہوں کہ فرہاد کی بے رخی اور سرورویہ نے مجھے اس سے دور کر دیا۔

اس عرصہ میں فرہاد میں صرف ایک اچھی تبدیلی یہ آئی کہ وہ نماز مسجد گمانہ کے ساتھ تہجد بھی پڑھنے لگا، وہ رات باوضو سوتا، صبح چار بجے کے لگ بھگ اٹھ جاتا نماز اور قرآن کی باقاعدہ تلاوت کرتا۔ اپنے سارے دن کی اپنی سرگرمیاں رات وہ یا سنین آپا سے ضرور شیئر کرتا، جو اسے دل کھول کر خراج تحسین پیش کرتے سے کبھی یہ سوال

نہ کرتیں کہ تم حقوق اللہ پورا کرنے کی کوشش میں ہلکان ہوتے ہوئے حقوق العباد تو نہیں بھول گئے؟ کہیں وہ حق تو نہیں فراموش کر دیا جو اللہ نے تمہارے ذمہ بیوی کا لگایا تھا۔

کاش وہ یہ سب سوال کرتیں فریاد کو احساس دلاتیں تو شاید آج وہ سب نہ ہوتا جو ہوا، لیکن نہیں سچ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے نصیب میں جو لکھ دیتا ہے وہ ہر حال میں پورا ہو کر رہتا ہے یقیناً ”اگر میرا رب مجھے اس بری گھڑی سے بچانا چاہتا تو وہ حادثہ نہ ہوتا جو اس دن ہوا جس نے مجھے اور فریاد کو ایک دوسرے کے لیے قطعی اجنبی کر دیا۔



”حبیب“

”ہاں بولو۔“

وہ کی بورڈ پر مسلسل انگلیاں چلاتے ہوئے ذرا کی ذرا رکی۔

”تمہیں میری ممانیسہ لگیں؟“

اس نے حبیب کے چہرے پر ایک گہری نظر ڈالتے ہوئے سوال کیا۔

”بہت اچھی اور ٹائپ میں ان کے بارے میں جوابدہائی آپریشن تھی وہ انتہائی غلط تھی۔“

کمپیوٹر اسکرین سے نظر ہٹا کر اس نے شاہ زین کی جانب دیکھتے ہوئے نہایت صاف گوئی سے جواب دیا۔

”تھینک گاڈ ورنہ میں تو ڈر رہا تھا جانے تمہاری رائے ان کے بارے میں کیا ہو۔ شاہ زین ایک گہرا سانس خارج کرتے ہوئے ہنس دیا۔

”اور اصل حبیب ممانیسہ ہمارے گھر والوں سے ملنا چاہتی ہیں۔“

وہ فوراً ”سے بیشتر اپنے اصل مدعا کی جانب آگیا۔

”میرے گھر والے۔“

حبیب کا ”کی بورڈ پر تیزی سے پلٹنا ہاتھ یک دم ساکت ہو گیا۔

”ہاں تمہاری امی یا پھر وہ آئی جس سے اس دن میں ملا تھا یعنی کوئی بھی تمہارا ایسا فیملی ممبر جس سے مماثل نکلیں۔“

وہ سمجھ نہیں پارتا تھا کہ حبیب کو اپنی بات کس طرح سمجھائے۔

”میرے والدین حیات نہیں ہیں اور یہ بات شاید میں پہلے بھی آپ کو بتا چکی ہوں۔“ وہ ایک بار پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

”حبیب تم ایک سیکنڈ کے لیے اپنا یہ کام چھوڑ کر میری بات نہیں سن سکتیں۔“ اب وہ پوری طرح جھنجھلا گیا۔

”ہاں بولو میں سن رہی ہوں۔“

حبیب شٹ ڈاؤن کرتے ہوئے پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور ظاہر ہے رشتہ طے کرنے کے لیے میری ممانیسہ ہمارے کسی فیملی ممبر سے ملنا از حد ضروری ہے۔“

اس نے جلدی جلدی اپنی بات مکمل کی۔

”واٹ۔“

شاہ زین کی بات سنتے ہی حبیب کو ایک جھٹکا سا لگا۔

”مجھ سے شادی۔“

وہ بے ساختہ ہنس دی اس کو اس طرح ہنستے دیکھ کر شاہ زین کچھ شرمندہ سا ہو گیا، ہنستے ہنستے حبیبہ کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔

”آپ میرے بارے میں کیا جانتے ہیں؟“

اس نے سیدھا شاہ زین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔  
 ”میں کون ہوں؟ کس خاندان سے تعلق رکھتی ہوں؟ میرا فیملی بیک گراؤنڈ کیا ہے؟ کیا آپ یہ سب جانتے ہیں حیرت ہے شاہ زین اتنا برا فیصلہ کرنے سے قبل آپ نے مجھ سے کچھ پوچھا ہی نہیں۔“  
 وہ اب مکمل طور پر سنجیدہ تھی۔

”تم کون ہو؟ کس خاندان سے تعلق رکھتی ہو؟ یہ سب جاننا میرے لیے انتہائی غیر ضروری ہے میرے لیے ضروری صرف اتنا ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں پس اس سے زیادہ میرے لیے کوئی بات اہمیت نہیں رکھتی۔“  
 اس کا لہجہ قطعی اور حتمی تھا۔

”حیرت تو اس بات کی ہے کہ میرے بارے میں اتنا برا فیصلہ کرنے سے قبل آپ نے یہ جاننا بھی ضروری نہیں سمجھا کہ آیا میں بھی آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں یا کہ نہیں۔“

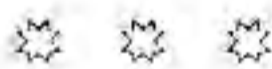
وہ کرسی پیچھے کھسکاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔  
 ”تو جیہ ہے کہ میں آپ سے شادی کر ہی نہیں سکتی کیونکہ آئی ایم آل ریڈی میڑ۔“  
 وہ شاہ زین کے اس قدر قریب تھی کہ اس کے بالوں سے اٹھتی مسک شاہ زین کے نتھنوں میں گھس کر اسے بے چین کر گئی۔

”واٹ۔“

اب جھٹکا لگنے کی باری شاہ زین کی تھی، حبیبہ کی قربت کی مدہوشی سے وہ ایک دم ہی باہر نکل آیا۔  
 ”کیا بکو اس ہے یہ۔“

اس کی آواز بے اختیار ہی بلند ہو گئی۔

”یہ بکو اس نہیں سچ ہے سو فیصد سچ میرے ہر مینڈپاکستان سے باہر ہیں جس کے باعث میں ہاسٹل میں تنہا رہائش اختیار کرنے پر مجبور ہوں اور ایسے میں آپ جیسے لوگ جانے کب کیا اندازے لگاتے رہتے ہیں۔“  
 وہ اس کے قریب سے گزر کر باہر جاتے ہوئے بولی ”شاہ زین کچھ بول نہ سکا، حبیبہ کے اس انکشاف نے اسے سن کر دیا اور وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔“



”میں مریم اور جازیہ کو اسکول سے لے کر گھر واپس آ رہی تھی جب وہ خوفناک حادثہ رونما ہوا جس نے میرے ہوش و حواس کو کچھ دیر کے لیے مفلوج کر دیا ایک منٹ پوری بات بتانے سے قبل میں آپ کو واضح کر دوں جازیہ کون تھی؟“

جازیہ دراصل جگنو کا وہ نام تھا جو اس کے برتھ سرٹیفکیٹ پر درج تھا جبکہ جگنو تو میں اسے صرف پار سے پکارتی تھی۔ ہاں تو میں آپ کو اس حادثہ کے بارے میں بتا رہی تھی جب روڈ کر اس کرتے ہوئے بالکل اچانک ہی ایک تیز رفتار گاڑی مریم کو ٹکراتی گزر گئی۔ اس کا سرفٹ پاتھ سے ٹکرایا اور وہ وہیں بے ہوش ہو کر گر گئی اسے اس طرح خون میں لت پت دیکھ کر میں اپنے حواس کھو بیٹھی مریم کے گرد ایک جم غفیر اکھٹا ہو گیا بھانت بھانت کی

آوازیں میرے کانوں سے ٹکرارہی تھیں مجھ کو سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرنا ہے جب یک دم مجمع کو چیرتا ہوا ایک شخص آگے بڑھا۔

”ہیں سب لوگ یہاں سے۔ بجائے بچی کو اسپتال لے جانے کے آپ سب لوگ یہاں کھڑے باتیں بنارہے ہیں۔“

لوگوں کے تارنے کے بعد اس نے میری جانب دیکھا۔

”گھبراؤ مت کچھ نہیں ہوا اسے معمولی زخمی ہے اسپتال جا کر مرہم پی ہوگی تو ٹھیک ہو جائے گی۔“  
مجھے تسلی دینے کے بعد اس نے مریم کو گود میں اٹھالیا یہ دیکھے بنا کہ مریم کا خون اس کے سفید کلف شدہ لباس کو خراب کر رہا ہے۔

”بلیز آپ میرے ساتھ آئیں۔“

اور میں خاموشی سے روتی ہوئی جگنو کو گود میں لیے اس اجنبی شخص کی گاڑی میں جا بیٹھی کیونکہ اس وقت میرے پاس اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا وہ شخص کون ہے؟ یہ جاننے سے زیادہ ضروری میرے نزدیک میری بچی کی زندگی تھی اس کی بے ہوشی میرے دل کو ہولا رہی تھی مگر میں خدا پر مکمل بھروسہ کیے اس کی گاڑی میں سوار اسپتال کی جانب رواں دواں تھی۔



”دیکھو بیٹا کوئی بھی مسئلہ اس طرح رونے دھونے سے حل نہیں ہوتا۔“  
سالار نے اپنے سامنے بیٹھی بری طرح روتی اس لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھ کر سمجھایا۔  
”میرا مشورہ مانو ایک دفعہ ایشال سے مل لو اور ختم کرو اس کہانی کو جس نے تمہاری ساری زندگی کو ایک اذیت بنا دیا میں نے صدمہ کو پہلے ہی سمجھایا تھا کہ تمہیں ایشال سے طلاق دلوادے ماکہ ہم تمہاری بھی کہیں اور شادی کر سکیں اور تم ایک خوش گوار زندگی میں داخل ہو کر ماضی کی تمام تلخیوں کو بھلا سکو مگر جانے کیوں اس وقت تم دونوں نے ہی میری بات نہ مانی بہر حال اب بھی کچھ نہیں بگڑا صدمہ کی شرط کے مطابق ایشال تم سے ملاقات کرنے کو تیار ہے دوسرے لفظوں میں وہ تم سے مل کر تمہیں طلاق دینا چاہتا ہے۔“  
اس نے روتے روتے اپنا سر اٹھایا۔

”ظاہر ہے بیٹا اگر وہ تمہارے ساتھ رہنا چاہتا تو ایشال سے شادی بھی کیوں کرتا۔“ سالار کی دلیل معقول تھی۔  
”مگر انکل۔“

طلاق کا خوف اس کے دل میں کسی ناگ کی طرح پھن پھلائے بیٹھا تھا اور یہ بات سالار سے زیادہ بہتر کون جان سکتا تھا۔

”کوئی اگر نہیں۔ حقیقت کا سامنا کرو بچے زندگی ریت میں سروے کر نہیں گزرتی اسے فیس کرنا پڑتا ہے ویسے بھی جب تک ایک مشکل ختم نہ ہو ہم آسانیوں کی راہ پر قدم نہیں رکھ سکتے میری بات سمجھ رہی ہوتا؟“  
سالار آج اسے ہر بات کھل کر سمجھانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

”تمہارے لیے بہتر یہ ہے کہ تم ایشال سے طلاق لو ماکہ تمہاری کہیں اور شادی کی جاسکے ساری جوانی اس طرح تنہائی کا عذاب سہتے ہوئے نہیں گزر سکتی یہ ایک بہترین وقت ہے ٹھیک فیصلہ کرنے کا اپنی مری ہوئی ماں کی روح کو سکون دینے کا اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ ہمت کرو اور اپنے حق میں فیصلہ کی خاطر ایشال کا سامنا کرو۔“

سالارا نکل ٹھیک کہہ رہے تھے یہ ہی تو وہ وقت تھا جس کا انتظار جانے اسے کب سے تھا۔

”ٹھیک ہے انگل میں ایشال سے ملنے کے لیے تیار ہوں۔“

اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اس نے سالارا کی جانب دیکھا۔

”مذمبھے تم سے یہ ہی امید تھی یاد رکھنا بیٹا مجھے اپنے رب پر پورا بھروسہ ہے اس نے ضرور تمہارے لیے ایک ایسا متبادل رکھا ہوگا جو پہلے سے کئی گنا بہتر ہوگا اور ان شاء اللہ وہ تمہیں ضرور مل کر رہے گا جو تمہارے نصیب میں لکھا جا چکا ہے۔“ وہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولے۔



”تم نے حبیبہ سے بات کی تھی۔“

ممانے صوفے سے سر نکالے، آنکھیں موندے شاہ زین کا کندھا ہلایا۔

”جی ممان۔“

وہ جلدی سے سیدھا ہو بیٹھا اس کی آنکھیں بالکل سرخ تھیں شاید اس کی نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔

”پھر کب ملواری ہے ہو مجھے اس کی آئی ہے۔“

”شاید کبھی نہیں۔“

وہ نظریں چراتے ہوئے دھیرے سے بولا۔

”کیوں۔“

ممان کو حیرت ہوئی۔

”حبیبہ نے انکار کر دیا ہے کیا؟“

اس کے علاوہ کوئی وجہ ان کی سمجھ میں نہ آئی۔

”جی ممان۔“

اس کی آواز رندھ گئی۔

”ممان وہ شادی شدہ ہے اور مجھے دیکھیں میں اتنا بے خبر تھا کہ مجھے اس بات کا آج تک علم ہی نہ ہوا یہاں تک کہ

کرن بھی اس کی شادی کے بارے میں قطعی کچھ نہیں جانتی پتا نہیں ممان مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ حبیبہ نے اپنی

شادی کے حوالے سے جو کچھ مجھ سے کہا آیا وہ سچ بھی ہے یا جھوٹ۔“

ایک بے بسی سے اس کے لہجہ میں در آئی۔

”شوہر کہاں ہے اس کا؟“

ممان اس کی کسی بھی بات پر توجہ دے بنا تیزی سے بولیں۔

”شاید لیس باہر رہتا ہے کسی اور ملک میں ہمیں نے پوچھا نہیں۔“

”اوہ میرے خدایا اس کا مطلب میں جو کچھ سمجھ رہی تھی وہ سچ تھا۔“

ان کی آواز کپکپا رہی تھی یا شاید شاہ زین کو ایسا محسوس ہوا۔

”میرے ساتھ آؤ۔“

وہ تیزی سے اوپر جانے والی سیڑھیوں کی جانب بروہیں شاہ زین عالم حیرت میں گھرا ان کے ساتھ ہولیا۔ جب وہ

اسٹڈی کا دروازہ کھول کر پاپا کے عین سامنے جا کھڑی ہوئیں۔

”سالارا۔“

انہوں نے پیپا کو پکارا 'شاہ زین کو ان کی آواز نہ دیکھی ہوئی ان کی آنکھیں سرخ تھیں یقیناً' وہ رو رہی تھیں۔

"جیبہ کون ہے؟"

پیپا کے کچھ کہنے سے قبل ہی انہوں نے وہ سوال کر دیا جسے سنتے ہی پیپا حیرت کے عالم میں منہ کھولے ان کی جانب دیکھنے لگے۔

"مجھے بتائیں سالار جیبہ کون ہے؟"

اب وہ باقاعدہ رو رہی تھیں 'شاہ زین کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا یہ سب کیا ہو رہا ہے وہ ہکا بکا ان دونوں کی جانب تک رہا تھا۔

"تم سمجھ رہی ہو وہ بالکل درست ہے نازیہ۔"

پیپا اپنا قلم نیل پر رکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے 'آہستہ آہستہ چلتے وہ ماما کے قریب آن کھڑے ہوئے۔

"جیبہ زینب کی بیٹی ہے۔"

"اوہ میرے خدا یا آپ نے آج تک مجھ سے یہ بات چھپائی اس لیے میں جب اسے دیکھتی تھی مجھے زینب کی یاد آ جاتی تھی۔" پیپا خاموشی سے سر جھکائے کھڑے تھے۔

"وہ تمہاری بھابھی ہے شاہ زین، تمہارے بھائی ایشال کی منکوحہ جسے طلاق دیے بنا اس نے ارشہ سے شادی کر لی۔"

ماما نے پلٹ کر شاہ زین کی جانب دیکھا جو اپنی جگہ بالکل ساکت کھڑا تھا یہ ایک ایسا انکشاف تھا جس نے اسے بالکل سن کر دیا تھا اور وہ کچھ بھی بولنے کے قابل بھی نہ رہا تھا ایک کے بعد ایک انکشاف نے اسے دنگ کر کے رکھ دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"پلیز آپ روئیں مت آپ کی بچی اب بالکل ٹھیک ہے صرف خوف کے باعث بے ہوش ہو گئی تھی اب اسے پر لگی چوٹ کی ڈر نہ لگ ہو گئی ہے، بچی بھی ہوش میں ہے آپ چاہیں تو میرے فون سے اپنے گھر اس حادثہ کی اطلاع دے سکتی ہیں۔"

سامنے کھڑے شخص نے موبائل میری جانب بڑھایا۔

میں جیسے یک دم ہوش میں آ گئی مجھے یاد آیا جیبہ صبح سے اوپر فائرہ کے پاس تھی 'فرہاد جب دوپہر میں گھر آیا ہوا تھا تو ہمیں نہ پا کر یقیناً 'پریشان ہوا ہو گا سوچ رہا ہو گا میں جانے کہاں گئی یہ بھی سب سوچتے ہوئے میں نے اپنے پاس سے وہ پریچی نکالی جس پر فرہاد کا موبائل نمبر درج تھا اور خاموشی سے سامنے کھڑے شخص کی جانب بڑھا دی 'اس نے نمبر ملا یا اور فون میری سمت بڑھا دیا۔

"ہیلو فرہاد میں زینب بات کر رہی ہوں۔"

فرہاد کے فون ریسپونڈ کرتے ہی میں بے قراری سے بولی۔

"کہاں ہو تم فائرہ کئی بار پوچھ چکی ہے بچی نے رو کر اپنا برا حشر کر لیا ہے اور یہ کس کے نمبر سے بات کر رہی ہو تم۔"

اسے جیسے اچانک ہی یاد آیا کہ میرے پاس تو موبائل فون ہی نہیں ہے جواباً میں نے اسے ساری بات بتا دی۔

"اوہ کہاں ہو تم اس وقت 'میرا مطلب کس اسپتال میں ہو اور مریم کیسی ہے؟"

اس کے لہجہ کی بے قراری مجھے اچھی لگی۔

”اب تو اللہ کا شکر ہے کہ وہ ٹھیک ہے۔“

جواب کے ساتھ ہی میں نے اسپتال کا نام بھی بتا دیا۔

”کیا ضرورت تھی اتنے مہنگے پرائیویٹ اسپتال جانے کی۔“

اسپتال کا نام سنتے ہی فرہاد کا موڈ آف ہو گیا۔

”قریب ہی ایک سرکاری ڈسپنسری تھی وہاں لے جاتیں مگر اب تمہیں کون سمجھائے تمہیں تو صرف ایک ہی

شوق ہے کہی بہانے فرہاد کا روپیہ برباد کرنے کا۔“

وہ وقت ان باتوں کا نہیں تھا، میری کچھ دیر قبل والی خوشی کا فور ہو گئی۔

”بہر حال میں آ رہا ہوں۔“

میرا جواب سننے بنا اس نے فون بند کر دیا۔

”میرے ہر منڈ آ رہے ہیں۔“

میں نے فون اپنے سامنے کھڑے شخص کی جانب بڑھا دیا جو میری طرف ہی متوجہ تھا۔

”میرا خیال ہے آپ مسز فرہاد ہیں۔“

فون تھامتے ہی اس نے اپنا خیال ظاہر کیا جو سو فیصد درست تھا۔

میں حیران ہو گئی وہ مجھے کیسے جانتا تھا۔

”آپ شاید مجھے نہیں جانتیں میں فائزہ کا بھائی ہوں آپ کے گھر اس دن چابی کے لیے آیا تھا۔“

”اوہ۔“

تو یہ ہی سبب تھا جو وہ شخص مجھے کیسے دیکھا ہوا لگ رہا تھا۔

”آپ کی بچیاں تو اکثر مجھے فائزہ کے گھر دکھانی دیتی ہیں بہر حال آپ کی بیٹی ڈسچارج ہو چکی ہے، میں فائزہ ہی کی

طرف جا رہا ہوں آپ اگر چاہیں تو آپ کو بھی ڈراپ کروں گا۔“ وہ سوالیہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

”نہیں شکریہ آپ کا بس فرہاد ابھی آتے ہی ہوں گے۔“

جانتی تھی اگر اس وقت میں فرہاد کو اسپتال میں نہ ملی تو کئی دنوں تک اس کا موڈ آف رہتا تھا نہ صرف یہ بلکہ اس

نے مجھے بہت باتیں بھی سنائی تھیں اس لیے بہتر تھا سامنے کھڑے شخص کو صاف منع کر دیا جائے۔

”جیسے آپ کی مرضی۔“

مریم کو نرس نے میرے قریب ہی رکھی کرسی پر لا بٹھایا، ساتھ ہی ایک چھوٹا سا پلاسٹک کابینک جس میں اس کی

دوائیاں تھیں۔

”میں نے بل پے کر دیا ہے کچھ زیادہ نہیں تھا۔“

مجھے ابھمن میں مبتلا دیکھ کر وہ فوراً ہی سمجھ گیا۔

”ویسے اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں۔“

وہ شخص گہری نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

”جی پوچھیں۔“

میں نے چادر کو اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ لیا۔

”آپ استانی فضیلت کی بیٹی تو نہیں ہیں وہ جو مغل پورہ میں بچوں کو قرآن شریف پڑھاتی ہیں غالباً اس کا نام

بھی زینب ہی تھا۔“

مجھے حیرت ہوئی فارزہ نے تو کبھی مجھ سے اس حوالے سے بات نہیں کی تھی۔  
 ”پلیز آپ کچھ غلط مت سمجھیں میں بھی وہیں کارہائشی ہوں ہمارا گھر آپ کی دوسری گلی میں تھا آپ نے یقیناً“  
 مجھے نہیں دیکھا ہو گا مگر میں نے اکثر آپ کو اسکول سے گھر آتے جاتے دیکھا تھا۔“

”آپ نے ٹھیک پہچانا استانی فضیلت میری والدہ ہیں۔“  
 کسی شخص کی یادداشت اتنی اچھی بھی ہو سکتی ہے میں حیران تھی۔  
 ”اچھا اللہ حافظ میں اب چلتا ہوں۔“

شاید وہ میری بے چینی بھانپ گیا تھا اس لیے اٹھ کھڑا ہوا۔  
 میں نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کیوں کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ فرہاد کے آنے تک وہ یہاں موجود

رہے۔  
 ”آپ کا بہت بہت شکریہ آپ نے آج میری بہت مدد کی۔“  
 مجھے بروقت یاد آیا کہ اس شخص کی مہربانی کے باعث ہی آج مریم اسپتال پہنچ پائی تھی۔  
 ”کوئی بات نہیں۔“  
 مجھے جواب دے کر وہ شخص باہر نکل گیا۔



”بی بی جی آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔“  
 ”کون ہے؟“

حبیبہ نے الماری کے پٹ بند کر کے رابعہ کی جانب دیکھا جو اسی ہاسٹل کی ملازمہ تھی۔  
 ”جی نہیں جی کوئی بیگم صاحبہ ہیں۔“  
 ”بیگم صاحبہ۔“ حبیبہ نے حیرت سے دہرایا۔  
 ”یہ مجھ سے ملنے کون آگیا؟“

اس نے دل ہی دل میں سوچا ضرور مگر بولی نہیں۔  
 ”اچھا انہیں بٹھاؤ میں آرہی ہوں۔“

بالوں کو اچھی طرح سنوار کر گلے میں دوپٹا ڈالے جیسے ہی وہ وینٹک روم میں داخل ہوئی خلاف توقع اپنے سامنے  
 موجود نازیہ کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔  
 ”آئی آپ۔“

وہ اتنی ایکسائینڈ ہوئی کہ سلام کرنا بھی بھول گئی۔  
 ”ہاں بیٹا میں۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔  
 ”پلیز آئی بیٹھیں آپ۔“

”مجھے معاف کر دینا حبیبہ میں نہیں جانتی تھی کہ تم کون ہو۔“  
 حبیبہ کے قریب آکر اسے سینے سے لگاتے ہوئے وہ اتنا بے اختیار بولیں کہ حبیبہ ہکا بکا رہ گئی۔  
 ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کو سالارا انکل نے سب کچھ بتا دیا ہے۔“

نازیہ آنٹی کے رویہ نے اس پر ہر بات واضح کر دی۔  
 ”ہاں بیٹا وہ سب کچھ جس کا تعلق تمہاری ماں کی ذات سے تھا آج ہم وہ سب جان گئے جو نہ جانتے تھے اور اللہ

تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے ہم اس کے لیے بہت کچھ غلط سمجھتے رہے ہمیشہ اس غلط فہمی کا شکار رہے کہ تم شاید فرہاد کی بیٹی ہی نہیں ہو یہ سب وہ غلط باتیں ہیں جو فاضلہ بھابھی نے شروع دن سے ہی ہمارے دلوں میں ڈال دی تھیں ایسی باتیں جو میں اور صباحت چاہ کر بھی دل سے نہ نکال سکے بہر حال بیٹا اب ہو سکے تو ہمیں معاف کر دو بے شک گزرا وقت واپس نہیں آسکتا پھر بھی ہم یہ چاہیں گے کہ تمہارے ساتھ جو بھی زیادتی آج تک ہوئی ہے اس کا کسی حد تک ازالہ کیا جاسکے۔

وہ رو رہی تھیں جواباً ”جیبہ کے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔

”رات میری مریم اور جاذبہ دونوں سے بات ہوئی ہے وہ دونوں بھی بے حد شرمندہ ہیں اور تم سے ملنا چاہتی ہیں بس بیٹا تم ہم سب کو معاف کر دو۔“

انہوں نے روتی ہوئی جیبہ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

”پلیز آئی آپ مجھے شرمندہ مت کریں۔“

اتنی محبت کا تو جیبہ نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر نازیہ کے بندھے ہاتھ کھول دیے۔

”آئی میری اماں آپ سے بہت محبت کرتی تھیں انہوں نے ہمیشہ آپ کو اچھے الفاظ میں یاد کیا۔“

”ہاں بیٹا میں جانتی ہوں وہ مجھ سے اپنی سگی بہن سے بھی بڑھ کر محبت کرتی تھی بس میں ہی اپنی نا سمجھی کے

باعث دوسروں کی باتوں میں آگئی میں تمہیں یہاں سے لینے آئی ہوں اپنا سامان پیک کرو تمہیں آج اور اسی وقت

یہاں سے جانا ہے تم یہ باتیں چھوڑ رہی ہو اور یہ ہم سب کا متفقہ فیصلہ ہے۔“

وہ شاید سب کچھ طے کر کے آئی تھیں۔

”مگر آئی۔۔۔“

”اگر مگر کچھ نہیں جلدی جلدی سامان پیک کرو اور ہمارے ساتھ گھر چلو۔“

پشت کی جانب سے آئی یہ آواز یقیناً ”سالارا انگس“ کی تھی جیبہ حیرت سے پٹی۔

”ہاں بیٹا ہماری کوتاہیوں کے باعث تم نے بہت قید تنہائی کاٹ لی اب ہم میں سے کوئی بھی یہ نہیں چاہتا کہ تم

مزید ایک پل بھی یہاں رہو۔“

سارے فیصلے ہو چکے تھے جیبہ کے پاس انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں تمہارا ویٹ کر رہی ہوں تم اپنا سامان لے آؤ۔“

”اوکے آئی۔“

جواب دے کر وہ باہر نکل آئی۔



”کیا ضرورت تھی اتنے مہنگے اسپتال جانے کی قریبی کسی کلینک سے پی ٹی کروالیتیں بلا وجہ اتنا پیسہ برباد کیا۔“

یہ وہ جملہ تھا جو جانے دن میں کتنی بار مجھے فرہاد سے سننا پڑتا جبکہ بل کی مد میں خرچ ہونے والی رقم وجاہت نے

ہم سے نہیں لی تھی۔ فرہاد کی اس گفتگو نے مجھے جی بھر کر بدظن کر دیا، مریم اب بالکل ٹھیک تھی مگر پر زخم کا نشان

بھی خاصا مندمل ہو چکا تھا۔ مریم کے ساتھ پیش آنے والے اس اتفاقی حادثے نے مجھے فائزہ کے خاصا قریب کر دیا

شاید اس کی ایک وجہ وجاہت بھی تھا عموماً ”جب بھی میں اوپر جاتی وہ پہلے سے ہی موجود ہوتا اور نہ فائزہ مجھے نیچے

سے بلا کر لے جاتی ان دونوں بہن بھائیوں کی سنگت میں میرا وقت اتنا اچھا گزرنے لگا کہ میں آہستہ آہستہ اپنے گھر

کی تلخیاں بھولنے لگی۔

وجاہت اپنی بہن کے لیے جب بھی کچھ لاتا میرا حصہ ضرور ہوتا اور پھر جانے کیسے ایسا ہوا کہ ہم دونوں کے درمیان سے فائر نہ نکل گئی اب صرف میں اور وجاہت ہی رہ گئے یہ سب کیسے ہوا مجھے پتا ہی نہیں چلا سہ میری اتنی تعریفیں کرتا کہ میرا دل چاہتا وہ اسی طرح بولتا رہے اور میں اس کے سامنے بیٹھی سنتی رہوں اور اس دن تو میں بہت ہی حیران ہوئی جب وجاہت نے بتایا کہ وہ مجھے شادی سے پہلے پسند کرتا ہے اس نے اعتراف کیا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا اور وجاہت کی یہ بات سن کر جانے کتنے دنوں تک میں ایک صدمے کی سی کیفیت میں مبتلا رہی۔

’کاش وجاہت مجھے شادی سے پہلے مل جاتا تو یقیناً“ آج فرہاد کی جگہ وہ ہوتا اور پھر صورت حال قدرے مختلف ہوتی۔“

رفتہ رفتہ اس سوچ نے میرے دماغ کو بالکل مفلوج کر دیا۔ فرہاد سے مجھے بالکل انیسیت نہ رہی وہ میرے لیے قلعی ابھی بن گیا، پہلے وہ مجھے اگنور کرتا تھا اب میں نے اسے اگنور کرنا شروع کر دیا وقت نے مجھے ضرورت اور محبت کے درمیان فرق سمجھا دیا وجاہت کی محبت نے مجھے اپنی نظروں میں دنیا کی حسین ترین عورت قرار دے دیا میں بھول گئی کہ ایک شادی شدہ عورت ہونے کے ناطے میرے فرائض کیا ہیں؟ میں اپنی مینوں بچیوں کو میکسر فراموش کر کے وجاہت کی محبت میں غرق ہو گئی۔

اس کا تعریفیں کرتا میری ہر ضرورت کا خیال رکھتا، یہاں تک کہ محبت سے میری جانب تکنا، یہ سب وہ کچھ تھا جو مجھے آٹھ سالہ ازدواجی زندگی میں کبھی نہ ملا وجاہت نے میری تری روح کو سیراب کر دیا۔ کیا گناہ کیا ثواب اپنے نفس کی تسکین کے لیے میں سب کچھ بھلا بیٹھی۔ کسی نے صحیح کہا ہے ”عورت اور مرد کی تنہائی میں تیسرا وجود شیطان کا ہوتا ہے۔“ وہ شیطان ہم دونوں کے درمیان داخل ہو چکا تھا اپنے آپ کو تباہی کے وہانے کی طرف دھکیل کر شاید میں فرہاد سے انتقام لے رہی تھی۔ میں سارا دن ننگ سگ سے تیار رہتی میری یہ تیاری وجاہت کے لیے ہوتی فرہاد میری طرف متوجہ ہے یا نہیں اس بات کی اہمیت میرے نزدیک بالکل ختم ہو گئی تھی۔



آج ملک انکلیڈ کے ساتھ آنٹی اور ایشال بھی آرہے تھے شاید اریشہ بھی ان کے ساتھ تھی مگر اسے کسی سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی اس کے لیے پریشانی کی بات تو صرف یہ تھی کہ شاہ زین اسے مسلسل اگنور کر رہا تھا وہ جب سے یہاں آئی تھی اس کا سامنا بہت کم ہی شاہ زین سے ہوتا مگر جب بھی کبھی اتفاق سے وہ اس کے سامنے آتا ایک دم ہی اجنبی سا بن جاتا اور یہ بھی بات حبیبہ کے لیے باعث تکلیف تھی ابھی کچھ دیر قبل ہی اسے نازیہ آنٹی نے بتایا تھا کہ انکل اور آنٹی صباحت کے ساتھ ایشال اور اریشہ اس سے ملنے آرہے ہیں لہذا وہ اچھی طرح تیار ہو کر نیچے آجائے مگر وہ نہایت بددلی سے بیڈ پر بیٹھی جانے کیا سوچ رہی تھی جب کمرے کا دروازہ کھول کر کوئی اور داخل ہوا۔

”تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں نیچے ماما تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔“

یہ آواز یقیناً ”شاہ زین کی تھی اس نے چونک کر سر اٹھایا وہ اس کے عین سامنے سینے پر دونوں ہاتھ باندھے کھڑا اس کی ہی جانب متوجہ تھا۔ شاہ زین کو آج اتنے دنوں بعد خود سے مخاطب دیکھ کر وہ یک دم ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی آنسو خود بخود اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔

”کم آن حبیبہ خود کو مضبوط کرو ایشال کو احساس دلاؤ کہ وہ تمہارے لیے اتنا ہی غیر اہم ہے جتنی تم اس کے لیے، اس کا سامنا خود اعتمادی سے کرو جتنے آنسو بہانا ہے ابھی بہا لو اور رولو جتنا رونا ہے مگر خدا کے لیے اس کے سامنے

اس طرح مت رونا اس کے سامنے بنے والا ایک آنسو کا قطرہ بھی تمہاری اہمیت ختم کروینے کے مترادف ہے میری بات سمجھ رہی ہوتا۔“

جیبہ کے آنسو اسے بے چین کر گئے۔  
”میں اس کے لیے نہیں رو رہی۔“

جیبہ نے تیزی سے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے وضاحت دی۔  
”میں تو صرف اس لیے رو رہی ہوں کہ آج اتنے دنوں بعد تم نے مجھے مخاطب کیا، مجھ سے بات کی، تمہیں اس طرح اچانک اپنے سامنے دیکھ کر مجھے اتنی خوشی ہوئی ہے کہ بے اختیار ہی آنسو آنکھوں سے بہہ نکلے ورنہ ایساں میرے لیے اتنا اہم نہیں کہ اس کے لیے اپنے قیمتی آنسو ضائع کروں۔“  
اس کی فطری خود اعتمادی لوٹ آئی۔

”گڈ نیچے ایسی ہی جیبہ چاہیے خود اعتماد اور حاضر جواب اب وہ کچھ ہی دیر میں پہنچنے والے ہیں جلدی سے تیار ہو کر نیچے آ جاؤ۔“

شاہ زین کمال بہت کچھ کہنے کو چاہا، مگر وہ اتنا ہی کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ گیٹ کے دوسری طرف تیز مارن کی آواز سنائی دی اس نے کھڑکی کا پردہ ذرا سا سرکا کر نیچے جھانکا گاڑی ملک انکل کی تھی، خان چاچا نے گیٹ کھول دیا تھا وہ پردہ چھوڑ کر تیزی سے الماری کی جانب بڑھی اپنا ڈریس نکالا اور باتھ روم میں گھس گئی۔



آج فضا بھابھی کے گھر میلاد تھا، میں فرہاد کے ساتھ جب وہاں پہنچی تقریباً ”میلاد ختم ہونے والا تھا۔ میلاد کے بعد کھانے کا اہتمام خواتین کے لیے چھت پر ہی تھا سب سے فارغ ہو کر میں نیچے آئی جہاں لاؤنج میں فرہاد، اسفند بھائی کے ساتھ موجود تھا مجھے جلدی واپس گھر جانا تھا کیوں کہ صبح مریم اور جازیہ (یہ جگنو کا اصل نام تھا اور وہ جب سے اسکول داخل ہوئی تھی میں اسے اسی نام سے پکارنے کی عادی ہو چکی تھی) کا اسکول تھا اور جازیہ اگر کسی وجہ سے سونے میں لیٹ ہو جاتی تو صبح اٹھتے سے بہت تنگ کیا کرتی۔

”فرہاد کھانا کھا لیا ہے تو آ جائیں گھر چلیں۔“

تیزی سے بولتے ہوئے میرا جملہ درمیان میں ہی رہ گیا، لاؤنج میں فرہاد اور اسفند بھائی کے ساتھ ایک تیسری شخصیت بھی موجود تھی جس پر پڑنے والی پہلی نظر نے ہی مجھے ساکت کر دیا میرے عین سامنے والے صوفے پر سالار موجود تھا۔

”السلام علیکم زینب کیسی ہیں آپ۔؟“ مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”شکراً الحمد للہ بالکل ٹھیک ہوں، آجائیں فرہاد دیر ہو رہی ہے۔“

اسے جواب دے کر میں نے فرہاد کو مخاطب کیا اور خود لاؤنج سے باہر نکل آئی۔ سالار اور جازیہ نے پچھلے کچھ عرصہ میں مجھے اگنور کیا تھا جس کا احساس ابھی بھی میرے دل میں پوری طرح موجود تھا یہ ہی وجہ تھی۔ وہ میرا دل سالار سے زیادہ بات کرنے کو بالکل نہیں چاہا۔



”تم نے ایک بات نوٹ کی؟“

فضہ بھابھی نے حسب عادت سیپتیس پھیلاتے ہوئے سوال کیا۔

”کون سی بات؟“ صبا حجت جانتی تھیں ان کی پٹاری میں ضرور کوئی نئی بات موجود ہوگی۔

”زینب خاصی بدل گئی ہے۔“

جانے کیوں زینب ہمیشہ ان کی خصوصی توجہ کا مرکز رہی اور یہ بات صباحت سے زیادہ بھلا کون جان سکتا تھا۔

”میں آپ کی بات سمجھی نہیں بھابھی آپ کس تبدیلی کی بات کر رہی ہیں؟“

”زینب کے رویہ کی جو پہلے سے بالکل بدل چکا ہے پہلے والی اپنائیت اور لگاؤ تو اب اس میں سرے سے

غائب ہو چکی ہے اس کی جگہ عجیب سی سرد مہری اس کے مزاج کا حصہ بن گئی ہے۔“

جانے ان کا پیش کردہ تجزیہ درست تھا یا غلط صباحت سمجھ نہ پائیں۔

”میری تو ایک ماہ قبل فون پر اس سے بات ہوئی تھی مجھے تو ایسا کچھ محسوس نہیں ہوا۔“

”اچھا۔۔۔“

فصلہ بھابھی کچھ مایوس سی ہو گئیں۔

”ہو سکتا ہے مگر جانے کیوں مجھے زینب کچھ عجیب سی لگنے لگی ہے۔“ وہ اپنی بات سمجھا نہیں پا رہی تھیں۔

”چلو خیر، میں کیا۔۔۔“

وہ سمجھ چکی تھیں کہ صباحت ان کی گفتگو میں دلچسپی نہیں لے رہیں اس لیے ہی انہوں نے بات کو ختم کرتے

ہوئے کہا۔

”لگتا ہے مسلسل بچیوں کی پیدائش نے اسے تھوڑا سا بدل کر دیا ہے۔“

”ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔“

صباحت نے ان کی بات سے مکمل طور پر اتفاق کیا۔



فرہاد کافی دیر سے فون پر بڑی تھا اس کی گفتگو سے میں اندازہ لگا چکی تھی کہ یقیناً ”دوسری جانب یا سمین آپا ہیں“ مگر اب میں نے ان فون کالز سے پریشان ہونا چھوڑ دیا تھا وہ دونوں بہن بھائی کیا بات کر رہے تھے مجھے اب یہ سب جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ فرہاد کو مکمل طور پر نظر انداز کر کے میں لی وی دیکھنے میں مصروف تھی جب اچانک اوپر جانے والی سیڑھیوں سے فائزہ نے مجھے آواز دی۔

”زینب آئی۔۔۔ زینب آئی۔“

”ماں کیا ہوا؟“ لی وی آف کر کے میں فوراً ”صحن میں نکل آئی۔“

”مچھلی کھائیں گی وجاحت بھائی لے کر آئے ہیں۔“

وہ سیڑھیوں کے اوپر منڈیر پر جھکی مجھ سے پوچھ رہی تھی وجاحت پچھلے دنوں سے اپنے چھوٹے بھائی کے پاس

حیدر آباد گیا ہوا تھا اب فائزہ کی بات سنتے ہی میں سمجھ گئی کہ وہ واپس آچکا ہے میرا دل یک دم ہی خوشی سے بھر گیا۔

”میں اوپر ہی آ رہی ہوں۔“

اسے جواب دے کر میں نے جلدی جلدی اپنا حلیہ درست کیا اور اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

مجھے پیچھے کی کوئی فکر نہیں تھی کیوں کہ جانتی تھی کہ میں کتنی ہی دیر بعد گھر واپس آؤں فرہاد نے کوئی پروا نہیں کرنی

یہاں تک کہ بستر میں جانے سے قبل اس نے آواز دے کر مجھے نیچے بھی نہیں بلانا اس کے اس قسم کے رویہ نے

ہی مجھے شاید اس قدر آزاد اور خود سر بنادیا تھا یا شاید میں بھی دوسروں کی طرح اپنی غلطیوں کا الزام خود سے منسلک

دوسرے افراد پر ڈالنے کی عادی ہوتی جا رہی تھی۔



بے چینی ایشال کے چہرے سے چھلک رہی تھی، اریشہ نے ایک نظر بغور اس کے چہرے کی جانب تکا اور دوسری نظر اپنے بالکل سامنے بیٹھی صباحت آنٹی پر ڈالی جو نہایت اطمینان سے نازیہ آنٹی سے محو گفتگو تھیں وہ نفرت جو حبیبہ کا نام سنتے ہی ان کے چہرے پر چھا جایا کرتی تھی آج سرے سے غائب ہو چکی تھی یعنی کافی کچھ بدل چکا تھا اور جو رہ گیا تھا وہ کچھ ہی دیر میں تبدیل ہونے والا تھا۔ وہ کہانی جو آج کئی سال قبل شروع ہوئی تھی بہت سارے لوگوں کو کئی عرصہ تک تکلیف میں مبتلا رکھ کر آج ختم ہونے والی تھی۔

اس نے بے چینی سے پہلو بدلا جانے حبیبہ اب تک کیوں نہیں آئی تھی وہ بڑی شدت کے ساتھ اس کی آمد کی منتظر تھی وہ اسے دیکھنا چاہتی تھی اس سے ملنا چاہتی تھی حبیبہ نامی وہ تلوار جو کئی سالوں سے ان دونوں میاں بیوی کے سر پر لٹک رہی تھی آج اس سے نجات کا دن تھا، وہ چاہ رہی تھی کہ ہر عمل بخوبی انجام پاجائے اور جھنی جلد ہو سکے ایشال حبیبہ کو طلاق دے دے۔

وہ ان ہی سوچوں میں غرق تھی جب دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی اس نے فوراً گردن گھما کر دیکھا اندر داخل ہونے والا شاہ زین تھا اس کے ساتھ ساتھ ایشال کے چہرے پر بھی ایک مایوسی سی چھا گئی۔



”ایک بات کہوں زینب۔“

وجاہت نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟“ میں نے سر اس کے کندھے سے ٹکاتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

”مجھ سے شادی کرو گی۔“

”کیا۔“

میں نے جھٹکے سے آنکھیں کھولتے ہوئے سیدھی ہو گئی، کچھ سال قبل یہ جملہ اسی طرح میرے کانوں نے سنا تھا، مگر کہنے والا شخص کوئی اور تھا آج پھر میں اسی جگہ کھڑی تھی وہی جملہ اور وہی ہی محبت، مگر کہنے والا کوئی اور۔

”میری بات کا جواب دو زینب۔“

میری خاموشی نے شاید اسے پریشان کر دیا۔

”مگر یہ کیسے ممکن ہے میں تو پہلے ہی شادی شدہ ہوں۔“

اس دفعہ میرا لہجہ پہلے سے خاصا کمزور تھا وہ مضبوطی جو سالار کو جواب دیتے ہوئے میرے انداز میں تھی آج وہ کہیں نہ تھی شاید فرہاد کے رویہ نے مجھے اندر سے توڑ دیا تھا۔

”ہمارے مذہب میں طلاق رکھی ہی اس لیے گئی ہے کہ ہم اپنی ناپسندیدہ زندگی سے نجات حاصل کر سکیں، ہمیں کہیں پابند نہیں کیا گیا کہ ایک مسلسل اذیت میں رہتے ہوئے جیسے تیسے اپنی زندگی پوری کرو اور مر جاؤ۔ قرآن میں کہیں عورت کے لیے یہ حکم نہیں ہے کہ وہ دوسری شادی نہیں کر سکتی۔“ وہ مجھے سمجھاتے ہوئے بولا۔

”مگر وجاہت میری بچیاں۔“

ایک اور کمزور دلیل۔

”مجھے تمہاری بچیاں دلانے پر کوئی اعتراض نہیں ہے، لیکن یہ تم پر منحصر ہے اگر تم چاہو تو۔“

”دنیا کیا کہے گی اگر میں فرہاد کو چھوڑ کر تم سے شادی کر لوں پورا خاندان مجھ پر تھو تھو کرے گا۔“ میری آواز خاصی دھیمی تھی۔

”ایک ناجائز تعلق دنیا کے سامنے آنے سے بہتر ہے کہ اسے جائز کر لو۔ دنیا سے زیادہ اللہ کا خوف دل میں رکھو سب آسان ہو جائے گا۔“ وجاہت کی ہر بات درست تھی میں سوچنے پر مجبور ہو گئی۔

”نقد پرید نے کا ایک موقع ہر انسان کو ضرور ملتا ہے۔“ سالار کے الفاظ ایک بار پھر میرے کان سے ٹکرائے، مجھے تو قدرت نے ایک کے بعد دوسرا موقع فراہم کر دیا تھا اب مجھ پر منحصر تھا میں اس موقع سے فائدہ اٹھاؤں یا ایک بار پھر سے رد کر کے پرانی زندگی میں لوٹ جاؤں، مگر اب کی بار میرا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا۔

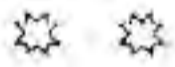
”پھر کیا سوچا زینب؟“ وہ منتظر انداز میں مجھے دیکھ رہا تھا۔

”مجھے کچھ ٹائم دو میں اچھی طرح سوچ لوں۔“ یہ میری طرف سے نیم رضامندی تھی۔

”جتنا چاہو ٹائم لے لو مگر میں یہ چاہوں گا کہ تمہارا فیصلہ میرے حق میں ہو کیوں کہ میں اب تمہارے بنا زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“

اس نے ایک محبت بھری نگاہ میرے چہرے پر ڈالی ایسی نگاہ جس نے مجھے ساری دنیا بھلا کر صرف اسی کا ہی کر دیا تھا۔ ویسے بھی وہ شادی شدہ نہ تھا۔ سالار کے ساتھ تازیہ کی موجودگی مجھے اس سے دور کرنے کا باعث بنی تھی اور یہاں ایسا کچھ نہ تھا اسی لیے میں مطمئن تھی۔

(آئندہ ماہ آخری قسط ملاحظہ فرمائیں)



ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

ساری بھول  
ہماری تھی



راحت جبین

قیمت - 300 روپے

شریک سفر



زہرہ ممتاز

قیمت - 550 روپے

کسی راستے کی  
تلاش میں



میمونہ خورشید علی

قیمت - 350 روپے

میرے خواب  
لوٹا دو



نگہت عبداللہ

قیمت - 400 روپے

فون نمبر:  
32735021

منعوانے مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی



چچی تھیں لیکن میں انہیں امی کہنے پر تیار نہ ہوتی تھی۔ میری امی کی فونو تو دادی کے بکسے میں پڑی تھی جس میں امی گونے والا غرارہ پننے ابو کے ساتھ کھڑی مسکرا رہی تھیں۔

خیر دادی کی بات میری عقل میں سما ہی گئی اور میں نے زرینہ بیگم کو امی کہنا شروع کر دیا تھا لیکن وہ صرف نام کی ہی امی تھیں۔ عملی طور پر دادی میری ماں تھیں اور میں دادی کی بیٹی تھی۔ دادی مجھے صبح جگاتیں۔ ہاتھ منہ دھلوا کر ناشتا کرواتیں پھر انگلی پکڑ کر خود اسکول چھوڑ کر آتیں حالانکہ تائی، چچی اور امی کے بچے بھی اسکول جاتے تھے لیکن وہ گھر کے پاس والے اسکول میں ہی جاتے تھے۔ دادی نے مجھے سڑک پار والے زیادہ اچھے اسکول میں داخل کروایا تھا میں پڑھائی میں اپنے گھر کے سب بچوں میں سب سے اچھی تھی۔ ہمارے گھر میں پڑھائی کا خاص رجحان نہ تھا۔

ابو، تایا اور چچا کی مین بازار میں کراری کی تین بڑی دکانیں تھیں۔ تایا کے دونوں بیٹے چھوٹی عمر سے ہی اسکول چھوڑ چھاڑ کر تایا کے ساتھ دکانیں سنبھال چکے تھے۔ چچا کی کوئی اولاد نہ تھی نہ ہی نہ تھی اور میرا چھوٹا بھائی (ابو اور زرینہ امی کا بیٹا) بھی تایا کے بچوں کے نقش قدم پر چلنے کا ارادہ ظاہر کر چکا تھا۔ خیر ابو اسے زبردستی پڑھنے بھیجتے تھے باقی بچی گھر کی لڑکیاں تو انہیں انڈین فلمیں دیکھنے گانے سننے اور جینز اکٹھا کرنے کا شوق تھا۔ سب سے پہلے میری تایا زاوہن نوشین کی شادی ہوئی۔ اس کی شادی میری پھوپھو کے بیٹے سے ہوئی تھی فمد بھائی کی کاسیٹس شاپ تھی۔ پھر تایا ابو

میرے گھر کی اوپر، نیچے کی دو منزلوں میں تین کنبے بستے تھے اور ان تین کنبوں کے کل افراد کی تعداد پندرہ تھی۔ ان پندرہ لوگوں میں دادی کو شامل کر لیا جاتا تو تعداد سولہ ہو جاتی۔ ان سولہ افراد کے ساتھ میں بچھلے بائیس برس سے زندگی گزار رہی تھی۔ ظاہر ہے سب کے ساتھ میرا خون کا رشتہ تھا ہاں دادی کے ساتھ خون کے رشتے کے ساتھ دل اور روح کا بھی رشتہ تھا۔ میں دو سال کی تھی کہ امی دوسرے بچے کی پیدائش کے وقت زچگی میں پیچیدگی کے باعث زندگی کی بازی ہار گئیں۔ امی کی پہلی برسی سے بھی پہلے ابو سری بیوی بیاہ لائے تھے۔ سوتیلی ماں کے روایتی ظلم و ستم کی داستانیں کہانیوں فلموں اور ڈراموں میں بار بار دہرائی جاتی ہیں لیکن مجھے سوتیلی ماں کا کوئی عتاب نہ سہتا پڑا کیونکہ امی کے انتقال کے بعد دادی نے مجھے اپنی پر شفقت آغوش میں سمیٹ لیا تھا۔

سوتیلی ماں کو تو میں اپنے تایا کے بچوں کی دیکھا دیکھی ایک عرصے تک چچی کہہ کر پکارتی رہی تھی پھر جب ہوش سنبھالا تو ایک روز میرے سر میں تیل کی مالش کرتے ہوئے دادی نے مجھے بہت پار سے سمجھایا کہ زرینہ چچی صرف تایا کے بچوں کی چچی ہیں اب کی بیوی ہونے کے حوالے سے وہ میری ماں کے رتبے پر فائز ہیں سو مجھے انہیں امی کہہ کر بلانا چاہیے۔ میں بچپن میں بہت ضدی قسم کی بچی تھی۔ کسی بات پر اڑ جاتی تو اڑ جاتی، کوئی مجھ سے زور زبردستی بات نہ منوا سکتا تھا۔ دادی مجھے جو بات سمجھا رہی تھیں وہ اس سے پہلے میری تائی، پھوپھی اور حتیٰ کہ زرینہ چچی تک سمجھا

کے ذیشان کی شادی چچا کی فرح سے ہو گئی۔ چچا کی دوسری دو بیٹیوں کے رشتے چھوٹی عمر میں ان کے ننھیال میں طے پا گئے۔ ہمارا پورا گھرانہ بنیادی طور پر کاروباری گھرانہ تھا صرف مجھے ہی پڑھنے کا شوق تھا اور دادی کو مجھے پڑھانے کا لیکن جب میں نے ہائر سیکنڈری اسکول سے ایف اے کا امتحان پاس کر لیا تو جیسے دادی کے شوق کو قرار مل گیا۔

”خیر سے بہت پڑھ لیا فریحہ۔ اب کچھ گھرداری بھی

سیکھ لے۔“

”ابھی سے گھرداری سیکھ کر کیا کروں گی دادی! ابھی تو میں نے پی اے کرنا ہے پھر ایم اے اس کے بعد ایم ایڈ پھر۔“

”پی اے کالج سے ہو گا اور کالج بہت دور۔ تیرا باپ کبھی جانے کی اجازت نہ دے گا۔“ دادی نے ترنت میری بات کالی تھی۔

”آپ اجازت دلوائیں گی تو کیوں نہ ملے گی اجازت



آخر آپ میرے باپ کی ماں ہیں۔“

”ماں ہوں اس کی اسی کیے جانتی ہوں اس کے مزاج اور عادتوں کو وہ تیرے ہاتھ پہلے کرنے کی سوچ رہا ہے۔ اس کے نزدیک کچھ آگے پڑھانا وقت اور پیسے کا ضیاع ہے۔“ دادی ذرا افسردگی سے بولی تھیں۔

”اچھی دادی پیاری دادی آئیں آپ کے سر میں تیل لگاؤں کتنے دن سے آپ نے تیل کی مالش نہیں کروائی۔“ میں نے دادی کا ہاتھ پکڑ کر انہیں چارپائی پر بیٹھایا اور جھٹ تیل کی شیشی اٹھا لائی۔ تیل کی اس شیشی کا ہم دادی پونی کی زندگی میں بڑا گہرا عمل دخل تھا۔ جب میں دادی کی کوئی بات ماننے سے انکاری ہو جاتی تو دادی مجھے زبردستی اپنے پاس بٹھا کر سر میں تیل کی مالش شروع کر دیتیں۔ دادی کی انگلیوں کی حرکت سے عجیب سا سرور میرے رگ و پے میں سرایت کر جاتا یا یوں سمجھیں کہ میں پیناٹا نرسی ہو جاتی اور دادی نے مجھ سے جو بات منوائی ہوئی منوالیتیں۔

جب میں کچھ بڑی ہوئی تو میں نے دادی کا وارن ہی پر الٹا شروع کر دیا۔ اب میں دادی کے سر کا مساج کرتی اور غنودگی میں جاتی دادی سے اپنی ضد منوالیتی۔ دادی سے کالج جانے کی اجازت اسی تیل کی شیشی کے طفیل ملی تھی اور جب دادی نے اجازت دے دی تو ابا کو بھی اجازت دیتے ہی بنی تھی۔ دادی چونکہ ابا کی ماں تھیں اس لیے ان کی بات ماننا ابا کی مجبوری تھی ویسے اس گھر میں عورتوں کی بات ماننے کا کوئی رواج نہ تھا۔ اس گھر کے مرد عورتوں کو اچھا کھلاتے، عمدہ پہناتے، لیکن انہیں رعایا سے زیادہ درجہ دینے پر تیار نہ ہوتے۔ رعایا بھی اپنے حال میں مست اور مگن تھی انہیں بادشاہ سلامت سے کوئی شکایت نہ تھی۔

لیکن اگر کبھی ابا یا تایا کی دکان پر میرا جانا ہوتا تو میں حیران رہ جاتی کہ گھر کی خواتین سے تیور یا چڑھا کر بات کرنے والے جب گاہک خواتین کو سودا بیچ رہے ہوتے ہیں تو خوش خلقی کتنے عروج پر ہوتی ہے۔ میں گھر کی جملہ خواتین کو سمجھاتی کہ وہ صرف اچھا کھانے اور عمدہ پہننے پر اکتفا نہ کریں بلکہ اپنے شوہروں سے اپنے

حقوق بھی مانگیں کم از کم یہ حق تو تسلیم کروائیں کہ مرد انہیں کڑک دار اور بارعب انداز میں مخاطب کرنے کے بجائے دھیمے اور نرم لہجے میں پکاریں۔ میری بات سن کر ہمارے گھر کی عورتیں ہنسنے لگتی تھیں۔ اور جب میں نے فرسٹ ڈویژن میں بی اے پاس کر لیا تو دادی سے کہا کہ وہ مجھے ابا سے کہہ کر ایم اے کی کتابیں منگوا دیں۔ میں نے یونیورسٹی جانے کی فرمائش کر کے دادی کو آزمائش میں نہ ڈالا تھا میرا خیال تھا کہ میں گھر بیٹھے کسی آسان سبجیکٹ میں ایم اے کر لوں گی۔

”بی اے پاس کر لیا۔ یہ ہی بہت ہے میری بچی۔ تیرا باپ آج کل بہت شدد سے تیرے لیے رشتہ ڈھونڈ رہا ہے۔ نو سین، افشین کی شادیاں کتنی چھوٹی چھوٹی عمروں میں ہو گئی تھیں۔ تیرے باپ کے خیال میں تو تیری شادی بھی بہت پہلے ہو جانی چاہیے تھی وہ تو میں نے زور زبردستی سے تجھے بی اے کروا دیا، لیکن بس اب ایم اے کا خیال دل سے نکال دے۔“ دادی رسائیت سے گویا ہوئی تھیں۔

”اچھا دادی کتابیں تو منگوا دیں جیسے ہی ابا نے میرے لیے رشتہ ڈھونڈ لیا۔ میں کتابیں الماری میں رکھ کر جینز کی خریداری شروع کر دوں گی۔“ میں نے حاجت سے دادی کو مخاطب کیا۔ دادی نے کتابیں منگوا دیں تھیں اور ابا نے رشتے کی تلاش مزید تیز کر دی۔ میں رات دن یہی دعا مانگتی تھی کہ ابا کی رشتہ ڈھونڈو مہم دو سال سے پہلے ختم نہ ہو۔ کوئی معجزہ ہو جائے اور میرا سٹریز کھلیٹ ہو جائے۔



میرا پہلا رشتہ پارٹ فرسٹ کے پیپرز کے دوران آیا تھا۔ پیپر کی تیاری کے بجائے مجھے گھر آئے مہمانوں کے لیے تیار ہونا پڑا تھا۔ لڑکے والے مجھے پسہ کر گئے تھے اور اب گھر والوں نے لڑکا دیکھنے ان کے گھر جانا تھا۔ لڑکے کا بڑا بھائی میرے پھوپھی زاد بھائی کا دوست تھا۔ فہد بھائی کی طرح ان لوگوں کی بھی کاسمیٹکس شاپ تھی۔ لڑکے کی چھوٹی بہن چپکے سے مجھے اپنے

بھائی کی تصویر دے گئی تھی اس تصویر کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ ان لوگوں کی واقعی کاسٹیکس شاپ ہے۔ موصوف نے اتنا میک اپ تھوپ رکھا تھا کہ خاصا زنانہ ٹیچ دے رہے تھے۔ دادی، دو سرے گھروالوں کے ساتھ جب ان کے گھر جانے لگیں تو میں نے دادی کے سر میں ڈھیر سارا تیل لگا کر ان کی چوٹی بنائی اور التجا کی تھی کہ وہ لڑکے والوں کے گھر جا کر کوئی ایسا پوائنٹ نوٹ کر آئیں جس کو بنیاد بنا کر انکار کیا جاسکے۔ شومی قسمت اس گھر کی بڑی بہو اور دادی کو تنہائی میں چار باتیں کرنے کا موقع مل گیا اس نے دادی کو اپنے سسرال والوں کے ظلم و ستم کی دو تین داستانیں سنا دیں۔ پھر بابے دادی کی ناگوہاں میں بدلوانے کے لیے بہترے جتن کر ڈالے دادی نے رشتے کی منظوری نہ دی۔

پھر ایک رشتہ اور آیا، لیکن انیس سو پچاس بجائے تایا کی سب سے چھوٹی ارم پسند آگئی میرے فائنل ایر کے امتحانوں کے دو ہفتے بعد ارم کی شادی تھی۔ خیر و عافیت سے میرا ماسٹرز مکمل ہوا تھا میری خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ ارم کی شادی میں، میں نے ایک لہک کر شادی کے گیت گائے تھے اور شادی کے اختتام پر میرا ایک اور رشتہ آگیا تھا۔ حاجی رب نواز میرے تایا کے دوست تھے۔ وہ مین بازار کے سب سے بڑے کلاتھ ڈپو کے مالک تھے۔ ان کے سارے بیٹے اسی کاروبار سے منسلک تھے۔ حاجی صاحب کی بیوی نے مجھے ارم کی شادی میں دیکھا اور اپنے چھوٹے بیٹے کے لیے میرا رشتہ مانگ لیا۔ اس بار تو میرے ضبط کی ساری حدیں نوٹ گئیں میں دادی کے سامنے بلک بلک کر رو پڑی تھی۔

”آخر ہمارے خاندان کی لڑکیوں کے نصیب میں یہ ہی دکان دار رہ گئے ہیں کیا۔“

”تو پڑھ لکھ کر سمجھ رہی تھی کہ تیرے لیے ڈپٹی کمشنر کا رشتہ آئے گا؟“ دادی میرے رونے دھونے سے ذرا متاثر ہوئے بناتنگ کر بولی تھیں۔

”کسی بڑھے ڈپٹی کمشنر کے رشتے سے مجھے کوئی

سروکار بھی نہیں، لیکن کوئی ڈاکٹر، انجینئر یا کوئی میچر ہی میرا طلب گار بن جاتا۔ کم از کم پڑھا لکھا تو ہوتا۔“

”عادل بھی جاہل نہیں ہے۔ چودہ پڑھا ہوا ہے اور تو اسی پر شکر منا فریحہ ورنہ اپنے خاندان میں دیکھ ذرا کوئی لڑکا بارہ سے آگے نکلا ہے کیا، لیکن اللہ کا شکر ہے سب اچھا کھاتے ہیں۔ عادل بھی کھاتے پیتے گھر کا لڑکا ہے، مارکیٹ میں سب سے زیادہ چلتی ہے حاجی صاحب کی دکان۔ تو راج کرے گی میری بچی۔ کیوں انٹی سیدھی باتیں کر کے کفران نعمت کر رہی ہے۔ ایسے رشتے تو نصیبوں والوں کو ملتے ہیں۔“ دادی اب میرے آنسوؤں سے چیخ کر مجھے پچکار رہی تھیں۔

”دادی، پیاری دادی کسی طرح اس رشتے کو بھی انکار کر دو ہو سکتا ہے اللہ نے میری قسمت میں دکان دار نہ لکھا ہو۔ اگلی بار کوئی ڈھنگ کا رشتہ آجائے میرا۔“ میں نے دادی کے ہاتھ تھام کر التجا کی۔

”اچھا فضول باتیں مت کر۔ ادھر آتیرے سر میں تیل لگاؤں بال کتنے بے رونق ہو رہے ہیں۔“ دادی نے ہاتھ برہا کر سرہانے دھری سیائی سے تیل کی شیشی اٹھائی تھی پھر سر میں تیل کی مالش کرتے ہوئے دادی بہت پیار سے مجھے اس رشتے کے لیے قائل کرتی رہیں۔ میرے ساتھ کی خاندان، برادری کی سب ہی لڑکیاں بیاہی جا چکی تھیں اگر میری عمر اور برہہ گئی تو کوئی مجھے پوچھے گا بھی نہیں اور یہ کہ دادی اپنی زندگی میں ہی مجھے گھر بار کا کر کے اپنی زندگی کا مشن پورا کرنا چاہتی ہیں۔ وہ قیامت والے دن میری ماں کے سامنے سرخرو ہونا چاہتی، مزید یہ کہ دکان داروں کے حوالے سے جو وہم میں نے اپنے ذہن میں پال رکھے ہیں۔ وہ قطعاً درست نہیں۔

بے شک ہمارے گھر کے مرد حضرات عورت کو قطعی اہم نہیں دیتے، لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان کا پیشہ دکان داری ہے بلکہ مزاج کی یہ سختی اور اکڑا نہیں ورثے میں ملی ہے۔ دادی نے آس پڑوس اور دور و نزدیک کے بہت سے شریف النفس اور بھلے مانس

ہے نئے سیزن کی بہت اچھی ورائٹی آئی ہے حاجی صاحب کی دکان پر۔ ایک دوسوٹ ہی خرید لاؤں گی۔“  
میں نے دادی کو اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔  
”اگر کسی کو پتا چل گیا تو۔“ دادی میرا پلان سن کر سخت متوحش ہوئیں۔

”آپ میرے ساتھ ہوں گی نا۔ پہلے آپ کو حکیم گلزار کے مطب پر بٹھاؤں گی۔ چار قدم آگے حاجی صاحب کا ڈپو ہے۔ عورتوں کا اتار تارش ہوتا ہے وہاں۔ کسی کو کیا پتا چلے گا کہ کپڑا دیکھنے آئی ہوں یا لڑکا دیکھنے۔ پانچ سات منٹ میں میری واپسی ہو جائے گی۔ اتنے آپ خمیرے اور جو شاندرے خرید چکی ہوں گی پھر دونوں دادی پوتی گھر کی راہ لیں گے۔“  
”اور اگر مجھے لڑکا پسند نہ آیا فریکہ تو۔“ دادی کا دل انہوں نے خدشات سے کانپ رہا تھا۔

”میں ایسا ویسا کچھ نہیں کروں گی دادی۔ بس آپ میری یہ بات مان لیں۔“ میں نے دادی کی منت کی۔  
”بہت تنگ کرتی ہے مجھے۔“ دادی خفگی سے بس اتنا ہی بولی تھیں، لیکن یہ ہی ان کا اقرار تھا۔ اگلے روز حکیم صاحب کے ہاں جانے کا کہہ کر میں اور دادی گھر سے نکل لیے تھے۔ ہمارے گھر کی خواتین عموماً بازار میں جاتی تھیں۔ مرد حضرات بہترین سے بہترین چیز گھر بیٹھے فراہم کر دیتے تھے انہیں گھر کی خواتین کا دکان، دکان پھر نامعیوب لگتا تھا۔ ہاں چونکہ حکیم گلزار کا مطلب بھی اتفاق سے مین بازار میں تھا سو دادی کے ساتھ میرا وہاں کا پکڑ لگ جاتا تھا۔ حاجی صاحب کی دکان اس سے کچھ ہی فاصلے پر تھی۔

دادی کو مطب میں بٹھا کر دھڑکتے دل کے ساتھ میں بازار میں آگے چل پڑی۔ دادی کو تو میں نے اطمینان دلایا تھا کہ میں ایسا ویسا کچھ نہیں کروں گی، لیکن دل میں یہ پکا تہہ کر رکھا تھا کہ اگر حاجی صاحب کا بیٹا عورتوں کے گمے کے مطابق اکھڑ بد مزاج اور بد لحاظ ٹائپ کا لگا تو میں گھر جا کر کسی نہ کسی طرح دادی کو قائل کر لوں گی کہ وہ یہ منگنی توڑ دیں۔

دکان پر عورتوں کا جم غفیر تھا میں بھی اس ہجوم کا

دکاندار گنوا گنوا کر مجھے قائل کر رہی ڈالا کہ میں محض اپنے خاندان کے مردوں کا مزاج دیکھ کر دوسروں کے بارے میں حتمی رائے قائم نہیں کر سکتی۔  
میں نے دادی سے مزید بحث و سمجھنے نہ کی اور جب حاجی صاحب (سر) کے گھر والے مجھے انگوٹھی پہنانے آئے تو چپ چاپ عادل رب نواز کے نام کی انگوٹھی پہن لی۔



آس پڑوس کی خواتین کو جب میری منگنی کا پتا چلا تو دادی کو مبارک باد دینے آنے لگیں اور جب انہیں یہ پتا لگا کہ میری منگنی حاجی صاحب کے چھوٹے بیٹے سے ہوئی ہے تو دادی کی شناسا خواتین حق حق رہ جاتیں۔

”ہائے خالہ بی، حاجی صاحب کا چھوٹا بیٹا تو بہت اکھر اور بد مزاج ہے۔ اپنی فریکہ کے لیے کیا وہ ہی کھڑوس شخص رہ گیا تھا۔“ یہ کھنٹس ساتھ والوں کی بجمجھلی بسو کے تھے۔ اس کی بات سن کر میرا دل ڈوب سا گیا۔ اس وقت تو دادی نے مجھے چائے لانے کا کہہ کر منظر سے ہٹا دیا، لیکن دادی مجھے کس کس کی بات سننے سے روک پاتیں ہمارے محلے کی سب ہی عورتوں کی گواہی حاجی صاحب کے بد مزاج بیٹے کے خلاف جاتی تھی۔  
”میری ایک نہ سنی دادی آپ نے لے کر مجھے ایک اکھر دکان دار کے پے باندھ دیا تھا۔“ میں عورتوں کی باتیں سن کر رو ہانسی ہوئے جاتی تھی۔

”ایسے ہی بکتی ہیں سب۔ میں نے دیکھا ہے عادل کو۔ بھلا مانس لڑکا ہے۔ میرا دل مطمئن ہے۔“ دادی مجھے تسلی دیتیں۔

”پھر میں نے بھی دیکھا ہے اسے تاکہ میرا دل بھی مطمئن ہو۔“ میں نے ضدی سے لہجے میں فرمائش کی۔  
دادی نے مجھے ایسے دیکھا جیسے میرا داغ چل گیا ہو۔  
”ییسے دیکھے گی تو اسے۔ تصویر دیکھ لی کافی نہیں ہے کیا۔“ دادی خفگی سے گویا ہوئیں۔

”برقعہ پہن کر اس کی دکان پر جاؤں گی ویسے بھی سنا



Pakistan's ONLY  
Baking Soda  
Toothpaste



دانت سفید چاکلک

حصہ بن گئی تھی۔ دکان کے آخری حصے میں ایک بیچ پر دو خواتین پہلے سے ہرجمان تھیں، میں اسی بیچ پر جا کر بیٹھ گئی۔ سیلز مین ان خواتین کو کپڑے کے تھان کھول کھول کر دکھا رہا تھا۔ میری نگاہیں کچھ اور کھوج رہی تھیں۔

ذرا فاصلے پر میرے جیٹھ صاحب خواتین سے بارکیننگ میں مصروف تھے۔ عادل کے یہ بھائی صاحب دو چار بار اپنے والد کے ساتھ ہمارے گھر آچکے تھے اور میں نے ڈرائنگ روم کے دروازے کی جھری سے انہیں خوب اچھی طرح دیکھ رکھا تھا۔ خواتین ناز و انداز دکھاتے ہوئے آصف بھائی سے قیمت میں کمی کا مطالبہ کر رہی تھیں۔ وہ ان کی باتوں پر مسکرا رہے تھے۔ بات سے بات نکل رہی تھی۔ آصف بھائی کی خوش اخلاقی عین پر تھی اور پھر انہوں نے خواتین کو منہ مانگے دام دینے پر راضی کر ہی لیا۔ وہ ہی خواتین کپڑوں کی کچھ مزید ورائٹی دیکھنا چاہ رہی تھیں۔

”عادل! یار عربیک لینن انہیں بھی دکھاؤ۔“ آصف بھائی نے نیکار اٹھا۔ میرا دل تیری سے دھڑک اٹھا۔ ابھی تک جو شخص رخ موڑے کھڑا تھا وہی تو تھا جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے میں مشن زیر و زبرو سیون پر نکلی تھی۔ عادل ان خواتین کی طرف متوجہ ہوا تھا اور میں جی جان سے اس کی جانب وہ خوب صورت تھا اس میں کوئی شک نہیں، لیکن مجھے اس کی شکل کی خوب صورتی سے کوئی سروکار نہ تھا آج میں اس کا مزاج پر کھنے آئی تھی۔ ویسے تو چار پانچ منٹ کے مختصر سے وقت میں جانچ پڑتال کی یہ خواہش سراسر احمقانہ تھی پھر بھی میں اپنے دل کی تسلی کے لیے یہ حماقت کر بیٹھی تھی۔

”آپ کو کیا چاہیے باجی۔“ اتنے میں ایک سیلز مین میری جانب متوجہ ہوا۔

”میں یہ پرنٹ ہی دیکھ رہی ہوں۔“ میں نے دھیرے سے جواب دیا۔ کچھ فاصلے پر بیٹھی خواتین کو دو سوٹ پسند آگئے تھے وہ اب عادل سے بھاؤ تاؤ کرنے لگی تھیں۔ ایک عورت شوخ مزاج تھی وہ ویسے ہی

مسکراتے جیسے عادل کی طرف لڑھکا رہی تھی جو ابھی ذرا دیر پہلے آصف بھائی پر آزما چکی تھی حالانکہ آصف بھائی کبھی گھاک دکان دار تھے بات اپنی ہی منوائی تھی، لیکن عورتوں کی خوش مزاجی کا جواب بھرپور خوش مزاجی سے دیا تھا، لیکن عادل کا چہرہ عورتوں کی باتیں سن کر بھی بالکل سیاٹ تھا وہ ان کی باتیں سن ان سنی کر رہا تھا، لیکن اس کے ماتھے پر پڑنے والی بل اب واضح ہوتے جارہے تھے۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے چہرے کو ٹک رہی تھی۔ پھر اس نے کچھ درشتگی سے عورتوں کو مخاطب کیا تھا۔

”میں نے بالکل جائز اور مناسب ریٹ لگائے ہیں لی۔ اگر آپ کو لینا ہے تو لیجیے ورنہ۔“ ورنہ کے آگے بات ادھوری تھی، لیکن مطلب واضح تھا کہ ورنہ آپ اپنی راہ لے سکتی ہیں۔ عورتوں کا منہ بنا تھا، لیکن جانے کیوں میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ رنگ گئی۔ اپنے کھڑوس منگیتر کی یہ بد مزاجی مجھے قطعاً بری نہ لگی تھی، بہر حال عورتوں نے دو سوٹ مزید کٹوائے تھے اتنے میں آصف بھائی فون پر بات کرتے کرتے عادل کے قریب آئے تھے۔ ان کا مزاج کچھ اکھڑا اکھڑا لگ رہا تھا۔

”میں ”احسان شوز“ سے جوتوں کے چار پانچ ڈیزائن لے کر گھر بھجوا دیتا ہوں۔ حمزہ کو جو پسند آئے گا رکھ لے گی۔“ آصف بھائی فون پر کسی سے مخاطب تھے۔ میں ذرا چونکی حمزہ ان کی بڑی بیٹی تھی میٹرک کی اسٹوڈنٹ تھی۔ بہت ہنس مکھ اور پیاری بچی تھی۔ حمزہ کے ذکر سے اندازہ ہوا کہ فون ان کے گھر سے ہی آیا ہے۔

”کیسی باتیں کرتی ہو شمس۔ مجھے الہام تو ہونے سے رہا کہ حمزہ کی دوست نے کیسا سٹائل خریدا ہے۔ اسے سمجھاؤ کہ اسکول کی پارٹی میں ایک چمے کپڑے جوڑتے پہن کر جانا فرض کا درجہ نہیں رکھتا۔“ آصف بھائی بری طرح چڑ کر بولے تھے اب معاملہ کچھ کچھ میری سمجھ میں آگیا۔ فون کے دوسری جانب یقیناً شمس بھابھی (میری جیٹھانی) تھیں وہ اپنی بیٹی کی کسی

کر کے میں دادی کے بوڑھے شفیق وجود سے لپٹ گئی تھی۔



فرمائش سے اس کے والد صاحب کو آگاہ کر رہی تھیں والد صاحب کے تیور بگڑے اکھڑے سے تھے اور جب ہی عادل نے ان سے فون مانگا تھا۔

”دکان گاہکوں سے بھری بڑی ہے ان بے وقوف عورتوں کو اندازہ ہی نہیں کہ فضول باتوں میں الجھا کر کیسا قیمتی وقت برباد کرتی ہیں۔“ آصف بھائی بگڑے موڈ کے ساتھ بڑبڑاتے تھے میں کھڑے ہو کر دوسرے ریک میں لگے کپڑوں کے برنٹ دیکھنے کی ایکٹنگ کرنے لگی تھی۔ فون پر محو گفتگو عادل کی آواز بخوبی میری سماعت تک پہنچ رہی تھی۔

”بھابھی آپ میری حسد سے بات کروائیں۔“ اس نے نرمی سے اپنی بھانج کو مخاطب کیا تھا۔

”ہاں بیٹا بتاؤ کیسا سینڈل چاہیے۔“ وہ یقیناً اب جھنجھی سے مخاطب تھا۔ دوسری طرف یقیناً ”جزئیات کے ساتھ سینڈل کاؤنٹرائزن سمجھایا جا رہا تھا۔“

”یار تم نے تو جو تفصیل بتائی ہے دکان پر جا کر اس تو بھول بھال جاؤں گا۔ تم یوں کرو خضر یا لوی کا ہاتھ پکڑ کر دکان پر آجاؤ میں تمہیں خود ”احسان شوز“ لے جاؤں گا اپنی پسند کا جو تا خرید لیتا۔“ اس نے پیار سے جھنجھی کو مخاطب کیا تھا۔

”ارے بابا نہیں ہوں گے بابا ناراض۔ میں کہہ دوں گا ان سے۔“ وہ اب جھنجھی کو تسلی دے رہا تھا۔ میں عورتوں میں سے جگہ بناتی غیر محسوس طریقے سے دکان سے باہر نکل گئی۔ پریشان ٹیٹھی دادی کو مطب سے لیا اور گھر کی راہ لی۔

”میرا تو دل ہوتا رہا فریج کہ کہیں تجھے کوئی پہچان نہ لے بتا تو سہی دیکھ پانی اپنے منگیتر کو یا جانا فضول ہی رہا۔“ گھر آکر میری بوڑھی بھجولی رازداری سے مجھ سے مخاطب ہوئی۔ تیکھے نقوش والے اس مغرور سے دکان دار کی شبیہ میرے ذہن کے پردے پر لہرائی تھی۔ ”دیکھ بھی لیا دادی اسے پاس بھی کر دیا لیکن۔“ میں نے بات ادھوری چھوڑی۔

”لیکن کیا۔“ دادی پھر پریشان ہوئیں۔

”لیکن اپنا دل ہار آئی ہوں۔“ شرمایا لجا یا سا اقرار

مشہور و مزاح نگار اور شاعر

انشاء جی کی خوبصورت تحریریں،

کتاب کا نام قیمت

|       |                         |                        |
|-------|-------------------------|------------------------|
| 450/- | سفر نامہ                | آوارہ گرد کی ڈائری     |
| 450/- | سفر نامہ                | دنیا گول ہے            |
| 450/- | سفر نامہ                | ابن بطوطہ کے تعاقب میں |
| 275/- | سفر نامہ                | چلتے ہو تو چین کو چلیے |
| 225/- | سفر نامہ                | گھری گھری پھر اسلم     |
| 225/- | طرح و مزاح              | غمار گندم              |
| 225/- | طرح و مزاح              | اردو کی آخری کتاب      |
| 300/- | مجموعہ کلام             | اس سنی کے کوچ میں      |
| 225/- | مجموعہ کلام             | چاندگر                 |
| 225/- | مجموعہ کلام             | دل وحشی                |
| 200/- | ایڈ گرامیں پوائنٹ انشاء | اندھا کتواں            |
| 120/- | ادھر تو انشاء           | لاکھوں کا شہر          |
| 400/- | طرح و مزاح              | ہاتھیں انشاء جی کی     |
| 400/- | طرح و مزاح              | آپ سے کیا پوچھ         |

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی



وہا حویلی آج بھی ویسی ہی تھی جیسی پہلے تھی۔

وہی سرخ اینٹوں کی دیواریں۔  
وہی بوگن ویلیا میں لپٹے کاہی رنگ کے جھروکے۔  
وہی سفید 'سرخ' وہی اس کے ستونوں پہ لگی چھتیاں۔  
وہی کیلے کے درختوں کے جھنڈ کے اس پار سے  
جھانکتے کھنڈر کے منار۔

اور جب میرے قدموں کے نیچے چرمراتے زرد  
پتوں نے آہ بھری تو مجھے احساس ہوا کہ نہیں۔  
یہ حویلی آج ویسی نہیں جیسے پہلے تھی۔

## کلی ولٹ

سرخ اینٹوں کی دیواروں میں کالی جی تھی۔

جھروکوں سے لپٹی بوگن ویلیا کسی جوان بیوہ کی اجازت  
کھائیوں کی طرح ٹنڈ منڈ تھی۔

اور اس سفید 'سرخ' سبز اور سیاہ چپس کے فرش  
والے برآمدے کی خنکی میں اب ہڈیوں تک کو جما دیئے  
والی برف تھی اور کیلے کے درختوں کے جھنڈ سے  
جھانکتے کھنڈر کے مناروں کا بہت سا حصہ بھر بھرا ہو  
کے گر چکا تھا۔ اور آج اس حویلی میں نہ قلعاریاں  
تھیں۔ نہ کسی کی چھکار۔ ایک سناٹا مکمل سکوت۔  
پردے ہوائے سرمرا ضرور رہے تھے لیکن شاید ہوا  
نے بھی اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھی ہوئی تھی۔

یہ وہ زمین تھی۔ وہی آسمان۔ وہی درو دیوار۔  
وہی پھول پتے۔ وہی جھروکے۔ وہی آنگن تھا۔  
جہاں میری محبت نے پہلی بار آنکھیں کھولیں۔

وہ گہری نیند سو رہا تھا مگر پھر پٹ سے اس نے  
آنکھیں کھول دیں جیسے کسی نے اسے بری طرح  
جھنجھوڑ کے جگایا ہو۔ وہ بڑا کے اٹھ بیٹھا اور ادھر ادھر  
دیکھنے لگا۔ مگر کمرے میں سوائے اس کے اور کوئی نہ  
تھا وہ دم سادھ کے باہر سے آتی سسکیوں کی آواز سننے  
لگا۔ یہ سسکیاں جیسے اسے کھینچ کر پہلے بستر سے اتار  
کے کھڑکی تک لائیں پھر انہی سسکیوں نے اسے پردہ ہٹا  
کے باہر جھانکے پہ مجبور کیا۔ ہال میں سامنے والے  
بڑے سے طاؤسی تخت پہ بیٹھی وہ لڑکی سر جھکائے  
سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ اس سے پانچ چھ  
سال تو بڑی ہو گی۔ شاید پندرہ سال کی یا پھر زیادہ سے  
زیادہ سولہ سال کی۔ اس نے چہرہ آگے کر کے کچی نیند  
سے جاگی آنکھیں سکڑ کے اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش  
کی وہ چہرہ جو اس کی محبت کا پہلا چہرہ بننے والا تھا۔  
مگر بھلا محبت کا چہرہ بھی یونہی آسانی سے نظر آیا کرتا  
ہے۔ ہونہ بدھو۔

اس کے ننگے پیرا سے بے اختیار کمرے سے باہر  
ہال تک لے گئے۔



میری نظریں ہال کے وسط میں بجھے اس طاؤسی  
تخت پہ کھیں جس پہ آج بھی گہرے فرمزی رنگ کا  
مخملیں بچھونا تھا۔ دونوں اطراف میں گاؤ تکیے۔ مگر  
آج وہ خالی تھا اس پہ وہ نہ تھی۔



ہال میں آج بھی جا بجا بہت سی شمعیں رکھیں تھیں۔ مگر سب کی سب بجھ چکی ہوئیں۔

وہی بڑے دادا کی جلالی تصویر۔ جسے بچپن میں دیکھ کے میں شرارت کرتے کرتے سہم جایا کرتا تھا اور لڑکھن میں دیکھ کے شرارت سے ہنس پڑتا تھا۔ لیکن آج اس قد آدم تصویر میں جھانکتے بڑے دادا کے نقوش میں جلال نہیں ملال نظر آ رہا تھا۔

یہ ہال پوری حویلی کا مرکز تھا۔ ہمہ وقت بھرا بھرا رہتا۔ جسے کسی کو ڈھونڈنا ہوتا۔ وہ ہال میں آجاتا۔ لیکن آج یہاں کوئی نہیں تھا۔

بس ایک چیز تھی۔ جو سالوں پہلے بھی تھی آج بھی ہے اور جانے کب تک رہنے والی ہے۔ اس کی سسکیوں کی گونج۔

میرے قدم مجھے اسی طاؤسی تخت کی جانب لے گئے، جہاں سے کئی سالوں سے اس کی سسکیاں ابھر رہی تھیں۔ میرے ترسے ہوئے ہاتھ اس کے مخملیں پچھونے کو سہلانے لگے۔

اس کی سسکیوں نے پہلی بار مجھے۔ جسجور اٹھا مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا تھا کہ کسی اور کے آنسو آپ کے دل کو گیلایسے کرتے ہیں۔



ناٹ سوٹ میں ملبوس اس نو سالہ بچے کے چھوٹے چھوٹے قدم ہال کے چکنے سفید فرش پر بے اختیار اٹھ رہے تھے اور نظریں طاؤسی تخت پہ اب تک گھٹنوں میں سروے کر رہی اس سیاہ لباس والی لڑکی پہ مرکوز تھیں۔ وہ سیاہ رنگ جیسے سارے ہال پہ چھا چکا تھا۔ اسے اس سیاہ رنگ کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

ہال کے وسط میں پچھی سفید چادریں بھی نہیں۔ ان پہ بیٹھی سیپارے بڑھتی وہ سب آئیناں بھی نہیں، جو اب تلاوت کرتے کرتے سر اٹھا کے اسے دیکھ رہی تھیں۔

اسے ان سسکیوں کے علاوہ کچھ سنائی بھی نہیں

دے رہا تھا۔ اپنی ماں ناملہ کی آواز بھی نہیں۔ جو دوپٹے سے نم آنکھوں کے گوشے خشک کرتی اس سے پوچھ رہی تھی۔

”سعد۔ بیٹا آپ آج اتنی جلدی جاگ گئے؟“ وہ سب کے درمیان سے گزرتا بس اس سیاہ رنگ کی جانب بڑھ رہا تھا جو جلد ہی اس کے وجود کو اپنے رنگ میں رنگنے والا تھا۔

”بس کرو بیٹی۔ جانے والوں کو آنسوؤں سے تکلیف ہوتی ہے۔“ رقیہ خالہ نے اسے تسلی دی اور وہ سوچنے لگا۔

”جانے والوں کو؟ آنے والے کو بھی ہو رہی ہے تکلیف ان آنسوؤں سے۔“

”باپ اور ماں دونوں کو کھویا ہے اس نے“ اس اتنی سی عمر میں اتنا بڑا صدمہ۔

ناملہ نے افسوس سے اس سیاہ وجود کو دیکھا تو وہ بے چین ہوا تھا۔

”نہیں۔ کوئی مت دیکھے اسے کوئی نظر نہ ڈالے اس پہ۔ سوائے میرے۔“

یہ بے چینی اس کے قدموں میں بجلی بھر گئی اور وہ اگلے ہی پل اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ اٹھے اور اس جھکے ہوئے سر کے بکھرے گہرے بھورے ریشمی بالوں پہ ٹھہر گئے۔ اس لمس پہ وہ سسکیاں تھمیں اور اس لڑکی نے سر اٹھا کے اپنے سامنے کھڑے اس حیران آنکھوں والے لڑکے کو دیکھا۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھرے اسے دیکھ رہی تھی۔ اور وہ آنسوؤں سے رندھے گلے کو تر کرتا اب اپنا ہاتھ اس کے بالوں سے اس کے رخسار تک لایا اور اپنی انگلی سے اس کے آنسو صاف کرنے لگا۔ ایسا کرتے ہوئے اسے احساس تک نہ ہوا کہ اس کے اپنے گال گیلے ہو چکے ہیں۔

ناملہ کے ساتھ ساتھ کچھ دوسری رشتے دار عورتیں بھی اس بچے کے اس عجیب و غریب عمل کو حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ پھر اچانک اسے نجانے کیا

ہوا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ اور وہ سیاہ ملبوس والی لڑکی اپنا غم بھول کے اسے سینے سے لگا کر چپ کرانے لگی۔

اب ہال میں دونوں کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ وہ میں تھا۔ سعد رضوان۔ نو سال کا سعد رضوان۔ اور وہ ام ہانی تھی۔ پندرہ سال کی ام ہانی سلمان۔ میری بہن۔

یہاں رشتہ آنسوؤں کا تھا۔ اس کے آنسوؤں سے میرے آنسوؤں کا۔ پھر جب جب میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ میرے بھی آنسو بہنے لگے۔ ”کیا یہ محبت ہے؟“

میرے سوال نے اس سنان ہال کو اور بھی اجاڑ اور بیابان کر ڈالا۔

وہ سسکیاں تک سوچ میں پڑ گئی تھیں۔ تبھی تو ایک سکوت چھا گیا۔ اس جان لیوا سکوت کو توڑنے کے لیے میں نے اپنا سوال پھر سے دوہرایا۔

”کیا یہ محبت تھی؟ کیا یہ محبت ہے؟“ میرا سوال اس سنانے میں گونج کے رہ گیا۔ اور پھر ہوانے سرگوشی کی۔

”شاید۔“

اور ہوا کی اس سرگوشی نے ہال میں واحد جلتی اس شمع کو بھی بجھا ڈالا۔ جس کی پکھلتی موم کچھ حرفوں میں ڈھل رہی تھی اور یہ حرف اس جواب میں ڈھل رہے تھے۔

”شاید۔“



رسالہ پور کے اس نواحی قصبے میں گرمیوں کے آغاز تک بھی راتیں کافی ٹھنڈی رہتی تھیں۔ اور آج تو شام کو ہونے والی ہلکی ہلکی بوندا باندی نے الماری کے اوپر والے خانے میں سنبھال کے رکھی گرم شالیں پھر سے نکلوا دی تھیں۔

ناکملہ نے شال اوڑھتے ہوئے بڑی حیرت سے رضوان سے کہا تھا۔ ”سعد نے کتنی عجیب حرکت کی۔“

”بچہ ہے۔ بچوں کا دل نرم ہوتا ہے۔ ام ہانی کا رونا اس سے دیکھا نہیں گیا۔“

رضوان کو ہر بات کی گہرائی میں جانے کی عادت نہیں تھی۔ وہ قہوے کے گھونٹ بھرتے کھڑکی کے پاس کھڑے باہر اترتی دھند کو دیکھ رہے تھے۔

”ہاں مگر سعد عام بچوں جیسا نہیں ہے۔ وہ تو کبھی کسی بات کو دل پہ نہیں لیتا اور مجھے تو یاد بھی نہیں کہ آخری بار وہ کب رویا تھا اور کل اپنے چچا اور چچی کے ایک سیٹلٹ اور وفات کا من کے بھی اس نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ یونہی کھیل میں مگن رہا جیسے اسے کوئی فرق نہ پڑا ہو۔“


”ظاہر ہے۔ اس نے سلمان کا صرف نام سن رکھا تھا چچا سے کوئی وابستگی تھی کہاں سے یوں بھی بچوں کے لیے موت اتنی سفاک حقیقت نہیں ہے جتنی ہمارے لیے۔“

”اسی لیے تو حیرت ہے اس کے یوں رونے پر۔“ اپنے قہوے کی پیالی لبوں سے لگائے ہوئے بھی ناکملہ ابھی تک اس حیرت میں تھی۔

”ناکملہ وہ اکیلا ہے۔ نہ بہن۔ نہ بھائی۔ تم اس

## خواتین ڈائجسٹ

حرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

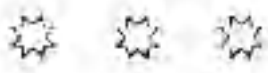


# حک زہد محبت

قیمت - 300 روپے

مصنفہ: سہارن پٹیل

دیا تھا کہ قہوہ بھی تلخ سا لگنے لگا۔



اور رضوان کی ہمشیرہ مہ پارہ بیگم کے مزاج کی تلخی کو تو کسی کے تذکرے کے بہانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ یہ خدا کا خاص کرم تھا ان پر۔ اس وقت بھی ماتھے پہ بل ڈالے۔ اپنی ستواں ٹانگ کو ایک خاص زاویے تک چڑھائے وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے مختلف شیلفوں میں سے رنگ برنگ کی دوا میں اپنی ہتھیلی پہ نکالتی جا رہی تھیں۔ اور بڑے سے نواڑی رنگے پلنگ پہ لیٹے بڑے دادا کھانستے تھے۔ آہ بھرتے تھے۔

”ہکھا۔ میں بڑھے ویلے جوان اولاد کے صدمے اٹھانے جو گا ہی رہ گیا۔ پہلے پتر گیا پھر اب جوان پوتر اسے جانے کی عمر تے میری تھی۔“  
”تو چلے جاتے ناں۔“

مہ پارہ نے بڑبڑا کے گلاس میں پیانی انڈیلا۔ پانی کے پیتل کے گلاس میں چھن چھن کرنے کی آواز میں مہ پارہ کی بڑبڑاہٹ نہ بھی دیتی تو تب بھی بڑے دادا کی ساعٹیں اب ایسی نہ رہی تھیں کہ وہ سن پاتے۔  
”کی کہیا؟“

”کچھ نہیں۔ یہ دوا میں کھالیں۔ یہ نیلی والی گولی۔ یہ رہی سفید والی گولی اور یہ پیلی گولی۔“  
اس نے پی آئی اے کی ایئر ہو سنس کے سے انداز میں گلاس آگے کیا۔ قطرے چھلک کے بڑے دادا کے کرتے پہ گرے۔

”گولیاں بھی ایسے رتی سے جیسے گولامار رہی ہو۔ بڑھے دادا کی خدمت کرنا تجھے بار لگتا ہے پوری حویلی میں اور کام کیا ہے تجھے۔“  
چلا کے بولنے سے ان کی پسلیوں نے احتجاجاً دوبارہ کھانسی کا دورہ شروع کر دیا۔



یہ بڑے دادا تھے۔ یعنی دادا کے بھی بڑے۔ میرے ابو رضوان کے دادا۔ جب سے ہوش سنبھالا

لیے ام ہانی کے یہاں آنے۔ پریشان تھیں کہ پتا نہیں سعد اس کے آنے اور مستقل یہاں رہنے کو کیسے لے گا کہ اب اس کے ساتھ ساتھ کوئی اور بھی اس گھر میں رہے گا تو تمہارا یہ مسئلہ تو حل ہو گیا۔ اس نے دل سے ام ہانی کو قبول کر لیا، بلکہ اکیلے پن کی وجہ سے اس میں جو عجیب سی تنہائی پسندی آگئی تھی۔ وہ بھی اب ختم ہو جائے گی۔ اس کا ام ہانی کے دکھ میں رونا ظاہر کر رہا ہے کہ وہ اب نارمل بچوں کی طرح ری ایکٹ کر رہا ہے۔“  
رضوان کے مفصل جواب نے بھی نائلہ کی تشفی نہ کرائی۔

”مگر سوال یہ ہے کہ کیا ام ہانی یہاں ایڈجسٹ ہو جائے گی۔ سعد کے تو صرف بہن بھائی نہیں ہیں۔ ورنہ وہ رہا تو ایک بھرے بڑے گنبے میں ہے جبکہ سلمان بھائی نے محبت کی شادی کی بہت بھاری قیمت چکانی۔ ساری عمر خانہ ان سے کٹ کے رہے ہم سب ام ہانی کے اپنے سہمی۔ اس کے لیے اجنبی ہیں۔ کیا وہ ہمارے ساتھ رہ لے گی۔“

”سمجھ دار پنہی ہے وہ جانتی ہے اب ہمارے سوا اور کوئی نہیں ہے اس کا۔“ رضوان اب عادت سے مجبور اس بحث سے ذرا بے زار نظر آ رہے تھے۔  
”کہیں تمہیں اس کی فکر تو نہیں کہ اب ایک اور ذمے داری تمہارے سر پہ آگئی ہے؟“ اور اس سوال نے تو نائلہ کے دماغ کا فیوز ہی اڑا دیا۔

”کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟ میں اتنی کم ظرف ہوں؟“ اس نے قہوے کی پیالی میز پر پنہی اور ہو گئی شروع۔

جب سے بیاہ کے آئی ہوں ذمے داریاں ہی تو نباہ رہی ہوں۔ ساس سرکی۔ پھر دادا جان ہیں اور ہاں وہ آپ کی ہمشیرہ ایک مستقل عذاب۔“  
رضوان نے کھبل منہ تک تاننے میں ہی عافیت سمجھی۔ نائلہ نے سر جھٹک کے بڑبڑاتے ہوئے قہوے کی پیالی دوبارہ اٹھائی۔

”ہونہ۔ ہمشیرہ صاحبہ کے ذکر پہ چپ سا دھ لیتے ہیں۔“ مگر نند کے تذکرے نے منہ کاذا لقمہ ایسا کڑوا کر

# پیارے بچوں کے لئے پیاری پیاری کہانیاں



بچوں کے مشہور مصنف

محمود خاور

کی لکھی ہوئی بہترین کہانیوں  
پر مشتمل ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے  
آپ اپنے بچوں کو تحفہ دینا چاہیں گے۔

ہر کتاب کے ساتھ 2 مارک مفت

قیمت - 300/- روپے  
ڈاک خرچ - 50/- روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے  
مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

تھا انہیں اسی رنگے نواڑی پنگ پہ کبھی کھانستے تو کبھی  
ڈانٹتے ہی دیکھا تھا۔ ان کی جوانی کی یادگار ایک بار عب  
اور جلالی تصویر ہال میں آویزاں تھی۔ اور یہ جلال اور  
رعب صرف اس تصویر میں نہیں تھا۔ بڑے دادا کے  
مزاج سے آج بھی سب خائف رہتے تھے۔ وہ دواؤں  
کے سارے چل رہے تھے اور پوری حویلی کو چلا رہے  
تھے۔ آج بھی ابوان کی اجازت اور مرضی کے خلاف  
کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ حتیٰ کہ مہ پارہ پھوپھو کی شادی  
بھی۔

ہمارے خاندان میں شادی بیاہ کے معاملات آپس  
میں ہی نمٹائے جاتے ہیں۔ پھوپھو کی قسمت۔ ان  
کے جوڑ کا یا تو ذات برادری میں کوئی تھا ہی نہیں۔ یا تھا  
تو ان کو نہ ملا اور باہر سے آئے رشتے کے لیے کبھی  
بڑے دادا ماننے ہی نہیں۔ ابو کے دے دے دلا نکل  
کے باوجود۔ اور یہ اصول صرف گھر کی عورتوں کے  
لیے نہیں تھے۔ سلمان چچا نے جب اپنی پسند سے  
انہیں آگاہ کیا تو ان کے آڑے بھی یہی اصول آئے۔  
مگر وہ کوئی مہ پارہ پھوپھو تھے جو ماتھے پہ بل لے کر  
بربرواتے ہوئے حویلی کی دیواروں میں تلخ زندگی گزار  
دیتے۔ انہوں نے ڈنکے کی چوٹ پہ اپنی پسند کو اپنایا  
اور اسی پاداش میں انہیں خاندان سے الگ کر دیا۔  
ساری زندگی انہوں نے اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ  
ایبٹ آباد میں گزاری۔ ابوان سے رابطے میں رہے  
۔ شاید کبھی کبھی چھپ چھپ کے مل بھی آتے تھے،  
مگر بڑے دادا سے ان کو کبھی معافی نہ دلا سکے۔ یہاں  
تک کہ چچا اپنی چیمٹی بیوی کے ساتھ ایک کار حادثے کا  
شکار ہو کے یہ دنیا ہی چھوڑ گئے۔ اور ان کی اکلوتی بیٹی ام  
ہانی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حویلی میں آگئی۔

نہیں شاید۔ شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری زندگی  
میں بھی۔

اس کی روئی روئی آنکھیں اداس اداس چہرہ مجھے ذرا  
اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں خود خاصا آدم بے زار اور  
سریل قسم کا بچہ تھا۔ لیکن اس کے ہونٹوں پہ  
مسکراہٹ لانے کے لیے ہر جتن کرنے پہ تیار تھا۔

اس کی خاطر جو کر تک بنے۔ میں جو کمرے میں گھسا گیمز کھیلتا رہتا تھا اب کبھی اس کو چھت پہ پٹنگ اڑا کے دکھا رہا ہوتا تو کبھی اس کے لیے آم کے درخت پہ چڑھا کیریاں توڑ رہا ہوتا۔ اسے آنکھ پھولی کھیلنا بہت پسند تھا اور مجھے اسے آنکھوں پہ دھڑا باندھے میری تلاش میں گھومتے دیکھنا۔ اور میں جیب چاپ ایک جگہ کھڑا اسے تکتا رہتا۔ چھپنے کی کوشش بھی نہ کرتا۔ بھلا میں اس کی نظروں سے او بھل کیوں رہنا چاہتا اور جب وہ مجھے کاندھوں سے تھام کے خوشی سے چلاتی۔

”دھونڈ لیا میں نے۔ سعد مل گیا مجھے۔“ تو میرے اندر سکون سا تر آتا۔ میں اسے مل جانا چاہتا تھا۔

اور ایک میں ہی تو تھا پوری حویلی میں جس کے ساتھ وہ باتیں کرتی تھی۔ ہنستی تھی۔ کھیلتی تھی۔ باقی سب کے ساتھ وہ کل ہی نہ پار ہی تھی۔ امی اس کا بے حد خیال رکھتیں، ابو اس پہ اتنا پیار لٹاتے بڑے دادا تو لگتا تھا سلمان چچا کے ساتھ ہونے والی ہر زیادتی کی تلافی اسی کے لاڈ اٹھا کے کرنا چاہتے تھے۔ بس ایک مہ پارہ پھوپھو تھیں جو ذرا لیے دیے۔ میں اس کے ساتھ۔ مگر وہ کوئی اتنی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ ان کا رویہ سب کے ساتھ ہی ایسا تھا اس معاملے میں وہ رواداری اور انصاف سے کام لیتیں۔ سب کو ایک سی بے مروتی اور سرد مہری سے نوازتی تھیں۔ پھر بھی وہ جیسے اپنے اندر سمٹی رہتی وہ اپنے نہیں کسی اور کے گھر میں رہ رہی ہے۔ ایک ایسے گھر میں جہاں اس کی ماں کو کبھی قدم رکھنے کی اجازت نہ ملی۔ ایک ایسے گھر میں جس کے دروازے ہمیشہ کے لیے اس کے باپ پہ بند کر دیے گئے تھے۔ یہ احساس اس کے اندر سے نہیں جاتا تھا۔

حویلی کی نسبت وہ حویلی کے پچھلے گوشے والے اس کھنڈر نما حصے میں زیادہ خوش تھی۔ جو بڑے دادا کے بھی دادا کے وقتوں کی یادگار تھا۔ اس کی خاطر میں بھی وہیں جانے لگا اس کے ساتھ۔ اور چونکہ اس کا دل وہاں لگتا تھا میرا بھی لگنے لگا۔ ہم نے اس کھنڈر کو ایک نام دیا۔ خواب نگر۔ یہ خواب نگر ہمارا تھا۔ ہم

دونوں کا۔ ہم پہروں یہاں بتا دیتے۔ وہ کالج سے اور میں اسکول سے آنے کے بعد کتابیں بھی یہاں اٹھا لاتے۔ پڑھتے، کھیلتے، باتیں کرتے۔ اسے دیواروں پہ کارٹون بنانے کا بہت شوق تھا۔ بہت اچھی ڈرائنگ بھی تھی اس کی۔ جب دل چاہتا کمال قسم کے اسکی چیز اور پینٹنگز بھی بناتی۔ مگر خواب نگر کی شکستہ دیواروں پہ صرف کارٹونز۔ مزے مزے کے کارٹونز اور میں۔ میری ڈرائنگ تو ہمیشہ سے بہت بری تھی۔ مگر اس کے لیے کچھ تو کرنا تھا میں نے۔ ایک دن چاک اٹھایا۔ اور ایک دیوار پہ اس کا اور اپنا نام لکھ دیا۔ اس سے کچھ دیر پہلے میں کسی بات پہ اس سے ناراض ہوا تھا۔ نہیں۔ ناراض نہیں ہوا تھا۔ ناراض ہونے کا ڈرامہ کر رہا تھا تاکہ وہ مجھے منائے اور اس نے مجھے منایا۔ میں مان گیا پھر اپنا اور اس کا نام دیوار پہ لکھتے ہوئے میں نے کہا۔

”ہنی۔ آج کے بعد جب بھی ناراضی کے بعد ہماری پھر سے دوستی ہوا کرے گی۔ میں یہاں اپنا اور تمہارا نام لکھوں گا۔“ وہ ہنس پڑی تھی۔

”بدھو۔ پھر تو جلد ہی یہ سب دیواریں تمہارے اور میرے نام سے بھر جائیں گی۔ پھر میں کارٹونز کہاں بناؤں گی۔“

”تو ہم کم کم ناراض ہوا کریں گے ناں۔“

میں نے حل نکالا اور وہ پھر سے ہنس پڑی اور زمین پہ کونکے سے لیکرس کھینچنے لگی۔ یہ اس کا پسندیدہ کھیل تھا اسی سے متعارف ہوا تھا میں اس کھیل سے اور اس کا نام سن کے ہنس بھی پڑا تھا۔

”اشاپو۔ یہ کیسا نیم ہے بھلا۔ کتنا فضول نام۔“

”بدھو۔ تمہیں کیا پتا تم اپنے روم میں بیٹھے بس ویڈیو گیمز کھیلا کرو۔ جو مزا ایسے کھیلوں میں ہے وہ ویڈیو گیمز میں کہاں۔“

پھر میں بھی اکثر اس کے ساتھ اشاپو کھیلنے لگا اور اکثر رات کو وہ مجھے کہانی بھی سنایا کرتی۔ مجھے کہانی سننے سے زیادہ کھلے آسمان کے نیچے ستاروں کی چھاؤں میں آنگن میں بچے پٹنگ پہ اس کے برابر لیٹ کر اسے

اور جیسے ہی حسد، غرض اور رقابت کی آگ سے سیاہ ہوتے چہرے والے سعد رضوان پہ میری نظر پڑی۔  
میرے بدن سے قدم رک گئے۔ اس بے پناہ مکروہ چہرے کو دیکھ کے میں نے حیرت سے سوچا تھا۔ کیا واقعی یہ میں تھا؟

”کیسے محبت ہوس کی تپش سے گھبرائی ہوتی ہے۔“  
اور پھر کہیں ہانی کے کمرے کی کھلی کھڑکی سے اندر کا منظر نظر آ رہا تھا۔ زرد لباس میں مایوں کی دلہن ہر اس چہرے والی امہ ہانی۔ اور وحشت کے عالم میں اسے کاندھے سے پکڑ کے جھنجلاہٹا سعد رضوان۔  
”اور کہیں محبت طلب کی پیاس میں بے کل۔“  
میں نے گھبرا کے اس کے کمرے کی ادھ کھلی کھڑکی سے نظر ہٹائی تو سامنے ایک اور مکروہ منظر تھا۔

شکست خورہ، زخم خورہ، مایوس سعد رضوان آنسوؤں کے ساتھ روتا، گڑ گڑاتا ام ہانی کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑے کھڑا تھا اور وہ اس کی وحشت و دیوانگی سے سہمی کر رہی تھی۔

”اور کہیں۔ کہیں محبت نفرت کے زہر میں ڈوبی ہوئی۔“

اور جب دھندلی آنکھوں کے سامنے دلہن بنی ام ہانی نے سعد رضوان کو شدت کے ساتھ تھپڑ مارا تو میں اس منظر کی تاب نہ لا سکا اور آنکھیں بند کر لیں۔ مگر بند آنکھیں اور بہت کچھ دکھانے لگیں۔



”کیوں جاؤں میں ہاسٹل؟“  
میں جھنجلا اٹھا تھا ابو کے اس نئے آرڈر پہ۔ مگر ان پہ میری جھنجلاہٹ اور احتجاج کا کوئی اثر نہ پڑا۔  
”کیونکہ میں کہہ رہا ہوں۔“

ان کے لہجے کی سختی اور قطعی پن کا اثر زائل کرنے کے لیے امی نے وہی بات ذرا مکھن میں بھگو کے کی۔  
”تمہارے ابو نے تمہارے مستقبل کے لیے ہی یہ فیصلہ کیا ہے سعد یہاں اس چھوٹے شہر میں تم کو کیا تعلیم حاصل کرو گے؟“

محسوس کرنا زیادہ اچھا لگتا تھا۔  
”اس کے زخم گہرے تھے مگر شنراوی کو محسوس نہ ہوئے کیونکہ شنراوی اس سے بے حد محبت کرتا تھا۔ اس لیے اس کے زخم بھرتے گئے۔“

”تمہارے زخموں میں بھی کبھی درد نہیں ہو گا ہنی۔ کیونکہ میں بھی تم سے بے حد محبت کرتا ہوں۔“  
میں نے کہانی میں دخل دیا تو اس کی کھلکھلاہٹ دور اوپر ستاروں سے جا ٹکرائی۔

”بدعو۔ وہ والی محبت نہیں شنراوی کو شنراوی سے دوسری والی محبت تھی اور قسم کی۔“  
”کیا محبت کی بھی قسمیں ہوا کرتی ہیں ہنی؟“  
یہ میرا پہلا سوال تھا جس نے اسے لمحے بھر کے لیے چپ کر دیا تھا۔ پھر اس کے لبوں سے ایک سرگوشی سی آزاد ہوئی۔

”شاید۔“



اور میں اس ویرانے میں کھڑا ہوں۔ اسی بازگشت میں۔

”شاید۔ شاید۔ شاید۔“

میں نے اس حویلی کے سنان، اجاڑ ویرانے میں کسی کو کھوجنا چاہا۔ کسی بھی جانب کوئی نہیں تھا اور ہر جانب وہ تھی۔

اس کے ہونے اور اس کے نہ ہونے کے درمیان ہی معلق تھا میں کب سے۔

”ہاں۔ محبت کی بھی قسمیں ہوا کرتی ہیں۔“ مجھے طاؤسی تخت پہ پھر سے سیاہ وجود سسکیاں لیتا نظر آیا۔

”کیسے محبت عبادت کے وضو سے پاک ہوتی ہے۔“ اور پھر مجھے برآمدے کے سرخ، سبز، سفید اور

سیاہ چپس والے سرو فرش پہ وہ جائے نماز بچھائے سفید دوپٹے کے بالے میں سجدہ کرتی نظر آئی میرے قدم آگے بڑھے۔

”تو کہیں محبت، غرض کے کالے بادلوں میں دھندلائی ہوئی ہوتی ہے۔“

”اچھا؟ تو جب ہنی نے لاہور جا کے NCA میں ایڈمیشن لینا چاہا تھا تب آپ سب نے مخالفت کیوں کی تھی اور یہ کیوں کہا تھا کہ ایسی کون سی پڑھائی ہے جو اس شہر میں رہ کے نہیں ہو سکتی۔“

”سعد وہ لڑکی ہے۔“ امی نے جیسے اپنی دانست میں کوئی انکشاف کیا تھا۔

”اچھا تو وہ لڑکی ہے اس لیے اس کے فیوچر کی کوئی پروا نہیں۔ میرے فیوچر کی ہے؟ میں نہیں جانے والا کہیں۔“

وڈھائی سال پرانا مقدمہ نکال کے میں اب لڑ رہا تھا اس کی حمایت میں وہ بالکل صحیح مجھے بدھو کہتی تھی۔

”سعد تم۔“ اس سے پہلے کہ ابو ڈانٹ کا ایک لمبا سیشن شروع کرتے امی نے ان کا ہاتھ دبا کے انہیں منع کر دیا۔

”میں بات کرتی ہوں رضوان۔“

”یا گل ہو گیا ہے کیا یہ؟“

”گھر سے دور کبھی نہیں رہا نا۔ اس لیے۔“

”تو کیا ساری عمر تمہاری گود میں بیٹھا رہے گا۔“

ان کو بحث میں الجھا دیکھ کے میں پیر پٹنا ہاں سے نکل گیا۔

اور بھلا دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ام بانی سے بستر سامع اور خواب نگر سے بستر جگہ اور کون سی تھی۔

”ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں وہ۔ یہاں کیا پڑھ لو گے تم؟“

”کوئلے سے دیوار پہ کارٹون بناتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی۔“

”وہی۔ جو تم نے پڑھا۔“

”بدھو۔ میں نے تو ہسٹری اور لٹریچر کے ساتھ ہی اے کیا اور تم نے کرنی ہے انجینئرنگ اور اس کے لیے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا ہو گا۔“

”تم بھی تو آرٹس بننا چاہتی تھیں اور اس کے لیے نیشنل کالج آف آرٹس جانا چاہتی تھیں۔ مگر تمہیں تو

کسی نے اجازت نہ دی۔“

”تو میں بن تو گئی آرٹس۔“ وہ کوئلہ پھینک کر ہاتھ جھاڑتے ہوئے فخر سے مجھے دیوار پہ بنا کارٹون دکھانے لگی۔

”یہ دیکھو۔ مگر انجینئر ایسے خود بخود نہیں بنا جاتا۔“

”نہیں تو نہ سہی۔ نہیں بنوں گا۔ اگر اس کے لیے ہاسٹل جانا شرط ہے۔“ میں اڑا ہوا تھا وہ میرے برابر بیٹھ گئی۔

”سمجھ گئی۔ تم کیوں نہیں جانا چاہتے۔“ اس کی بات پہ میں نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

”اچھا۔ تو تم واقعی جانتی ہو کہ وہ کیا ہے جو مجھے یہاں باندھے ہوئے ہے۔ کیوں نہیں جاسکتا میں دور؟“

”ہاں۔ تمہارا ڈر۔“ اس کے اطمینان بھرے جواب پہ میں جل اٹھا۔

”ڈر؟“

”ہاں نا۔“ وہ میرے جلنے کڑھنے کا مزالے رہی تھی۔

”ڈرتے ہو اکیلے رہنے سے۔۔۔ چہ چہ۔۔۔ بے چارہ تنہا سا بچہ۔۔۔ کسے رہے گا اکیلے۔“

”میں بچہ نہیں ہوں سمجھی۔“ آئی بڑی۔“ میری ناراضی پہ وہ ہنس پڑی۔

”ہاں۔ ہوں تو بڑی اور تم چھوٹے۔“

”اچھا؟ ذرا اٹھنا تو۔“ میں جھٹ کھڑا ہو گیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کے بھی اپنے برابر کھڑا کرنے کے لیے کھینچنے لگا۔

”یہاں کھڑی ہو ذرا۔ ساتھ ایسے اب بتاؤ یہ میں چھوٹا ہوں؟ تم چھوٹی ہو پورے پانچ انچ۔“

”اور تم پورے پانچ سال۔ اتنا ہی سَوق ہے نہ بڑا بننے کا تو جاؤ۔ جا کے دکھاؤ ہاسٹل اور رہو اکیلے۔“

وہ چڑا بھی رہی تھی اور اکسا بھی رہی تھی۔ میں کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے بھی اکسانے کی کوشش کی۔

”سوچ لو۔ چلا گیا تو یاد آؤں گا تمہیں۔“

”آجائے۔ میں خوشی خوشی کر لوں گی تمہیں یاد۔“  
اس کے اطمینان نے مجھے تاؤ دلا دیا اور میں نے  
فورا ہی جانے کا فیصلہ کر لیا، ٹھان لی کہ اب اسے یاد آ  
کے رہوں گا اور ایسے یاد آؤں گا کہ مزا چکھا دوں گا اور  
بھیجے مجھے دور۔



”یہ سب چھوڑو سلمیٰ اور پہلے جا کے وہ سارے  
کہڑے بریس کر دو جو میں نے سعد کے نکال کے رکھے  
ہیں۔ مجھے پیکنگ کرنی ہے اس کی۔“  
نائلہ نے تے ہی سلمیٰ کی گلو خلاصی کرائی جو  
مہ پارہ کے سامنے بیٹھی اس کے لیے سیب چھیل رہی  
تھی اور ساتھ ساتھ اس کی جلی کٹی سن رہی تھی۔ فورا  
شکر کا کلمہ پڑھتی اٹھی۔

”جی بی جی۔۔۔“  
”مان کیا وہ جانے کے لیے؟“ مہ پارہ نے دانتوں  
سے سیب کترتے اور آنکھوں سے نائلہ کو چٹکی لیتے  
پوچھا۔

”میں نے ہانی سے کہا تھا کہ اسے سمجھائے۔ مان  
گیا۔“ ام ہانی کا نام کیا تھا۔ گویا تنہا مرج تھی جو مہ پارہ  
کے حلق تک میں لگ کے سی سی کرا گئی۔  
”ام ہانی نہ ہوئی۔ گینڈر منکھی ہو گئی جو سعد کو  
سوٹکھائی اور ہر بات منوالی۔“  
وہ نکلس کے بولی تھی اور نائلہ نے حسب عادت  
رسان سے اس کے اعتراض کو ٹالنا چاہا۔  
”اس کی مان جو لیتا ہے وہ۔“

”بھابھی۔۔۔ آپ کے دل کو کچھ ہوتا نہیں ہے؟  
اولاد وہ آپ کی ہے اور مانتا وہ ہر بات اس کی ہے۔“  
”تو کیا ہوا مان جاتا ہے یہی کافی ہے۔“  
”آپ بہت بھولی ہیں بھابھی۔۔۔“ ام ہانی نے اسے  
ڈھال بنا رکھا ہے۔ وہ نہ صرف اس سے آپ کی  
باتیں منواتی ہے بلکہ اپنی بھی ہر بات اسی کے ذریعے  
آپ لوگوں سے منوالیتی ہے۔  
”نہیں مہ پارہ۔۔۔ ام ہانی کبھی کچھ منوانا تو دور کی بات

مانگتی تک نہیں۔ میری تو حسرت ہی ہے کہ وہ کبھی مجھے  
ماں سمجھ کے کوئی فرمائش کرے۔“  
”لو۔۔۔ یاد نہیں؟ لاہور جا کے داخلہ لینے کے لیے  
اس نے کیسے سعد کو ڈھال بنایا تھا۔۔۔ وہ اتنا پدا سالڑ کا  
ڈٹ کے کھڑا ہو گیا تھا اس کے لیے۔“

مہ پارہ تکی بیٹھی تھی آج نائلہ کو ام ہانی کے سب  
کردہ ناگروہ گناہ یاد دلانے کے لیے مگر نائلہ نے بھی شاید  
صبر گھول کے پی رکھا تھا جو مہ پارہ کا ایک ایک وار اٹھا جا  
رہا تھا۔

”تو کون سا اس کی یا سعد کی مان لی گئی تھی۔۔۔ کب  
جانے دیا اسے دادا جی نے اور تمہارے بھائی صاحب  
نے۔“

”ٹھیک ہی تو کیا۔۔۔ میں تو خود اس حق میں نہیں تھی  
کہ وہ دوسرے شہر جا کے پڑھتی وہ بھی لڑکوں کے ساتھ  
بھابھی پرانی بیٹی کی ذمہ داری بہت بھاری ہوتی ہے اور  
پھر اس کی ماں۔۔۔ کچھ ڈھکا چھپا ہوا تو ہے نہیں کسی سے۔“

”مہ پارہ۔۔۔“ اب نائلہ اپنی ناگواری چھپانہ سکی۔  
”جو دنیا میں نہیں۔ اس کا ذکر کیا تو اچھے لفظوں میں  
کرو۔ یا نہ کرو۔“

”اب جو بچ ہے۔ وہ بچ ہے بھابھی۔۔۔ دنیا سے لوگ  
جاتے ہیں۔ ان کے کارنامے ہیں۔ وہ تو پیچھے ہی رہ  
جاتے ہیں۔ ہمارے بھائی سے اس کی ماں کی دوستی  
یونیورسٹی میں ہی تو ہوئی تھی اور وہ سارے خاندان سے  
نکلے کر اس سے کورٹ میں کر کے الگ ہو گیا تھا۔  
ایسی ماں کا کچھ اثر تو آتا ہے۔ میں تو کہتی ہوں اس پر  
بہت کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ ذرا سی  
ڈھیل اس لڑکی کو۔“

بات کرتے کرتے مہ پارہ کی نظر سامنے پڑی تو وہ منہ  
بنا کے چپ ہو رہی۔ باہر سے آتی ام ہانی اس کی بات  
سن کے دہلیز پر ہی جمی رہ گئی تھی۔ مہ پارہ تو سر جھٹک  
کے پھر سے سیب کترنے میں مشغول ہو گئی اور نائلہ  
کچھ نہ کرتے ہوئے شرمندہ ہو گئی ام ہانی کے سامنے۔  
”میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی ام ہانی۔۔۔ ذرا

میرے ساتھ سعد کی پینگنگ تو کروانا۔“

”جی ہاں۔“

بچھے بچھے انداز میں کہتی ست قدموں سے وہ نائک کے پیچھے چل دی۔

ہمیشہ کی طرح مہارہ کی باتوں کو جلد ہی ذہن سے اتار کے وہ پھر سے مسکراتے ہوئے مگن انداز میں کپڑے سوٹ کیس میں رکھ رہی تھی میں بیڈ پہ کہنی کے بل لیٹا اسے تنکے جا رہا تھا۔

”کچھ رہ گیا ہے تو بتا دو۔“ ایک سوٹ کیس بند کرنے کے بعد اس نے بیگ کھولا۔

”ہاں۔۔۔ وہ تو ہمیں رہ جائے گا۔“

”ہاں تو بتا دو ناں۔۔۔ کوئی ضروری چیز ہے؟ پیک کر دوں۔“

”بتا دوں۔۔۔ مگر تم پوری نہیں آؤ گی اس میں۔“ میری نظریں اس کے چہرے سے ہٹ نہ پا رہی تھیں۔ ”بدھو۔“ اس کی کھلکھلاہٹ میرے سوٹ کیس اور بیگ میں بھر گئی۔

”چلو اب سو جاؤ۔ صبح جلدی نکلتا ہے تمہیں۔“

وہ بیگ بند کے پاس رکھ کے چلی گئی۔ میں چھ دیوے پر دے کو دیکھتا رہا۔ پھر اچھل کے بیڈ سے نیچے اڑا اور الماری کھول کے اپنے شب خوابی کے لباس کے نیچے چھپا کے رکھا وہ چھوٹا سا چکنا سا سرمئی پتھر نکالا جس پہ ام ہانی کے ان گنت لمس قید تھے اسے ہتھیلی پہ رکھتے ہی میرے ہونٹوں سے مسکراہٹیں پھوٹنے لگیں۔ یہ وہ پتھر تھا۔ جو کل کھیل کے دوران میں نے غائب کیا تھا جب ام ہانی کمر پہ دوپٹا کسے اپنے پسندیدہ کھیل اشابو کے لیے خواب گھر کے کچے آنگن پہ کوئلے سے لکیریں کھینچ رہی تھی۔ پھر اس نے پتھر کو حسب عادت چوم کر نشانہ ناک کر پھینکا۔ اور ایک ایک خانے پہ پیر جماتی۔ کودتی آگے بڑھی اور جیسے ہی اس کی نظر چوکی۔ میں پتھر اٹھا کے بھاگ نکلا۔ وہ پلیٹی تو مجھے سرپٹ بھاگتے دیکھ کے چلائی تھی۔

”سعد۔۔۔ رکو کہاں جا رہے ہو کھیلنا نہیں تھا تو بتا

دیتے سعد۔“

مگر مجھے جو چاہیے تھا۔ وہ میں لے اڑا اس چکنے سرمئی پتھر کو میں نے سوٹ کیس میں سب سے چمکی تہ میں چھپا دیا۔



بڑے دادا کا کمرہ۔

نواڑی رنگلا پینگ۔ تپائی پہ رکھی رنگ برنگی دوائیں، صراحی اور پیتل کا گلاس۔ پینگ کے ساتھ نیچے رکھا اگالداں۔

پائنٹی رکھی بروکید کی رضائی۔ عقب پہ ٹنگی بندوق

اور بڑے دادا کی وہی آہیں۔ وہی کھانسی وہی سرو آہیں۔

اور ان آہوں اور کھانسی کے درمیانی وقفے میں بار بار کچھ کہنے کی کوشش کرتے ابو۔

مجھے اب جمائیاں آنے لگیں۔۔۔ کب سے ابو انہیں کچھ بتانے کی کوشش کر رہے تھے۔

”صبح سعد کو۔“ اور کھانسی کا دورہ۔

”آپ سوئے ہوں گے اس وقت تو میں نے سوچا ابھی۔“ رضوان نے دوبارہ کہنے کی کوشش کی۔ مگر

اس بار ذرا زیادہ طویل ہو گیا کھانسی کا دورانیہ۔ اور میری جمائیاں بھی۔ ذرا تھمیں تو وہ آہیں بھرنے لگے جو قدرے غنیمت تھیں۔

”بس اب ابھی اسے دعا دے کر رخصت۔“ اب کے جو دورہ پڑا تو میری جمائیوں نے ہی ہاتھ جوڑ کر معذرت کر لی۔ میں ابو کی بات مکمل ہونے کی امید چھوڑ کے اب بڑے دادا کی دواؤں کے کیبل بڑھنے لگا۔ ”نہ بھیج اسے لہور۔“ ابو کی بات تو کیا پوری ہوئی تھی۔ بڑے دادا نے اپنی شروع کر دی۔

”لہور جا کے منڈے خراب ہو جاتے ہیں سلمان کا حال یاو نہیں؟ وہ تو پھر بھلے وقت تھے۔ اب تو ماحول اور خراب ہو گیا ہے۔ لہور بھیجنے سے اچھا ہے اسے ولایت بھیج دے۔“

ان کے مشورے پہ ابو مسکرا دیے۔  
”تو کیا ولایت جاگے لڑکے خراب نہیں ہو سکتے دادا جی؟“

”نہ اوتھے کی خراب ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ میم لے آئے گا۔ چنگالے آوے۔ بچے سوہنے ہوں گے۔ نیلی آنکھوں سنہرے بالوں والے۔ مگر لہو نہ بابا۔“  
توبہ توبہ۔“

پھر انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں سرہانے رکھی چھڑی اٹھا کے مجھے ٹھوکا دیتے ہوئے متوجہ کیا۔  
”اوئے۔“

”جی بڑے دادا۔“  
میں نے پسلی سہلائی۔ بڑے زور کی چبھی تھی چھڑی۔

”گل سن۔ خبردار جو توٹے وڈے بازار کا رخ کیا تو میں ٹانگیں چیر دوں گا تیری۔“  
”ہیں؟ وڈا بازار؟“ میں ہونق سا بن کے دونوں کو تنکے لگا۔ ابو خاصے جز بزلگ رہے تھے۔

”دادا جی آپ بھی کیا۔ اسے کیا پتا ان باتوں کا۔“  
”کیوں؟ یہ چھوٹا کا کا ہے؟ تجھے کیا پتا نئی نسل کا کتنی کھو چل اور مہسنی ہے اندرو اندری۔ سعد جیسے مجھے پتا چلا کہ تو وڈے بازار جانے لگا ہے تو تیری خیر نہیں۔“

انہیں دوبارہ کھانسی کا دورہ پڑا اور ابو نے آنکھ سے مجھے کھسکنے کا اشارہ کیا۔

”ابو۔ یہ وڈا بازار کونسا ہوتا ہے؟“  
نکلتے نکلتے میں نے سرگوشی میں پوچھا تو جواب میں انہوں نے تگڑی سی گھوری ڈالی۔



علی الصباح نکلتا تھا۔ میں جانتا تھا وہ اس وقت کہاں ہوگی اس لیے بیگ اٹھائے سیدھا برآمدے میں آیا جہاں وہ جائے نماز بچھائے فجر کی نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ پھیلائے ہوئے تھی۔ میں دو قدم دور کھڑا چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ کتنا اچھا لگتا تھا ناں مجھے

اسے یوں دیکھتے چلے جانا۔ دعا مانگنے کے بعد اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے پاس بلایا۔ میں وہیں گھٹنوں کے بل ٹھنڈے فرش پہ بیٹھ گیا۔ وہ زیر لب کچھ پڑھ رہی تھی۔  
”ہنی۔ میں جا۔“

اس نے گھور کے چپ رہنے کا اشارہ کیا تو میں پھر سے اپنے دل پسند شغل سے خود کو بہلانے لگا۔

اس کے دھلے دھلے چہرے پر بند پلکوں کا ہلکا سا ارتعاش۔ ورد کرتے لب۔ پھر اس نے میرا چہرہ ہاتھ سے پکڑ کر اپنے نزدیک کیا اور میرے دائیں کان میں پھونکتے ہوئے کہا۔

”فی امان اللہ۔“  
”مجھے روک لو ہنی۔“

اور یہ تو میں پچھلے تین دنوں میں اسے کتنی بار کہہ چکا تھا۔

”فضول باتیں۔ پڑھنے کی چوری کرو گے تو میں ناراض ہو جاؤں گی۔“

وہ دوپٹے کے پلو کی گرہ کھولتے ہوئے کچھ نکال رہی تھی۔

”آدھی جان تو میری جانے کے خیال سے نکل رہی ہے۔ باقی آدھی تم ناراضی کی دھمکی دے کر نکال دو۔“

اس نے کپڑے کی ایک دھچی میرے دائیں بازو پہ باندھنی چاہی۔

”اب یہ کیا ہے؟“  
”امام ضامن۔“

اس کا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا تو صرف لہجہ نہیں تھا جو بھگ رہا تھا آنکھوں کے گوشے بھی تھے۔ میں نے انگلی کی پور پہ اس کی پلک پہ لنگا آنسو چن لیا۔

”اسے بھی باندھ دو ساتھ۔ کیا کروگی چھپا چھپا کے۔“ وہ مسکرا دی۔

”بدھو۔“  
”سعد۔“

مہ پارہ پھوپھو کی پاٹ دار آواز گونجی۔

”جاؤ ناں۔ دیر نہ ہو جائے۔“ اس نے کاندھے سے پکڑ کے میرا سر خموڑا۔

”سب وہاں تمہارا انتظار کر رہے ہیں اور تمہاری باتیں ہی ختم نہیں ہو رہیں۔“

میں نے آنکھوں میں اس کا چہرہ بھرنا چاہا مگر کسی طرح سنا تا ہی نہیں تھا۔ آنکھیں دل سب چھوٹا پڑ جاتا تھا۔ جانتا تھا مجھے رخصت کرنے وہ کبھی بھی باہر تک نہیں آئے گی۔ اس لیے میں نے کہا بھی نہیں اور جتنے نقوش میری دو آنکھوں میں سما سکتے تھے، ان کو ہی سیٹ کر چل دیا جہاں مسلسل ہارن پہ ہارن بج رہے تھے۔

”آج بھی جاؤ سعد۔ تمہارے ابو کا ہاتھ نہیں بننے والا ہارن ہے۔“ امی تھیں جو پتا نہیں کیسے خود کو سنبھالے ہوئے تھیں۔

”میرا شونا موتا جا رہا ہے؟“

اور یہ مہ پارہ پھوپھو تھیں جو میرے دونوں گال نوچتے ہوئے لاڈ جتا رہی تھیں۔ وہ لاڈ دو سال میں ایک آدھ بار آتا۔

میں نے ان سے اپنے گال چھڑاتے ہوئے اور کار میں بیٹھتے ہوئے ایک نظر مڑ کے پیچھے ڈالی۔ اس کے کمرے کی کھڑکی بند تھی۔ مگر جالی کے پردے کے پیچھے اس کا ہیولا نظر آ رہا تھا۔ جو فوراً ہی ہٹ گیا۔



ام بانی اداسی سے کھڑکی کے پاس سے ہٹی۔ آنسوؤں کو اب کسی کا پردہ نہیں تھا۔ وہ دیوار پہ لگی اپنی اور سعد کی ان گنت تصویریں دیکھنے لگی۔ ہنسی مسکراتی تصویریں۔ زندہ جاگتی تصویریں۔

”ساری زندگی کوئی دوست نہیں بنا میرا۔ تم بھی نہ بنے۔ کم از کم ایک اور اداسی تو میرے حصے نہ آتی۔“

”بانی بی بی۔“ سلمیٰ نے جھانک کر پکارا۔

”بی بی جی کہہ رہی ہیں آپ کی خالہ کا فون ہے۔ آگے سن لیں۔“

”خالہ؟“ وہ چونکی۔

”ہاں جی۔۔۔ ولایت والی خالہ۔۔۔ وہ جو عید کے عید فون کرتی ہیں۔“



ہاسٹل کی بلڈنگ کو دیکھتے ہی میرا دل ہولنے لگا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سنٹرل جیل کے سامنے کھڑا ہوں۔ ابو بڑے اطمینان سے ڈرائیور کو سامان اندر رکھوانے کا کہہ رہے تھے۔ پھر مجھے ڈپٹنے لگے۔

”اب بس بھی کرو سعد۔ مرد بنو یہ تمہارا پہلا قدم ہے گھر سے باہر ابھی تمہیں بہت آگے بڑھنا ہے۔“ میں برے برے منہ بنا تا سر ہلا رہا تھا۔

”میں ہر ویک اینڈ پہ ڈرائیور کو بھیج دیا کروں گا۔“ ”شکریہ اس عنایت کا۔“

”اور ہاں۔۔۔ سنو۔“

میرے چلے کٹے لہجے پہ بھی انہوں نے مزید ڈانٹنے سے پرہیز کیا اور کچھ ہچکچاتے ہوئے کہنے لگے۔

”وہ۔۔۔ دراصل۔۔۔ دادا جی کی بات نے میرے دل میں بھی وہم سا بیٹھا دیا ہے۔ دوستوں کے معاملے میں احتیاط کرنا۔ نہ تو ہر کسی سے یاریاں گانٹھنا۔ نہ ہر جگہ منہ اٹھا کے چلے جانا خاص طور پہ وہاں تو بالکل بھی نہیں۔“

”وہاں کہاں؟“

”وہیں۔۔۔ جہاں کا دادا جی نے بھی منع کیا تھا۔“

”اوہ۔۔۔ اچھا وہ ڈا بازار۔“ مگر میرا اس جگہ کا نام لینے سے ہی ابو کی تیریاں چڑھ گئیں۔

”اوں ہوں۔ بالکل بھی نہیں ہرگز نہیں سمجھے۔“ کچھ نہ سمجھنے کے باوجود میں نے تابعداری سے سر ہلا دیا۔

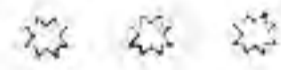


”دھیان سے سلمیٰ یہ آلو کے چھلکے اتار رہی ہو یا تریوز کے اتنے موٹے؟ جلدی کس بات کی ہے؟ ایسے ہبڑ دھڑ لگائی ہوئی ہے؟ کہیں جانا ہے تجھے؟“ نائلہ کی جھڑکیاں سن کے سلمیٰ کا تو جیسے دل کا چور پکڑا گیا۔

”نہیں بی بی جی۔ تو بے۔ میں نے بھلا اتنے شام  
 ڈھلے کہاں جانا ہے۔“  
 اور پھر مہ پارہ کو آتے دیکھ کے سلمیٰ کا رنگ اور فق  
 ہو گیا۔ نائلہ تو ایک آدھ سوال کے بعد جان چھوڑ  
 دیتیں۔ انہوں نے بھلا کہاں جان خلاصی کرنا تھی۔  
 مگر مہ پارہ کے اندر تو الگ ہی کھد بد لگی تھی سویرے  
 سے۔ سلمیٰ پہ دھیان کہاں دیتیں۔  
 ”خیر تو ہے بھابھی۔ یہ ام ہانی کی خالہ کہاں سے  
 زندہ ہو گئی۔“

”یوں کہ۔ کہ بھانجی کی محبت زندہ ہو گئی۔“  
 ”ہاں جی۔۔۔ عید سے پہلے ہی فون کر لیا انہوں نے  
 اس بار۔“ سلمیٰ کے برائے کی دیر تھی کہ نائلہ نے پہلے  
 تو اسے باہر چلتا کیا۔  
 ”ہر بات میں ناک گھسیڑتی ہے۔ جاؤ جا کے دادا جی  
 سے پوچھو۔ رات کے کھانے میں دیا لیں گے یا  
 کچھڑی؟“  
 ”اس کے جانے کے بعد نائلہ نے پانی پینی مہ پارہ کو  
 بڑی رازداری سے بتایا۔

”غنیمت ہے۔ خیال تو آیا خالہ کو بھانجی کا اور وہ بھی  
 نیک خیال اس کا چھوٹا بیٹا جو ڈاکٹری کر رہا ہے اس کے  
 لیے؟“ اور مہ پارہ کو یہ سنتے ہی اچھو لگ گیا۔



کروٹیں لے لے کر ہی میں تھک گیا تھا۔ ایک  
 عجیب سی بے کلی تھی۔ دل کا کوئی کونہ خالی خالی سا  
 محسوس ہو رہا تھا۔ شعیب۔ میرا روم میٹ۔ گجراتیا  
 اسٹڈی ٹیبل پہ بیٹھا کتاب سے بار بار نظر ہٹا کے  
 مجھے دیکھتا۔ اور میں مزید چڑ جاتا آخر اس سے رہا نہیں  
 کیا۔

”کیا بات ہے؟ نیند نہیں آرہی؟“  
 دل تو چاہا۔ کہوں ”تمہیں کیا؟ تم کتاب میں منہ دو  
 ۔“ مگر بے بسی سے انکار میں سر ہلا کے رہ گیا۔  
 ”پہلی بار گھر سے دور ہوئے ہو؟“  
 ”ہاں پہلی بار۔ پہلی بار دور ہوا ہوں اور احساس ہو

رہا ہے کہ دور ہونا کسے کہتے ہیں۔“  
 ”عاوی ہو جاؤ گے میں تو بچپن سے ہاسٹل میں رہتا  
 ہوں۔ آری آفیسر کا بیٹا جو ہوا۔ چلو تمہیں بھلانے کے  
 لیے کہیں گھمالاتا ہوں۔ کہاں چلو گے؟“ وہ کتاب  
 بند کرتے ہوا اٹھا اور مجھے اچانک یاد آیا۔  
 ”سنو۔ یہ دو بازار کہاں ہے لاہور میں؟“  
 ”واٹ۔“ وہ پہلے چونکا پھر بے تحاشا ہنسنے لگا۔



”کیوں؟ دادا جی کو کیوں اعتراض ہوگا؟“ نائلہ  
 حیرت سے بولیں۔  
 ”تمہیں ان کے خیالات کا اندازہ تو ہے۔ سلمان  
 کی سالی کا بیٹا ہمارے لیے غیر ہے اس کی بیوی کو ہی تو  
 ساری زندگی بسو کے طور پہ قبول نہیں کیا انہوں نے  
 ۔ کہ غیر برادری کی ہے۔“ رضوان کے کہنے پہ وہ  
 جھنجھلا اٹھی۔

”اور وہ جو ولایت سے میم لانے کے لیے کہہ رہے  
 تھے سعد کو۔ وہاں کون سی برادری ٹٹھی ہے ہماری۔“  
 ”یہ نہی کہا ہوگا اور یوں بھی گزرے سالوں نے اتنا تو  
 فرق ڈالا ہے اب خاندان میں کئی بسو کہیں باہر سے آئی  
 ہیں۔ مگر بیٹی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ایسا ابھی تک  
 نہیں ہوا۔“

”آخر پہلی بسو بھی تو کوئی لایا ہوگا۔ کسی کو تو اس  
 معاملے میں بھی پہل کرنی ہے۔ اب کل پرسوں تک  
 وہ لڑکا آرہا ہے۔ مل تو لیں۔“

”نائلہ۔ ایک غیر جوان لڑکا۔ وہ بھی لندن پلٹ  
 ۔ ہمارے گھر آ کے رہے۔ وہ بھی کچھ دن کے لیے  
 ہماری بچی کو جانچنے پر کھنہ۔ وہ بالکل پسند نہیں کریں  
 گے۔“

”ایک تو دادا جی نے حویلی پہ 1925ء کا آئین نافذ  
 کر رکھا ہے۔ اب کون سا زمانہ رہا ہے ایسی باتوں کا۔  
 ہمارے لیے غیر سہی۔ ام ہانی کا تو سگا خالہ زاد ہے اور وہ  
 اسے ہانی کو جانچنے پر کھنہ کے لیے نہیں بھیج رہیں۔  
 ہمیں کہا ہے کہ ہم لڑکے کو دیکھ بھال لیں تو وہ اگلے

مہینے آکے باقاعدہ رسم کریں۔“

”اور وہ جو تین چار دن رہنے کے بعد ام ہانی کو ناپسند کر کے چلا گیا تو؟“ رضوان نے خدشے کا اظہار کیا۔

”کمی کیا ہے ام ہانی میں اور ماں نے بیٹے کو کچھ سمجھا کے ہی بھیجا ہو گا۔ ولایتی لوگ ہیں۔ بنا بیٹے کے رضامندی کے اتنے بڑی بات منہ سے نہیں نکالی ہوگی انہوں نے اور دیکھیں رضوان۔ رشتے ناتے ایسے ہی طے ہوتے ہیں۔ لڑکی بیاہنی ہے کہ نہیں؟ یا بہن کی طرح اسے بھی حویلی میں سجا کے رکھنا ہے۔“

”ایک تو تمہیں ہر موقع پر میری بہن چبھنے لگتی ہے۔“ رضوان نے پہلے ہی حفاظتی بند باندھ دیا۔ پتا تھا کہ مہارہ کی بات نکلی ہے تو دور تک جانے لگی۔

”اللہ کے فضل سے ہے ہی ایسی نوکری۔ چبھ چبھ جاتی ہے۔“ ٹھیک سے آئے در لڑکے کو آگے جو ام ہانی کا نصیب وہ اتنی اچھی ہے اس کے ساتھ اچھا ہی ہونا چاہیے۔ دادا جی کو بھی سمجھا دیں گے۔“



شعیب اپنے تئیں بڑا مجھے بھلائے نکلا تھا۔ لاہور کی رونقیں، روشنیاں، گہما گہمی ان سب نے میری وحشت میں مزید اضافہ ہی کیا تھا۔ بہت ہی برے موڈ میں واپس آتے ہی میں نے اسے کال کی اور لڑنے لگا۔

”تم بہت بری ہو۔ بالکل بھی اچھی نہیں ہو۔ تم مجھ سے ملی بھی نہیں جاتے ہوئے۔“

”تم حرکتیں بھی تو بچوں والی کرتے ہو۔ اگر مجھ سے ملے ہوئے رونے لگ جاتے تو سب کتنا مذاق بناتے تمہارا۔“ اس کے بہانے کو میں خاطر نہ لایا۔

”جھوٹ، تمہیں ڈر تھا کہ تم خود رونے نہ لگ جاؤ۔“ سچی بات سن کے اس نے بات ہی بدل دی۔

”اچھا تو تم نے لڑنے کے لیے فون کیا ہے؟“

”نہیں تمہاری آواز سننے کے لیے، پتا ہے ابھی تمہاری آواز سن کے کیسا لگا؟“

”کیسا لگا؟“

میں چپ ہو گیا جو محسوس ہوا تھا اس کی آواز سن کے وہ شاید لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر بھی کچھ تو کہتا تھا۔

”اس وقت تمہاری آواز سننا ایسا ہے ہنی۔ جیسے گرمیوں کے روزے میں مغرب کی آواز سننا۔“

”آ رہی ہوں تائی اماں۔“

اس کی بلند پکار میں میری آدھی بات دب ہی گئی۔

نجانے باقی کی آدھی بھی اس نے سنی تھی یا نہیں۔

”میں بعد میں بات کرتی ہوں۔“

تھا تو رات کا پہلا پہر مگر سکوت آخری پہر والا چھایا تھا۔ ایک تو اماؤس، اوپر سے جاتا جاڑا اور پھر شام سے ہونے والی بوند باندی سب لحافوں میں دبکے پڑے تھے ایسے میں سلمیٰ کے پیروں کی پازیب خوب ہی راز کھول رہی تھی۔

تائی اماں کی بات سن کے اپنے کمرے کے لیے جاتی ام ہانی نے اس پازیب کی چھٹک کو خوب پہچان لیا اور فوراً ہی پچھلے والان کی جانب کھلنے والے دروازے کی جانب آکے اسے آن لیا۔

سلمیٰ گلابی کروشیے سے بھری سیاہ چادر میں سمٹ کے رہ گئی۔ اسے اس وقت ام ہانی کی گھورتی نظریں مہ پارہ کی نظروں سے کم نہیں لگ رہی تھیں۔

”سلمیٰ تم اتنی رات کو باغیچے میں کیا کر رہی تھی۔“

”وہ میں۔ میں ہانی بی بی۔“

”پچھواڑے سے آ رہی ہو؟“

ام ہانی کی نظریں ساتھ ساتھ ادھر ادھر کسی اور کے وجود کو بھی تلاش کر رہی تھیں۔ مگر دور تک صرف پیڑوں کے سیاہ بیولے نظر آ رہے تھے۔

”میں تو۔“

”جھوٹ مت بولو میں نے خود دیکھا ہے۔“

ام ہانی نے ڈپٹ کر کہا تو سلمیٰ بالکل ہی ڈھس گئی۔

اور لگی واسطے دینے۔

”بی بی جی کونہ بتانا ہانی بی بی۔ اللہ پاک کا واسطہ ہے

”پنجتن کا واسطہ۔“

”میں تو نہیں بتا رہی مگر یہ کم بخت تمہاری پانہیں ضرور بتا دیں گی کسی دن ان کو اتار کے دفنان ہوا کرناں۔“

ذرا سی چھوٹ کیا ملی کہ سلمیٰ چادر کا کونہ دانتوں میں دبا کر شرانے لگی۔

”اس کو پسند ہے جی اور اسی کا تحفہ ہے۔ اسے پہنتی ہوں تو جی اٹھتی ہوں۔“

”بہت جی لیا۔ اب یہی پانہیں شور مچا کے تجھے مروائیں گی۔“



”بے کار رہا۔ تم نے ٹھیک کہا تھا۔ تمہارا دل نہیں لگ سکتا یہاں۔“

شعیب مجھے بے زار سا بیڈ پڑا دیکھ کے افسوس سے سر ہلا رہا تھا۔

”بلکہ میں تو کہتا ہوں۔ یہاں کیا۔ کہیں بھی نہیں لگے گا۔ کیونکہ۔“

وہ ذرا سار کا۔ پھر کھوجتی نظروں سے دیکھ کر کہا۔

”کیونکہ دل تم کہیں اور لگا بیٹھے ہو۔“

کسلمندی سے لیٹے میں نے ایک دم آنکھیں کھول کے اسے دیکھا۔ وہ اپنے اندازے کی درستگی پر مسکرا رہا تھا۔

”میں صحیح کہہ رہا ہوں؟“

میری ہلکی سی مسکراہٹ نے اس کے سوال کا جواب دیا وہ مزید بے تکلفی دکھاتا برابر پھیل کے لیٹ گیا۔

”کچھ بتاؤ گے نہیں؟“

”اوں ہوں۔ پہلے اسے تو بتا دوں۔“



ناشتے کی میز پر آلو کی بھجیا اور بل والے پراٹھے رکھتے ہوئے نائلہ کو سعد کی یاد پہلے سے کچھ بڑھ کے آئی۔

”آج تیسرا دن ہے سعد کو گئے۔“

”تین دن اور صبر کے ساتھ گزار لو۔ دیک اینڈ یہ بلو الیتا ہوں۔“ رضوان نے تسلی دی۔

”وہ جی مہمان آگئے ہیں ولایت والے۔“ سلمیٰ کے آکے اطلاع دینے پہ رضوان پہلا نوالہ توڑتے توڑتے رکے اور جلدی سے اٹھے۔

”اوہو۔ نائلہ تم نے مجھے یاد کیوں نہیں دلایا، میں ڈرائیور بھیجنا چاہیے تھا ایر پورٹ۔“

”کچھ زیادہ جلدی نہیں دکھائی امہ ہانی کی خالہ نے؟“

مہ پارہ اندوں کا جلوہ کھاتے ہوئے بھی حلق کی تلخی کو محسوس کر رہی تھیں۔

”بیٹی کا معاملہ ہے۔ جتنی جلدی فرض ادا ہو جائے اتنا اچھا۔“

نائلہ نے رضوان کے پیچھے پیچھے جاتے جاتے کہا۔

اور جلتی بھنتی مہ پارہ نے ہاتھ کا چمچ پیالی میں واپس پٹا۔

”ہاں اب سب کو جلدیاں سوجھ رہی ہیں میرے تو سر کے بال بھی پکا ڈالے۔ ٹھاٹھا کے۔“ اور وہ اپنا موڈ تب بھی ٹھیک نہ رکھ سکی جب جنید بڑے موڈب انداز میں سب کے درمیان بیٹھا ان کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ مگر اس کی آنکھیں مسلسل کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

”تمہارے گھر میں سب خیریت ہے بیٹا۔“ نائلہ کے پوچھنے کے دوران مہ پارہ مسلسل جنید کی نظروں کی بے چینی نوٹ کر رہی تھی۔

”جی سب ٹھیک ہیں مام نے سلام بھجو لیا ہے۔“

”و علیکم اسلام۔ سفر میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟“ رضوان کے سوال کے جواب میں بھی وہ ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

”جی نہیں آرام سے کٹ گیا۔“

”کسے ڈھونڈ رہے ہو؟“ آخر مہ پارہ سے رہا نہ گیا۔

”جی نہیں کسی کو بھی نہیں۔“ بے چارہ بوکھلا کے رہ گیا۔

”آپ کی حویلی بہت خوب صورت ہے۔“

”ام ہانی اسکول سے بس آتی ہی ہوگی۔“ نائلہ نے

”کب کی بات ہے یہ؟“ وہ یونہی پوچھ رہی تھی۔  
بات برائے بات مگر وہ مسکرا اٹھا۔

”آپ میری Age جانتا چاہ رہی ہیں تو ڈائریکٹ پوچھ لیں۔“

”نہیں نہیں۔“ وہ شرمندہ ہوا تھی۔ بلاوجہ ہی۔  
”میں آپ کی Age جان کے کیا کروں گی؟“

”جانتی چاہیے آپ کو میرے بارے میں سب کچھ جانتا چاہیے۔ اسی لیے تو آیا ہوں۔“

اس سے پہلے کہ وہ جنید کی اس بات پہ کچھ غور کرتی اندر سے آتی فون کی مسلسل آواز نے اسے پلٹنے پہ مجبور کیا۔

”ایکسکیوز می۔ میں ذرا فون سن لوں۔“ جنید بھی اس کے پیچھے پیچھے ہال تک آگیا۔  
”ہیلو۔“

دوسری جانب میں تھا جو بے تابی سے پوچھ رہا تھا۔  
”کہاں تھی تم؟ اتنی دیر سے فون اٹھایا؟“

”پہلے تم بتاؤ۔ تم کہاں ہو یہ ٹائم تو تمہاری کلاس کا ہے۔“ ام ہانی نے رعب جھاڑنا چاہا۔ جسے میں ذرا خاطر میں نہ لایا۔

”ہاں۔ لیکن درمیان میں چھوڑ کے آیا ہوں۔ اب تم نہ شروع کرو بنا اپنا لیکچر میں تمہیں مں کر رہا ہوں بہت۔“

”نہ بڑھنے کے بہانے۔“ ام ہانی نے ہنسی روکی۔  
تم نے مجھے یاد کیا؟“ میں بڑی آس سے پوچھ رہا تھا۔

”ہاں۔ دو تین دن تو کافی۔“  
”اور اس کے بعد؟ کافی سے بھی بہت زیادہ؟“

میرے لہجے کی امید اور بڑھی۔  
”نہیں۔ پھر ٹائم ہی نہیں ملا۔ آج صبح جنید آ گئے۔ ان کو کمپنی دے رہی ہوں۔ کل انہیں فارم ہاؤس اور اپنا اسکول بھی دکھانا ہے۔“

”کون جنید؟“ میں چونکا۔  
”کزن ہیں میرے۔“

”وہ تو میں ہوں۔“ میں باقاعدہ برامان گیا۔

مسرا کے وہ جواب دیا۔ جس کا سوال وہ کرنا پارہا تھا۔  
”اسکول؟“ جنید کے استفسار پہ رضوان نے وضاحت کی۔

”سلمان کی وفات کے بعد میں نے اس کے نام سے قصبے میں ایک ٹرسٹ اسکول اور ایک چھوٹا سا ہسپتال بنوایا تھا۔ اپنی ایجوکیشن مکمل کرنے کے بعد ام ہانی ہی اس اسکول کو دیکھ رہی ہے۔“

”اوہ۔۔۔ thats great۔“  
اسی وقت ام ہانی اندر داخل ہوئی۔ اور ٹھٹکتے سنہٹتے سلام کیا۔  
”السلام علیکم۔“

مہربانہ نے جنید کے چہرے پہ وہ پسندیدگی دیکھ لی۔ جو ام ہانی کی پہلی جھٹک کے بعد ہی نمایاں ہو گئی تھی۔ ان کی بے آرائی اور بڑھ گئی۔ وہ پہلو بدلتے لگی۔

”اوہ۔۔۔ کیسے ہیں آپ؟ خالہ کیسی ہیں وہ کیوں نہیں آئیں؟ انہیں بھی ساتھ لے آتے۔“

اس کا جواب جنید کی بجائے ناند نے بڑی ہی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ دیا۔

”آجائیں گی۔ وہ بھی آجائیں گی۔ بہت جلدی ان شاء اللہ۔“



اور میرے دل کا ایک نہیں جیسے ہر کونا خالی ہو رہا تھا۔ بے کلی بڑھتی جا رہی تھی۔ جو نقش میں آنکھوں میں سمو کے لایا تھا۔ پتا نہیں وہ دھندلے کیوں پڑ رہے تھے کیا آنکھوں کی نمی اتنی بڑھ گئی تھی۔



”مجھے اندازہ نہیں تھا یہ جگہ اتنی خوب صورت ہو گی۔“ جنید نے جھروکے سے جھانکتے ہوئے دور تک پھیلے سبزے کا نظارہ کرتے ہوئے کہا۔

”آپ پہلے کبھی پاکستان نہیں آئے؟“  
”آیا تھا۔ دو بار۔ مگر ایک تو اس جگہ کبھی نہیں آیا“  
صرف لاہور اور کراچی گیا۔ دوسرا بہت پرانی بات ہے آخری بار جب آیا تو کوئی بارہ تیرہ سال کا تھا۔“

”بدھو۔ تم اکیلے تھوڑا ہی ہو۔ کوئی اور بھی تو ہو سکتا ہے۔“ اس بات پہ تو جیسے میرا فیوز ہی اڑ گیا۔ میں نے کال فوراً ”کٹ دی۔“

”ارے۔ سعد ہیلو۔“ اور ریسور رکھتی مڑی جنید صوفے پہ بیٹھا کسی میگزین کے ورق الٹ رہا تھا۔

”سوری۔ سعد کی کال تھی۔ کزن سے میرا۔“ وہ تو میں ہوں۔“ جنید نے میگزین رکھتے ہوئے اسے مسکرا کے دیکھا۔

”آپ اکیلے تھوڑا ہی ہیں اور پھر آپ تو صرف کزن ہیں۔ وہ تو اور بھی بہت کچھ ہے میرا سب سے اچھا دوست میرے بچپن کا سا بھی۔ میرے ہر دکھ سکھ کا شریک۔“

”وہ تو میں بھی ہو سکتا ہوں۔“

ام ہانی دوسری بار اس کی بات پر غصی۔ اور ابھی پھر سنجیدگی سے کہنے لگی۔

”نہیں جو سعد ہے وہ کوئی اور نہیں ہو سکتا اس کی جگہ کوئی اور لے ہی نہیں سکتا۔“

فون بند کرنے کے بعد ہی میں سن سا بیٹھا رہا جیسے دماغ میں جھکڑ چل رہے ہوں۔

”بدھو۔ تم اکیلے تھوڑا ہی ہو۔“ میرے ہاتھوں پیروں میں جان ہی نہ رہی۔

”کوئی اور بھی تو ہو سکتا ہے۔“ ام ہانی کی اترا آواز نے ان بے جان ہاتھ پیروں میں جیسے روح پھونک ڈالی۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

”نہیں کوئی اور نہیں ہو سکتا کوئی اور ہو بھی کیسے سکتا ہے۔“

”اور اگلے ہی پل میں بھاگتا ہوا کالج کے گیٹ سے روڈ پہ تھا۔“



ام ہانی جنید کو قصبے کی سیر کرانے لے جا رہی تھی۔

”چتا نہیں آپ کو یہ جگہ پسند بھی آتی ہے یا نہیں۔“

”ابھی تک تو جو دیکھا ہے۔ وہ بہت پسند آیا ہے۔ دل سے۔“

جنید کے الفاظ۔ اس کا لہجہ ہر بار ام ہانی کو الجھا سا جاتا تھا۔ وہ ایک بار پھر الجھن بھری آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی مگر جنید کے چہرے پہ ایک سادہ مہربان سی مسکراہٹ کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

”میرا مطلب ہے یہ حویلی بہت شاندار ہے۔“ دونوں کے قدم بڑے سے لکڑی کے پھاٹک کی جانب بڑھ رہے تھے۔ جنید مڑ مڑ کے پیچھے دیکھ رہا تھا پھر پوچھے بتا رہا نہ سکا۔

”وہ کیلے کے جھنڈ کے پیچھے جو کھنڈر نما عمارت نظر آرہی ہے کیا وہ بھی حویلی کا ہی حصہ ہے؟“

”جی کہہ سکتے ہیں۔“ وہ بھی چلتے چلتے رکی۔

”مگر اب استعمال میں نہیں ہے۔ تقریباً“ پچاس ساٹھ سال سے ”واؤ۔“ پھر تو میں اسے ضرور دیکھنا چاہوں گا۔“ جنید کی فرمائش پہ وہ کچھ تذبذب کا شکار ہو گئی۔

”اسے دیکھ کے آپ کیا کریں گے۔ چند بوسیدہ دیواریں، گرٹی چھتیں اور خود رو گھاس میں جنٹلی پودے۔“

”یہ بتا کے تو آپ نے میرا شوق اور بھی بڑھا دیا ہے۔ ارے کہیں آپ اس پرانی جگہ پہ جاتے ہوئے ڈر تو نہیں رہیں۔“

”جی نہیں۔ میرا تو بچپن اور لڑکھن وہیں کھیلتے گزرا ہے ڈر کیسا وہ جگہ تو میری سہیلی ہے۔“

”میں آپ کی سہیلی سے ملنا چاہوں گا۔ ابھی۔“

جنید اسی جانب بڑھ گیا تو ام ہانی اسے روکتے روکتے ہچکچاسی گئی اور پھر چپ چاپ اس کے پیچھے چل دی۔

کھنڈر ویرانی اور وحشت سے منسوب ہوتا ہے۔ مگر یہ خواب مگر عجب تھا۔ یہاں آتے ہی اندر کی شمالی

دوست بن جاتی تھی اور وحشت نیم خوابیدہ سی ہو جاتی تھی۔ جنید نے بھی وہی سکون محسوس کیا وہاں آ کے۔

پیروں تلے آ کے کسمس کے کراہتے زرد پتے۔ بڑے سے برگد کے پیڑ تلے کچی مٹی پہ چاک سے بنے

امہانی کے پسندیدہ کھیل کا خاکہ۔

پیڑ کے دوسری جانب لٹکتا جھولا۔ جس پہ اب کھمبیاں اگ آئی تھیں۔

آنگن کے وسط میں لال کناروں والا کنواں۔ جس کا ڈول ہوا کے دوش پہ ہلتا ایک کھنک سی پیدا کر رہا تھا۔ جسید بھی مہسوت سا ہو گیا۔

”بیولی فل۔“

”کچھ اور آگے بڑھ کے راہداری کے اکھڑے فرش پر پیر جھاتا جھاتا وہ رکا۔ راہداری کی داہنی دیوار ساری گی ساری مختلف تصویروں سے بھری تھی۔ کہیں قدرتی مناظر کو ابھارا گیا تھا تو کہیں ناشناس نقوش والے چہرے۔

”یہ آرٹ ورک؟“

”میرا شوق ہے۔“ جسید کے پوچھنے پہ بتاتی بتاتی وہ کچھ شرمانی۔

”بہت آرٹسٹک مزاج ہے آپ کا۔“

راہداری پچھلے والان میں نکلتی تھی وہاں پہنچ کر جسید پھر سے رکا۔ اسی بار نظروں میں حیرت اور بھی نمایاں تھی۔ دیواروں پہ دروازوں پہ۔۔۔ ستونوں پہ۔۔۔ جابجا سعد اور امہانی کا نام بمع تاریخ کے لکھا تھا نام وہی تاریخ ہر بار مختلف۔

”اور۔۔۔ یہ؟ یہ کس کا شوق ہے؟“ اب وہ سنجیدہ تھا۔

”یہ سعد کا شوق ہے۔“



میں پہلی بار لوکل بس میں بیٹھا تھا اس سے پہلے صرف راستوں میں آتے جاتے پاس سے گزری ان بڑی بڑی رنگین بسوں کے پیچھے لکھے صرف اشعار ہی بڑھے تھے۔ مگر اب میں دوسرے بہت سے مسافروں کے ساتھ ٹھنسا اس میں بجتے اعلا ذوق کے میوزک سے بھی ہسلانے کی کوشش کر رہا تھا خود کو۔

ہاں، ہسلانے کی کوشش۔ دھیان بار بار امہانی کی ان ہی الفاظ میں اٹک جاتا تھا جو نیزے کی طرح کبے

تھہر رہی تھیں۔

”تم اکیلے تھوڑا ہی ہو۔ کوئی اور بھی تو ہو سکتا ہے۔“

یہ الفاظ۔۔۔ ان کی چھین۔۔۔ ان کی جلن اس چند گھنٹے کے سفر کو بہت طویل۔ بہت ٹھن اور بہت تکلیف دہ بنا رہی تھی۔ پہلے میں نے دھیان بٹانے کے لیے ادھر ادھر جائزہ لینا چاہا۔

سامنے والی سیٹ پہ براجمان سرمسی ٹوپی پر قے والی خاتون۔ جن کی گود میں بڑا سا ٹفن تھا اور ٹفن سے اٹھتی دیکھی گھی کی خوشبو ان کے ساتھ بیٹھی ان کی چودہ پندرہ سال کی بیٹی جس کے نقوش اس کی کم عمری کی چغلی کھا رہے تھے مگر نظروں کی بے باکی۔ میں نے گھبرا کے نگاہیں دوسری جانب کیں۔

ایک نوبیا ہتادھیاتی جوڑا۔ مرد نے شاید شادی کے دن سے لے کر آج تک یہ بوسکی کاشلوار قمیص اور واسکٹ تبدیل نہیں کی تھی۔ پسینے کی بدبو کے بھجکے یہاں تک آ رہے تھے مگر اس کی تاریخی جوڑے تاریخی لب اسٹک اور گولڈن سینڈل والی بیوی اس سے چپکی بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ مسکراتے ہوئے اس کے ماس خورے کے شکار مسوڑھے عجیب کراہیت دلا رہے تھے۔ میں نے گھن کھاتے ہوئے رخ ہی بدل لیا۔

وہاں ایک مولوی صاحب ڈکار پہ ڈکار لیے توند کھجا رہے تھے۔ اور جب ڈکاروں کا سلسلہ تھمتا تو کنڈیکٹر کو یہ بے انگم موسیقی بند کرنے کی نصیحت کرتے۔ میں نے آخر اس موسیقی میں ہی پناہ لینی چاہی بصارت کا امتحان بہت لے لیا تھا۔ شاید سماعتیں ہی اس سفر کی دشواریوں کو سہل بنا دیتیں۔

”تیرے جیامینوں ہو رہ نہ کوئی۔“

ڈھونڈاں جنگل، بیلہ، روہی۔

چھمتی مڑیں دے طبیب۔

ننکس تے میں مرگئی آں۔

مجھے سچ میں سکون سا آنے لگا۔ آنکھیں موند کے میں کچی پکی سڑک کی وجہ سے ملنے والے ہچکولوں کے مزے لینے لگا۔

سانوں گھاٹل کر کے خیر خبر نہ لئی آں۔

چھٹی مڑیں دے طبیباً۔

نہیں تے میں مر گئی آں۔

اچانک بس ایک جھٹکے سے رکی۔ میری سماعتیں  
اب عجیب سے شور سے جھنجھلا اٹھیں۔ کوفت سے  
آنکھیں کھولیں تو بس ایک ویران اجاڑ سڑک پہ رکی  
کھڑی تھی۔

”اوئے انتھیر تیرے سوہرے نیں؟“ ایک اکھڑ  
سے شخص نے کنڈیکٹر سے استفسار کیا۔

”بس خراب ہو گئی ہے جی۔ ٹیم لگے گا۔“

میری بے چینی بے کلی پھر سے عود کر آئی۔  
دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح میں بھی بس سے  
نیچے اترا۔ پیروں کے نیچے سنگلاخ زمین شاید اتنی  
نہیں تپ رہی تھی۔ جتنا سنک میرے دل سے اٹھ رہا  
تھا۔ تپتے تپتے وجود نے مجھے ایک پل وہاں نہ کھڑا  
ہونے دیا اور میں پیدل چل پڑا۔ جیسے بانی کا دیرھ گھنٹے کا  
سفر انہی قدموں پہ تو کروں گا۔

تیرے عشق نچایا۔

کر تھیا تھیا تھیا۔

تیرے عشق نچایا۔

پندرہ بیس منٹ شاید پندرہ صدیوں پہ محیط ہو گئے  
تھے۔

”کوئی اور۔ کوئی اور۔ کوئی اور بھی ہو سکتا ہے۔“

یہ کوڑے مجھے ننگے بدن پہ پڑتے اور چابک کھائے  
گھوڑے کی طرح میں سرپٹ بھاگنے لگتا۔

اور پھر سامنے سے آتے ٹرالر کو دیکھ کے میں نے  
یو نہی لفٹ کا اشارہ بھی کر دیا۔ نہیں۔ میں تھکا نہیں  
تھا اس وقت تھکن کا احساس ہو بھی نہیں سکتا تھا۔  
مگر میں جلد از جلد وہاں پہنچنا چاہتا تھا۔ خلاف امید  
چارے سے بھرے اس ٹرالر میں بھی جگہ دے دی گئی  
اب میں ایک گھنٹے تک وہاں پہنچ سکتا تھا۔



”اچھے دوستوں میں۔ اور پھر بچپن کے دوستوں

میں جھگڑے تو ہوتے ہی ہیں۔“

وہ دیوار پہ لکھے اپنے اور اس کے نام پر محبت سے  
ہاتھ پھیرتی جنید کو بتا رہی تھی۔

”ہم بھی خوب لڑتے ہیں اور پھر مان جاتے ہیں۔ پھر  
جھگڑے کے بعد ہونے والی صلح پہ سعد اپنا اور میرا نام  
یہاں لکھتا ہے اور تاریخ بھی۔“

بتاتے بتاتے وہ مڑی اور من پڑی۔

”دھو۔“

”لگتا ہے جیسے آپ دونوں زیادہ تر جھگڑتے ہی  
رہتے ہیں۔ سب دیواریں بھر چکی ہیں یعنی ہر بار نئے  
سرے سے ہونے والی دوستی کی روایت ہے یہ۔“

”یہی سمجھ لیں۔“

”تو ایک نئی دوستی کی شروعات بھی اسی روایت سے  
ہونی چاہیے۔“

یہ کہتے ہوئے وہ زمین پہ کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔ ام ہانی  
اس کی بات کا مطلب تو نہ سمجھی مگر جب اسے زمین  
سے ایک چاک کا ٹکڑا اٹھا کے سیدھا ہوتے دیکھا تو  
چونک گئی۔

”ہوں۔ تو آج ڈیٹ کیا ہے؟“

وہ چاک کا ٹکڑا ہاتھ میں لیے دیوار پہ خالی جگہ تلاش  
رہا تھا۔

”نہیں۔ پلیز۔ جنید۔“ وہ گھبرا گئی مگر جنید نظر  
انداز کرتا ایک کونے میں اپنا نام لکھنے لگا۔

”جنید۔“ وہ احتجاجاً پلا اٹھی۔

”جھگڑا نہیں ہوا تو کیا ہوا۔ مگر دوستی تو ہوئی ہے  
آج۔“

”ہاں۔ وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر آپ پلیز آپ  
یہاں۔“ وہ گھبراہٹ کے عالم میں اب اسے اپنا نام  
لکھتے دیکھ رہی تھی۔ اس کے نام کے بالکل ساتھ۔

”چلیں دیکھتے ہیں ہم اپنا نام یہاں کتنی بار لکھیں  
گے۔ Hopefully زیادہ بار نہیں کیونکہ ہم بہت کم  
لڑیں گے۔“

”آپ سمجھتے کیوں نہیں۔ یہ جگہ۔“ وہ رو ہانسی  
سی ہو گئی۔

”چلیں۔ اب آپ کا اسکول دیکھ لیں۔“

جیب سے رومال نکال کے ہاتھ صاف کرتا وہ آگے چل پڑا۔ ام ہانی نے چلتے چلتے مڑ کے بے بسی سے اپنے اور جنید کے نام کو دیوار پر لکھا دیکھا۔ اسے یکایک ہی جنید کا ساتھ چھینے سا لگا۔ فضول آدمی بلا وجہ کی بے تکلفی۔



”سلمیٰ۔ سلمیٰ۔ سلمیٰ۔ او سلمیٰ۔ منحوس۔“

مہ پارہ سلمیٰ کو پوری حویلی میں پکارتی پھر رہی تھی۔ نائلہ نے دیکھ کر بتایا۔

”وہ تو صبح کی نکلی تھی حکیم سے دوالا نے کا کہہ کر ابھی تک نہیں لوٹی۔“

”کس بات کی روا ہے ہنسی کئی تو ہے اور کون سے کوفہ قاف کے حکیم سے دوالے لگتی ہے جو شام کر ڈالی آپ نے بھی ناں بھا بھی۔ حد سے زیادہ جھوٹ دے رکھی ہے ملازموں کو۔ آپ سمجھتی کیوں نہیں۔ منہ زور جوانی ہے اور اس ملازم پیشہ طبقے پہ تو جوانی دے بھی اندھی بہری ہو کے آتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں آپ ہاتھ ملتی رہ جائیں۔“

مہ پارہ پھر شروع ہو جاتی تو کون چپ کرا سکتا تھا۔ نائلہ نے وہاں سے کھسک لینے میں ہی عافیت جانی۔

”توبہ ہے مہ پارہ۔ تمہیں تو موقع چاہیے۔“  
”ہونہ۔ رنگ ڈھنگ ہی بدل گئے ہیں اب تو حویلی کے۔“ مہ پارہ ناگواری سے بھا بھی کو جا تا دیکھ کے بربر مانے لگی۔

”کہاں تو منڈیر یہ دوپٹا تک دھوکے نہیں ڈالا جاتا تھا کہ آتے جاتے کی نظر ہو بیٹی کے آنچل پہ نہ بڑے اور اب۔۔ دیکھو تو ام ہانی کو صبح سے اس غیر مرد کے ساتھ سیر پائے کرنے کے لیے چھوڑا ہوا ہے۔“

توپا سے مل کے آتی ہے

بس آج سے نیند پرانی ہے

یا کل میں گیت ہیں چھم چھم کے

نسلمیٰ گنگنائی۔۔ بکے قدموں کے ساتھ ڈولتی

پھانک سے داخل ہو رہی تھی۔

”تولا کھ چلے ری گوری۔“

اور مجھے ایک دم سے اپنے سامنے دیکھ کے اس کی گنگناہٹ سم گئی۔

”تھم۔۔ تھم۔۔ کے۔“

”سنو ہنی سکول سے آگئی؟“ میں نے چھوٹے ہی سوال کیا۔

”وہ تو جی۔ گئی ہی نہیں۔“ حواسوں میں آتے ہوئے سلمیٰ نے ذرا غور سے میرا جائزہ لیا۔ شاید وہ میرے بالوں میں پھنسے۔ اور کپڑوں پہ لگے گھاس پھوس کو دیکھ کے حیران ہو رہی تھی۔

”اندر ہے؟“

مجھے تسلی ہوئی۔ میں بھی تو ابھی ابھی آیا تھا۔ اندر نہیں گیا تھا۔

”چائیں۔ میں صبح جب نکلی تھی حویلی سے تو وہ وہاں پیچھے کھنڈر لے کر جا رہی تھیں ولایت والے مہمان کو۔“

”کیا؟“

مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میری سلطنت پہ شب خون مارا ہو۔ چند منٹ پہلے بھاگتا ہوا ہی اندر داخل ہوا تھا۔ پھر سے بھاگتے ہوئے اپنے خواب نگر کی طرف جانے لگا۔ لیکن میں بھاگا نہیں تھا۔ میں تو گویا اڑ کے وہاں پہنچا تھا۔ ہانپتے ہوئے میں نے اسے تلاش کرنے کے لیے نظر دوڑائی۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ نہ اور۔ مگر کچھ تھا کچھ غیر معمولی کچھ انجانا سا جو مجھے کھٹک رہا تھا میں اس کی کھوج لگائے بنا یہاں سے واپس کیسے جا سکتا تھا اور پھر میری نظروں نے اس انجان چیز کو دریافت کر لیا۔ اور سامنے کی دیوار پہ لکھا ام ہانی کا نام تھا۔ لیکن غیر معمولی اور چونکا نے والی بات یہ تھی کہ وہ میری لکھائی میں نہیں تھا اس سے بھی برہ کے جھنجھوڑنے والی بات یہ تھی کہ اس نام کے ساتھ اس بار سحر رضوان نہیں بلکہ کسی جنید کا نام لکھا تھا۔

”تم اکیلے تو نہیں ہو۔ کوئی اور بھی تو ہو سکتا ہے؟“

مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میری سلطنت پہ شب خون مارا ہو۔ چند منٹ پہلے بھاگتا ہوا ہی اندر داخل ہوا تھا۔ پھر سے بھاگتے ہوئے اپنے خواب نگر کی طرف جانے لگا۔ لیکن میں بھاگا نہیں تھا۔ میں تو گویا اڑ کے وہاں پہنچا تھا۔ ہانپتے ہوئے میں نے اسے تلاش کرنے کے لیے نظر دوڑائی۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ نہ اور۔ مگر کچھ تھا کچھ غیر معمولی کچھ انجانا سا جو مجھے کھٹک رہا تھا میں اس کی کھوج لگائے بنا یہاں سے واپس کیسے جا سکتا تھا اور پھر میری نظروں نے اس انجان چیز کو دریافت کر لیا۔ اور سامنے کی دیوار پہ لکھا ام ہانی کا نام تھا۔ لیکن غیر معمولی اور چونکا نے والی بات یہ تھی کہ وہ میری لکھائی میں نہیں تھا اس سے بھی برہ کے جھنجھوڑنے والی بات یہ تھی کہ اس نام کے ساتھ اس بار سحر رضوان نہیں بلکہ کسی جنید کا نام لکھا تھا۔

”تم اکیلے تو نہیں ہو۔ کوئی اور بھی تو ہو سکتا ہے؟“

مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میری سلطنت پہ شب خون مارا ہو۔ چند منٹ پہلے بھاگتا ہوا ہی اندر داخل ہوا تھا۔ پھر سے بھاگتے ہوئے اپنے خواب نگر کی طرف جانے لگا۔ لیکن میں بھاگا نہیں تھا۔ میں تو گویا اڑ کے وہاں پہنچا تھا۔ ہانپتے ہوئے میں نے اسے تلاش کرنے کے لیے نظر دوڑائی۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ نہ اور۔ مگر کچھ تھا کچھ غیر معمولی کچھ انجانا سا جو مجھے کھٹک رہا تھا میں اس کی کھوج لگائے بنا یہاں سے واپس کیسے جا سکتا تھا اور پھر میری نظروں نے اس انجان چیز کو دریافت کر لیا۔ اور سامنے کی دیوار پہ لکھا ام ہانی کا نام تھا۔ لیکن غیر معمولی اور چونکا نے والی بات یہ تھی کہ وہ میری لکھائی میں نہیں تھا اس سے بھی برہ کے جھنجھوڑنے والی بات یہ تھی کہ اس نام کے ساتھ اس بار سحر رضوان نہیں بلکہ کسی جنید کا نام لکھا تھا۔

”تم اکیلے تو نہیں ہو۔ کوئی اور بھی تو ہو سکتا ہے؟“

مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میری سلطنت پہ شب خون مارا ہو۔ چند منٹ پہلے بھاگتا ہوا ہی اندر داخل ہوا تھا۔ پھر سے بھاگتے ہوئے اپنے خواب نگر کی طرف جانے لگا۔ لیکن میں بھاگا نہیں تھا۔ میں تو گویا اڑ کے وہاں پہنچا تھا۔ ہانپتے ہوئے میں نے اسے تلاش کرنے کے لیے نظر دوڑائی۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ نہ اور۔ مگر کچھ تھا کچھ غیر معمولی کچھ انجانا سا جو مجھے کھٹک رہا تھا میں اس کی کھوج لگائے بنا یہاں سے واپس کیسے جا سکتا تھا اور پھر میری نظروں نے اس انجان چیز کو دریافت کر لیا۔ اور سامنے کی دیوار پہ لکھا ام ہانی کا نام تھا۔ لیکن غیر معمولی اور چونکا نے والی بات یہ تھی کہ وہ میری لکھائی میں نہیں تھا اس سے بھی برہ کے جھنجھوڑنے والی بات یہ تھی کہ اس نام کے ساتھ اس بار سحر رضوان نہیں بلکہ کسی جنید کا نام لکھا تھا۔

”تم اکیلے تو نہیں ہو۔ کوئی اور بھی تو ہو سکتا ہے؟“

مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میری سلطنت پہ شب خون مارا ہو۔ چند منٹ پہلے بھاگتا ہوا ہی اندر داخل ہوا تھا۔ پھر سے بھاگتے ہوئے اپنے خواب نگر کی طرف جانے لگا۔ لیکن میں بھاگا نہیں تھا۔ میں تو گویا اڑ کے وہاں پہنچا تھا۔ ہانپتے ہوئے میں نے اسے تلاش کرنے کے لیے نظر دوڑائی۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ نہ اور۔ مگر کچھ تھا کچھ غیر معمولی کچھ انجانا سا جو مجھے کھٹک رہا تھا میں اس کی کھوج لگائے بنا یہاں سے واپس کیسے جا سکتا تھا اور پھر میری نظروں نے اس انجان چیز کو دریافت کر لیا۔ اور سامنے کی دیوار پہ لکھا ام ہانی کا نام تھا۔ لیکن غیر معمولی اور چونکا نے والی بات یہ تھی کہ وہ میری لکھائی میں نہیں تھا اس سے بھی برہ کے جھنجھوڑنے والی بات یہ تھی کہ اس نام کے ساتھ اس بار سحر رضوان نہیں بلکہ کسی جنید کا نام لکھا تھا۔

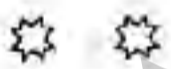
”تم اکیلے تو نہیں ہو۔ کوئی اور بھی تو ہو سکتا ہے؟“

مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میری سلطنت پہ شب خون مارا ہو۔ چند منٹ پہلے بھاگتا ہوا ہی اندر داخل ہوا تھا۔ پھر سے بھاگتے ہوئے اپنے خواب نگر کی طرف جانے لگا۔ لیکن میں بھاگا نہیں تھا۔ میں تو گویا اڑ کے وہاں پہنچا تھا۔ ہانپتے ہوئے میں نے اسے تلاش کرنے کے لیے نظر دوڑائی۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ نہ اور۔ مگر کچھ تھا کچھ غیر معمولی کچھ انجانا سا جو مجھے کھٹک رہا تھا میں اس کی کھوج لگائے بنا یہاں سے واپس کیسے جا سکتا تھا اور پھر میری نظروں نے اس انجان چیز کو دریافت کر لیا۔ اور سامنے کی دیوار پہ لکھا ام ہانی کا نام تھا۔ لیکن غیر معمولی اور چونکا نے والی بات یہ تھی کہ وہ میری لکھائی میں نہیں تھا اس سے بھی برہ کے جھنجھوڑنے والی بات یہ تھی کہ اس نام کے ساتھ اس بار سحر رضوان نہیں بلکہ کسی جنید کا نام لکھا تھا۔

تھا۔ مگر میں ذرا توجہ نہیں دے رہا تھا اس پر۔ اور نہ ہی ام ہانی۔ وہ تشویش سے میری جانب بڑھ رہی تھی۔  
 ”کیا ہوا سعد؟ تم ٹھیک ہو؟ یوں بنا ہتائے اچانک؟“

اسے میرے اچانک آنے پر تشویش تھی۔ میری نظروں کے گلے شکوے اسے سمجھ نہیں آرہے تھے۔ میں اور تب گیا ایک سلگتی ہوئی نظر میں نے جنید پر ڈالی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے جانے لگا۔ وہ مجھے پکارتی پیچھے تک آئی تھی۔  
 ”سعد۔ سنو تو کیا ہوا؟“

”کیا ہوا؟“ یہ پوچھنے کی ضرورت باقی تھی اب۔ میں تقریباً ”بھاگتا ہوا“ اپنے کمرے کی جانب جا رہا تھا۔ پھر میں نے دروازہ لاک کر دیا۔ کیوں بتاتا میں اسے کہ کیا ہوا؟ خود جانے۔ خود سمجھے۔ ناراض ناراض سا اب میں دروازے کو دیکھتا جا رہا تھا۔  
 اب ہوگی دستک۔  
 ابھی ہوگی۔  
 بس۔۔۔ آئی ہوگی وہ۔



(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)



قیمت - 300/- روپے

منگوانی کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر:  
32735021

37، اردو بازار، کراچی

ایک نشتر سا چلا تھا میرے دل پر۔ اس چھوٹے سے اسکول میں چار کمرے تھے اور کوئی جماعت ایسی نہ تھی جس کے درو دیوار اس کے ہاتھ کی بنی تصویروں سے محروم ہوں۔  
 ”یہاں کے غریب بچوں کو تعلیم دے کر مجھے سکون ملتا ہے۔ بڑے دادا نے ابو کی یاد میں یہ ٹرسٹ اسکول بنا کے ان کی روح کو بھی وہی سکون دیا ہے۔“

”تم اتنی ٹیلنٹڈ لڑکی ہو۔ بہت کچھ کر سکتی تھیں اور بہت کچھ کر سکتی ہو۔“ جنید سچ سچ متاثر نظر آ رہا تھا۔  
 ”تمہیں نہیں لگتا کہ یہاں کے ڈگری کالج سے سیمپل سانی اے کرنے کے بعد تم اس اسکول میں خود کو ضائع کر رہی ہو۔“ ام ہانی نے مسکرا کے اسے دیکھا۔  
 ”اگر دل کا سکون خود کو ضائع کر کے ملتا ہے تو میں خود کو بار بار ضائع کرنا چاہوں گی۔“ اب جنید کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔

”شام ہو گئی چلتے ہیں اب۔“ وہ گھڑی پر وقت دیکھتے ہوئے تشویش سے کہنے لگی۔  
 ”یہاں کا Sun set دیکھنے کا بھی اپنا ہی چارم ہو گا۔ نہر کے پاس بیٹھ کے سورج کو غروب ہوتے دیکھتے ہیں۔“

”نہیں۔۔۔ شام سے پہلے پہلے ہر حال میں واپس جانا ہو گا ورنہ پھوپھو۔“

جماعت کے دروازے پر مجھے کھڑا دیکھ کے وہ بات کرنا بھول گئی۔ میرا آنا تو غیر متوقع تھا ہی۔ مگر شاید میری حالت نے اس کو زیادہ چونکایا تھا۔

اس اہتر سفر کے اہتر ترین حالات، میرے حلیے اور لباس سے ظاہر ہو رہے تھے۔ میلی شرٹ، بکھرے بال، تھکن پسینہ لیکن اس کے علاوہ میرے چہرے پر میری آنکھوں میں جو بہت سے شکوے رقم تھے۔ وہ اسے زیادہ ہراساں کر رہے تھے۔

”سعد۔“

اس نے پکارا۔ مگر میرے اندر اس پکار نے بھی آج شکوے نہیں کھلائے۔ میری نظریں یوں نہی شرر برساتی رہیں۔ جنید مجھے سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہا

# عشاء مسکرات کی

مظلوم بننا چاہتے ہیں کہ اتنی ظالم بیوی ملی ہے۔ جو چائے بھی نہیں دیتی۔  
”تو نہیں دیتی نا۔“ وہ کہہ کر آرام سے صوفے پر بیٹھ گئے اور ریموٹ اٹھا کر اپنا پسندیدہ چینل لگا لیا۔  
”حد ہوتی ہے سرور صاحب مبالغہ آرائی کی۔“ وہ پیر پختی ہوئیں باہر نکل گئیں جبکہ وہ مسکراتی وی دیکھنے لگے۔



وہ اسکول سے آئی تو اس کا موڈ سخت آف تھا۔ وہ کچن میں کام کرتیں ناصرہ کو سلام کر کے کمرے میں آگئی۔ اس نے بیگ پختی کے انداز میں بیڈ پر پھینکا اور بیڈ پر بیٹھ کر جوتے اتار کر ایک دائیں اور دو سرابائیں پھینکا۔ تب ہی باتھ روم کا دروازہ کھول کر نازباہر نکلی اور اس نے حیران ہو کر اپنے قدموں میں بڑے جوتے کو دیکھا اور دوسری نظر اپنی منہ پھلائے بیٹھی بہن پر ڈالی۔

”یہ کیا طریقہ ہے علیہ۔“ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یوں ہی سر جھکائے پیر جھلائی رہی۔  
”سمیٹو ساری چیزیں جو پھیلائی ہیں سنا نہیں تم نے۔“ اسے یوں ہی بیٹھا دیکھ کر وہ زور سے بولی تو علیہ کو اٹھنا پڑا۔ جتنی دیر میں اس نے اپنا پھیلا یا پھیلاوا سمیٹا تب تک نازوہیں کھڑی رہی۔  
”منہ کیوں بنا ہوا ہے تمہارا۔“ اب اس نے علیہ کے قریب جا کر پوچھا۔

کھانا کھانے کے بعد وہ چائے کی طلب کے باوجود بڑے ضبط سے اسکرین کو دیکھنے پر مجبور تھے ڈراما ختم ہوا تو انہوں نے بے ساختہ گہری سانس لی۔  
”ایک کپ چائے مل سکتی ہے بیگم۔“ شمیم نے غصے سے ان کی طرف دیکھا۔  
”ایک تو ہر پندرہ منٹ بعد آپ کو چائے کی طلب جاگ اٹھتی ہے۔ مجھ سے بار بار نہیں اٹھا جاتا۔“  
”بیگم مبالغے کی بھی حد ہوتی ہے یورے تین گھنٹے

## مکمل ناول

پہلے ایک کپ پیا تھا اور ایک کپ سے کیا بنتا ہے۔  
”تو آپ کے لیے چائے کی دیگ چڑھا دیتی ہوں۔“  
”نوازش ہوگی تمہاری۔“ ان کے طنزیہ انداز پر وہ شرارتی انداز میں گویا ہوئے۔  
”گیس نہیں آرہی سلنڈر استعمال ہوتا ہے گیس ختم ہوگی تو آپ نے ہی باتیں کرنی ہیں۔“  
”اتنی بحث سے بہتر ہے میں عظیم یاراشد کی طرف چلا جاؤں وہاں کم از کم چائے کے ساتھ اور بھی کچھ کھانے کو مل جائے گا۔“ کہہ کر وہ کھڑے ہو گئے اور ان کا یہ حربہ کامیاب بھی رہا وہ ایک دم اچھل کر صوفے سے اٹھی تھیں۔  
”ہاں۔ ہاں آپ تو چاہتے ہی یہ ہی ہیں کہ سب مجھے برا سمجھیں۔ اپنے بھائی بھابھوں کے سامنے

ہے کہ میں ہمیشہ اپنا ہوم ورک مکمل کرتی ہوں، لیکن پھر بھی انہوں نے مجھے روم سے باہر نکال دیا۔ اتنی انسٹ ہوئی میری۔" یہ کہتے ہوئے وہ رو پڑی تھی۔ تو تازے اسے ساتھ لگا لیا۔

"ہو جاتا ہے علیحدہ کبھی کبھی ایسا ہو سکتا ہے تم بائے مسٹیک گھر بھول گئی ہو۔"

"میں بھول جاتی تو تھیک تھا باجی، پر میری کاپی کاشفہ نے نکال لی تھی اور جب پریڈ ختم ہو گیا تو کاپی لا کر

"ہو لو علیحدہ" اب کی بار اس نے اس کا چہرہ تھام کر پیار سے پوچھا۔

"یہ سچر نے آج مجھے ہنسن کیا۔"

"کیوں؟" تاز نے حیرت سے پوچھا، کیونکہ وہ کافی محنتی اور لائق اسٹوڈنٹ تھی۔

"ہوم ورک چیک کروانا تھا۔ میرا ہوم ورک

کمپلیٹ تھا۔ کاپی میں نے خود کل بیگ میں رکھی تھی۔ سچر کو دینے لگی تو کاپی غائب تھی۔ سچر کو بتا بھی



FLOWER

میرے ذہن پر رلھ دی۔  
 "کاشفہ نے ایسا کیوں کیا۔" ناز کو کافی حیرانگی ہوئی تھی۔

"وہ پہلے بھی کئی بار ایسا کر چکی ہے، جس کی وجہ سے نیچر نے میری انسٹ کی ہے۔"

"میں پوچھوگی کاشفہ سے۔" ناز کو برا لگا تھا۔  
 "کوئی فائدہ نہیں اس ڈھیٹ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔" علیہ نے آنسو صاف کرتے ہوئے تپ کر کہا۔

"ہوں۔ دیکھتے ہیں فی الحال تم اپنا موڈ ٹھیک کرو اور لھٹا لھاؤ۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"بھوک کیوں نہیں ہے مجھے پتا ہے تم نے اسکول میں کچھ بھی نہیں کھایا ہوگا۔ چلو شاباش پھینچ کر کے جلدی سے باہر آؤ۔"

وہ کھانا کھا رہے تھے جب صہیب سلام کر کے اندر داخل ہوا تھا۔

"آؤ آؤ بڑی مین! آج تمہیں کہاں سے ہماری یاد آگئی۔" ناز اس کو دیکھ کر بے ساختہ انداز میں بولی تو وہ مسکراتا ہوا کرسی گھسیٹ کر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔  
 "یاد تو روز آتی ہے ابھی آپ نے خود ہی تو کہہ دیا مصروف آدمی ہوں۔"

"اچھا تو کیا مصروفیات ہیں جناب کی۔" ناز نے ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ نکا کر بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

"وہ سیکرٹ ہے جو میں ہر کسی کے سامنے نہیں بتا سکتا۔" اس نے شرارت سے علیہ کی طرف دیکھ کر کہا، جو بے زار سا چہرہ لیے پلیٹ پر جھکی تھی۔ کوئی ری ایکشن آتا نہ دیکھ کر اس نے ابرو اچکا کر ناز کو دیکھا۔  
 "کیا بات ہے، آج مس مربی بڑی خاموش ہیں۔" ساتھ ہی اسے بھی چھیڑ ڈالا۔

"کیوں چوبیا نہیں کیا ہوا ہے۔" صہیب اس کی بونی کھینچ کر بولا۔ تو وہ غصے و ناراضی سے ناز کو دیکھنے لگی۔

"باجی آپ صہیب بھائی کو منع کر دیں، انہیں

میں سمجھ سے میٹر سے بات کیا کریں۔"  
 "اومائی گاڈ!" اس کے انداز پر صہیب قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

"تمہیں سے بات کیا کروں ملکہ عالیہ آپ سے۔ اچھا کوئی اور حکم۔" علیہ غصے سے کوئی جواب نہیں دے چک تھی رہی۔

"لگتا ہے اسکول میں مار پڑی ہے، اسی لیے ملکہ عالیہ کے مزاج خراب ہیں۔" اور وہ جو کب سے بڑے ضبط سے بیٹھی تھی پھٹ پڑی۔

"آپ کی دوست نے اپنا کارنامہ آپ کو سنا دیا ہوگا۔ اسی لیے آپ یہاں تماشا دیکھنے آئے ہیں، مجھے زہر لگتی ہے وہ بھی اور آپ بھی۔"

"علیہ۔" ناز نے تنبیہ انداز میں اس کا نام لیا۔ "کیسے بات کر رہی ہو تم بڑا بھائی سے تمہارا۔"

"میرا کوئی بھائی نہیں، کم از کم یہ تو بالکل بھی نہیں، یہ کاشفہ کے چچے ہیں۔" اس کے چچے کہنے پر بڑے غور سے اس کو دیکھا صہیب ایک بار پھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تو وہ خود کو یہی مزید نارچر ہوتا دیکھ کر اپنے کمرے کی طرف بھاگی تھی۔

"صہیب پلیز! تم مائنڈ نہ کرنا آج علیہ کا موڈ ٹھیک نہیں۔"

"پہلے بھی کب ٹھیک ہوتا ہے۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"خیر میں نے مائنڈ نہیں کیا، میں بھی تو اسے تنگ کرتا ہوں۔"

"تو کیوں تنگ کرتے ہو، پتا ہے نا اس میں برواشت کا مادہ کم ہے۔"

پتا ہے اسی لیے تو کرتا ہوں۔ مزا آتا ہے جب وہ چڑتی ہے۔ اب آپ کو تو تنگ کرنے سے رہا۔"  
 "کیوں۔ مجھے کیوں تنگ نہیں کر سکتے۔"

"کیونکہ آپ مذاق کو انجوائے کرتی ہیں۔ اپنی سڑیل بہن کی طرح نہیں ہیں آپ۔"

"اچھا میری اتنی سویٹ بہن کو سڑیل تو مت کہو نا۔"

"اب میں اتنا بھی اچھا نہیں کہ سڑیل کو سویٹ کہہ

”دول۔“

”یکو مت۔“ ناز نے زور سے اس کے شانے پر ایک تھپڑ لگایا تھا۔

”آجھا۔ اب جو بھی پکا ہے ذرا جلدی سے لے آئیں، مجھے بہت بھوک لگی ہے۔“

”لگتا ہے آج تائی جی نے کوئی سبزی پکائی ہے۔“ ناز مسکراتے ہوئے بولی۔

”سبزی نہیں، سبزیاں۔ پتا بھی ہے مجھے سبزیوں کا تعین پسند نہیں، پھر بھی بنا لیتی ہیں۔“ اس نے براسا منہ بنایا۔ ناز نے بریانی کی پلیٹ رائتہ کے ساتھ اس کے سامنے رکھی تو وہ بے ساختہ خوش ہو گیا۔

”جیتی رہو میری آپلی!“ وہ تیزی سے کھانے لگا تھا۔

”آرام سے کھاؤ کھانا کبیس بھاگا نہیں جا رہا۔“

”کھانا تو نہیں بھاگ رہا، پر مجھے دیر ہو رہی ہے، میرے فرینڈز میرا انتظار کر رہے ہیں۔“

”صہیب اب تم کالج میں ہو، انجینئرنگ تمہارا سبجیکٹ ہے اور تم اپنی اسٹڈی کو اتنا لائٹ لیتے ہو پتا ہے تائی جی بھی تمہاری طرف سے اتنا پریشان رہتی ہیں۔“

”او فوہ مما کو تو عادت ہے چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان ہونے کی۔ اگر میں تھوڑا سا وقت اپنے دوستوں کے ساتھ گزار لیتا ہوں تو اس میں حرج کیا ہے۔“

”تھوڑا۔“ ناز نے آنکھیں پھیلانیں۔ ”سارا سارا دن گھر سے غائب رہتے ہو۔“

”آپلی پلین۔ اب آپ مت شروع ہو جائیں، گھر میں بھی سارا دن یہی سنتا رہتا ہوں۔“

”ہاں تو ٹھیک ہے نا، تم اپنے پیرٹس کے اکلوتے بیٹے ہو ان کی ساری امیدیں تم سے ہیں۔“

”ایک تو یہ اکلوتے ہوئے کے بڑے نقصان ہیں۔“ وہ منہ بنا کر بولا۔

”اور فائدوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔“ ناز نے ابرو اچکا کر پوچھا۔

”وہ تو میرا حق ہے۔“ وہ بریانی کا بڑا سا چمچ منہ میں

ڈالتے ہوئے بولا۔

”ماں، باپ کا بھی پورا حق ہے تم پر۔“

”پتا ہے مجھے پر وہ شکایت مجھ سے تب کریں جب میرے مار کس ٹھیک نہ آئیں اور اتنی زبردست بریائی کے لیے بہت شکریہ، بہن ہو تو آپ کے جیسی ہو، ورنہ نہ ہو۔“ اس کے انداز پر ناز مسکرا دی تھی۔ ”آپ کو کچھ چاہیے ہو تو بتادیں، آتے ہوئے لیتا آؤں گا۔“ وہ اپنا موبائل چیک کرتے ہوئے بولا۔

”ہاں آتے ہوئے ہیڈ لیتے آنا، علیحدہ کو پسند ہے اس کا موڈ ٹھیک ہو جائے گا۔“

”آپ کو سب کے موڈ کا خیال رہتا ہے۔ تھوڑا اس بندریا کو سکھا دیں۔“

”صہیب تم میری بہن کا نام مت بگاڑا کرو۔“ ناز نے مصنوعی خفگی سے اسے ٹوکا۔

”اوہ سوری! میں تو بھول گیا، اس کا نام چوہیا ہے۔“

کہہ کر وہ رکا نہیں تھا، جبکہ ناز اپنی مسکراہٹ نہیں روک سکی تھی۔ ☆ ☆ ☆

”علینہ میرے ساتھ چلو گی۔“ ناز کی آواز پر ڈرائنگ کرتا اس کا ہاتھ رک گیا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دروازے پر کھڑی ناز کو دیکھا، جس کے ہاتھ میں ٹرے تھے۔

”کہاں جانا ہے آپلی۔“ وہ اٹھ کر اس کے قریب آگئی اور رومال اٹھا کر دیکھا۔ ”گاجر کا حلوہ“ وہ ندیدے پن سے بولی۔

”تایا جی کی طرف جانا ہے۔“ علیحدہ نے برا سامنے بنایا۔

”مجھے نہیں جانا، میں کاشفہ کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔“

”بری بات علیحدہ! ایسا نہیں بولتے، وہ کزن ہے ہماری اور کزن ایک دوسرے سے مذاق کرتے رہتے ہیں۔“

”باجی مذاق اور انسٹلٹ میں فرق ہوتا ہے، وہ اور صہیب بھائی کوئی موقع نہیں جانے دیتے، جس سے وہ میرا مذاق نہ اڑا سکیں۔“

”مجھے ان کے پیار سے نام دیتا ہے نا۔“  
”مجھے ان کے پیار کی ضرورت نہیں۔“ وہ نروٹھے

انداز میں بولی۔

”او کے میں صہیب کو منع کروں گی۔“

”اور کاشفہ کو بھی منع کریں، نہیں تو میری دین اور اسکول بدل دیں۔“ ناز نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا اور سر ہلا کر بولی۔

”چلو ابھی تو چلو۔“ وہ سر ہلا کر ساتھ چل پڑی۔

”جیتی رہو بیٹی، دل خوش کر دیا، مزا آگیا۔“ سرور صاحب کے جھوم کر تعریف کرنے پر شمیم نے ٹیڑھی نظروں سے انہیں دیکھا۔ لیکن وہ تو پوری طرح اپنی جھنجھوں کی کمپنی انجوائے کر رہے تھے۔ ”حلوے سمیت“

”سرور صاحب، ایسی باتیں کرتے ہیں جیسے گھر میں تو کبھی ان کو کھانے کو ملا ہی نہیں۔“ وہ بظاہر ہنس کر، لیکن جملے ہوئے انداز میں بولی تھیں۔

”میں نے کب کما کھانا نہیں ملا، لیکن جو ذائقہ میری بیٹی کے ہاتھ میں ہے، وہ کس اور کے ہاتھ میں نہیں۔“

”نہیں تایا جی، تائی جی مجھ سے زیادہ اچھا بناتی ہیں۔“ شمیم کے تاثرات دیکھ کر ناز کو بولنا برا وہ نہیں چاہتی تھی، اس کی وجہ سے ان کے گھر تماشا لگے، موقع کی نزاکت دیکھ کر سرور صاحب بھی چپ کر گئے تھے۔ ”ضمیر اور کاشفہ نظر نہیں آ رہے۔“

”وہ اپنے ماموں کی طرف گئے ہیں۔“ شمیم کے

کہنے پر وہ سر ہلا کر سرور صاحب کی طرف متوجہ ہو گئی۔

وہ سرور صاحب کو دھیمی آواز میں علیحدہ اور کاشفہ کا قصہ سنانے لگی۔ ان کی دھیمی آواز پر شمیم کچھ چوکنا ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگیں، تب ہی سہیل اندر آیا تھا۔ پہلے تو وہ چونکا اور پھر مسکرا کر ناز کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

”واہ آج تو بڑے لوگ آئے ہیں۔“ وہ ناز پر گہری نظر ڈال کر بولا۔

”یہ بڑے بڑے لوگ کس کو کہا تم نے۔“ ناز نے

مسکرا کر سہیل سے پوچھا۔

”تمہیں تو نہیں گما میں نے تو یہ علیحدہ کے لیے کہا ہے۔“ اور اس دوران پہلی بار علیحدہ کے چہرے پر

مسکراہٹ آئی تھی۔

”حلوہ کھاؤ ناز نے بنایا ہے۔“ سرور صاحب کے کہنے پر اس نے پلیٹ میں تھوڑا سا حلوہ ڈالا۔

”اچھا پھر تو میں کھائے بغیر بھی بتا سکتا ہوں کہ یہ اچھا نہیں، بہت اچھا ہو گا۔“ سہیل کی تعریف پر شمیم نے بے ساختہ پہلو بدلا باپ کم تھا، بیٹا بھی اس پر فدا ہے۔ وہ دل ہی دل میں کڑھ کر رہ گئیں۔ کچھ عرصے سے وہ یہ محسوس کر رہی تھیں۔ ناز کے سامنے آتے ہی سہیل کی آنکھوں کا رنگ بدلنے لگتا ہے۔ اپنے بیٹے کی آنکھوں کی زبان سمجھتی تھیں وہ، لیکن سب سمجھنے کے باوجود وہ کسی طور پر بھی اپنے بیٹے کی خواہش کو پورا کرنے کے حق میں نہیں تھیں۔

سرور صاحب تین بھائی ہیں۔ وہ راشد سلیم اور علیم سلیم، سرور صاحب سب سے بڑے ہیں۔ والدین نے اپنی پسند سے ان کی شادی شمیم سے کروائی۔ بڑی بہو کی حیثیت سے ان کی اہمیت ہمیشہ زیادہ ہی رہی۔ ”نظر تا“ وہ ایک حاسد عورت تھیں، لیکن بظاہر ان کا رویہ ایسا ہوتا جو دیکھنے والے کو یہ ہی احساس دلا تا کہ ان سے زیادہ ہمدرد کوئی اور نہیں، یہ ہی حاسدانہ فطرت ان کے سینوں بچوں سہیل، ضمیر اور کاشفہ کی تھی۔

دوسرے بھائی راشد نے فاخرہ سے شادی اپنی پسند سے کی تھی، جس پر والدین کچھ عرصہ ان سے ناراض رہے اور اس ناراضی کو بھارا دینے میں شمیم بیگم کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ وجہ وہی حسد فاخرہ ہر لحاظ سے ان سے برتر تھیں، شکل میں، تعلیم میں، دولت میں اور خاندان میں۔ لیکن فاخرہ عادت کی اچھی تھیں۔ ان کی طبیعت کے ٹھہراؤ اور مخلصی نے جلد ہی راشد کے والدین کا دل جیت لیا اور وہ اس گھر کی دوسری بہو کہلا گئیں۔ ان کا ایک ہی بیٹا تھا۔ صہیب اللہ تعالیٰ نے انہیں مزید اولاد سے نہ نوازا، لیکن وہ صہیب کو

پاکر ہی بہت خوش تھے۔  
 اس سے چھوٹے علیم سلیم تھے جن کی شادی ان کی  
 ماموں زاد کزن ناصرہ سے ہوئی، ان کی دو بیٹیاں ہیں، ناز  
 اور علینہ، علیم صاحب اپنے بھائیوں میں سب سے  
 زیادہ سخت مزاج کے ہیں۔ کچھ دو بیٹیوں کی وجہ سے  
 اور کچھ بیٹانہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنی دونوں بیٹیوں اور  
 بیوی سے اکھڑے اکھڑے رہتے ہیں۔ ناز کو اپنے باپ  
 کا پیار تو نہیں ملا۔ لیکن وہ اپنے دونوں تایا کی بہت لاڈلی  
 تھی اور یہ ہی بات شمیم کو بری لگتی ہے۔ انہیں اندازہ  
 تھا کہ سہیل ناز سے شادی کرنا چاہتا ہے، لیکن انہیں ناز  
 سے شدید چٹ تھی۔  
 ”ارے شمیم بھابھی آئیے آج آپ کو ہماری یاد  
 کیسے آگئی۔“ فاخرہ ان سے گلے ملتے ہوئے بولیں۔  
 ”میں نے یاد کیا تو آئی تم سے تو یہ بھی نہ ہوا یہ دو  
 قدم پر گھر ہے۔“ وہ ان سے الگ ہو کر شکوہ کرتے  
 ہوئے بولیں۔

”نہیں بھابھی ایسی تو کوئی بات نہیں کہ میں یاد  
 نہیں کرتی بس آج کل کچھ مصروفیت ہی زیادہ رہی  
 ہے۔ خیر اس کو چھوڑیں آپ بتائیں کیا پیشگی چائے  
 یا کوئی جوس۔“  
 ”چائے کا وقت ہو رہا ہے تو وہی پیوں گی“ کہہ کر  
 ریلیکس ہو کر صوفے سے ٹیک لگائی اور تھوڑی دیر بعد  
 ملازمہ کی ہمراہی میں وہ چائے کے ساتھ دیگر لوازمات  
 بھی لے آئیں۔

”لیں بھابھی یہ کباب ٹرائی کریں، میں نے بنائے  
 ہیں۔“ شمیم نے بڑی دقت سے مسکراتے ہوئے ایک  
 کباب اٹھا کر پلیٹ میں رکھا۔ وہ جہاں جاتی تھیں سب  
 ہی اپنے جوہر دکھانے میں پیش پیش رہتے تھے۔ انہیں  
 ہمیشہ یہ بات چبھتی تھی، کیونکہ خود اتنے سالوں بعد بھی  
 ان کے ہاتھ میں ذائقہ نہیں تھا اور اس کی وجہ ان کی  
 بچن کے معاملوں سے عدم دلچسپی تھی۔  
 ”کل کوئی آیا ہوا تھا۔“ آخر کچھ دیر بعد ادھر ادھر کی  
 باتوں کے بعد انہوں نے وہ سوال پوچھ ہی لیا۔ جس کے  
 لیے انہیں یہاں آنا پڑا تھا۔

”جی۔“ فاخرہ چائے کا سب لے کر بولیں۔  
 ”میرے بھائی اور بھابھی آئے تھے۔“  
 ”وہ کینیڈا والے۔“ شمیم نے انگلی سے پیچھے اشارہ  
 کیا۔ جیسے کینیڈا پیچھے دیوار کے پار ہو۔  
 ”جی ایک ہی تو بھائی بھابھی ہیں میرے۔“ فاخرہ  
 نے مسکرا کر جیسے انہیں یاد دلایا۔  
 ”ہوں۔“ وہ ہنکارا بھر کر چائے پینے لگیں۔ چائے  
 پیتے ہوئے ان کی نظریں تیزی سے کمرے کا جائزہ لے  
 رہی تھیں۔ کمرے کا فریج چریدا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ دیوار پر  
 بڑی اسکرین والا LED بھی لگ چکا تھا۔  
 ”کچھ چاہیے تھا بھابھی۔“ ان کی گھومتی نظریں  
 فاخرہ کی نظروں میں آگئی تھیں۔ اپنی چوری پکڑے  
 جانے پر وہ ہنستا کر مسکرائیں۔  
 ”نہیں وہ میں صہیب کو دیکھ رہی تھی وہ نظر نہیں  
 آ رہا۔“

”بس بھابھی اس لڑکے کی سمجھ نہیں آتی اس کو تو  
 دوستیاں ہی نہیں چھوڑتیں۔“ وہ جو کچھ دیر پہلے فاخرہ  
 کے چمکتے چہرے کو حسد بھری نظروں سے دیکھ رہی  
 تھیں۔ صہیب کے نام پر جو پریشانی ان کے چہرے  
 سے جھلکی تھی۔ اس نے انہیں اندر تک طمانیت  
 بخشی تھی۔

”نظر رکھا کرو فاخرہ جو ان بچہ ہے، کہیں کوئی غلط  
 سوسائٹی میں نہ رہ جائے، ایک تو تم لوگوں کا اکلوتا اور  
 لاڈلا ہے، کوئی روگ ٹوک نہیں تو بگڑتے پتا بھی نہیں  
 چلتا۔ اب میرے ضمیر کو دیکھ لو، صہیب کا ہم عمر ہے۔  
 لیکن مجال ہے میری اجازت کے بغیر کہیں باہر جائے  
 اور باپ کا بھی اتنا رعب ہے کہ یوں سارا سرا دان گھر  
 سے غائب رہنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔“

اب وہ اپنے بچوں کی تعریف میں رطب اللسان  
 ہو چکی تھیں اور ارد گرد کے واقعات کو جس طرح نمک  
 مرچ لگا کر فاخرہ کو سنار ہی تھیں، فاخرہ کا دل ڈوبتا جا رہا  
 تھا۔

وہ کمرے میں آئیں تو سرور صاحب بیڈ پر بیٹھے کسی  
 کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ انہوں نے نظر اٹھا کر

اپنی بیوی کا چہرہ دیکھا اور دوبارہ نظریں کتاب پر جمادیں۔  
عسیم نے ایک نظر کتاب میں گم اپنے شوہر کو دیکھا اور  
کچھ لمحے سوچنے کے بعد الماری کی طرف مڑ گئیں، کچھ  
دیر یوں ہی تہ شدہ کپڑوں کو ادھر سے ادھر کرتی رہیں۔  
کافی دیر بعد تک وہ تھک گئیں تو الماری بند کر کے  
پلیٹیں تب بھی سرور صاحب کے اسٹہاک میں کوئی فرق  
نہیں آیا تھا۔ وہ برا سامنہ بنا کر بیڈ کے دوسری جانب  
جا کر لیٹ گئیں۔

”کیا بات ہے، منہ کے زاویے کیوں بنے ہیں۔“  
کچھ دیر سرور صاحب کی آواز سنائی دی۔  
”آپ کو فرصت مل گئی کہ آپ غور کر لیں کہ میرا  
موڈ صحیح ہے یا خراب۔“

”اس میں فرصت کی کیا بات ہے، موڈ خراب تو  
روہین کی بات ہے۔ ہاں موڈ خوش گوار ہو یہ ذرا  
روہین سے ہٹ کے بات ہوتی ہے۔“ ان کے طنز پر وہ  
صبر کے گھونٹ پی کر رہ گئیں، کیونکہ بات بھی تو کرنی  
تھی۔

”آج میں راشد کی طرف گئی تھی۔“  
”اچھا تو اس میں پریشانی والی کیا بات ہے۔“ انہوں  
نے جیسے سنا ہی نہیں۔ ”راشد کے گھر سارا فریج چرپا  
ہے۔ اتنا بڑا LED۔ کل اس کا بھائی آیا ہوا تھا۔  
اتنے خوب صورت کپڑے سویٹر، جوتیاں اور سونے  
کی انگوٹھی اور بھی اتنا کچھ لے کر آیا ہے۔“  
”اچھا۔“ وہ ہنکارا بھر کر بولے۔

”میں آپ سے بات کر رہی ہوں۔“  
”سن رہا ہوں اور کیا کروں۔“ وہ کتاب بند کر کے  
بولے۔

”یہ ہی تو مصیبت ہے کہ آپ کچھ کرتے نہیں۔“  
”کیا کروں میں تمہاری خواہشات پوری کرنے کے  
چکر میں سولی پر لٹک جاؤں۔ ناشکرے پن کی بھی کوئی  
حد ہوتی ہے۔ ہمارے گھر میں اللہ کی دی ہوئی ہر چیز  
ہے، پر تمہارے لالچ کی کوئی حد نہیں۔ ہر وقت  
دوسروں کی ٹوہ میں رہنا، ان سے حسد کرنا اور تمہیں  
کوئی کام نہیں۔“

”سرور صاحب میں نے ایک بات کی ہے اور آپ  
نے دنیا جہاں کے کیڑے مجھ میں ڈال دیے ہیں۔“  
”بات کہنے کی تھی، ہر وقت فلاں کے گھر میں یہ فلاں کی  
بیوی کے پاس یہ فلاں کے بچے وہ۔ تم خود پر دھیان دو  
اپنے گھر اپنے بچوں پر دھیان دو، تمہیں پتا ہے بچے کیا  
کرتے ہیں۔ ان کی روٹین کیا ہے، سہیل دو دفعہ لی کام  
میں فیل ہو چکا ہے۔ آگے پڑھنے کی اس نے زحمت  
نہیں کی۔ ضمیر کی حرکتوں اور پڑھائی دونوں سے میں  
مطمئن نہیں اور کاشفہ اس کی طبیعت میں عجیب  
خود سری اور بد تمیزی ہے۔“

”آپ کو صرف اپنی اولاد میں کیڑے نظر آتے ہیں۔  
یہاں بات ہوتی نا ناز کی تو اس کی تعریف میں آپ نے  
زمین آسمان ایک کر دیئے تھے۔“

”ہاں کر دیتا زمین و آسمان ایک، وہ ہے ہی تعریف  
کے قابل، ناصرہ نے اپنی دونوں بیٹیوں کی تربیت بہت  
اچھی کی ہے۔ ناز پڑھائی میں گھریلو کاموں میں اخلاق  
میں، کروار میں ہر بات میں پرفیکٹ ہے۔ علیہہ  
کاشفہ جتنی ہے پرکشتی سلجھی ہوئی ہے۔ تمہاری بیٹی کو  
فیشن، اچھل کود اور لڑنے سے فرصت نہیں۔“

”وہ آپ کی بھی بیٹی ہے۔“ انہوں نے جتایا تھا۔  
”لیکن میں تربیت کی بات کر رہا ہوں، جس کی ذمہ  
داری تم پر لاگو ہوتی ہے۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت تمہارے  
ساتھ گزارتی ہے، تم سے سیکھتی ہے ہر اچھی بری  
بات۔“

”ایسا کیا کر دیا، اس نے جو آپ کو اس کی تربیت پر  
اعتراض ہو رہا ہے۔“ اب کے وہ تپ کر بولی تھیں۔  
”اپنی یہ حسد والی عادت اپنے تک محدود رکھو۔ اس  
سے بچوں کے ذہن آلودہ نہ کرو۔ کاشفہ کافی ہیور علیہہ  
کے ساتھ اچھا نہیں۔ اسے سمجھا دو وہ اس کی کزن  
نہیں بہن ہے۔ بہنوں کی طرح رہے۔ تم سمجھا دو تو  
اچھا ہے، میں نے اگر بات کی تو سختی سے پیش آؤں  
گا۔“ کہہ کر انہوں نے نظریں دوبارہ کتاب پر نکادیں،  
جبکہ وہ اتنی دیر کڑھتی رہیں، جب تک غیند ان پر مہریان  
نہیں ہوئی۔

نہیں چل رہا تھا علیحدہ کا گلہ دبا دے۔

☆ ☆ ☆

وہ دروازہ کھول کر اندر آئیں تو صہیب لیپ ٹاپ پر جھکا تھا۔ وہ دودھ کا گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر اسکرین کی طرف دیکھنے لگیں۔

”کیا کر رہے ہو صہیب۔“ ان کا خیال تھا شاید صہیب چونک جائے گا۔

”چپٹ کر رہا ہوں ماما۔“

”کس سے۔“ ”میری کلاس فیلو ہے بیٹش۔“ وہ اب اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئیں۔

”کلاس فیلو ہی سے نا۔“ اب کے صہیب نے اسکرین سے نظریں ہٹا کر فاخرہ کو دیکھا۔

”وہ میری دوست بھی ہے۔“

”کیسی دوست۔“ اب کے فاخرہ نے کافی سنجیدگی سے سوال کیا۔

”یہ کیسا سوال ہے ماما۔ دوست مطلب دوست جیسے سب دوست ہوتے ہیں۔ میں کو ایجوکیشن میں بڑھتا ہوں جہاں لڑکے اور لڑکیاں دونوں پڑھتے ہیں اور دونوں سے ہی ہیلو ہائے ہوتی ہے اور لڑکی سے فرینڈ شپ کا مطلب یہ نہیں کہ میرا اس سے کوئی افیر چل رہا ہے۔“

”صہیب میں نے یا تمہارے پیانے کبھی تم کو کسی بات سے ٹوکا یا باندی نہیں لگائی۔“

”یہ سب کہنے کا کیا مقصد ہے ماما کیا میں نے کوئی غلط حرکت کی ہے یا آپ کی وی ہوگی آزادی کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔“ اب کہ وہ پوری سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

”اگر آپ نے مجھے آزادی ہے تو مجھے اپنی لحد کا بھی پتا ہے۔“

”لیکن بیٹا تمہارے پیانے خوش نہیں انہیں لگتا تم اسٹڈی کو خاص طور پر لائف کو سرلیس نہیں لے رہے تم ہمارے اکلوتے بیٹے ہو صہیب ہماری زندگی کی ساری امیدیں تم سے جڑی ہیں۔“

”ماما! ان کے جذباتی انداز پر وہ حیران ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

سلاٹس کی طرف بڑھتا اس کا ہاتھ وہی رک گیا تھا۔ اس نے تعجب سے اپنی ماں کا چہرہ دیکھا نفرت سے جن کے نقوش بگڑ گئے تھے۔

”اس علیحدہ کی بجلی نے پیانے سے میری شکایت کی۔“ غصے میں اس کے ماتھے پر ہل پڑ گئے تھے۔

”وہ بھی ہو سکتی ہے لیکن تمہارے باپ کے کان اس ناز نے بھرے ہیں وہی تمہارے باپ کے کان میں من من کر رہی تھی۔“

”مجھے سمجھ نہیں آتی امی پیانے کو اپنی بیٹی سے زیادہ دوسروں کی بیٹیاں زیادہ پیاری ہیں ہر وقت ناز ناز علیحدہ علیحدہ کرتے رہتے ہیں اور وہ علیحدہ مجھے سخت نفرت ہے اس سے تو اسے بڑا شوق ہے ہریات میں نمائیاں ہونے کا۔ کلاس میں بھی اس کی کوشش ہوتی ہے ٹیچر کچھ پوچھے تو سب سے پہلے جواب دے والی وہ ہوتی ہے۔ ٹیچر اس کی ذہانت کی اور لڑکیاں اس کی خوب صورتی کی تعریف کرتی ہیں تو دل کرتا ہے اس کا منہ ہی نوچ لوں۔“ اس نے ہاتھوں کا ایسا زاویہ بنایا جیسے واقعی اس کا منہ نوچ لے گی۔

”اے جذبات پر قابو رکھا کرو تمہاری یہ ہی عادت مجھے بری لگتی ہے۔ فوراً بھڑک جاتی ہو اس علیحدہ کو دیکھو خود بولی یا تم سے لڑی۔“

”امی پلیز آپ بھی اب اس کی مثال دینا شروع نہ کر دیں۔“

”میں مثال نہیں دے رہی تمہیں سمجھا رہی ہوں جذبات اور زبان پر قابو رکھا کرو اور علیحدہ سے کوئی بات یا بد تمیزی کرنے کی ضرورت نہیں۔“

”کیوں کیا میں اس سے ڈرتی ہوں۔“ کاشفہ کے تنک کر بولنے پر عیسم نے ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ زور سے ٹیبل پر پٹخا۔

”پھر وہی بے وقوفی والی باتیں اگر تم نے باپ سے بے عزتی کروالی ہے تو کر لو جو دل کرتا ہے پھر مجھے نہ کہنا۔“ وہ کپ اٹھا کر کھڑی ہو گئیں جبکہ کاشفہ کا بس

”میں نے ایسا کیا کر دیا ہے جو آج یوں آپ مشکوک انداز میں مجھ سے سوال کر رہی ہیں۔“

”تمہارا سارا سارا اون گھر سے باہر رہنا تمہاری دوستی تمہارے پایا کو تمہاری کمپنی پسند نہیں اور یہ لڑکیوں سے دوستی۔ یہ مجھے پسند نہیں۔“ انہوں نے اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔

”ضمیر کو دیکھو سب اس کی تعریف کرتے ہیں، برسوں بھیا بھی شیم آئی تھیں۔ ضمیر کی اتنی تعریفیں کر رہی تھیں کہ مجھے شرمندگی ہو رہی تھی کہ تمہاری تعریف کے لیے میرے پاس کوئی ایسی بات ہی نہیں تھی۔“

”مما! ضمیر میرا کزن ہے اور دوست بھی اور میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ کیا ہے اور کیا کرتا ہے اور نہ تو اس نے ایسا کوئی کام کیا ہے کہ تائی جی اس کی تعریفیں کر کے نہیں تھکتیں اور نہ میں نے کوئی ایسا کام کیا جس پر آپ کو یا پایا کو شرمندگی محسوس کرنی پڑے۔ آئی ایم شکلف۔“ آخر میں اس نے جھٹکے سے لپ ٹاپ بند کیا۔ فاخرہ نے بے ساختہ اپنا نچلا ہونٹ کھلا تھا۔

”سوری بیٹا! میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا۔“ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

”پلیز ممما ہرٹ تو آپ کر چکی ہیں حیرت ہے۔ آپ کو دوسروں کی باتوں پر یقین ہے اور اپنے بیٹے پر نہیں اور تائی جی کو ویسے بھی بات کا بنگلڑ بنانے کی عادت ہے۔“

”اوکے اب چھوڑو یہ سب میں نے ایک بات کی ہے، ماں ہوں تمہاری کر سکتی ہوں۔ اب اپنا موڈ ٹھیک کرو اور دودھ پی لو۔“ وہ اس کا ماتھا چوم کر باہر نکل گئیں جبکہ اس کا موڈ بری طرح آف ہو گیا تھا۔



اس نے ابھی اپنی بائیک اشارت کی تھی جب پیچھے اسے ضمیر کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ رکتا نہیں چاہتا تھا۔ پر ضمیر کے قریب پہنچنے پر اسے رکتا پڑا پر اس

کا موڈ ہنوز خراب تھا۔

”کہاں جا رہے ہو۔“

”کام سے جا رہا ہوں۔“

”میں بھی چلوں۔“

”ضرورت نہیں میری کمپنی میں تم خراب ہو سکتے ہو۔“

”مطلب۔“ اب کے ضمیر نے چونک کر اس کے گہڑے انداز دیکھے۔

”یہ سوال تم اپنی امی سے جا کر پوچھو۔“

”پر ہوا کیا ہے۔“ ضمیر ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”آج تک ممانے یا پایا نے کبھی نہ مجھ سے کوئی سوال کیا ہے نہ کبھی کوئی پابندی لگائی ہے۔ لیکن کل زندگی میں پہلی بار ممما مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ انہیں لگتا ہے۔ میری کمپنی ٹھیک نہیں میرے دوست آوارہ ہیں اور ابھی میں پتا نہیں کن کن بری عادتوں میں ملوث ہوں اور یہ سب فتور ممما پایا کے دماغ میں ڈالنے والی تمہاری والدہ محترمہ اور میری ڈیرسٹ تائی جان ہیں۔“ آخری الفاظ اس نے چپا چپا کر ادا کیے تھے۔

”مجھے میرے پیرنس کی نظر میں برا اور تمہاری تعریف اور فرماں برداری کے جو جھوٹے جھنڈے کل وہ گاڑ کے گئی ہیں نا اگر میں وہاں موجود ہوتا تو تم جانتے ہو ضمیر کیا ہوتا کون کیا ہے۔ یہ تم بہت اچھی طرح جانتے ہو۔“ اس کے چہرے اور آواز میں اتنا غصہ تھا کہ کچھ لمحوں کے لیے ضمیر بول ہی نہیں سکا۔

”یار میری بات کا یقین کرو میں نہیں جانتا امی نے ایسی باتیں کیوں کہیں۔ میں نے کبھی تمہارے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں کی؟“

”اور تم کر سکتے بھی نہیں۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا اور مزید کوئی بات کیے بغیر اس نے بائیک کو کک لگائی اور اگلے ہی لمبے وہ گیٹ سے باہر تھا۔ ضمیر نے غصے سے اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے زیر لب اسے گالی دی تھی۔

وہ کپڑے استری کرنے کے ساتھ ٹی وی پر چلنے والا

ڈراما بھی دیکھ رہی تھیں۔ جبکہ ان سے کچھ فاصلے پر بیٹھی کاشفہ ناخنوں پر نیل پالش لگا رہی تھی۔ تب ہی لاؤنج کا دروازہ کھول کر دندنا ہوا ضمیر ان کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔

”آپ نے چچی کو کیا کہا صہیب کے بارے میں۔“

”میں۔“ شمیم قدرے گھبرا کر اپنے بیٹے کا منہ دیکھا۔ ”میں نے کیا کہنا ہے۔“ وہ نظریں چرا کر بولیں۔

”کیا آپ چچی سے صہیب کے خلاف باتیں نہیں کر کے آئیں۔ وہ آوارہ لڑکوں میں اٹھتا بیٹھتا ہے۔ روتھتا نہیں ہے اور بھی بتا نہیں کیا۔“ اس کے متصلے انداز پر انہوں نے پاس بیٹھی کاشفہ کو دیکھا جو نیل پالش ہاتھ میں پکڑے انہیں ہی دیکھ رہی تھی۔ ”ضمیر یہ کیا طریقہ ہے ماں سے بات کرنے کا۔“ اپنی گھبراہٹ کو انہوں نے غصے میں چھپانے کی کوشش کی تھی۔

”مجھے بات کرنے کا طریقہ آپ بعد میں سمجھائیں پہلے مجھے یہ بتائیں آپ نے باتیں کی ہیں یا نہیں۔“ وہ اب پہلے سے زیادہ بدلتا ظلی سے بولا تھا۔ شمیم نے زنج ہو کر پیٹنے کے انداز میں استری اسٹینڈ پر رکھی تھی۔ ”ہاں کی تھیں باتیں، پروہی کی تھیں جو تم نے بتائی تھیں۔“ ضمیر کا دل چاہا اپنے بال نوچ لے۔

”میں نے یہ باتیں اپنے گھر میں اپنی ماں سے کی تھیں، یہ نہیں کہا تھا کہ اس کے گھر جا کر ان باتوں کا ڈھنڈورا پیٹ آئیں۔“

”ناتو میں نے کیا برا کیا اس کی ماں کو اس کی کرتوتوں سے ہی آگاہ کیا تاکہ اسے سمجھائیں۔ آخر کل کو کچھ برا ہوا تو بیچ میں ہمارا بھی نام بدنام ہو گا۔ آخر وہ بھی اسی خاندان کا حصہ ہے۔“

”امی۔ امی کیا کروں میں۔“ اس نے غصے سے مکا دیوار پر مارا۔ ”آپ کو کیا ضرورت تھی پرانے پھڈے میں ٹانگ اڑانے کی، لے دے کر سارا کام خراب کر دیا۔ قسم ہے مجھے جواب میں آپ سے کوئی بات

کروں۔“ وہ غصے سے اسٹینڈ کو ٹانگ رسید کرتا باہر نکل گیا۔

”ذلیل کمینہ، غیر کے لیے ماں کو کتنی باتیں سنا گیا۔ ایسی ذلیل اولاد نہ ہو تو بہتر ہے۔“ وہ اس باز پرس پر اچھی خاصی شرمندہ ہوئی تھیں پر غلطی ماننا ان کی فطرت میں نہ تھا۔

”امی آپ کو کیا ضرورت تھی۔ چچی سے ایسی باتیں کرنے کی، صہیب بالکل ایسا نہیں، آپ کی ان باتوں کی وجہ سے وہ ہم سے ناراض ہو گیا ہے۔“

”لو۔“ شمیم نے حیرت سے انگلی اپنے دائیں گال پر رکھی۔ ”مینڈ کی کو بھی زکام ہونے لگا۔“ اپنی بیٹی جو انہیں ہمیشہ اپنی ہم خیال لگی تھی کے منہ سے یہ سن کر انہیں حیرت اور تکلیف دونوں محسوس ہوئی تھیں۔ ”تمہیں ماں سے زیادہ اس کی ناراضی کی پروا ہے۔“

”جی۔۔ کیونکہ آپ نے غلط کیا ہے۔“ کہہ کر وہ بھی غصے سے باہر نکل گئی۔ جبکہ شمیم ان دونوں بہن بھائی کے رد عمل پر حیران تھیں۔

”وہ سیڑھیوں میں بیٹھا خاموشی سے سامنے دیکھ رہا تھا۔ لیکن پریشانی اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔ اس کو بچچتاوا ہو رہا تھا۔ کیوں اس نے اپنی ماں سے صہیب کے متعلق باتیں کیں، جبکہ وہ جانتا تھا۔ اپنی ماں کی عادت کو اچھی طرح۔ صہیب سے دوستی کے اسے بہت سے فائدے تھے، کچھ آمدنی محدود ہونے کی وجہ سے اور کچھ بچوں پر کنٹرول رکھنے کے لیے انہیں کم پیسے دیے جاتے تھے۔ ان تینوں بہن بھائیوں کی پاکٹ منی بہت کم تھی۔ باقی دونوں کا تو پتا نہیں، لیکن ضمیر کا اتنے کم پیسوں میں گزارا نہیں ہوتا تھا۔ ایسے میں صہیب کی دوستی اس کے لیے تحفہ خداوندی تھی۔

جب اسے ضرورت پڑتی وہ صہیب کے برینڈڈ کپڑے استعمال کر لیتا۔ اس کا موبائل بلا جھجک لے جاتا اس کی بائیک استعمال کرتا۔ صہیب کی پاکٹ منی کا زیادہ تر حصہ وہ استعمال کرتا ادھار کے نام پر اس

سے اچھی خاصی رقم لیتا جو صہیب بعد میں اس سے کبھی واپس نہ مانگتا۔ وہ ایسا ہی تھا دوستوں کا دوست، لیکن اب جو ہوا تھا اس نے سب خراب کر دیا تھا۔ خود کو اچھا ثابت کرنے کے لیے اس نے صہیب کو برا ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ الناوار اسی پر چل گیا تھا۔ آج چار دن بعد وہ صہیب سے ملنے گیا تھا۔ اسے لگا اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا ہوگا، لیکن صہیب نے اس سے ملنے سے انکار کر دیا تھا۔

اسے یہ بات تکلیف نہیں دے رہی تھی کہ وہ ملا نہیں، بلکہ مسئلہ یہ تھا کہ ایک خاص ملاقات اسے رابعہ سے کرنی تھی۔ جس کو وہ صہیب کے نام سے فون کرتا اور ملتا تھا۔ اس سے ملاقات کے لیے اسے پیسوں اور صہیب کی بانٹیک کی ضرورت تھی۔



وہ دونوں بھائی اپنی فیملی سیت علیم صاحب کے گھر موجود تھے۔ وجہ ناز کا شان دار نمبروں کے ساتھ گریجویشن کرنا تھا۔

”واہ بھی نازیہ نمبر ہوئے تپاس ہونے کا بھی مرا آیا نا۔“ ہمیشہ کی طرح سرور صاحب نے ناز کی حوصلہ افزائی کی تھی اور شیم نے برا سامنہ بنایا تھا۔ ”علیم بہت لکی ہے جو ناز اور علینہ جیسی ہونہار بیٹیاں اسے ملیں۔“ سرور صاحب جہاں ہمیشہ ناز کی قابلیت کے گن گاتے تھے وہیں راشد صاحب اور فاخرہ علینہ کو بہت پسند کرتے تھے۔

”لکی تو میں تب ہوتا نا راشد جب اللہ بیٹا دیتا بیٹیاں لائق بھی ہوں تو کیا فائدہ پہلے ساری عمر انہیں کھلاؤ پلاؤ، اچھی تعلیم دلاؤ اور پھر لاکھوں کا جینز دے کر رخصت کرو، نرا نقصان بیٹیاں تو گھائے کا سودا ہوتی ہیں۔ لکی تو تم ہو جس کا بیٹا ہے اور بیٹی جیسی کوئی زحمت نہیں لگی تو سرور بھائی ہیں جن کے دو جوان بیٹے ہیں۔ ایک دایاں بازو اور ایک بایاں برہا پے میں کام آئیں گے۔“

وہاں موجود ہر شخص جیسے ساکت رہ گیا تھا۔ ناز کا کچھ

دیر پہلے جگمگاتا چہرہ یک دم تاریک ہو گیا تھا۔ ناصرہ تو شروع سے ہی شوہر کی ذہنیت سے واقف تھی، لیکن یوں سرعام جگ ہنسائی کی پہلے نوبت نہیں آئی تھی۔ دو بیٹیوں کو پیدا کرنے کے جرم میں پہلے ہی ان کی گردن جھکی تھی۔ اوپر سے ان چاہی وہ اب بھی سر جھکائے بیٹھی رہ گئیں۔ شیم نے مسکراتی نظروں سے ناصرہ کا جھکا سر اور ناز کا جھکا چہرہ دیکھا۔ ابھی اپنی خوشی ٹھیک طرح سے انجوائے بھی نہیں کر پائی تھیں کہ ان کے اپنے بیٹے نے پھر انہیں جلتے توے پر بٹھا دیا۔

”چاچو آپ کیوں ایسا سوچتے ہیں، آپ کا کوئی بیٹا نہیں، میں ہوں، ضمیر صہیب ہم سب آپ کے بیٹے ہیں۔“ وہ اٹھ کر ان کے قریب بیٹھ گیا۔ ساکت ماحول میں ہلچل پیدا ہوئی تھی۔ ایسے جیسے کسی نے سمٹل پکڑ کر کوئلے کر دیا ہو۔

”تمہاری سوچ پتا نہیں کب بدلے گی۔ علیم ناشکرے پن کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔“ راشد صاحب نے ماتھے پر ہل ڈال کر علیم کو دیکھا۔

”تمہیں اتنی ہی تکلیف ہے تو ناز مجھے دے دو، تم اس قابل ہی نہیں کہ اس کے باپ کہلا سکو۔“ اب کے سرور صاحب کے کہنے پر شیم اور سہیل نے حرکت کر انہیں دیکھا۔ وہ دونوں ان کے اگلے جملے کے منتظر تھے۔ سہیل کی تو جیسے دلی مراد بھر آئی تھی اور شیم ان کی تو جیسے ساس سینے میں اٹک گئی تھی۔ ناز اٹھ کر کچن میں آگئی اور اس کے پیچھے علینہ بھی۔ چائے کا پانی رکھتے ہوئے اس کے آس پاس نکلے تھے۔

اپنی کامیابی پر وہ کتنا خوش تھی وہ کتنی کوشش کرتی تھی۔ اپنے باپ کو خوش کرنے کی، لیکن ہر دفعہ وہ ناکام رہتی تھی۔ علینہ کی اس کی طرف پشت تھی، پر وہ جانتی تھی اس کی بہن رو رہی ہے۔ اس سے پہلے وہ اس کی دلجوئی کے لیے آگے بڑھتی صہیب اور ضمیر آندھی طوفان کی طرح کچن میں داخل ہوئے تھے۔

”ناز آئی!“ صہیب نے اسے کندھوں سے پکڑ کر سیدھا کیا تھا۔ ”بہت افسوس کی بات ہے، میں کم از کم آپ جیسی بہادر لڑکی سے یہ ایکسپیکٹ نہیں کر رہا

تھا۔ ”وہ جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔  
”آپ کو پتا ہے نا چاچو کی عادت ہے۔“ اب کے  
ضمیر بھی اس کے قریب آکر بولا۔

”لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے مجھے سمجھ نہیں  
آتا پاپا کو ہم سے کیا پر خاش ہے اگر ان کا کوئی بیٹا نہیں تو  
یہ ہمارا قصور ہے؟“ اس کے سوال پر ضمیر نے بے  
چارگی سے صہیب کو دیکھا۔

”آپی چھوڑیں یہ فضول باتیں۔“

”یہ فضول باتیں نہیں صہیب پاپا ہر دفعہ ہماری  
انسٹا کرتے ہیں۔“

”آپی انسٹا غیروں کے سامنے ہوتی ہے۔ اپنوں  
کے سامنے نہیں وہاں سب آپ کے اپنے تھے۔ کیا  
کسی نے آپ کو برا لیا یا چاچو کا ساتھ دیا۔ سب ان کو  
ہی ڈانٹ رہے تھے۔ باہر جا کر دیکھ لیں۔ ابھی تک  
انہیں پاپا اور تایا جی ڈانٹ رہے ہیں اور اگر آپ چاہتی  
ہیں تو میں بھی انہیں ڈانٹ کر آتا ہوں کہ ان کی ہمت  
کیسے ہوئی کہ وہ میری گھبرو جوان بہن کے ہوتے ہوئے  
بیٹا نہ ہونے کا شکوہ کرتے ہوئے۔ میری آپی کی  
موچھیں بنا دیں وہ کیا کسی لڑکے سے کم ہیں۔“  
صہیب کی مثال پر وہ بے ساختہ انداز میں چیخنے کے  
بعد ہنس پڑی تھیں۔ کب سے کونے میں گم صم کھڑی  
علینہ نے بہن کو ہنستے دیکھ کر گہری سانس لی تھی۔

”یہ ہوئی ثابت اور یہ میں آپ کے لیے لایا  
ہوں۔“ صہیب نے جیکٹ کی جیب سے دو پیکٹ  
نکال کر اس کی طرف برہائے ناز نے سوالیہ نظروں  
سے اسے دیکھا۔ ”آپ کے گفت ہیں اور انکار کا سوال  
ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بہن بھائیوں سے حق سے لیتی ہے  
اور یہ تو پھر میں اپنی خوشی سے لے کر آیا ہوں۔“ ناز  
نے نظریں اٹھا کر صہیب کا چہرہ دیکھا۔ اس کی  
آنکھیں یکایک پانی سے بھر گئی تھیں اور وہ بے ساختہ  
اس کے ساتھ لگ گئی۔

”آپی میں آپ کو بہن کہتا ہی نہیں مانتا ہوں۔“ وہ  
اس کے سر کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ”اب چھوڑیں یہ  
روئے دھونے کا پروگرام اور ٹریٹ کا بندوبست کریں“

میں نے آپ سے زبردست ٹریٹ لینی ہے۔“  
”ہاں جو تم کہو۔“ ناز آنسو صاف کرتے ہوئے  
بولی۔

”اور آپی میرا گفت ڈیو رہا کیونکہ میری ذرا کڑکی  
چل رہی ہے۔“ ضمیر کان کھجاتے ہوئے بولا۔  
”تمہاری جیب بھری کب ہوتی ہے۔“ ناز نے اس  
کے سر پر چپٹ لگاتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا کر سر کھجانے  
لگا۔

”اور تم کیا کھڑی ہماری باتیں سن رہی ہو چائے  
بناؤ۔“ وہ علینہ کو دیکھ کر بولا اور وہ جو کچھ دیر پہلے  
صہیب کے لیے اچھا سوچ رہی تھی اپنی سوچ پر  
لعنت بھیجی۔

”آپی آپ کی بہن بالکل آپ کے الٹ ہے۔ آپ  
اتنی اسٹائلش ہر فن مولا مسکراہٹ آپ کے ہونٹوں  
سے جدا نہیں ہوتی جبکہ میں۔“ اس نے علینہ کو دیکھ  
کر برا سامنے بنایا۔ ”ہر وقت سڑیل انداز بندہ ہستا ہوا  
اندر آتا ہے اور اس کا چہرہ دیکھ کر ایسے لگتا ہے پتا نہیں  
کون سا غمگین واقعہ ہو گیا ہے۔ نکمی چائے تک  
بنانی نہیں آتی۔ سڑسڑ کر رنگ الگ کالا ہو گیا ہے۔  
کون کرے گا اس سے شادی۔“ آخر میں وہ پھر پیٹری  
سے اتر گیا۔ علینہ اپنی اتنی بے عزتی پر جیسے پھٹ پڑی  
تھی۔

”کوئی نہ کرے شادی کم از کم آپ کے پاس نہیں  
آؤں گی۔“ اس کی بات پر ضمیر کے ساتھ ناز بھی مسکرا دی  
تھی۔ علینہ کو ناز سمیت سب پر غصہ آ رہا تھا جو اس  
کے مذاق اڑائے جانے پر مسکرا رہے تھے۔

”اپنی شکل دیکھی ہے چوہیا میرا داغ خراب ہے جو  
میں تم سے شادی کے بارے میں سوچوں۔ اتنی حسین  
لڑکیاں میرے آگے پیچھے پھرتی ہیں۔ انہیں کبھی میں  
نے لفٹ نہیں کروائی تم تو پھر شکل اور عقل دونوں  
سے پیدل ہو۔“ وہ واقعی ناز کی طرح خوب صورت  
کانفیڈنٹ نہیں تھی جو مقابل کو اپنی خوب صورتی یا  
باتوں سے ڈھیر کر لیتی لیکن اتنی کم تر بھی نہیں تھی جو  
صہیب اس کا مذاق اڑاتا اس کا بس رونے پر چلتا تھا

اور وہ ہی وہ کر سکتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ضمیر سٹٹا گیا تھا، جبکہ ناز نے بے ساختہ آگے بڑھ کر اسے گلے لگایا تھا۔

”صہیب تم میری بہن کو تنگ مت کیا کرو۔“ ناز نے خفگی سے اسے دیکھا۔ ”اور تم بھی کس کی باتوں کو دل پر لے رہی ہو، جانتی ہو وہ ایسا ہی ہے۔“

”تسلی دینے سے حقیقت نہیں بدل سکتی چوبیا بھی کبھی خوب صورت ہو سکتی ہے۔“ وہ پھر مذاق اڑانے سے باز نہیں آیا تھا۔ علینہ نے زور زور سے روتے ہوئے چہرہ ناز کے کندھوں پر رکھ دیا۔

”صہیب اپنا منہ بند کرو اور جاؤ باہر خبردار جواب دوبارہ میری بہن کا نام بگاڑا۔“ اب کہ ناز غصے سے بولی۔ ”وہ ویسے ہی تمہیں پسند نہیں کرتی۔“ وہ چوبیا ہر جا رہا تھا ایک دم رکا اور آنکھیں کھول کر ناز کے پہلو میں لگی علینہ کو دیکھنے لگا۔

”تو میں کیا اسے پسند کروانے کے لیے مرا جا رہا ہوں۔ میں تو آج سو نہیں سکوں گا، اس رات محسن کی دیوی، علینہ، علیم، صہیب راشد کو سخت ناپسند کرتی ہیں اور میرے خدا اب میرا کیا ہو گا۔“ وہ دروازے کے ساتھ لگ کر رونے کی ایکٹنگ کرنے لگا۔ ناز نے بڑی مشکل سے مسکراہٹ روک کر ضمیر کو اشارہ کیا جو اسے کھینچتا ہوا باہر لے گیا۔ باہر نکلتے ہی وہ دونوں ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے تھے۔



”فاخرہ!“ گھر میں داخل ہوتے ہی راشد صاحب نے غصے سے فاخرہ کو آواز دی تھی اور وہ جو کام والی ماسی سے اسٹور کی صفائی کروا رہی تھیں۔ گھبرا کر باہر نکلیں۔ ”کیا ہوا راشد! خیریت ہے۔“ راشد کو غصہ کم ہی آتا تھا اور اگر آج وہ غصے میں دکھائی دے رہے تھے تو ضرور کوئی وجہ تھی۔ ”صہیب کہاں ہے۔“

”کیوں کیا ہوا۔“ وہ گھبرا کر پوچھنے لگیں۔

”میں کیا پوچھ رہا ہوں کہاں ہے وہ۔“ وہ اب حلق

کے بل چلائے۔

”وہ گھر پر نہیں ہے۔“

”بلاؤ اسے جہاں بھی وہ ہے۔“ کہہ کر وہ اس کے کمرے کی طرف بڑھ گئے، جبکہ وہ پریشانی سے صہیب کا نمبر ڈائل کرنے لگیں۔ راشد ابھی تک صہیب کے کمرے میں تھے، جبکہ وہ پریشانی سے گیٹ کے سامنے نفل رہی تھیں۔ بندرہ منٹ بعد انہوں نے اس کی بائیک کی آواز سنی تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ گیٹ کے اندر تھا۔

”خیریت ممّا! آپ نے اتنی ایمر جنسی میں مجھے کیوں بلوایا۔“ وہ پریشانی سے ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔

”تمہارے پیپا بہت غصے میں ہیں۔“

”کیوں۔“ وہ حیران ہوا۔

”چتا نہیں، لیکن مجھے لگتا ہے انہیں غصہ تم پر ہے۔“ وہ تمہارے روم میں ہیں۔“ فاخرہ کے کہنے پر وہ سر ہلا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ فاخرہ بھی اس کے پیچھے تھیں۔ آہٹ پر راشد نے مڑ کر دیکھا اور اسے دیکھتے ہی ان کا جلال ان کے چہرے سے چھٹکے لگا۔

”یہ کیا ہے۔“ راشد نے اپنی پھلی اس کے سامنے پھیلانی جس میں سگریٹ کی ڈبیا تھی۔ حیران پریشان کھڑی فاخرہ بے ساختہ دو قدم آگے آئی تھیں۔

”میں پوچھ رہا ہوں یہ کیا ہے۔“ اب کہ راشد

صاحب زور سے بولے۔

”آئی ڈونٹ نوپایا میں نہیں جانتا یہ کہاں سے آئی، یہ سگریٹ میرے نہیں۔“

”تمہارے نہیں تو تمہارے کمرے میں تمہاری سائیڈ ٹیبل کی دراز میں کہاں سے آئے۔“

”تم اسموکنگ کرتے ہو صہیب۔“ فاخرہ روہا سی ہو کر بولیں۔

”ممّا! میں نے آج تک کبھی سگریٹ کو ہاتھ بھی نہیں لگایا، میں قسم کھا کر کہہ رہا ہوں۔“ ماں کے آنسو اور باپ کا غصہ دیکھ کر وہ کنفیوژ ہو گیا تھا۔

”پھر یہ کہاں سے آئے۔“ راشد ایک بار پھر

دھاڑے۔ صہیب نے صرف ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر بول دیا۔ ”یہ ضمیر کے سگریٹ ہیں۔ وہ اسموکنگ کرتا ہے۔“ فاخرہ نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ لیا جبکہ راشد صاحب نے ڈیبا فرش پر بیٹھ دی۔

”بکو اس کرتے ہو تم اپنی غلطی اب تم ضمیر پر ڈال رہے ہو اور اس کے لیے تمہارے پاس کیا جواب ہے؟“ کیا یہ بھی ضمیر نے کیا ہے۔ ”انہوں نے اس کی مارک شیٹ اس کے آگے کی۔ وہ پورے دو سبجیکٹ میں فیل تھا۔“ بولو یہ بھی ضمیر نے کیا ہے۔ ”اب کہ صہیب کچھ نہیں بولا تھا۔ اس کا سر جھکا تھا۔

”یہ دیکھ لیا نالاڈ پیار کا نتیجہ پڑھائی میں زیر و غلط حرکتیں“ اوپر سے جھبٹ اور ایک اور کارنامہ سنوائے سپوت کا جوان ہو گیا ہے تمہارا بیٹا لوگوں کی بیٹیوں کا پیچھا کرتا ہے ان کے گھرنون کر کے انہیں تنگ کرتا ہے۔“ وہ دیکھ صہیب کو رہے تھے لیکن مخاطب فاخرہ سے تھے جن کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ صہیب نے چونک کر سر اٹھایا۔ ”یہ رابعہ کون ہے۔“

”میں نہیں جانتا پایا۔“ وہ حیران ہو کر بولا لیکن اگلے ہی لمحے راشد صاحب کا زوردار ٹھپڑ اس کو دلوں میں تارے دیکھا گیا تھا۔ وہ جیسے شاکڈ ہو کر باپ کا چہرہ دیکھنے لگا۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا اسے یاد نہیں پڑتا تھا کہ اس کے ماں یا باپ نے اس پر ہاتھ اٹھایا ہو۔ فاخرہ نے بے ساختہ انداز میں آگے بڑھ کر راشد صاحب کا ہاتھ تھاما تھا۔

”کیا کر رہے ہیں راشد۔“ انہوں نے صہیب کا شاکڈ چہرہ دیکھ کر راشد کو ٹوکا تھا۔

”ایک ٹھپڑ سے تمہاری یادداشت واپس آئی ہے یا میں خود یاد کرواؤں۔“ صہیب اب بھی کچھ نہیں بولا لیکن اس کے بھینچے ہوئے ہونٹ اس کے غصے کی ترجمانی کر رہے تھے۔

”رابعہ وہ لڑکی ہے جس کا تم روز کالج تک پیچھا کرتے ہو۔ اس کے گھرنون کرتے ہو۔ آج اس کے والد میرے آفس آئے تھے کہ میں تمہیں سمجھاؤں

”نہیں تو وہ تمہیں سمجھائیں گے۔“ راشد صاحب نے فاخرہ کو بتانے کے بعد اسے دیکھا۔ ”میں اس نام کی کسی لڑکی کو نہیں جانتا۔“ صہیب اس دفعہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔

”کیا یہ تمہاری بانیٹ کا نمبر نہیں۔“ انہوں نے اس کی بانیٹ کا نمبر دہرایا۔ ”یا یہ تمہارا موبائل نمبر نہیں۔ تمہارے کے سب بے ہودہ میسجز بھی انہوں نے پڑھائے مجھے اور میرا دل چاہا زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں۔ کیا ہم نے تمہیں یہ سکھایا ہے تمہاری اپنی کوئی بہن نہیں تو کیا تمہیں کسی اور لڑکی کی عزت کا بھی خیال نہیں۔“

”پاپا میں کہہ رہا ہوں ناکہ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا یہ سب ضمیر کی حرکت ہے۔ وہ میری بانیٹ لے کر جاتا تھا۔ اور میرا موبائل بھی استعمال کرتا تھا اور رابعہ نامی لڑکی سے اس کی دوستی تھی۔“

”انف صہیب بند کرو اپنی بکو اس کیوں تم بار بار اپنی غلطی ضمیر پر ڈال رہے ہو۔ سب جانتے ہیں وہ ایسا لڑکا نہیں۔“ صہیب نے بے بسی سے اپنے ماں باپ کو دیکھا۔

”بہتر ہو گا تم اپنی غلطی مان لو۔“ راشد صاحب کے جتنا تے ہوئے انداز پر اس نے سنجیدہ نظران پر ڈالی تھی۔

”جب میں نے کوئی غلطی کی نہیں تو میں کیسے اسے مان لوں۔“

”تو تم نہیں مانو گے۔“

”میں نے کچھ نہیں کیا پایا۔“ وہ مزید سنجیدگی سے بولا۔

”ٹھیک ہے تو تم جیسے نافرمان لڑکے کے لیے میرے گھر میں کوئی جگہ نہیں میں مزید تمہاری وجہ سے کوئی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا۔ تم جاسکتے ہو۔“

”راشد“ فاخرہ کے جیسے دل پر کھونسا سا لگا تھا ”یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ وہ بچہ ہے بچوں سے غلطیاں ہو جاتی ہیں۔“

”تو اس سے کہو اپنی غلطی مانے“ انہوں نے کہہ کر

رخ موڑ لیا تو فاخرہ نے ملتجائی انداز میں اس کا بازو تھاما۔ ”صہیب بیٹا ہم تمہارے پیر شس ہیں اگر تم سے غلطی ہوئی ہے تو مان لو ہم معاف کر دیں گے۔“

”مما اگر میں نے ایسا کچھ کیا ہو تا تو میں ضرور مان لیتا لیکن کسی دوسرے کی غلطی کیوں میں اپنے سرلوں آپ ضمیر سے جا کر کیوں نہیں پوچھتیں۔“ کہہ کر وہ رکائیں تھیں۔

”صہیب“ فاخرہ اس کو پکارتی ہوئیں اس کے پیچھے بھاگی تھیں جبکہ راشد صاحب نڈھال سے ہو کر دیں بیٹھ گئے تھے۔



زور سے آئی آواز سن کر ناز اور علیہ نے پہلے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر دونوں تیزی سے باہر آئی تھیں جہاں شمیم ناصرہ کو صہیب کی سنار ہی تھیں۔

”اندھیر چا دیا اس لڑکے نے غلطیاں خود کر کے نام میرے معصوم بیٹے پر لگادیا میں کب سے اس لڑکے کی حرکتیں دیکھ رہی تھیں اور میں نے فاخرہ کو آگاہ بھی کیا تھا پر مجال ہے کوئی دھیان دیا ہو اب خود ہی بھگت رہے ہیں۔ بھئی سچی بات تو یہ ہے نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔“

”لیکن آپا صہیب تو بالکل ایسا نہیں۔“

”تو میں کیا جھوٹ بول رہی ہوں۔“ ناصرہ کی طرف داری شمیم کو بری لگی تھی۔ ”راشد تو اس سے اتنا ناراض تھا کہ اسے گھر سے نکالنے کے درپے تھا۔ اب فاخرہ اسے کینڈا بھیج رہی ہے اپنے بھائی کے پاس۔“

نازوا پس کمرے میں آگئی اور اس کے پیچھے علیہ بھی۔

”آپ کہاں جا رہی ہیں۔“ اسے جو تابدلتے دیکھ کر علیہ نے پوچھا۔

”صہیب سے ملنے کیونکہ مجھے اس کہانی پر یقین نہیں آ رہا جو تائی جی نے سنائی ہے۔“ علیہ نے برا سا منہ بنایا۔

”پر مجھے تو کوئی شک محسوس نہیں ہوا مجھے تو شروع سے ان کی حرکتیں پسند نہیں اور یہ لڑکی والی بات اس پر

تو مجھے سو فیصد یقین ہے وہ ہیں ہی ایسے کرکٹر لیس۔“ آخری لفظ اس نے زیر لب کہا تھا۔

”نہیں وہ شرارتی ہے منہ پھٹ ہے لیکن کرکٹر لیس نہیں۔“ ناز غصے سے اسے دیکھ کر بولی تھی۔

”میں آتی ہوں۔“ وہ مزید کچھ کہے بغیر باہر نکل گئی۔ جبکہ علیہ نے مسکرا کر کندھے اچکائے اسے لگا اللہ نے بدلہ لے لیا جو سلوک وہ اس سے کرتا رہا ہے۔ وہ ٹاک کر کے اندر آئی تو صہیب بید پر لیٹا تھا۔ دروازہ کھلنے پر اس نے گردن گھما کر دیکھا اور اسے دیکھ کر ایک دم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”آئی آئی تائیں نا اس کے مسکرانے پر ناز بغور اس کا چہرہ دیکھتی ہوئی اس کے ساتھ بیٹھ گئی وہ اسے کافی کمزور لگا تھا صرف دو دنوں میں۔“ آپ بھی کوئی الزام لگانے آئی ہیں۔“ اس کے لہجے اور الفاظ پر وہ تڑپ اٹھی تھی۔

”صہیب میں لگاؤں گی تم پر کوئی الزام اور دوسری بات کوئی کچھ بھی کہے مجھے تم پر پورا یقین ہے میں کوئی تصدیق مانگنے نہیں آئی مجھے بس سن کر اتنی تکلیف ہوئی کہ میں اسی طرح اٹھ کر آگئی۔“

”خوشی ہوئی آپ کی کہ کسی کو تو میرا یقین ہے۔ ورنہ میرے اپنے ماں باپ کو تو میرا یقین ہی نہیں۔“

”ایسا نہیں صہیب ان کو تم پر پورا یقین ہے۔“

”ہنہ“ اس نے سر جھٹکا۔ ”یہ یقین ہے کہ میری بات سنے بغیر کسی کی باتوں میں آکر مجھ پر فرد جرم عائد کر دیا۔ کسی کی غلطی مجھ پر خوب دی۔“

”تمہیں انہیں سچائی بتانی چاہیے تھی۔“

”کوشش کی تھی۔“ وہ مایوسی سے بولا۔ ”سب کام جو ضمیر نے کیے وہ اس نے مجھ پر لگادیا اور میرے ماں باپ نے یقین بھی کر لیا۔“

بہر حال اس نے گہرا سانس لیا۔ ”میں اب یہاں رہنا ہی نہیں چاہتا۔“ ناز نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”مطلب“ صہیب نے نظریں گھما کر ناز کا چہرہ دیکھا۔

”میں ماموں کے پاس جا رہا ہوں اور وہیں رہوں گا کیونکہ آپ کی میں ان لوگوں کے درمیان نہیں رہ سکتا جو

مجھ پر اعتماد نہیں کرتے جو میرے کردار پر شک کریں جن کو مجھے صفائیاں دینی پڑیں۔ میں ان کے ساتھ رشتہ قائم نہیں رکھ سکتا۔

اس کی بات سے ناز کو اندازہ ہو گیا کہ اس کا ارادہ پختہ ہے۔ ناز کی اس سے جوائیج منٹ بھی اس کی وجہ سے اسے اس کے جانے کا دکھ ہو رہا تھا۔ یہی بات اس کی آنکھوں میں آنسو لے آئی جسے دیکھ کر صہبب بھی پریشان ہو گیا۔

”آپی۔ لیز آپ روئیں نہیں۔“ اس نے ناز کا ہاتھ تھام لیا ”میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔“

”کب جا رہے ہو۔“ وہ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولی۔

”آج رات کو۔“

”اتنی جلدی۔“ وہ بے ساختہ بولی اور اگر میں نہ آتی تو تم نے ملنا بھی نہیں تھا مجھے۔“ اس کے کہنے پر وہ نظریں چرا گیا۔

”آپی میں کچھ نہ کرتے ہوئے بھی مجرم بن گیا ہوں اور میرے اپنوں میں ہی کچھ چہرے ایسے ہیں جو میں دیکھنا نہیں چاہتا اس لیے جا رہا ہوں شاید دور رہوں تو بھول سکوں، بہر حال۔“ وہ گہرا سانس لے کر بولا۔

”آپ سے میں ہمیشہ رابطے میں رہوں گا۔“

”ٹھیک ہے اور اپنا بہت خیال رکھنا اور یہ مت سمجھنا کہ تم پر کوئی یقین نہیں کرتا سب کرتے ہیں اور سچائی زیادہ دیر چھپتی نہیں کبھی نہ کبھی سامنے آ جاتی ہے تم اپنا دل کسی کی طرف سے برا مت کرو۔“ وہ اس کا گال تھپتھپا کر بولی تو وہ مسکرا دیا۔



وہ لاؤنج میں داخل ہوئی تو وہ خالی تھی حالانکہ کچھ دیر پہلے اسے آوازیں آرہی تھیں اس نے صوفے پر بیٹھ کر دونوں پیر بھی اور رکھ لیے اور ریמוٹ اٹھا کر ٹی وی بدلنے لگی تب ہی شیمم ہاتھ میں لفافہ لیے اندر داخل ہوئیں۔

”ای ناشتا ملے گا۔“ شیمم نے صوفے پر بیٹھنے سے

پہلے غصے سے اسے گھورا۔

”ہو گئی تمہاری صبح دوپہر کا ڈیرہ بچ رہا ہے۔“

”اوفوہ امی اب صبح صبح لیکچر شروع نہ کرویں۔“ وہ بے زار سا چہرہ بنا کر بولی۔

”یہ لیکچر ہے یہ تمہاری عمر ہے ماں سے خد متیں کروانے کی تمہاری عمر میں لڑکیاں سارا گھر سنبھال لیتی ہیں اور تم ماں کو کہتی ہو تمہیں ناشتا بنا کر دے۔“

”آپ نے نہیں دینا تو صاف بتادیں اتنا دماغ کیوں پکار رہی ہیں۔“ کاشفہ غصے سے بولتی ہوئی باہر نکل گئی۔

جبکہ اپنی ناخلف اولاد کی زبان کو شیمم کٹنی دیر کو سستی رہیں کاشفہ جب واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں چائے کا گلاس تھا۔

”یہ کیا ہے۔“ شیمم کے ہاتھ میں پکڑی تصویروں کو دیکھ کر کاشفہ نے پوچھا۔

”سہیل کے لیے۔“ شیمم کے جواب پر کاشفہ نے ابرو اچکائے۔

”بھائی سے پوچھا آپ نے۔“

”کیوں اس سے کیوں پوچھو۔“ وہ ماتھے پر ہل ڈالی کر بولیں۔

”کیونکہ شادی بھائی نے کرنی ہے اور آپ کو پتا ہے وہ لڑکی ان میں سے کوئی نہیں۔“ کاشفہ کے جتنا تے ہوئے انداز پر ایک لمحہ کے لیے ان کے ہاتھ رکے تھے۔

”جانتی ہوں اسی لیے تو کر رہی ہوں کیونکہ جو وہ چاہتا ہے میں ایسا نہیں چاہتی ناز مجھے بالکل پسند نہیں۔“ کاشفہ ان کے انداز پر مسکرائی تھی۔

”پسند تو وہ مجھے بھی نہیں لیکن یہاں بات میری یا آپ کی پسند کی نہیں۔“

”یہ بھی جانتی ہوں لیکن مجھے جو کرنا ہے وہ تو میں کروں گی۔“ کاشفہ نے بغور ان کا چہرہ دیکھا اور کندھے اچکا کر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئی۔

رات کو کھانا کھانے کے بعد وہ سب لاؤنج میں بیٹھے تھے شیمم کو لگا یہی مناسب موقع ہے جہاں بات کی جاسکتی ہے۔ وہ تصویروں والا لفافہ ہاتھ میں لیے اندر آگئی۔ ”سہیل یہ دیکھو۔“

”یہ کیا ہے امی“ سہیل نے کچھ حیران ہو کر وہ لفافہ  
تھاما۔ سہیل کے ساتھ باقی سب کی نظریں بھی اس  
سفید لفافے پر ٹھہر گئیں۔ پہلی تصویر کے بعد دوسری  
تیسری اور پھر چوتھی تصویر دیکھنے کے بعد وہ حیران  
نظروں سے ماں کا چہرہ دیکھنے لگا۔

”یہ کیا ہے“ اس کے پوچھنے پر ساتھ بیٹھے ضمیر نے  
تصویریں اس کے ہاتھ سے لے لیں۔

”یہ لڑکیوں کی تصویریں ہیں ان میں سے جو تمہیں  
اچھی لگے بتا دو تاکہ وہاں میں رشتے کی بات چلا سکوں۔“  
سہیل کے لیے یہ بات اتنی اچانک تھی کہ وہ کچھ  
لمحوں کے لیے بول ہی نہیں سکا۔ ”میں سالوں کے تم  
ہونے والے ہو۔ مجھے دو سالوں سے میں تمہارے پیچھے  
لگی ہوں شادی کرو، ہر بار تمہاری ٹال مٹول ہوتی  
ہے۔ اس ٹال مٹول کے پیچھے جو بھی کوئی وجہ ہو مجھے  
اس سے کوئی سروکار نہیں مجھے بس اب تمہاری شادی  
کرنی ہے۔“ انہوں نے سہیل کو کوئی موقع نہیں دیا کہ  
وہ ناز کا نام لے سکے اور اتنا وہ بھی جانتی تھیں کہ باپ  
کے سامنے وہ لحاظ میں ناز کا نام نہیں لے گا۔

”بھائی یہ دالی لڑکی سب سے بہتر ہے۔“ ضمیر نے  
شوخی سے ایک تصویر اس کے سامنے کی تو کاشفہ بھی  
اٹھ کر بھائیوں کے قریب آگئی۔

”شمیم بیگم میرا خیال ہے اتنا بڑا فیصلہ لینے سے پہلے  
باہمی مشورہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔“ سرور صاحب بڑی  
سنجیدگی سے پوچھ رہے تھے۔

”میں نے ابھی تو کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ ابھی صرف  
تصویریں دکھائی ہیں پھر باہمی مشورے سے ہی فیصلہ  
ہو گا۔“

”ٹھیک ہے اگر تمہیں سہیل کی شادی کا اتنا ہی  
شوق ہے تو کر دیتے ہیں لیکن اس کے لیے ضروری  
نہیں گھر گھر جا کر بچوں کو دکھا جائے جبکہ گھر میں  
بچیاں موجود ہیں۔“ شمیم کے سر پر دھماکا ہوا تھا وہی ہوا  
جس کا ڈر تھا۔ ”مطلب“ بڑی دقت سے ان کے منہ  
سے یہ لفظ نکلا تھا۔

”میں ناز کی بات کر رہا ہوں میں نے شروع سے ہی

سوچ رکھا ہے کہ سہیل کی شادی ناز سے ہوگی۔“  
سہیل جو پریشانی سے سوچ رہا تھا کیسے ناز کے بارے  
میں بات کرے ایک دم گہرا سانس لے کر ریلیکس ہوا  
تھا۔ کاشفہ نے ماں کی طرف دیکھا وہ جانتی تھی وہ اس  
وقت اپنا غصہ دبا رہی ہیں۔

”کیوں تمہیں کوئی اعتراض ہے۔“ سرور صاحب  
نے اعتراض کے بارے میں ایسے پوچھا تھا جیسے کہہ  
رہے ہو اعتراض کر کے دیکھو۔

”جب آپ نے فیصلہ کر لیا ہے تو میں کیا کہہ سکتی  
ہوں۔“

”نہیں تم کہہ سکتی ہو۔“ انہوں نے جیسے فراخ دلی  
کا مظاہرہ کیا۔

”مجھے سہیل کے لیے ناز پسند نہیں۔“

”کیوں؟“ سرور صاحب نے ماتھے پر ہل ڈال کر  
پوچھا جبکہ سہیل نے بھی بڑی سنجیدہ نظر ان پر ڈالی۔

”جوڑ نہیں بنتا دونوں کا۔ ناز کی قابلیت سے آپ  
بہت اچھی طرح واقف ہیں ہمیشہ ٹاپ کرتی رہی ہے  
اور دو سال سے لٹی نیشنل کمپنی میں بہت اچھی پوسٹ  
بروزر دست سیلری کے ساتھ کام کر رہی ہے جبکہ سہیل  
گریجویٹ نہیں یہ الگ بات ہے کہ یہ بات ہمارے  
علاوہ کسی اور کو پتا نہیں اور دوسرا سہیل جاب نہیں  
کرتا وہاں سے کبھی ہاں نہیں ہوگی۔ الٹا ہماری بے  
عزتی ہوگی۔“

”بس یہ بات تھی۔“ سرور صاحب نے جیسے ناک  
سے مکھی اڑائی۔ ”یہ تعلیم شکل و صورت و قابلیت یہ  
باتیں غیروں میں دیکھی جاتی ہیں اپنوں میں نہیں اور  
تمہیں کیا لگتا ہے اپنی اتنی قابل بیٹی کو میں غیروں میں  
بھیج دوں گا کبھی نہیں اور جہاں تک ہاں یا ناں کی بات  
ہے۔ میں جانتا ہوں میرا بھائی کبھی مجھے ناں کر ہی نہیں  
سکتا کیوں سہیل تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں“ آخر  
میں انہیں خیال آئی گیا کہ جس کی شادی کروائی ہے  
اس سے بھی پوچھ لیا جائے۔

”نہیں ابو آپ کی خوشی میں میری خوشی ہے۔“  
اس کے کہنے پر ضمیر اور کاشفہ نے مسکراتے ہوئے

کاشفہ نے قہر بھری نظروں سے اس کی مسکراہٹ دیکھی۔

”کیا ابو نے آپ کے لیے جو فیصلہ کیا ہے آپ اس سے خوش ہو۔“ کاشفہ کے سوال پر شمیم نے بھی اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

”میں ناخوش بھی نہیں ہوں۔ لیکن آپ لوگوں کا موڈ کیوں آف ہے۔“ اب کے اس نے غور سے اپنی ماں اور بہن کے بگڑے ہوئے تاثرات دیکھے۔

”کیونکہ امی کو نہ ناز باجی پسند ہیں اور نہ علیہ۔“ کاشفہ کے کہنے پر وہ سوالیہ نظروں سے ماں کا چہرہ دیکھنے لگا۔ ”کیوں امی آپ کو کیوں اعتراض ہے۔“

”بس ہے اعتراض اور کسی کو ناپسند کرنے کے لیے ضروری نہیں کوئی وجہ ہو۔“

”اچھا“ وہ مسکرایا تھا ”اچھی لاجک ہے یہ لاجک آپ نے ابو کو بھی دینی تھی۔“

”میرے ساتھ زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں نہ اپنے باپ کا ڈروادو مجھے۔“ ضمیر اٹھ کر ان کے قریب آگیا۔

”امی ناز باجی سہیل بھائی کو پسند ہیں سہیل بھائی خوش ہیں اس رشتے سے۔“

”وہ تو بس شروع سے ہی دیکھ رہی ہوں تم اپنی بات کرو۔“ اب کہ انہوں نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا۔

”ضمیر میری تو شروع سے ایسی کوئی خواہش نہیں تھی لیکن جب ابو نے علیہ کا نام لیا تو مجھے کوئی حرج بھی نہیں لگا۔ کیونکہ میرے جیسے آدمی کے ساتھ گزارا کرنے کے لیے علیہ جیسی الو لڑکی ہی صحیح رہے گی۔

”زیادہ چوں چا کرنے والی لڑکیاں مجھے پسند بھی نہیں اور دو سری اہم بات میں علیہ کے پرنسپل سے نا کر کے ابو سے دشمنی مول نہیں لے سکتا۔ ابھی تک میں بے کار ہوں اور ابو کی کمائی پر چل رہا ہوں نہ کر کے فاقوں مرتا۔“ کہہ کر اس نے بہن اور ماں کی شکل دیکھی جو اس کی بات سے اتفاق کر رہی تھیں۔ ”ویسے تم دونوں بھائیوں نے کبھی یہ سوچا ہے کہ تم لوگوں کی ماں کے

اس کا چہرہ دیکھا۔

”تو اب ان میں سے میں کوئی پسند کر لوں۔“ ضمیر نے شرارت سے ان تصویروں کی طرف اشارہ کیا۔

”نہیں بیٹا جی تمہیں بھی زحمت کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ تمہارے لیے بھی میں سوچ چکا ہوں۔

میں ناز کے ساتھ علیہ کا بھی ہاتھ مانگنے والا ہوں۔“ انہوں نے شمیم بیگم کے سر پر ایک اور دھماکا کیا تھا۔



وہ ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تھی۔ شمیم دونوں ہاتھوں میں سروے بیٹھی تھیں ایک نظر اسے دیکھ کر دوبارہ پہلی والی پوزیشن میں چلی گئیں۔

”امی یہ ہو کیا رہا ہے۔ آپ نے ابو کو منع کیوں نہیں کیا ایک ناز باجی کو برداشت کرنا مشکل تھا اوپر سے یہ علیہ

آپ جانتی ہیں وہ مجھے کتنی بری لگتی ہے۔ میں بطور کزن اسے پسند نہیں کرتی بھابھی بنانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور ابو نے کیا تماشا بنایا ہے جو وہ حکم دے دیں چاہے ہمیں پسند ہو یا نہیں ہمیں کرنا ہو گا کیا

شادیاں بھی یوں تھوپی جاتی ہیں۔ کل میری شادی کی بات ہو تو ابو کہہ دیں کہ مجھے بھی زحمت کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ میرے بارے میں سوچ چکے

ہیں تو یہ ان کی بہت بڑی غلط فہمی ہے کہ میں مان جاؤں گی مجھ پر یہ فارمولا اپلائی کرنے کی کوشش بھی نہ کریں۔ میرے ساتھ زبردستی کی ناتو میں گھر سے ہی

بھاگ جاؤں گی۔“ اتنے اشتعال سے بولنے کے بعد اس کا سانس پھول گیا تھا۔

”امی آپ سن رہی ہیں نا۔“ اپنی بات کا ری ایکشن نہ دیکھ کر اس نے ان کا کندھا ہلایا تھا اور وہ جیسے پھٹ پڑی تھیں۔

”تم نے جو بکواس کی ہے سن لی ہے میں نے تم نے بھی جو کرنا ہے کر لو میری بلا سے۔“ اس سے پہلے وہ مزید کچھ کہتیں دروازہ ٹاک کر کے ضمیر اندر آیا تھا۔

”کیا ہوا ہے آپ سب کمروں میں کیوں گھس گئے ہیں۔“ وہ مسکرا کر کہتا ہوا بیڈ پر لیٹ گیا۔ جبکہ شمیم اور

شاید سہیل یا ضمیر کی نوکری لگ گئی ہو یا ہو سکتا ہے  
ان کا رشتہ طے کر دیا ہو۔ ”ناز کیبنٹ سے کپ نکالتے  
ہوئے بولی۔

”اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کا رشتہ مانگنے  
آئے ہوں۔“ علیہ نے شرارتی انداز میں مذاق کیا تھا  
لیکن ناز کو اس کا یہ مذاق بالکل پسند نہیں آیا تھا۔  
”علیہ مجھے اس قسم کا بے ہودہ مذاق بالکل پسند  
نہیں۔“ علیہ نے ایک نظر بن کے ناراض چہرے کو  
دیکھا تو خاموش ہو گئی۔

”السلام علیکم۔“ فاخرہ اور راشد ایک ساتھ اندر  
داخل ہوئے تھے۔ ”آؤ بھئی فاخرہ اور راشد تم لوگوں کا  
ہی انتظار ہو رہا تھا۔“

”خیریت بھائی صاحب اتنی ایمر جنسی میں بلوایا آپ  
نے“ فاخرہ نے حیرت سے مٹھائی کے نوکرے دیکھ کر  
سرور صاحب سے پوچھا تھا۔

”میں کوئی سہنس نہیں رکھوں گا سیدھی سیدھی  
بات کروں گا۔ میں یہاں ناز اور علیہ کا رشتہ لینے آیا  
ہوں۔ مٹھائی اس لیے لے کر آیا ہوں کہ میں پوچھنے  
نہیں رشتہ پکا کرنے آیا ہوں اور مجھے امید ہے میرا بھائی  
مجھے انکار نہیں کرے گا۔“ ناصرہ نے فوراً ”علیم  
صاحب کا چہرہ دیکھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ وہ فوراً“  
ہاں کریں۔

”بھائی صاحب دونوں بچیاں آپ کی ہیں پر اتنی  
جلدی کیا ہے اور علیہ وہ تو ابھی گریجویٹ کر رہی  
ہے۔“ آخر کار وہ ہمت کر کے بول پڑی تھیں جواباً  
علیم صاحب نے غصیلی نظران پر ڈال کر انہیں مزید  
کچھ کہنے سے روکا تھا۔

”ناصرہ جانچ بڑتال۔ غیروں میں کی جاتی ہے اپنوں  
میں نہیں کیوں تمہیں اس رشتے پر اعتراض ہے۔“  
سرور صاحب کو ناصرہ کا بولنا برا لگا تھا۔

”نہیں بھائی صاحب ایسی بات نہیں۔“ وہ گھبرا کر  
بولیں۔ تب ہی ناز چائے کی ٹرے لیے اندر آئی تھی  
ناصرہ نے بغور اس کا چہرہ دیکھا اس کا چہرہ سیاٹ تھا  
انہیں اندازہ نہیں ہو سکا کہ وہ سن چکی ہے یا نہیں۔

”تو ای پورے کریں اپنے ارمان کس نے روکا  
ہے۔“

”کیا خاک پورے کروں اپنے ارمان۔ جینز کے نام  
تکا بھی نہیں ملنا۔ بیٹوں کی ماں کیا کچھ نہیں کرتی اور  
میں تو ہو میں بھی اپنی پسند سے نہیں لاسکی اور وہ دونوں  
بہنیں تمہارے باپ کی چہتھاں ابھی سے میرے  
سنے پر مونگ دلتی ہیں بعد میں پتا نہیں کیا کریں گی۔“  
آخر میں انہوں نے اپنی آواز میں رقت پیدا کر لی ضمیر  
نے انہیں بازو کے گھیرے میں لے لیا۔

”کیوں فکر کرتی ہیں۔ امی سہیل بھائی کا تو مجھے پتا  
نہیں لیکن خود کی میں گارنٹی دیتا ہوں علیہ وہی کرے  
گی جو آپ اسے حکم دیں گی میری طرف سے آپ کو  
پوری اجازت ہے۔ اس کے بال کھینچیں“ بھتیجی  
لگا میں مجھاؤ لگو امیں بڑتال دھلا امیں۔ جو مرضی  
کریں۔“ شمیم نے جاچتی نظروں سے اسے ہونہار  
بیٹے کا چہرہ دیکھا۔ جہاں مذاق کی رمت بھی نہ تھی۔ ان  
کے جلتے کلیجے میں کچھ تو ٹھنڈک پڑی تھی۔



ناصرہ اور علیم نے حیرت سے نیبل پر پڑے مٹھائی  
کے نوکرے کو دیکھا تھا۔

”خیریت بھائی صاحب یہ کس خوشی میں۔“ سب  
سے پہلے علیم نے سوال کیا تھا۔

”بتاتا ہوں ذرا راشد اور فاخرہ بھی آجائیں۔“  
ناصرہ نے بے ساختہ علیم کا چہرہ دیکھا جو بھائی اور بھابھی  
کے انداز سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”ناز بیٹا تم ذرا اتنی دیر میں اٹھی سے چائے بنا کر  
لاؤ۔“

”جی تایا جی۔“ وہ مسکرا کر کہتی ہوئی کچن میں  
آگئی۔ جہاں علیہ پہلے سے موجود تھی۔ اور چائے کا  
پانی رکھ چکی تھی۔

”یہ تایا جی اتنی مٹھائی کیوں لے کر آئے ہیں۔“  
علیہ کے لہجے کے ساتھ چہرے پر بھی الجھن تھی۔

سب کچھ سنتی دیکھتی فاخرہ نے پہلے اپنے شوہر کو سوالیہ نظروں سے دیکھا اور ان کی طرف سے مثبت اشارہ ملنے پر وہ بول اٹھی تھیں۔

”معذرت چاہتی ہوں میں درمیان میں بول رہی ہوں لیکن بولنا ضروری ہے۔ بھائی صاحب وہ سرور صاحب کو مخاطب کر کے بولیں۔“ جس طرح آپ کو ناز پسند ہے اسی طرح مجھے اور راشد کو علیحدہ بہت پسند ہے اور آیا تائی ہونے کے ناطے ہمارا بھی کچھ حق بنتا ہے۔ ایک بیٹی آپ کے گھر جائے گی تو دوسری بیٹی پر ہمارا بھی کچھ حق بنتا ہے۔“ فاخرہ کے کہنے پر ناصرہ نے بڑی ممنون نظروں سے اپنی جٹھالی کو دیکھا جو ان کی نظروں میں دیکھ کر تسلی دینے کے انداز میں مسکراتی تھیں۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں علیحدہ پر تمہارا ہی حق بنتا ہے۔“ سب سے پہلے بولنے والی شیم تھیں ”اور اصول کی بات بھی یہی ہے کیوں سرور صاحب“ آخر میں انہوں نے اپنے شوہر سے پوچھا تھا سرور صاحب کچھ کہنے کی بجائے تعلیم کی طرف دیکھنے لگے۔

”بولو علیم۔“ اب کے راشد صاحب بھی بولے تھے۔

”میں کیا بولوں بھائی صاحب مجھے تو ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ یوں اچانک میری پریشانیوں کا سدباب ہوگا۔“ وہ واقعی خوش ہو گئے تھے۔ سب کچھ آنا ”فانا“ طے پا گیا تھا اور جن دو کے مستقبل کا فیصلہ ہوا تھا وہ دونوں خوش نہیں تھیں لیکن یہاں زبان کھولنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔



دروازہ کھلنے پر دونوں نے چونک کر دروازے کو دیکھا جہاں ناصرہ کھڑی تھیں۔ وہ چپ چاپ خاموشی سے آکر ناز کے قریب بیٹھ گئیں۔ ابھی کچھ دن پہلے کی بات ہے جب ناز نے انہیں اپنے کولیگ کے بارے میں بتایا تھا جو اپنا پوزل بھیجنا چاہتا تھا۔ ابھی وہ سوچ رہی تھیں کیسے علیم صاحب سے بات کی جائے کہ یہ ہو گیا جو ان

کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ ”مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ یوں اچانک آجائیں گے اور رسم بھی کر جائیں گے۔“ علیحدہ نے انہی ماں کو کہتے ہوئے سنا تھا۔

”اور اگر آپ کو پتا ہوتا تو بھی آپ کیا کر سکتی تھیں۔“ جواباً ناز کا لہجہ سخت اور حتمی ہوا تھا۔

”پلیز ماما مجھے اس بارے میں کوئی بات نہیں کرنی میں شروع سے ہی سستی آرہی ہوں کہ ہمارے باپ کے لیے بیٹیاں بوجھ ہیں اور بوجھ تو پھر بونہی اتارے جاتے ہیں ٹھیک کیا پایا ہے میں اس سے زیادہ ان سے امید کر بھی نہیں سکتی تھی۔“

علیحدہ کا دکھ کچھ اور بڑھ گیا باپ کو تو کبھی پروا تھی نہیں اور ماں کو بھی ناز کی فکر تھی کسی نے اس سے پوچھا بھی نہیں کہ وہ خوش ہے یا نہیں۔ ”میں کوشش کرتی ہوں تمہارے پیار سے بات کرنے کی۔“ ناصرہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

”کوئی فائدہ نہیں ماما انا آپ کی بے عزتی ہوگی چھوڑ دیں اس بات کو کہہ رہی ہوں نا میں۔“ وہ کہہ کر لیٹ گئی تو ناصرہ سر جھکا کر باہر نکل گئیں علیحدہ کو بہن کی ناپسندیدگی پر حیرت ہوئی تھی۔ اس کے نزدیک ٹیبل بھائی بے شک بڑھے لکھے نہیں تھے پر شریف تھے ناز کو پسند کرتے تھے وہ اس کے نزدیک ہر لحاظ سے صہیب سے بہتر تھے پھر اس کی بہن خوش کیوں نہیں تھی۔

”بابی آپ خوش نہیں۔“ اس کے نکلتے ہی اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا تھا۔

”سو جاؤ علیحدہ مجھے نیند آرہی ہے لائٹ آف کرو۔“ علیحدہ نے ایک نظر اس کی پشت کو دیکھا وہ تو ناز کو تانا چاہتی تھی کہ اسے صہیب پسند نہیں لیکن وہ تو خود پریشان تھی۔ وہ چپ کی چپ رہ گئی اور اٹھ کر لائٹ آف کر دی۔

ناصرہ نے دودھ کا گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور خود بیڈ کے دوسرے کونے میں آکر لیٹ گئیں۔

”آج میں بہت خوش ہوں۔“ علیم نے ٹی وی پر

سے نظریں ہٹا کر انہیں دیکھا۔ ”مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا میرے دونوں بھائی یوں میرے سر کا بوجھ اپنے سر لے لیں گے۔“ ناصرہ نے بے ساختہ گہرا سانس لیا۔

”پھر وہی بوجھ پتا نہیں آج تک علیم صاحب کو یہ احساس کیوں نہیں ہوا ان کی بیٹیاں کتنی حساس نیک اور فرمانبردار ہیں بیٹوں سے برہم کر ہیں اگر بوجھ ہو تو انہوں نے گہرا رشتے نہ آجاتے۔“ انہوں نے گہرا سانس لے کر خود کو بات کرنے کے لیے تیار کیا۔

”آپ کو اتنی جلدی ہاں نہیں کہنا چاہیے تھا کم از کم مجھ سے ہی مسورہ کر لیتے میں بھی ان بچیوں کی ماں ہوں۔“ علیم صاحب کی پیشانی پر سلو میں پڑ گئی تھیں۔

”میری تو افسوس ہے کہ تم بچیوں کی ماں ہو۔ یہی بیٹوں کی ماں ہو میں تو تمہاری بات کو سنا لیا میں اہمیت بھی دیتا۔ کیا برا کیا میں نے تم تو چاہتی ہی ہو کہ میرے بھائی مجھ سے دور ہو جائیں۔ وہ اتنے مان سے آئے تھے اور میں انہیں انکار کر دیتا۔“ ان کے تلخ لہجے پر وہ گہرا کر بولیں۔

”میرا مطلب یہ نہیں تھا علینہ اور صہیب کو لے کر میں مطمئن ہوں لیکن ناز اور سہیل کے مزاج میں بہت فرق ہے۔“

”مثلاً“ علیم صاحب اب ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

”ایک تو سہیل کی ایجوکیشن دو سراسر اس کی چاب کوئی نہیں۔ وہ بہت جذباتی اور غصہ ور ہے چھوٹی چھوٹی باتوں پر برہم ہو جاتا ہے جبکہ ناز کا آپ کو پتا ہے وہ ان باتوں کو پسند نہیں کرتی۔ کم از کم ناز کے لیے اسی طرح کالا لف پارٹنر ہونا چاہیے تھا جس سے اس کی ذہنی ہم آہنگی ہو۔ آخر زندگی اس نے گزارنی ہے اور بھابھی وہ بالکل خوش نظر نہیں آرہی تھیں اور یہ تو میں جانتی ہوں وہ ناز کو پسند بھی نہیں کرتیں۔ ان کی عادت سے بھی آپ واقف ہیں شادی کے بعد ناز کا جینا دو بھر کر دیں گی۔“

”بول لیا تم نے۔“ ان کی اتنی طویل بات پر ان کی خاموشی محسوس کر کے وہ سمجھیں کہ وہ سمجھ رہے ہیں لیکن نہیں یہ ان کی غلط فہمی تھی۔

”ناز اور علینہ کی شادی میرے بھائیوں کے گھر ہی ہوگی اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے اور اگر تمہارے علاوہ تمہاری بیٹیوں میں سے کسی کو ذرا سا بھی اعتراض ہے تو انہیں کہو اپنا اعتراض یہیں ختم کر لیں۔ میں کوئی فضول بات نہیں سننا چاہتا اور اگر مجھے ناز یا علینہ سے متعلق کوئی بھی شکایت ملی تو میں انہیں زمین میں گاڑ دوں گا۔ مجھے اپنی عزت ہر چیز سے زیادہ پیاری ہے۔“ کہہ کر انہوں نے دوبارہ نظریں لی وی اسکرین پر لگا دیں جبکہ وہ آنسو پیتی رہ گئیں۔



صہیب کا میسج پڑھ کر وہ لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گئی تھیں۔ کیمرو آن کرتے ہی صہیب کا مسکراتا ہوا چہرہ ان کے سامنے ہی تھا۔

”کیسے ہو میری جان۔“

”میں بالکل ٹھیک ہوں ماما آپ سنائیں۔“

”میں بھی ٹھیک ہوں کیا کر رہے تھے؟“

”کچھ خاص نہیں ابھی کام سے واپس آیا ہوں۔“

”مشاور لیا اب کھانا کھانے لگا ہوں۔“

”کیا کھانے لگے ہو؟“ وہ اس کے آگے رکھی پلیٹ میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگیں۔

”دیکھ لیں۔“ اس نے پلیٹ اٹھا کر ان کے سامنے کی۔ اس میں رکھا سینڈویچ کو دیکھ کر فخر کا دل برا ہو گیا۔

”یہ کھانا ہے؟“

”اسے کھانا ہی بولتے ہیں ماما۔“ وہ بڑی رغبت سے سینڈویچ کا بائٹ لیتے ہوئے بولا۔

”گھر میں کچھ نہیں بنا تھا۔“

”ممائی کہاں ہے تمہاری؟“

”پتا نہیں میں آیا تو وہ دونوں گھر پر نہیں تھے۔“

”اور ننا شا۔“ انہوں نے اپنی بیٹی کا نام لیا۔

”وہ گھر پر تھی پر جب میں آیا تو وہ کہیں جا رہی تھی۔“ وہ اب سینڈویچ ختم کر چکا تھا اور کوک کاٹن اس کے ہاتھ میں تھا۔

”اس سے کہتے وہ کچھ بنا دیتی۔“ ان کے کہنے پر اس نے دل کھول کر قہقہہ لگایا۔

”یہ کینڈا ہے پاکستان نہیں جو میری کزن مجھے مہمان یا گھر کا فرد سمجھ کر ہی اپنا پروگرام کینسل کر کے میرے لیے کھانا بناتی اور دوسری بات یہ کہ اسے ککنگ بالکل نہیں آتی۔“ وہ ساتھ ساتھ کوک کے گھونٹ بھی بھر رہا تھا۔

”خیر چھوڑیں سب یہ بتائیں آپ سارا دن کیا کرتی ہیں۔“

”کچھ خاص نہیں بس بوری ہوتی ہوں کچھ کرنے کو ہوتا نہیں۔ آج سرور بھائی کا فون آیا کہ سب علیم کے گھر آجائیں ہم حیران ہوئے اسنے شارٹ نوٹس پر کیوں بلوایا ہے۔ وہاں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں ٹیبل مٹھائی کے ٹوکڑے سے بھرا ہے۔“ اب کی بار گری پر جھولتا صہیب رک گیا اور قدرے آگے کوچھک آیا۔

”خیر تھی۔“ وہ ناز کی بات پکی کرنے آئے تھے۔ ”صہیب“

”سن کر حیران ہوا“ اور چاچو مان گئے۔

”مان گئے خوشی خوشی مان گئے۔“

”اور آپلی وہ خوش تھیں۔“ اب کے وہ پریشانی سے بولا۔

”پتا نہیں مجھے اس کا اندازہ نہیں ہو سکا۔“

”اچھا۔“ وہ سر جھکا کر سوچ میں پڑ گیا جبکہ فاخرہ سوچ رہی تھیں کیسے بات شروع کریں۔

”صہیب تمہارا شادی کے بارے میں کیا خیال ہے۔“

”میرا۔“ وہ حیران ہوا۔ ”میرا یہاں کیا ذکر۔“

”کوئی لڑکی پسند ہے۔“

”نہیں۔“ وہ اب مسکرا دیا تھا۔

”پکی بات ہے نا۔“

”مما۔“ وہ اب قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔ ”مجھے نیند

آ رہی ہے کل بات کریں گے۔“

”صہیب روکو مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔“

”جی بولیں۔“ وہ جھمائی روک کر بولا۔

”اگر میں تمہارے لیے کوئی لڑکی پسند کروں تو تمہیں اعتراض تو نہیں ہوگا۔“

”مما۔“ وہ زچ ہو کر بولا۔

”جو پوچھا ہے صہیب وہ بتاؤ۔“ ”نہیں ممائیوں ہوگا آپ کی پسند میری پسند ہے۔“

”شبیور۔“ وہ پھر یسین مانگ رہی تھیں۔

”ہاں ممائی۔“

”تو بس پھر تیار ہو جاؤ میں نے تمہاری منگنی طے کر دی ہے۔“

”میری منگنی؟“ اسے لگا اسے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔

”ہاں تمہاری منگنی۔“

”مما۔“ وہ حیرت سے گرنے کے قریب تھا۔ ”کس سے؟“

”علینہ سے۔“ اب کی بار لگنے والا جھٹکا پہلے سے شدید تھا۔

”مما یہ سب کیا ہے میری منگنی آپ نے طے کر دی اور مجھ سے پوچھنے کی زحمت تک نہیں کی۔“

”آئی زیبا پر سب اتنا اچانک ہوا میں نے سوچا تھا کہ پہلے تم سے بات کروں گی، لیکن آج جب اچانک سرور بھائی نے بلایا تو مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ

علینہ کی بات کرنے والے ہیں۔ مجھے اور تمہارے پیلا کو بھی علینہ بہت پسند ہے۔ اگر ہم اس وقت بات طے نہ کرتے تو اتنی اچھی لڑکی ہاتھ سے نکل جاتی۔“

ان کے مسکرانے پر بھی وہ مسکرا نہیں سکا۔

”صہیب بیٹا کیا تمہیں علینہ پسند نہیں؟“

”بالکل نہیں ممائی۔“ وہ دو ٹوک انداز میں بولا۔

”لیکن کیوں بیٹا وہ تو بہت پیاری بچی ہے۔“

”مما وہ ہوگی اچھی، لیکن وہ میرے ٹائپ کی نہیں

اب اگر میں علینہ کو اپنی بیوی کے طور پر دیکھوں تو وہ

میرے ایچ پر پوری نہیں اتر رہی بچپن سے میری اس کی کبھی بنی نہیں۔ عجیب بے وقوف قصیلی سی ہے۔“ اس کی باتیں سن کر فاخرہ ہنس پڑی تھیں۔

”بس اتنی سی بات ہے۔“ اس نے آنکھیں پھیلائیں۔

”ہاں کیوں کہ تم ابھی تک علیحدہ کو اسی اینگل میں دیکھ رہے ہو چار سال سے تم نے اسے نہیں دیکھا کافی پیاری ہو گئی ہے۔“ وہ شرارتی انداز میں بولیں۔ ”اور دو سر ایٹا لڑکیاں ماں باپ کے گھر ایسی ہی ہوتی ہیں بچپنا بس رخصت ہو جاتا ہے جب وہ سسرال میں قدم رکھتی ہیں اور علیحدہ تمہارے لیے بہت اچھی بیوی ثابت ہوگی۔ یہ میں تم سے کہہ رہی ہوں۔“ وہ بولا کچھ نہیں تھا پر فاخرہ کو اس کا پر سوچ انداز صاف محسوس ہو رہا ہے۔ ”صہیب جب تمہاری اپنی کوئی پسند نہیں تو ماں باپ کی پسند پر اعتبار کر کے دیکھو۔“

”اوکے ماما جو آپ کو ٹھیک لگے فی الحال تو مجھے بہت نیند آرہی ہے۔“ اسے واقعی اتنی تھکن تھی کہ وہ سونا چاہتا تھا وہ سارا بھی وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ ”اوکے اللہ حافظ اپنا خیال رکھنا۔“

”آپ بھی۔“ اس نے لیپ ٹاپ بند کیا اور گرنے کے انداز میں بید پر لیٹ گیا۔ اگلے کچھ لمحوں میں وہ گہری نیند میں تھا۔



”جی کس سے ملنا ہے آپ کو؟“ ریسپشن پر موجود لڑکی نے بڑے مصروف انداز میں اس سے پوچھا تھا۔

”مجھے مس ناز علیم سے ملنا ہے۔“ اب کے لڑکی نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ ”آپ کون؟“

”میں ان کا منگیتر۔“ اس نے منگیتر پر زور دے کر کہا اس بار اس لڑکی نے کچھ حیرت سے اسے دیکھا اور فون اٹھا کر ایک نمبر ڈائل کیا اور ناز کا پوچھ کر فون بند کر دیا۔

”سرا ہکچو نیلی مس ناز کسی میننگ کے سلسلے میں باہر گئی ہیں۔“ سہیل کے ماتھے پر ہل پڑ گئے۔ ”کب تک وہ آئے گی؟“

”کوئی آئیڈیا نہیں سر۔“ وہ گھڑی دیکھ کر بولی۔ ”ٹھیک ہے میں انتظار کرتا ہوں۔“ لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا وہ دوبارہ فائل پر جھک گئی تھی جبکہ وہ اپنے اشتعال کو دبانے کے لیے ہنسنے لگا تھا۔

”آدھا گھنٹے انتظار کرنے کے بعد جب اس کی ٹانگیں اور ہمت دونوں جواب دے گئیں تو اس نے جانے کا سوچا تھا۔ اس سے پہلے وہ باہر نکلتا اس نے گلاس ڈور سے پار ناز کو ایک ہینڈ سم آدی کے ساتھ باتیں کرتے آتے دیکھا۔ اندر داخل ہوتے ہی ناز کی نظر سہیل پر پڑی تو نہ صرف اس کے چلتے قدم رک گئے بلکہ زبان بھی۔ وہ چہرے پر حیرت لیے اس کی طرف بڑھی۔

”تم یہاں خیریت ہے؟“ وہ حیرانگی سے اسے دیکھنے لگی۔ کیوں کہ آج سے پہلے گھر سے کوئی یوں نہیں آیا تھا۔

”ہاں خیریت ہی ہے تمہیں لینے آیا تھا پر تم تو اور ہی کہیں نکلی ہوئی تھیں۔“ اس نے طنزیہ انداز میں کہتے ہوئے کٹیلی نظروں سے ناز کے ساتھ کھڑے اس آدی کو دیکھا اور اس کی نظروں کے تعاقب میں ناز نے۔

”اظفر یہ میرے زن سہیل اور یہ میرے کو لیگ اظفر ہیں۔“

”تم نے پورا تعارف تو نہیں کروایا میرا۔ میں ناز کا منگیتر بھی ہوں۔“ سہیل کے طنزیہ اور جتاتے ہوئے انداز پر اظفر نے ایک نظر ناز کو دیکھا جو اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔

”بہت مبارک ہو آپ کو۔“ اظفر نے سہیل کو سہیل سے ہاتھ ملایا تھا۔ ”اوکے ناز آپ بات کریں میں یہ فائل باس کو دکھا دیتا ہوں۔“ وہ انہیں اکیلا چھوڑ کر خود اندر کی طرف بڑھ گیا۔ ناز نے گہرا سانس لے کر سوالیہ نظروں سے سہیل کی طرف دیکھا۔ ”گھر میں تو تم سے ملاقات ہوتی نہیں تو سوچا یہاں آکر مل لوں۔“

ہے نا جو پہلے بھی تمہیں گھر چھوڑنے آیا تھا۔“ ناز نے سہیل کی طرف دیکھتے ہوئے دل میں اس کی یادداشت کو دہرای دی تھی۔ ”ہاں“

”کافی کلوز لگتا ہے تمہارے۔“ سہیل کے چبھتے ہوئے انداز پر اس کے پاس بس خاموشی تھی۔

”مجھے تمہارا یوں لڑکوں کے ساتھ پھرنا اور ان کا تمہیں گھر ڈراپ کرنا بالکل پسند نہیں بہتر یہی ہو گا تم جاب چھوڑ دو۔“ ناز کو جیسے جھٹکا لگا تھا۔ ”کیوں۔۔۔“

”یہ جاب چھوڑ دوں کیوں۔“ ”کیوں کہ میں تمہارا ہونے والا شوہر ہوں اور میں یہ کہہ رہا ہوں۔“ ”ہونے والا لیکن ہوئے نہیں“

”تو تم یہ جاب نہیں چھوڑو گی۔“ سہیل کے انداز میں جیسے کوئی دھمکی نہاں تھی۔

”نہیں اور اگر تمہیں پسند نہیں تو تم یہ منگنی توڑ سکتے ہو۔“ کہہ کر وہ کھڑی ہو گئی تھی جبکہ سہیل کئی لمحوں کے لیے ہل بھی نہیں سکا اور پھر وہ بل پے کر کے لمبے لمبے ڈگ بھرتا گاڑی کے پاس پہنچا جہاں وہ پہلے سے کھڑی تھی۔

بطور کزن بھی سہیل اسے کبھی پسند نہیں تھا اس کو بابا جی کے علاوہ ان کے گھر کا کوئی فرد پسند نہیں تھا۔ لیکن باپ کے آگے وہ بول نہیں سکی۔ اسے لگا شاید یہی فیصلہ اس کے حق میں بہتر ہے۔ لیکن آج منگنی کے بعد بطور منیجر سہیل نے جس سوچ کا مظاہرہ کیا تھا وہ اپنا مستقبل دیکھ سکتی تھی تاریک اور ٹھنڈا۔



وہ کمرے میں لیٹی اپنی سوچوں میں الجھی تھی جب اس کا موبائل بجایا۔ اس نے اسکرین کی طرف دیکھا صہیب کی کال تھی۔ اس نے بے سادہ مسکراتے ہوئے فون آن کیا تھا ”کیسی ہیں آپ؟“ وہ چھوٹے ہی بولا۔

”میں ٹھیک ہوں تم کیسے ہو؟“

”میں بھی ٹھیک ہوں آپ یہ بتائیں یہ میں کیا سن رہا ہوں آپ سہیل بھائی سے منگنی کس کے کہنے پر

”یہ میرا آفس ہے سہیل۔“ اس نے ناگواری کو بمشکل کنٹرول کر کے کہا تھا۔

”جانتا ہوں میں بھی یہی سمجھا تھا پر یہاں تو کچھ اور معاملہ ہی لگ رہا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ سہیل کے طنزیہ انداز پر اب وہ غصے سے بولی تھی۔

”کچھ نہیں ابھی چلو میرے ساتھ لنچ اکٹھے کرتے ہیں۔“ ناز نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ”ابھی مشکل ہے پھر کبھی۔“

”کیوں منگیتر کے ساتھ جاتے تمہیں مشکل لگ رہا ہے اور کوئی لگ کے ساتھ تو بڑی خوش نظر آ رہی تھیں۔“ ناز کوئی سخت بات کہنا چاہتی تھی لیکن جہاں وہ کھڑی تھی وہاں اس کی عزت تھی وہ اپنا تماشا نہیں بنا سکتی تھی سو خاموشی سے کاؤنٹر کی طرف مڑ گئی اس لڑکی سے کچھ کہا اور اس کے قریب آکر بولی۔ ”چلو“ وہ دونوں مکمل خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے جب سہیل نے اس خاموشی کو توڑا تھا۔

”مجھے امید نہیں تھی کہ تم میرے ساتھ آؤ گی“ اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا بس خاموشی سے پلیٹ میں چمچ گھمائی رہی۔

”تم اس منگنی سے خوش نہیں؟“ سہیل کے سوال پر اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”تم یہ پوچھنے کے لیے مجھے یہاں لائے ہو“ ”یہ میرے سوال کا جواب نہیں۔“

”اس سوال کا جواب بنا بھی نہیں۔“ ”تمہارا رویہ تو یہی کہتا ہے کہ تم خوش نہیں۔“

”تمہاری غلط فہمی ہے۔“ وہ کہہ کر دائیں طرف دیکھنے لگی۔

”تو تم اتنی بے زار اور خاموش کیوں ہو۔“ ”میں تو ہمیشہ سے ہی ایسی ہوں یہ الگ بات ہے کہ

تم نے نوٹ اب کیا ہے۔“ اس نے چمچ پلیٹ میں رکھ کر پلیٹ پیچھے کھسکا دی۔ سہیل اب پر سوچ انداز میں اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

”تمہارا یہ جو کوئی ابھی تمہارے ساتھ تھا یہ وہی

مان گئیں۔ "ناز کے مسکراتے ہونٹ سکڑ گئے تھے اس کی خاموشی پر صہیب زور سے بولا تھا "آلی"

"ہاں صہیب سن رہی ہوں۔" وہ جھکے ہوئے انداز میں بولی تو صہیب چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا۔ "میں تو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔"

صہیب کے کہنے پر وہ استہزائیہ انداز میں مسکرائی۔

"اے قسمت کہتے ہیں میرے بھائی۔"

"پر آپ کو چاچو کو اظفر بھائی کے بارے میں بتانا چاہیے تھا۔ وہ ہر لحاظ سے آپ کے مطابق تھے۔"

ناز صہیب کو اظفر کے بارے میں بتا چکی تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔

"میں مناسب وقت کا انتظار کر رہی تھی کہ پیلا سے بات کروں لیکن تایا جی ہیں اچانک آکر سب طے کر جائیں گے یہ مجھے پتا نہیں تھا اور اس وقت میں کچھ کہتی تو پیلا کی انسٹل ہوتی تم تو پہلے ہی جانتے ہو ہم ان کے لیے بیٹیاں کم اور بوجھ زیادہ ہیں۔" اس نے کہہ کر گہرا سانس لیا۔ "اور اظفر بھائی۔"

"اس کو تو میں نے بتایا نہیں تھا پر کل سیل آفس آگیا۔" اور پھر جو اس نے کہا ناز نے صہیب کو بتا دیا۔

"اظفر بھی اب مجھ سے بات نہیں کر رہا۔"

"آلی وہ سب گھر والے ایسی ہی ذہنیت کے مالک ہیں آپ کچھ کریں مجھے آپ کی فکر ہو رہی ہے۔"

"میں کیا کر سکتی ہوں صہیب۔" وہ بے بسی سے بولی۔ "لیکن میں علیحدہ کے لیے خوش ہوں وہ اس خود غرض فیملی کا حصہ بننے سے بچ گئی مجھے یقین ہے تم اسے بہت خوش رکھو گے۔" اس کے اتنے یقین پر وہ چپ کا چپ رہ گیا۔ اس نے تو ناز کو فون اس لیے کیا تھا کہ وہ علیحدہ سے شادی نہیں کرنا چاہتا پر یہاں تو اس سے کافی امیدیں بندھ گئی تھیں۔

"تو کیا علیحدہ بھی خوش ہے۔" وہ سوچ میں پڑ گیا ہیلو صہیب تم سن رہے ہونا۔

"جی آلی" وہ دھیمی آواز میں بولا۔

"تم اس رشتے سے خوش تو ہونا صہیب تمہاری

مرضی ہے نا۔" ناز کے لہجے میں اندیشے بول رہے تھے۔

"علینہ خوش ہے" اس نے دل میں آیا سوال کر ڈالا۔

"اے کیا اعتراض ہو سکتا ہے صہیب اس کے دل و دماغ بالکل صاف ہیں اور اس پر پہلا نام تمہارا لکھا گیا ہے اور میں اسے اس کی خوش قسمتی مانتی ہوں کیونکہ صہیب وہ اتنی تیز نہیں کہ تائی جی کی فیملی کی چالاکیوں کا جواب دے پاتی اور نہ ضمیر جیسا گندہ آدمی میری خالص جذباتوں والی بہن کے قابل ہے۔"

"ہوں۔" وہ ہنکارا بھر کے رہ گیا۔

"پاکستان کب آرہے ہو۔"

"جلد ہی۔" پھر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس نے فون بند کر دیا۔



کاشفہ کتنی دیر تک ساکت بیٹھی رہی جبکہ اپنی خوشی سے نکلنے کے بعد شمیم نے بیٹی کے انداز ملاحظہ کیے "تمہیں کیا ہوا ہے"

"امی علیحدہ کی مسئلہ صہیب سے ہو گئی ہے۔"

"ہاں تو اس میں حیران ہونے والی کیا بات ہے یہ تو خوشی کی بات ہے ایک بلا سے تو جان چھوٹی اب میں اپنے ضمیر کے لیے اپنی مرضی کی ہسولواؤں گی۔"

"برائی مجھے تو لگا چچی صہیب کے لیے میرا رشتہ مانگیں گی۔" اب کہ وہ روہاسی ہو کر بولی تو شمیم چونکیں اور پھر سمجھ آنے پر بھڑکیں۔ "دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔"

"امی مجھے صہیب اچھا لگتا ہے۔"

"بکو اس بند کرو اتنی مشکل سے علیحدہ سے جان چھوٹی ہے اب تم شروع ہو جاؤ۔ ہو گئی اس کی سنگین صہیب سے اب منہ بند کرو۔ میں نے تمہارے لیے پتا نہیں کیا کیا سوچ رکھا ہے پر یہ بہن بھائی وہی کنویں کے مینڈک۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی اٹھ گئیں جبکہ بعد میں کاشفہ کافی دیر تک بڑبڑاتی رہی۔

”علینہ“ ناز تیزی سے بولتی ہوئی اندر داخل ہوئی تو وہ دونوں جیسے حرکت میں آئے۔

”صہیب“ ناز کی پکار میں حیرت نما خوشی تھی۔ وہ ایک دم آگے بڑھ کر اس کے ساتھ لگ گئی۔ ”تم کب آئے اتنی اچانک بتایا بھی نہیں۔“

”میں صبح آیا تھا ابھی سو کر اٹھا تو پہلے آپ کی طرف آیا ہوں“ اس کی بات سن کر ناز نے شرارتی انداز میں علینہ کو دیکھا جواب بھی حیران نظر آرہی تھی ”ہاں بھی! یہاں پہلے آنے کی وجہ سمجھ بھی آتی ہے۔“ اور صہیب اس کی شرارت سمجھ کر جھنجھلا نہیں مسکرایا تھا۔

”اور آپ کی بہن کو تو مجھے دیکھ کر اتنی خوشی ہوئی ہے کہ کہہ سکتے ہی ہو گیا ہے۔“ اس کے شرارتی انداز پر علینہ اپنے تاثرات چھپانے کے لیے جھک کر کرجیاں سینٹے لگی۔ ”تم نے کی ہوگی کوئی شرارت۔“

”میں سمجھا آپ ہیں۔“ وہ کھل کر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”علینہ اچھی سی چائے بناؤ صہیب کے لیے اور کل جو گاجر کا حلوہ بنایا تھا وہ بھی گرم کر کے لے آؤ اور تم چلو ماما پاپا سے مل لو بہت دیکھ لیا اپنی منگیتر کو“ اس کو علینہ کی طرف دکھایا کروہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کہتے ہوئے اسے اندر لے گئی جبکہ علینہ نے کب سے روکی ہوئی سانس خارج کی تھی وہ اپنی ہی کیفیات کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ ایک طرف نا پسندیدگی تھی اور دوسری طرف اسے دیکھ کر دل کی دھڑکن معمول سے ہٹ کر چلنے لگی تھی۔



اس کے آنے کی خوشی میں ناخرہ نے سب کی دعوت کی تھی وہ سب کھانا کھانے کے بعد اب اوچ میں جمع تھے۔ صہیب کو دیکھ کر شمیم کو جیسے کسی نقصان کا احساس ہوا تھا۔ کتنا شاندار لگ رہا تھا اور حقیقتاً اسے اس علینہ کی بجائے ان کی بیٹی کا شفق کا نصیب بننا چاہیے تھا پر واہ ری قسمت۔ وہ افسوس کے علاوہ اور کیا کر سکتی تھیں۔

اس نے سربراہنہ دیا تھا اچانک آکر اور اسے سامنے دیکھ کر ناخرہ اور راشد کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا تھا۔ اس نے ڈٹ کر ناشتا کیا اور پھر ایک لمبی نیند کے بعد شاور لینے کے بعد وہ بالکل فریش تھا۔ ”آپ نے کسی کو بتایا تو نہیں کہ میں آیا ہوں۔“

”نہیں مجھے پتا ہے تم نے ان کو بھی سربراہنہ دنا ہوگا۔“ ناخرہ نے مسکرا کر کہا تو وہ بھی مسکرا دیا۔ ”میں ذرا ناز آتی سے مل آؤں۔“ اس کی بات پر ناخرہ شرارت سے کھانسی تھیں۔ ”ناز سے یا علینہ۔“

”مما پلیز۔“ ان کے شرارتی انداز پر وہ جھنجھلا کر بولا اور باہر نکل گیا۔ تینوں پورشن کے درمیان دروازے تھے جو ان تینوں پورشن کو آپس میں ملاتے تھے وہ دروازہ کھول کر علیم صاحب کے پورشن کی بیک سائیڈ پر داخل ہوا جہاں کچن کا دروازہ کھلتا تھا وہ چپکے سے آگے بڑھا کچن کا جالی کا دروازہ کھلا تھا اور کھڑکی سے اس کو نیلا آجیل بھی نظر آیا۔ وہ جانتا تھا اس وقت ناز کچن میں ہوتی ہے وہ اسے ڈرانے کے ارادے سے آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر بڑھا ہاؤ کی آواز کے ساتھ سامنے کھڑا جو دا پھل کر پلٹا اور ہلکی چیخ کے ساتھ ہاتھ میں پکڑا کپ زمین بوس ہو چکا تھا۔ صہیب نے دیکھا دونوں ہاتھ ہونٹوں پر رکھے سہمی ہوئی آنکھیں اس پر جمی تھیں اور وہ آنکھیں یقیناً ”ناز کی نہیں تھیں ہاتھ ہونٹوں سے ہٹ گئے تھے اب وہاں ڈر کی جگہ حیرت تھی۔ وہ علینہ تھی۔ وہ واقعی علینہ تھی کیا پہلے بھی اتنی خوب صورت تھی یا اسے آج لگ رہی تھی۔ علینہ اس کے یوں ٹکڑ ٹکڑ دیکھنے پر جیسے ہوش میں آئی اس کی نظریں جھک گئی تھیں لیکن الفاظ جیسے گم ہو گئے تھے وہ اتنی حواس باختہ ہو گئی تھی اسے یوں سامنے دیکھ کر اس کی پلکیں لرزینے لگی تھیں۔ اور صہیب کو خود پر حیرت ہو رہی تھی وہ اس کو یوں دیکھ رہا ہے جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔

اس نے علیہ کا کتایا ہوا انداز بھی نوٹ کیا اور صہیب کی پرشوق نظریں بھی۔ وہیں اس نے ایک منصوبہ بنا ڈالا تھا۔

وہ بچن میں برتن رکھنے آئی تھی جب سہیل بھی اٹھ کر اس کے پیچھے آگیا۔ اپنے پیچھے آہٹ محسوس کر کے وہ مڑی اور پیچھے کھڑے سہیل کو دیکھ کر اسے کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی ”کچھ چاہیے تھا۔“ وہ سہیل سے پوچھ رہی تھی ”تم مجھے اگنور کر رہی ہو“ وہ یوں بولا جیسے بڑے ضبط سے کام لے رہا ہو۔

”ایسی کوئی بات نہیں“ وہ کاؤنٹر کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

”میں چاہتا ہوں تم جاب چھوڑ دو۔“ اس نے سیدھا سیدھا وہ کہہ دیا جو وہ کہنے آیا تھا۔

”پر کیوں“ کیوں کہ تمہارا یوں غیر مردوں کے ساتھ کام کرنا اور ان کے ساتھ باہر جانا مجھے بالکل پسند نہیں اور میں تمہارا منگیتر ہوں تمہیں وہ ہی کرنا چاہیے جو مجھے پسند ہو۔“ چند لمحوں کے لیے ناز کچھ بول ہی نہیں سکی پھر گہری سانس لے کر بولی۔ ”میں جاب نہیں چھوڑوں گی وہ بھی تمہارے کہنے پر کیوں کہ میں ابھی اپنے باب کے گھر میں ہوں اور ان کی پابند ہوں اور جہاں تک تمہاری بات ہے تم منگیتر ہو شوہر نہیں جو میں تمہارا حکمرانوں“ وہ بھی بڑے ضبط سے جواب دے کر نکلنے لگی تھی کہ سہیل کی دھمکی پر وہیں رک گئی۔ ”تو پھر مجھے چاچو سے بات کرنی پڑے گی ان کی زبان تو تمہیں صحیح طور پر سمجھ میں آئے گی۔“ ناز نے بڑے دکھ سے اسے دیکھا۔ ”جو تمہیں ٹھیک لگے۔“ وہ کہہ کر نکل گئی تھی جبکہ غصہ کے مارے سہیل کی مٹھیاں بھیج گئی تھیں۔

کل اس کا ٹیسٹ تھا لیکن بہت کوشش کے باوجود وہ کتاب پر دھیان نہیں دے پا رہی تھی سوچیں بار بار بھٹک کر صہیب کی طرف چلی جاتیں تھیں۔ صہیب ویسا تو نہیں لگ رہا تھا جیسے صہیب کو بچپن سے جانتی تھی ”ہیلو کزن“ اپنے پیچھے سے آئی آواز پر وہ چونک مڑی ضمیر چلتا ہوا اس کے سامنے والی کرسی پر

صہیب سب کے ساتھ خوش گہیوں میں مصروف تھا۔ سوائے ضمیر کے اس سے سلام کے علاوہ صہیب نے — کوئی دوسری بات نہیں کی تھی اور نہ ضمیر نے کیونکہ صہیب بھولا نہیں تھا جو ضمیر نے اس کے ساتھ کیا تھا اور نہ ضمیر۔ بچپن سے ضمیر کو صہیب سے جو حسد تھا وہ وقت گزرنے کے ساتھ بڑھا تھا۔ یہ جو پانچ سال درمیان میں آئے تھے تو ضمیر کو لگا سب ختم ہو گیا لیکن آج اسے سامنے دیکھ کر اسے لگا نہیں وہ حسد اور نفرت پہلے سے بڑھ گئی ہے کیونکہ آج صہیب پہلے سے زیادہ شاندار اور کامیاب تھا۔

جب اسے پتا چلا تھا کہ علیہ کی منگنی اس کے بجائے صہیب سے ہو گئی ہے تو اسے رتی بھر افسوس نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ علیہ کو اس نے کبھی اس نظر سے دیکھا ہی نہیں تھا اور وہ جانتا تھا صہیب علیہ کو پسند نہیں کرتا اول تو وہ منع کر دے گا اور نہ بھی کیا تو مجبوری کے تحت بندھے بندھن میں کتنی دیر بندھ سکے گا، کبھی خوش نہیں رہ سکے گا اور یہی تو ضمیر چاہتا تھا کہ وہ کبھی خوش نہ رہے۔ لیکن اب معاملہ الٹ نظر آ رہا تھا یہاں سب موجود تھے علیہ سمیت اور صہیب کی نظریں بار بار بھٹک کر علیہ پر ٹھہر جاتی تھیں۔

وہ ٹرائی گھسیٹی ہوئی آئی اور اب چائے کیوں میں ڈال کر سب کو سرو کر رہی تھی اس کی نظریں جھکی تھیں لیکن کسی کی نظروں کا مسلسل احساس اسے ڈسٹرب کر رہا تھا۔ اس نے بے چین ہو کر آنکھیں اٹھائیں اور وہ بے ساختہ صہیب کی طرف انھیں اور وہ بڑے غور سے اسے ہی دیکھ رہا تھا اور اس کے دیکھنے پر وہ اس انداز میں مسکرایا کہ چائے کا کپ اس کے ہاتھ میں کانپ کر رہ گیا۔ وہ کپ لے کر سائیڈ والے صوفے پر جا کر بیٹھ گئی جہاں صہیب کی نظر اس پر نہ پڑ سکے۔ جبکہ صہیب کی مسکراہٹ دیکھ کر ضمیر کو اپنے چاروں طرف آگ دھکتی محسوس ہوئی حسد کی آگ جو دوسروں کے ساتھ خود کو بھی جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔

اگر بیٹھ گیا۔ ”کیا سوچا جا رہا ہے“ کچھ نہیں کل کے ٹیسٹ کی تیاری ہو رہی ہے۔ ”اس نے سامنے رکھی کتاب اٹھا کر کہا۔

”اچھا مجھے لگا تمہارا دھیان کہیں اور تھا“ وہ کہہ کر غور سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

”نہیں تو۔“ وہ نظریں چرا کر بولی۔

”تم خوش ہو“ ضمیر کے سوال پر وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”صہیب کے ساتھ منگنی ہونے پر“ اب کی بار بھی وہ خاموش رہی تھی بس نظریں جھکالی تھیں۔

”تم کچھ نہ بھی کہو لیکن میں جانتا ہوں تم خوش نہیں۔ اور صہیب کے ساتھ کوئی خوش رہ بھی نہیں

سکتا یہ بات مجھ سے زیادہ بہتر اور کون جانتا ہے۔ دنیا کی ہر برائی اس کے اندر ہے۔ بچپن سے ہی لڑکیوں میں

اس کی دلچسپی ضرورت سے زیادہ ہے۔ لڑکیوں سے دوستی کرنا ان کو ڈیٹ پر لے جانا اس بات کا میں گواہ

ہوں اور کینیڈا جا کر تو جو روک ٹوک اس پر تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔ میں نے سنا ہے وہاں بھی اس کی گرل فرینڈز

تھیں۔ یہاں تو بات ملنے کی حد تک محدود بھی پر وہاں تو تمہیں پتا ہے کتنا کھلا ماحول ہوتا ہے تم سمجھ ہی گئی

ہو گی۔“ علیحدہ نے بے ساختہ اپنا نچلا ہونٹ کھلا تھا تاکہ آنسو آنکھ سے باہر نہ آئیں۔

”مجھے پتا ہے تمہیں تکلیف ہو گی یہ سن کر لیکن میں تمہیں تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ ہم کزن ہیں

بچپن کے ساتھی ہیں۔ میں جانتا ہوں تم کیسی ہو اور چاہتا ہوں تمہیں تمہاری طرح کا نیک لڑکا ملے

”صہیب جیسا عیاش آدمی تمہارے قابل نہیں۔“ اور اب کی بار کنٹرول کرنے کے باوجود آنسو اس کے

گالوں پر پھیلنے لگے۔ اس کی آنکھیں جھکی تھیں وہ دیکھ نہیں سکی سامنے والے کے چہرے پر اپنے مقصد میں

کامیاب ہونے کی خوشی پھیلی ہے۔

”تمہارے آنسو مجھے تکلیف دے رہے ہیں علیحدہ۔“ اس نے ہاتھ برہا کر اس کے آنسو صاف کرنے چاہے لیکن وہ جھجک کر پیچھے ہٹی ضمیر نے

شرمندہ ہو کر ہاتھ پیچھے کر لیا۔ ”امی اور ابو کو ناز باجی کے علاوہ تمہارا ہاتھ بھی مانگنا چاہیے تھا لیکن راشد چاچو کے بات کرنے پر سب خاموش ہو گئے مجھے لگا تم منع کر دو گی اس لیے میں بولا نہیں لیکن اب سب دیکھ کر میں خود کو روک نہیں سکا۔“

”کچھ بولو علیحدہ۔“ اس کی مسلسل بکواس کرنے پر اس کی خاموشی بروہ کوفت زدہ ہو کر بولا۔

”کیا بولوں ضمیر بھائی آپ جانتے ہیں پاپا کو میرے کچھ کہنے سے ان کا فیصلہ نہیں بدلے گا۔“ وہ بے بسی سے بولی تو ضمیر کھسک کر کچھ آگے ہوا۔

”اگر تم میرا ساتھ دو تو میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔“ علیحدہ نے قدرے چونک کر اسے دیکھا۔

”تم صہیب سے جا کر کہو کہ تم اس کو پسند نہیں کرتی اور نہ ہی اس سے شادی کرنا چاہتی ہو۔“

”میں“ وہ کھرا کر بولی ”میں ایسا نہیں کر سکتی“ ضمیر نے ناگواری چھپانے کے لیے چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔

”اگر تم انکار نہیں کرو گی تو میں کیا کوئی بھی تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکے گا پھر شادی کے بعد

دیکھنا اسے روز کسی نئی لڑکی کے ساتھ“ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ ”لیکن اگر تم انکار کر دیتی ہو تو میں تم سے شادی

کروں گا۔“ آخر میں وہ مسکرا کر بولا تو علیحدہ کتنی دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی یہاں تک کہ وہ چلا گیا تھا۔ لیکن جیسے فیصلے کی سولی پر لٹکا گیا تھا۔



کچھ دیر تو دروازے کے باہر کھڑی الفاظ ترتیب دیتی رہی کہ اسے بات کہے کرنی ہے اور پھر گرا سانس لے کر اس نے دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلنے پر علیم

صاحب نے اسے دیکھا ”پاپا مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“

”ہاں آؤ“ انہوں نے کتاب بند کر دی اور عینک اتار کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی۔ ”پاپا کل آفس کی میٹنگ

ہے جس کے لیے آفس کے کچھ لوگوں کو کراچی جانا

ہے ان میں میرا نام بھی شامل ہے۔ تو اگر آپ اجازت دیں تو میں چلی جاؤں۔“

”ہوں۔“ اس کی بات سن کر انہوں نے ہنکارا بھرا۔ ”کل سہیل بھی میرے پاس آیا تھا۔“ ناز نے بے ساختہ گہرا سانس لیا۔ وہ جانتی تھی اب کیا ہوگا۔

”وہ کہہ رہا تھا اسے تمہارا جواب کرنا پسند نہیں اس نے تم سے بات کی تو تم نے بد تمیزی سے جواب دیا۔“ ناز نے سن کر افسوس سے سر ہلایا۔

”یہ کیا آج تک میں نے کبھی آپ کو شکایت کا موقع دیا ہے یا آپ کو لگتا ہے میں بد تمیزی کر سکتی ہوں۔“ اس کی سوالیہ نظروں کے جواب میں وہ خاموش رہے۔

”بیٹا میں یہ نہیں کہتی آپ نے جو فیصلہ میرے لیے کیا ہے وہ غلط ہے۔ یقیناً میرے لیے آپ سے اچھا کوئی نہیں سوچ سکتا۔ پر یہ سہیل کالی ہیوسٹر بہت عجیب ہے۔ اس دن وہ میرے آفس آیا۔ میں کو لیگز کے ساتھ میننگ پر تھی۔ تب بھی اس نے برے الفاظ استعمال کیے۔ وہ مجھ پر شک کرتا ہے۔ فضول کا رعب جھاتا ہے۔ ایک آدمی کو مجھ پر یقین ہی نہیں تو وہ کسے میرے ساتھ زندگی گزارے گا۔ یا یوں قدم قدم پر مجھے ذلیل کرے گا۔“ آخر میں وہ رو ہی پڑی تھی۔ کیونکہ اتنے دنوں سے اکیلے خود سے لڑ لڑ کر وہ تھک گئی تھی۔ علیم صاحب نے بے ساختہ پہلو بدلا۔ کیونکہ زندگی میں پہلی بار ناز نے یوں سامنے بیٹھ کر ان سے کوئی بات کی تھی ”نہیں بیٹا وہ کبھی تمہیں ذلیل کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔“ ناز بس سر جھکا کر اپنی ہتھیلیوں کو دیکھنے لگی۔

”تم فکر نہیں کرو میں سہیل سے بات کروں گا تم نے میننگ پر جانا ہے ضرور جاؤ۔“ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے تو خوشی کے مارے وہ بول ہی نہیں سکی۔ ”تھینک یو بیبا۔“ وہ ان کے ہاتھ چوم کر باہر نکل گئی۔ اس کی اس حرکت پر پہلے وہ حیران ہوئے اور پھر کھل کر مسکرائے تھے۔

وہ باہر آئی تو ناصرہ کے ساتھ صہیب کھڑا تھا۔ وہ

اسے دیکھ کر خوش ہو گئی۔

”چلیں آبی جلدی سے تیار ہو جائیں میرا آفس کریم کھانے کا موڈ ہو رہا ہے۔“ وہ ہنس پڑی تھی۔ موڈ تمہارا ہو رہا ہے اور مجھے ساتھ لے کر جانا چاہتے ہو۔ کہیں تم میری آڑ میں کسی اور کو تو نہیں لے کر جانا چاہتے ناز کے کہنے پر اس نے درزیدہ نظر مسکراتی ہوئی ناصرہ پر ڈالی اور چابی سے سر کھجانے لگا۔ ”چلیں نا آبی۔“

”ٹھہرو میں علیحدہ کو بھی لے کر آتی ہوں۔“ وہ مسکراتی ہوئی کمرے کی طرف مڑ گئی ”چچی آپ بھی چلیں“

”نہیں بیٹا مجھے معاف رکھو تم بچے جاؤ میں ذرا تمہارے چاچو کے لیے روٹیاں ڈال لوں۔“

”جی۔“ وہ مسکرا کر سیٹی کے انداز میں گانا گنگنانے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی دس منٹ سے زیادہ ہو گئے تھے۔ وہ مسکراتا ہوا دبے پاؤں ناز اور علیحدہ کے کمرے کی طرف بڑھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی تو علیحدہ چہرے پر تکیہ لے کر لیٹی تھی۔ ”علیحدہ جلدی سے ریڈی ہو جاؤ صہیب ہمیں لینے آیا ہے آفس کریم کھانے جائیں گے۔“ وہ جلدی سے وارڈروب سے اپنے اور اس کے کپڑے نکالتے ہوئے بولی۔

”کرنا پڑے گی۔“ اس نے دونوں ہینگر سامنے کیے لیکن وہ ہنوز اسی پوزیشن میں تھی۔

”علیحدہ۔“ اب کی بار اس نے قریب جا کر تکیہ اس کے چہرے سے ہٹایا اور دھک سے رہ گئی اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

”کیا ہوا علیحدہ۔“ وہ ایک دم گھبرا کر اس کے قریب بیٹھ گئی اور وہ ایک دم روتے ہوئے ناز سے اپٹ گئی۔

”بابی مجھے شادی نہیں کرنی۔“ ”کسے“ ”کیا مطلب۔“ ناز نے اس کی بال سہلاتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے صہیب بھائی سے شادی نہیں کرنی۔“ ناز کا بال سہلاتا ہوا ہاتھ رک گیا تھا اس نے اس کا چہرہ اپنی

آنکھوں کے سامنے کیا۔ ”کیا کہا تم نے“  
 ”باقی مجھے صہیب بھائی سے شادی نہیں کرنی۔  
 آپ جانتی ہیں مجھے وہ اچھے نہیں لگتے اور آپ کو یاد  
 ہے نا وہ بچپن سے ہی مجھے کتنا تنگ کرتے رہے ہیں ان  
 کا بی، سویر میرے ساتھ کتنا روڈ تھا۔“

”پاگل وہ بچپن کی بات تھی۔ اب اور بات ہے۔“  
 ناز نے اسے پکارا ”لیکن آپ کی کرکٹر کے حساب سے وہ  
 کیسے ہیں سب جانتے ہیں چاچو نے انہیں کیوں کینیڈا  
 بھیجا تھا جانتی ہے نا کیونکہ یہاں کسی لڑکی کے ساتھ ان  
 کا افسر تھا اور کینیڈا میں بھی وہ یہی سب کچھ کرتے  
 رہے ہیں آخر میرا کیا قصور ہے کہ مجھے صہیب بھائی  
 کی صورت میں سزا دی جا رہی ہے۔“ وہ اب رونے  
 لگی تھی۔

”کس نے کہا تمہیں یہ سب۔“ ناز کا انداز بہت  
 سنجیدہ تھا۔

”مجھے ضمیر بھائی نے بتایا کہ وہ یہاں کئی لڑکیوں سے  
 فلرٹ کرتے رہے ہیں اور کینیڈا میں بھی ان کی گرل  
 فرینڈ ہے جس سے ان کے تعلقات گرل فرینڈ سے بھی  
 زیادہ ہیں۔“ کہنے کے ساتھ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ  
 چھپا کر رونے لگی۔

”بکواس کرتا ہے ضمیر وہ خود ایسا ہے صہیب کے  
 اوپر جو الزام اس نے لگایا تھا وہ اپنی غلطی چھپانے کے  
 لیے اس نے کیا تھا صہیب نے کینیڈا جانے سے پہلے  
 سب مجھے بتایا تھا۔ اور صہیب کو میں بہت اچھی طرح  
 جانتی ہوں وہ صاف کروار کا مالک ہے اگر ایسا کچھ ہوتا نا  
 علینہ تو میں سب سے پہلے انکار کرتی۔ تم تو لکی ہو پاگل  
 جس کو صہیب جیسا لافسار ٹر ملے گا۔“

علینہ نے کچھ کہنے کے لیے سراٹھایا لیکن نظریں  
 دروازے پر جیسے جم گئی اس کے چہرے کے تاثرات  
 جس تیزی سے بدلے تھے ناز نے بے ساختہ مڑ کر دیکھا  
 صہیب پلٹ رہا تھا۔ سب کچھ اتنا اچانک تھا کہ کچھ  
 لمحوں کے لیے ناز اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکی۔ اس  
 نے دوبارہ علینہ کی طرف دیکھا جس کا رنگ بالکل  
 سفید پڑ گیا تھا۔ اگلے ہی پل ناز تیزی سے باہر کی طرف

بھاگی۔ لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے صہیب کی گاڑی  
 جا چکی تھی وہ ان ہی قدموں سے واپس کمرے میں آئی  
 اور اس کو دیکھتے ہی بے چینی سے کمرے میں مسلتی  
 علینہ اس کی طرف بڑھی۔ لیکن ناز اس کی طرف  
 متوجہ نہیں تھی وہ اپنے موبائل پر صہیب کا نمبر ملا  
 رہی تھی۔ پہلے تو بیل جا رہی تھی اور اس کے بعد فون  
 پاور آف ہو گیا تھا۔ ناز نے بے ساختہ نچلا ہونٹ  
 دانتوں سے کچلا۔

”بہت برا ہوا علینہ بہت برا اپنے پاؤں پر تم نے  
 خود کلہاڑی ماری ہے اب اگر صہیب نے کوئی شدید  
 ری ایکشن دیا تو جانتی ہو کیا ہوگا؟ کیا کہو گی بیبا سے؟“  
 کہہ کر ناز نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔  
 جبکہ علینہ اپنی کیفیات سمجھنے سے قاصر تھی وہ یہی  
 چاہتی تھی کہ صہیب سے اس کی شادی نہ ہو اگر اس  
 نے سن لیا تو اچھا تھا لیکن پھر بھی کوئی بات تھی جو اسے  
 غلط ہونے کا احساس دلا رہی تھی۔ اس کے بعد ان  
 دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی ناز و رات  
 تک صہیب کے نمبر پر ٹرائی کرتی رہی۔ لیکن وہ  
 مسلسل بند جا رہا تھا تھک کر وہ سو گئی تھی۔ صبح اسے  
 سیننگ کے لیے کراچی جانا تھا۔ صہیب اور علینہ  
 کے مسئلے کو اس نے واپسی تک کے لیے ملتوی کر دیا تھا  
 اس بات سے بے خبر کہ اس کی زندگی میں خود ایک بڑا  
 مسئلہ آئے والا ہے۔“



”تم کلج نہیں گئیں اسے کمرے سے نکلتے دیکھ کر  
 ناصرہ نے حیرت سے پوچھا تو وہ سر فنی میں ہلا کر ڈانٹنگ  
 ٹیبل کی کرسی پر بیٹھ گئی۔“  
 ”تمہارا تو ٹیسٹ تھا نا۔“ انہیں حیرت ہوئی کیونکہ  
 وہ کوئی ٹیسٹ مس نہیں کرتی تھی۔  
 ”جی میری طبیعت ٹھیک نہیں سر میں درد تھا تو میں  
 تیاری نہیں کر سکی۔“  
 ”ہوں تم ناشتا کر لو میں تمہیں کوئی پین کھرو دیتی  
 ہوں۔“ وہ غائب دماغی سے سر ہلا کر چائے پینے لگی۔

ساری رات وہ سو نہیں سکی تھی وہ جو باتیں اس نے ناز کے سامنے کی تھیں وہ باتیں سب کے سامنے کہنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ اسے اپنے باپ سے خوف آتا تھا اگر صہیب نے سب کچھ پایا کو بتا دیا۔ یہیں آکر اس کی ہمت جواب دے جاتی تھی اس نے بے چینی سے اپنی پیشانی مسلی۔

”علینہ مجھے تمہارے پایا کے لیے سوپ بنانا ہے چکن بھی نہیں ہے رات سے انہیں بخار ہے میڈیسن بھی کوئی نہیں ہے ایسا کرو ضمیر گھر پہ ہوگا اس سے کہہ دو دو چکن اور یہ دوائیاں ہیں تمہارے پایا کی یہ لے آئے“ انہوں نے دو ہزار اور دوائیوں کا پرچہ اس کے سامنے رکھا۔

”مما میں“ وہ بے زاری سے بولی۔

”ہاں یہ ساتھ ہی تو جانا ہے کچھے لان والے گیٹ سے چلی جاؤ جلدی کرو ابھی تمہارے پایا بھوک بھوک کا شور مچا دیں گے۔“ کہہ کر وہ پلٹ گئی تھیں جبکہ علینہ نے بے زاری سے سر جھٹکا وہ اس وقت کسی سے ملنا یا بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے ایک نظر دوائیوں کے پرچے کو دیکھا اور دونوں چیزیں منہ میں رہا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ چھوٹے گیٹ سے نکل کر سرور صاحب کے پورشن میں داخل ہوئی تھی اس کا ارادہ کچن میں سے گزرنے کا تھا۔ وہ کھڑکی کے قریب پہنچی جب اسے کاشفہ اور ضمیر کی آواز سنائی دی تھی وہ آگے بڑھ کر دروازہ کھولنے والی تھی جب کاشفہ کے منہ سے اپنا نام سن کر اس کے ہاتھ بے ساختہ رکے تھے۔

”یہ آپ کل علینہ کے ساتھ بیٹھ کر کون سے رازو نیاز کر رہے تھے۔“ کاشفہ کے پوچھنے کا انداز بہت عجیب تھا۔

”تم کیا میری جاسوسی کر رہی تھیں۔“

”کر تو نہیں رہی تھی پر اب لگتا ہے کرنا پڑے گی بلکہ امی کو بھی آپ کی حرکتوں کی اطلاع دینی پڑے گی۔“

”اب اتنی بھی بڑی بات نہیں تھی جتنا تم بتا کر بنا رہی ہو۔“

”تو پھر سیدھی طرح بتائیں کیا باتیں کر رہے تھے۔“

”میں اس کا برین واش کر رہا تھا۔“

”برین واش۔“ کاشفہ نے زور سے دہرایا۔ ”میں سمجھی نہیں۔“

”میں اس کو یہ سمجھا رہا تھا کہ صہیب کے ساتھ اس کی منگنی کا جو فیصلہ کیا گیا ہے وہ سراسر اس کے ساتھ زیادتی ہے۔“ اب کہ کاشفہ ہنس پڑی۔

”یہ آپ کو اس سے اتنی ہمدردی کیوں ہو رہی ہے اور اپنے دوست کی منگنی تو مانا چاہتے ہیں۔“

”دوست۔“ اس نے ضمیر کی زہر خندہ آواز سنی ”دوست نہیں دشمن ہے وہ میرا دنیا میں اگر میں کسی سے بہت نفرت کرتا ہوں تو وہ صہیب ہے بچپن سے لے کر آج تک میں نے اس سے حسد اور نفرت کے سوا کچھ نہیں کیا اور دوستی تو صرف مطلب کے لیے تھی چونکہ ابونے تو ہمیں ترسانے کے علاوہ تو کچھ کیا نہیں وہ بھی تو اسی خاندان کا حصہ تھا لیکن اس کا لائف اسٹائل دیکھا تھا نا تم نے کیا شہزادوں کی طرح زندگی گزارتا ہے جبکہ میں ہمیشہ اس کی اترن پہنتا رہا۔

کالج میں اسکول میں ہر کوئی اسے پسند کرتا تھا۔ میں لڑکیوں سے بات کرنے کے لیے ترستا تھا اور لڑکیاں اس سے دوستی کرنے کے لیے مری جاتی تھیں۔ پر وہ اسے احساس تھا اپنی اہمیت کا۔

میں نے سوچ لیا تھا اسے سب کی نظروں میں گرا دوں گا۔ تب میں نے اس کے نام سے اس کے موبائل سے لڑکیوں کو فون کر کے ان سے دوستی شروع کر دی۔

ہر الٹا کام کرنے کے بعد میں نام اس کا لگا دیتا پہلے تو وہ سمجھ ہی نہیں سکا اور جب سمجھ آئی تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ چاچو نے اسے مارا اور کینڈا اچھڑا دیا۔ وہ اپنی پوزیشن کلیئر نہیں کر سکا اسے یہ پتا چل گیا تھا کہ یہ میں نے کیا ہے اور میں انتظار کرتا رہا وہ مجھ سے لڑنے آئے گا لیکن اس نے دوبارہ کبھی مجھ سے بات ہی نہیں کی۔

وہ کینڈا گیا میری نظروں سے دور ہو گیا تو مجھے لگا میں سب بھول گیا لیکن پانچ سال بعد جب میں نے اسے

دیکھا وہ خوش تھا اور اس کی خوشی کی وجہ علینہ تھی۔ میرا خیال تھا علینہ سے منگنی کا سن کر وہ خوش نہیں ہوگا اور یہی افسوس میں اس کے چہرے پر دیکھنے کے لیے گیا تھا لیکن وہاں تو سب الٹ تھا وہ علینہ کا ساتھ ملنے پر خوش تھا بس اب مجھے یہ خوشی چھینی ہے۔“

باہر کھڑی علینہ کا سارا وجود جیسے زلزلوں کی زد میں تھا۔ اس نے اگر گیس کے باپ کو مضبوطی سے پکڑا نہ ہوتا تو شاید گر گئی ہوتی۔ اس کی ٹانگیں بری طرح کانپ رہی تھیں۔

”ہوں۔“ خاموشی سب سے سختی کاشفہ نے ہنکارا بھرا ”تو کیا علینہ آپ کی بات مان جائے گی۔“

”ارے وہ۔“ وہ قہقہہ لگا کر ہنسا ”ایک نمبر کی بے وقوف ہے اسے بے وقوف بنانا کیا مشکل ہے جو ایج میں نے صہیب کا بنایا تھا وہ تو پہلے ہی اس کے ذہن میں تھا مزید اس ایج کو مضبوط کر آتا ہوں۔ بلکہ ایک پرکشش آفر بھی دے آیا ہوں اپنا پرنسپل“ وہ مزے سے بولا۔

”دماغ خراب ہے بھائی امی کو پتا لگاتا تو آپ کا سر پھاڑ دیں گی۔ جانتے ہیں نا انہیں ناز باجی سے اور علینہ سے کتنی چیز ہے ابھی ناز باجی کے رشتے کو لے کر وہ کتنی ناراض ہیں۔“

”پاگل ہو تم میری بہنا میں کونسا اس سے شادی کروں گا یہ چار تو صرف منگنی تڑوانے کے لیے ڈالا ہے ادھر منگنی ٹوٹی ادھر میں مکرا۔“

”آپ کو لگتا ہے کہ آپ کا پرنسپل پرکشش آفر ہے ورنہ دیکھا جائے تو صہیب شکل دولت و تعلیم ہر لحاظ سے آپ سے بہتر ہے۔“ کاشفہ نے ضمیر کا مذاق اڑایا تھا جو اس کو اچھا خاصا برا لگا تھا۔

”یہی میں ثابت کرنا چاہتا ہوں وہ ہر لحاظ سے مجھ سے بہتر ہونے کے باوجود علینہ کو نہیں پاسکتا۔ وہ جب اس پر مجھے ترجیح دے گی اس وقت اس کا چہرہ دیکھنے والا ہوگا اور مجھے بڑی بے چینی سے اس وقت کا انتظار ہے۔“

”بے چاری علینہ“ کاشفہ کے کہنے پر اس نے ان

دونوں کو ہنستے سنا تھا۔

مزید سننے کی اس میں سکت نہیں تھی اب سننے کو رہ گیا گیا تھا۔ وہ کانپتی ٹانگوں کے ساتھ بمشکل چل کر گھر تک آئی تھی۔ شکر تھا اس کا سامنا ناصرہ سے نہیں ہوا تھا۔ کمرے میں آکر وہ گرنے کے انداز میں بیڈ پر بیٹھی تھی اسے لگ رہا تھا اس کا سانس بند ہو جائے گا وہ گہرے گہرے سانس لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ کوئی ایسا کیسے کر سکتا ہے وہ بھی اس کا اپنا کزن اتنا حسد اتنی نفرت کہ دو زندگیاں برباد کرنے پر تل گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جمع ہونے شروع ہو گئے جو آنکھوں سے نکل کر اب اس کے بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔

قصور کسی کا نہیں تھا اس کا اپنا تھا وہ کمزور تھی۔ کانوں کی کچی دماغ کی کمزور۔ کوئی ایک لمحہ اس کی گرفت میں نہیں آیا۔ جب اس نے صہیب کو فلرٹ کرتے دیکھا ہو یا وہ مذاق کرتا تھا پر وہ بچپن تھا وہ بھی تو جواب دیتی تھی۔ ناز نے اسے کتنا سمجھایا تھا لیکن وہ سمجھی نہیں۔ اب بار بار صہیب کی خود پر جمی نظریں یاو آ رہی تھیں اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ دھانپ لیا۔

”آپ کیا ہوگا میں کیا کروں۔“ وہ بے چین ہو کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ناز بھی یہاں نہیں تھی تو ہی تھی جو صہیب سے بات کر سکتی تھی۔ لیکن وہ اس سے اتنا ناراض ہو چکا تھا کہ وہ ناز سے بھی بات نہیں کر رہا تھا۔ اس نے موبائل اٹھا کر ناز کا نمبر ملایا وہ بند جا رہا تھا۔ اس نے مایوس ہو کر فون بند کر دیا۔



اس نے آنکھیں کھولیں تو پورے کمرے میں اندھیرا پھیلا تھا۔ شاید وہ روتے روتے سو گئی تھی۔ اٹھ کر اس نے سوچ آن کیا۔ روشنی سارے کمرے میں پھیل گئی شام کے سات بج رہے تھے۔ وہ ہاتھوں سے بال سیدھے کرتی ہوئی باہر آگئی سامنے صوفے پر ناصرہ فون ہاتھ میں لیے پریشان بیٹھی تھیں ”کیا ہوا ماما“ ان

کے انداز پر اس نے بے ساختہ پوچھا تھا۔  
 ”پتا نہیں صبح سے ناز کا نمبر ملا رہی ہوں بند جا رہا ہے  
 پہلے سوچا میسنگ میں ہوگی اس لیے لیکن اب رات  
 ہو رہی ہے اب تک تو اسے ابھی جانا چاہیے تھا۔“  
 ”آپ نے ان کے کسی کو لیگ کا نمبر لڑائی کیا۔“  
 ”ہاں اس کی ایک دو سیلیوں کا پتا ہے ایک تو ساتھ  
 گئی نہیں اور دوسری جو ساتھ گئی ہے اس کا بھی فون  
 بند ہے۔“ اب علینہ بھی پریشان ہو گئی۔  
 ”بابا کہتایا۔“

”میں وہ سو رہے ہیں اور اللہ کرے ان کے اٹھنے  
 سے پہلے آجائے“ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا رات کے  
 گیارہ بج گئے تھے ناز کا فون مسلسل بند آ رہا تھا اور علیم  
 صاحب نے کچھ دیر انتظار کیا اور پھر سرور صاحب اور  
 راشد کو فون کر دیا۔ اب وہ سب یہاں موجود تھے۔ وہ  
 پہلے ہی پریشان تھے اس پر شمیم کی فصول گوئی جاری  
 تھی۔ ان کی ہر بات پر فخرہ لاجول ولا پڑھ رہی تھیں  
 جبکہ ناصرہ کارور کر رہا حال تھا۔

سہیل اور صہیب ناز کے آفس اور ایئر پورٹ  
 کے کئی چکر لگا آئے تھے۔ رات کا ایک بج گیا تھا۔ اور ہر  
 بندہ تڑھال ہو چکا تھا۔ سب کے دماغ میں برے برے  
 خیالات آرہے تھے۔ سوائے چار لوگوں کے۔ شمیم  
 ’کاشفہ‘ ضمیر اور سہیل۔ سہیل کب سے اپنا غصہ  
 دبائے بیٹھا تھا۔ لیکن ڈیڑھ بجے وہ پھٹ پڑا تھا۔

”بس یہی رونا تھا اس لیے میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ  
 جا ب کرے لیکن وہی اس کی خود سری اور ڈھٹائی۔“  
 سہیل کے کہنے پر سب اس کا منہ دیکھنے لگے۔

”میں نے تو پہلے منع کیا تھا لڑکی ہم جیسی نہیں لیکن  
 تمہارے باپ پر بیعتی کا بھوت سوار تھا۔ کر گئی نامہ  
 کالا۔ جا ب کے بہانے عشق لڑائی رہی اور اب میسنگ  
 کا بہانہ کر کے بھاگ گئی عاشق کے ساتھ“ ناصرہ اور  
 علینہ نے تڑپ کر شمیم کا منہ دیکھا تھا۔ علینہ نے  
 دوسری شکایتی نظر باپ پر ڈالی جو سر جھکائے پتا نہیں کیا  
 سوچ رہے تھے من بھی رہے تھے یا نہیں۔

”بند کرو اپنی بکواس۔“ سرور صاحب دھاڑے۔

”میں ہمیشہ جپ رہی لیکن اب نہیں ہوں گی ایسی  
 گرمی ہوئی لڑکی مجھے نہیں بنانی اپنی بہو۔“  
 ”امی آپ کیا منع کریں گی میں خود انکار کرتا ہوں  
 ایسی بد کردار لڑکی سے میں شادی نہیں کروں گا جو  
 راتوں کو جا ب کا بہانہ بنا کر باہر رہے اگر شادی کے بعد  
 ایسا کرتی تو بھی میں کسی بات کا لحاظ نہ کرتا اور کھڑا کھڑا  
 طلاق دے دیتا۔“

”میں کہتا ہوں خاموش ہو جاؤ تم لوگ۔“ سرور  
 صاحب چیخے تو سہیل نے ہونٹ بھیج لیے۔ جبکہ  
 شمیم ہنسنے لگی۔ کرمندہ دوسری طرف موڑ لیا۔ رات کے دو  
 بجے باہر اطلاعی گھنٹی بجی تھی اور سب چونکے تھے۔  
 صہیب باہر کی طرف بھاگا تھا۔ واپسی میں ناز زخمی  
 حالت میں اس کے ہمراہ تھی۔

”باجی۔“ علینہ سب سے پہلے اس کی طرف بڑھی  
 تھی۔ علیم صاحب نے چونک کر سر اٹھایا۔ ناز نے  
 حیرت سے وہاں موجود سب لوگوں کو دیکھا۔

”آپ لوگ پوچھیں گے یا میں پوچھوں یہ سارا دن  
 اور آدھی رات کہاں گزار کر آئی ہے۔“ سہیل کے  
 منہ سے نکلنے والے الفاظ پر ناز نے ایک بار پھر سب  
 کے چہرے دیکھے اور اسے اندازہ ہوا کہ کچھ غلط ہوا ہے  
 یا ہونے جا رہا ہے۔

”کہاں تھی تم۔“ سہیل کے ساتھ شمیم بھی آکر  
 اس کے سامنے کھڑی ہو گئیں ان کی آنکھوں سے شعلے  
 نکل رہے تھے جن میں ناز کو اپنا آپ جلتا محسوس ہوا  
 تھا۔ اس نے ان پر سے نظر ہٹا کر پہلے اپنی ماں کو دیکھا  
 اور پھر اپنے باپ کو وہ اسے ہی دیکھ رہے تھے وہ کسی سے  
 کوئی بھی بات کیے بغیر باپ کے قدموں میں جا کر بیٹھ  
 گئی۔

”بابا میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا جو میں سب لو  
 صفائی دوں لیکن میں آپ کو ضرور صفائی دوں گی۔ مجھے  
 آپ کی عزت اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے اور میں نے  
 ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا ہے کہ میری وجہ سے آپ کا  
 سر کبھی نہ جھکے۔ آج جب ہم میسنگ کے بعد آفس  
 سے نکل رہے تھے بائیک پر سوار کچھ افراد نے ہماری

گاڑی پر حملہ کر دیا۔ ہمارے موبائل اور بیگ چھین لیے۔ جب انہوں نے مجھ سے اور دوسری کولیگ سے بدتمیزی کی کوشش کی تو باس اور ہمارے دو کولیگ کے ساتھ ان کی ہاتھ پائی ہو گئی اس جھڑپ میں ہمارے ایک کولیگ کو گولی لگ گئی۔ ”شاید وہی منظر اسے یاد آیا تھا جو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

علیم صاحب نہ صرف اسے سن رہے تھے بلکہ بغور دیکھ رہے تھے۔ اس کے چہرے پر زخم کے تازہ نشان تھے اور آنکھیں رونے کی وجہ سے سو جی تھیں۔

”اپنے اس زخمی کولیگ کو وہاں کے اسپتال میں ایڈمٹ کروایا۔ باس ابھی وہیں ہیں اور پہلی جوفلائیٹ ملی باس نے ہم لڑکیوں کو بھیج دیا۔ وہاں اتنی پریشانی تھی میں فون بھی نہیں کر سکی یہ میری غلطی ہے۔“ کہہ کر اس نے سر جھکا لیا۔

”بکو اس کرتی ہے یہ جھوٹی کہانی سیدھی طرح کہو جس کے ساتھ بھاگی تھی۔ اس نے مار کر نکال دیا۔“ سہیل کی زہرا گھٹی زبان پر اس نے نفرت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر باپ کی طرف دیکھا کیا وہ ان کی نظر میں بھی گناہ گار ہے۔

”جس نے جو کہنا ہے کہہ لیا۔ میں نے جو سنا تھا سن لیا۔“ علیم صاحب کے کہنے پر سب انہیں دیکھنے لگے۔ ناز کارواں رواں گھڑا ہو گیا تھا۔

”بھائی صاحب۔“ انہوں نے سرور صاحب کو مخاطب کیا تھا۔ ”میں جانتا ہوں آپ ناز سے بہت پیار کرتے ہیں اور یہی چاہت دیکھتے ہوئے میں نے ایک لمحہ سوچ بغیر یہ رشتہ طے کر دیا، لیکن سہیل۔ چاہت تو دور کی بات یہ تو اس کی عزت بھی نہیں کرتا۔ اس کو ناز پر اعتبار نہیں ابھی اس نے بغیر سوچے سمجھے میرے سامنے بیٹھ کر میری بیٹی کے لیے کتنے گندے الفاظ استعمال کیے۔ میری بیٹی اگر جاب کرتی ہے تو میری اجازت سے کرتی ہے۔ مجھے اعتماد ہے اس پر اور شادی کے بعد اگر سہیل منع کرتا تو یقیناً ”میری بیٹی جاب نہ کرتی۔ اتنی سمجھ ہے اس میں۔ آج تک میں نے اپنی بیٹیوں کو بوجھ کہا پر میری بیٹیاں ہمیشہ میرے لیے فخر کا

باعث رہی ہیں اور آج ناز نے جو کچھ کہا اس کے حرف حرف پر میرا یقین ہے۔ میری بیٹی کبھی کچھ غلط کام نہیں کر سکتی۔“ ناز جو حیرت سے اپنے باپ کے منہ سے نکلنے والے الفاظ سن رہی تھی۔ آخری لفظوں پر اسے لگا ساری زندگی جو افسوس رہا یہ لمحہ ان سب پر بھاری ہے۔ ناصرہ اور علینہ ان کی بھی یہی کیفیت تھی۔

”اور سہیل تم کیا رشتہ ختم کرو گے میں خود اپنی ہیرا صفت نیک بیٹی تمہیں دینے سے انکار کرتا ہوں۔ یہ رشتہ یہیں ختم۔“

سہیل کو امید نہیں تھی ایسا ہو گا ایک پل کے لیے تو وہ حیران رہ گیا۔ اس کا خیال تھا سب ناز کو برا کہیں گے۔ اس کی منتیں کریں گے اور اس پر شادی کی صورت میں احسان کر کے وہ ہمیشہ ناز پر حاوی رہے گا۔ اس نے بے اختیار باپ کی طرف دیکھا، لیکن انہوں نے ناراضی سے نظریں پھیر لیں اور شمیم نے اٹھ کر سہیل کا بازو تھاما۔

”ضرورت بھی نہیں علیم سنبھال کر رکھو اپنی بیٹی، میرے بیٹے کو کمی نہیں۔“ وہ اس کا بازو کھینچتی ہوئی باہر نکل گئیں۔ کاشفہ ان کے پیچھے بھی جیکہ سرور صاحب کے ساتھ ضمیر وہیں موجود تھا۔

”علیم میں بہت شرمندہ ہوں۔“ وہاں موجود ہر شخص خاموش تھا اس خاموشی کو سرور صاحب کی شرمندہ آواز نے توڑا تھا۔

”بھائی صاحب آپ کو شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں آپ کی نیت میں کوئی کھوٹ نہیں تھا آپ میرے بڑے بھائی ہیں میرے لیے قابل احترام۔“ وہ اٹھ کر ان کے گلے لگ گئے اور اس کے بعد ناز کو گلے لگا کر رو پڑے اور وہ تو پہلے ہی کسی کندھے کی تلاش میں تھی جہاں وہ رو کر اپنا غبار نکال سکے۔

”راشد میں نہیں چاہتا پھر کچھ ایسا ہو اس لیے تم صہیب سے بھی پوچھ لو وہ یہ رشتہ رکھنا چاہتا ہے یا نہیں۔“ روتی ہوئی علینہ کی نظریں بے ساختہ صہیب کی طرف اٹھیں تب ہی صہیب نے اس کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر چھایا خوف صہیب

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

# سوتلی ہیرائل

SOHNI HAIR OIL

- کرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- بے ہال آگاتا ہے
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
- یکساں مفید
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے



قیمت - 120/- روپے

سوتلی ہیرائل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری

کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تصویقی مقدار میں تیار ہوتا ہے۔ یہ بازار میں

یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں اس کی خرید جاسکتا ہے، ایک

کلوں کی قیمت صرف - 120/- روپے ہے، دوسرے شہروں کے لئے آڈر بھیج

کر جیٹر ڈائریل سے منگوائیں، رجسٹری سے منگوانے والے سنی آڈر اس

صاحب سے بھرا آئیں۔

- 2 بوتلوں کے لئے - 300/- روپے
- 3 بوتلوں کے لئے - 400/- روپے
- 6 بوتلوں کے لئے - 800/- روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور ٹیکس چارج شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوتلی ہیرائل ان جگہوں

سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 32735021

صاف دیکھ سکتا تھا اس نے نظریں بے ساختہ چرائیں۔  
”کیسی باتیں کر رہے ہو علیم صہیب کی پسند سے  
یہ رشتہ طے ہوا ہے۔“ فاخرہ کہہ کر علینہ کے پاس  
آگئیں۔

”کیوں بیٹا تمہیں کوئی اعتراض ہے۔“ علینہ کا سر  
نفی میں ہلاتا تھا۔

”تم خوش ہونا اس رشتے سے۔“

”جی۔“ اب کی بار اس نے واضح جواب دیا اور پھر  
صہیب کو دیکھا وہ ابھی اسے دیکھ رہا تھا۔

”بیٹا بسن کو کچھ کھانے کو دو پتا نہیں اس نے کھانا  
کھایا بھی ہے یا نہیں۔“ سرور صاحب کے کہنے پر

علینہ سر ہلا کر کچن میں آگئی۔ علینہ کے پیچھے ضمیر گیا  
تھا جسے دیکھ کر صہیب کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے وہ

بھی دیے پاؤں اس کے پیچھے گیا تھا۔ وہ سالن گرم  
کر رہی تھی جب آواز سن کر وہ چونک کر پلٹی اور ضمیر کو

دیکھ کر اس کے چہرے کے اثرات سخت ہو گئے تھے۔  
”یہ تم نے کیا کیا اتنا اچھا موقع گنوا دیا۔ چچی نے خود

تم سے پوچھا تھا تم نہ کر دیتیں تو سارا مسئلہ ہی حل  
ہو جاتا۔“ ضمیر کا بس نہیں چل رہا تھا کہ علینہ سے

زبردستی نا کر دلیتا۔

”میں کیوں نا کرتی۔“ علینہ کے ٹھنڈے ٹھار انداز  
میں پوچھنے پر جہاں ضمیر کو جھٹکا لگا وہیں باہر دیوار کے

پاس کھڑا صہیب بھی چونکا تھا۔

”کیا مطلب۔“ ضمیر ہکا کر بولا۔

”تمہیں صہیب پسند نہیں تھا نا۔“

”کیا میں نے آپ کو ایسا کہا۔“ وہ اب اس کی  
آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی اور ضمیر اس

کے انداز دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔

”اس دن ہماری بات ہوئی تھی۔“ ضمیر نے اسے  
یاد دلایا۔ تو علینہ بڑے مطمئن انداز میں پلیٹ کاؤنٹر پر

رکھ کر اسے دیکھنے لگی۔ ”جی ہوئی تھی بات اسی لیے تو  
پوچھ رہی ہوں۔ میں نے آپ سے کہا کہ میں

صہیب کو پسند نہیں کرتی۔“

”پر مطلب تو وہی تھا۔“ علینہ نے افسوس سے سر

میں تھپڑ کی صورت میں دوں تمہیں، لیکن جو جواب تمہیں میری ہونے والی بیوی نے دیا ہے۔ اس سے اچھا تو میں کبھی نہیں دے سکتا تھا۔“ وہ کہہ کر مڑ گیا۔ خوشی اس کے انگ انگ سے چھلک رہی تھی۔ دو دن سے وہ پریشان تھا سمجھ نہیں آرہا تھا کیا کرے، لیکن آج وہ اتنا خوش تھا کہ دل چاہ رہا تھا ابھی جا کر علیحدہ کو گلے لگالے۔



”اظفر سے ہمیں ناز کے ایک سیلڈنٹ کا پتا چلا تو ہم اسی وقت آگئے۔ بڑی پیاری اور نیک بچی ہے آپ کی۔ میں نے جب پہلی بار ناز کو دیکھا تب ہی سمجھ گئی تھی کسی سلجھے ہوئے ماں باپ کے ہاتھوں اس کی پرورش ہوئی ہے۔“ سامنے بیٹھی اظفر کی ماں کی بات سن کر علیم صاحب کے ساتھ بیٹھی ناصرہ نے بھی مسکرا کر انہیں دیکھا۔

”ویسے بھی ہمیں آتا تھا آپ سے ضروری بات کرنی تھی۔“ ان خاتون کے کہنے پر ناصرہ اور علیم صاحب دونوں نے چونک کر دیکھا تھا۔

”اظفر کے آفس میں ایک فنکشن تھا ہم بھی انوائٹ تھے۔ وہیں ہم نے ناز کو دیکھا تھا اور تب ہی ہمیں بہت پسند آئی تھی۔ میں اپنے بیٹے اظفر کے لیے جس طرح کی لڑکی کی تلاش میں تھی ناز بالکل ویسی ہے۔ میں گئی بار اس سے کہا مجھے ناز کے پیرئس سے ملو! او کچھ دن پہلے دوبارہ کہا تو اس نے بتایا ناز کی منگنی ہو گئی سچ بتاؤں تو میرا دل بڑا برا ہوا، لیکن اللہ سے ناز کی اچھی قسمت کی دعا کی۔ بہر حال آج ہم خاص مقصد سے آئے ہیں۔ آپ اظفر سے ملے ہیں نا۔“ انہوں نے ساتھ بیٹھے اپنے بیٹے کی طرف اشارہ کیا۔

”ناز کے ساتھ کام کرتا ہے آپ ناز سے بھی پوچھ سکتے ہیں ہمیں بس ناز بیٹی چاہیے اور کچھ نہیں چاہیے۔“ وہ جتنی چاہت سے رشتہ مانگ رہی تھیں علیم صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ انہوں نے پہلی بار مشورہ طلب نظروں سے ناصرہ کو دیکھا جنہوں نے آنکھ

ہلایا۔ ”آپ ابھی اتنے عقل مند نہیں ہوئے ضمیر بھائی کہ اپنے علاوہ دوسروں کے مطلب سمجھ جائیں آپ جیسا حاسد آدمی اپنا مطلب ہی سمجھ سکتا ہے۔ آپ تو اتنے گرے ہوئے بے شرم انسان ہیں کہ اتنا کچھ ہونے کے باوجود میرے سامنے کھڑے ہیں۔ ابھی ابھی آپ کے بھائی نے جو کیا آپ کو میرے سامنے کھڑے ہونے کی بجائے کہیں ڈوب مرنا چاہیے تھا۔“

”علیمہ“ وہ ایک دم بھڑک کر بولا جواباً ”وہ اس سے زیادہ غصے سے بولی۔

”اپنا والیوم آہستہ رکھیں ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ وہ جو اس دن آپ نے صہیب کے بارے میں بکواس کی تھی نا اگر میں نے سن لی تھی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں نے اس بکواس پر یقین بھی کر لیا تھا۔ کریکٹر لیس آپ ہیں صہیب نہیں۔ میں اتنی بھی بے وقوف نہیں جتنا آپ نے سمجھا تھا اور ایک بات۔“ وہ ہنڈیا سے سالن نکالتے ہوئے بولی۔ ”میں صہیب کو بہت پسند کرتی ہوں اور خود کو خوش قسمت سمجھتی ہوں جو میری شادی صہیب سے ہو رہی ہے۔“ ضمیر کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ ٹرے سیٹ کر کے اس نے ضمیر کو دیکھا۔

”اور آخری بات آئندہ آپ نے یا آپ کی گندی ذہنیت کے گھروالوں نے صہیب کے خلاف کوئی بات کی نا تو سب سے پہلے میں بغیر کسی لحاظ کے آپ لوگوں کے منہ توڑ دوں گی۔“ کہہ کر وہ اسے ہکا بکا چھوڑ کر باہر نکل گئی۔

باہر کھڑا صہیب ابھی تک حیرت کے جھٹکے کھا رہا تھا یہ جو اس نے سنا وہ علیحدہ نے کہا تھا اسے ابھی تک اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ضمیر سر جھکائے باہر نکلا تو نظر سامنے کھڑے صہیب سے ٹکرا گئی۔ صہیب کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ سب سن چکا ہے۔

”سوچا تھا جو تم نے میرے ساتھ کیا تھا اس کا جواب

”ابھی چاچو نے فون کر کے ماما کو بلایا تو میں بھی آگیا دیکھوں تو سہی اظفر صاحب دیکھتے کیسے ہیں۔“ اس کے شرارتی انداز پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ”اب آپ پلیز تھوڑی دیر کے لیے ہمیں اکیلا چھوڑ دیں۔ مجھے علیحدہ سے کچھ بات کرنی ہے۔“ ”اچھا جی۔“ ناز نے شرارتی انداز میں اسے دیکھ کر علیحدہ کو دیکھا جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ناز کے باہر نکلتے ہی وہ پانچ قدم کا فاصلہ سمیٹ کر اس کے بالکل سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ کسی مجرم کی طرح سر جھکائے اس کے سامنے تھی جبکہ نظریں زمین پر

سے ہاں کا اشارہ کیا تھا۔ ”دیکھیں بہن جی آپ لوگ مجھے اچھے لگے ہیں“ لیکن بیٹی والے ہیں تھوڑا ناگوار۔“ ”جی بھائی آپ پوری تسلی کر لیں، لیکن جواب ہمیں ہاں میں چاہیے۔“ ان کے کہنے پر علیم اور ناصرہ دونوں ہنس پڑے تھے۔ ”بابی آپ بہت لکی ہیں اظفر بھائی مجھے بہت اچھے لگے۔“ بات سنی ہوتے ہی علیحدہ بھاگتی ہوئی کچن میں آکر ناز کے گلے لگ گئی جس کا چہرہ پہلے ہی خوشی سے جگمگا رہا تھا۔ ”میری گڑیا تم کیا کم لکی ہو۔“ ناز کے کہنے پر اس کی مسکراہٹ سکڑ گئی تھی۔ ”کیا ہوا میں نے کچھ غلط کہا۔“

”بابی آپ نے ٹھیک کہا تھا میں نے اپنے پاؤں پر خود کھلاڑی ماری ہے۔ میں نے سنی سنائی بات پر یقین کر کے صہیب کے بارے میں اتنا غلط بولا۔ مجھے کوئی حق نہیں بنتا تھا کہ انہیں ایسے بولتی اب آگرو مجھ سے ناراض ہیں تو وہ ٹھیک ہیں۔“ ”کیا صہیب نے تم سے کچھ کہا ہے۔“ ناز نے فکر مندی سے پوچھا تو اس نے سرنفی میں ہلایا۔ ”پریشانی والی بات تو یہی ہے نا بابی کہ انہوں نے مجھے کچھ نہیں کہا۔ انہیں برا لگا تو مجھے ڈانٹ لیتے کچھ کہہ دیتے۔ اس خاموشی سے مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“

”میں بات کروں گی صہیب سے، لیکن علیحدہ اسے ہرٹ تم نے کیا ہے اور تمہیں اس سے خود بات کر کے سوری کہنا چاہیے۔“ ”بابی میں خود ان کو سوری کہنا چاہتی ہوں، لیکن ڈر لگتا ہے کہ۔“ گلا کھنکھارنے کی آواز پر دونوں نے پلٹ کر دیکھا اور کچن کے دروازے میں کھڑے صہیب کو دیکھ کر ناز خوش جبکہ علیحدہ پریشان ہو گئی۔ ”مبارک ہو جناب کی منتگنی ہو گئی۔“ وہ علیحدہ کو انور کر کے ناز کے گلے لگتے ہوئے بولا۔ ”خیر مبارک تمہیں کیسے پتا چلا۔“

### ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوب صورت ٹاؤلر

|       |                       |                   |
|-------|-----------------------|-------------------|
| 300/- | ساری بھول ہماری تھی   | راحت جبین         |
| 300/- | اوبے پرواجن           | راحت جبین         |
| 350/- | ایک میں اور ایک تم    | تزیلہ ریاض        |
| 350/- | بڑا آدمی              | نسیم سحر قریشی    |
| 300/- | دھیمک زدہ محبت        | صائمہ اکرم چوہدری |
| 350/- | کسی راستے کی تلاش میں | میمنہ خورشید علی  |
| 300/- | ہستی کا آہنگ          | ثمرہ بخاری        |
| 300/- | دل موم کا دیا         | سائرہ رضا         |
| 300/- | ساڈا چڑیا دا چنبا     | نفیسہ سعید        |
| 500/- | ستارہ شام             | آمنہ ریاض         |
| 300/- | مصحف                  | نمرہ احمد         |
| 750/- | دست کوزہ گر           | فوزیہ یاسمین      |
| 300/- | محبت من محرم          | سمیرا حمید        |

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

گڑی تھیں۔

اس کے چہرے پر جیسے جم سی گئی تھیں۔ ان نظروں کی تپش سے اس کی نظریں خود بخود جھک گئی تھیں۔ وہ سر کو اثبات میں ہلاتے ہوئے مسکرا دی تھی۔ صہیب نے فدا ہونے والی نظروں سے اس کی مسکراہٹ کو دیکھا تھا۔

”کتنی محبت کرتی ہو؟“ اس کے مزید قریب آکر پوچھنے پر علینہ دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔

”پتا نہیں۔“

”یہ کیا جواب ہوا؟“ وہ بد مزاج ہو کر بولا۔

”اس بات کا یہی جواب ہوتا ہے۔“ اب کے وہ بھی ہاتھ کھینچتے ہوئے بولی۔

”پر میں اس کا جواب بہت اچھا دے سکتا ہوں۔“ وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ علینہ نے نظریں اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا جہاں آنکھوں میں اس کے لیے محبت ہی محبت تھی۔

”ایا“ اس کے مزید قریب آنے پر وہ ایک دم چلا کر بولی وہ ایک سیکنڈ میں ہاتھ چھوڑ کر مڑا تھا پیچھے کوئی نہیں تھا۔ اس کے یوں ڈرنے پر وہ کھلکھلا کر باہر کی طرف بھاگی تھی۔

”فکر نہیں کرو کرتا ہوں تمہارا بندوبست ماما سے جا کر کرتا ہوں۔ نکاح نہیں رکھتی کریں پھر دیکھتا ہوں ایسے بھائی ہو اور کہاں۔“ اپنے پیچھے صہیب کی دھمکی سن کر اس کے چہرے کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی تھی۔

ان دونوں نے کوئی شکوے نہیں کیے تھے نہ ایک دوسرے کو بتایا تھا کہ وہ غلط نہیں۔ جو ان کے درمیان آئی تھیں وہ کیسے بنا کے ختم ہو گئیں۔ انہوں نے غلط فہمیوں کے مٹ جانے کو اس رشتے کا جو ان کے درمیان تھا (محبت کا رشتہ) کا اعجاز سمجھا تھا۔ آنے والے حسین لمحوں کے خیال نے ان دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی اور ان کی مسکراہٹ دیکھ کر باہر اترتی شام بھی جیسے مسکرانے لگی تھی۔



”اس دن جو تم نے ناز آبی سے کہا میں نے سب سنا تھا مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا تم مجھے اتنا برا سمجھتی ہو۔ اگر مجھے تمہاری اتنی نفرت کا اندازہ ہوتا تو میں کبھی اس رشتے کے لیے ہاں نہ کرتا۔“ علینہ کی جھکی آنکھیں پانی سے بھرنے لگیں۔

”جس طرح تم نے اپنے بڑوں کی خواہش کا احترام کیا ہے ویسے ہی میں نے بھی ممالیہ کی پسند کو مان لیا۔ یہ الگ بات ہے کہ تم کو اتنے سالوں بعد دیکھ کر بہت اچھا لگا لیکس۔“ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور علینہ کی سانس جیسے سینے میں اٹک گئی۔

”خیر یہ رشتے زور زبردستی سے نہیں نبھائے جاتے۔ اس کی بنیاد اعتماد اور محبت ہے جو تمہیں مجھ سے نہیں۔“ صہیب کی اپنی لمبی تقریر کے جواب میں وہاں ابھی تک خاموشی تھی۔

”آئی ایم سوری۔“ اب کے اس نے نظریں اٹھا کر صہیب کو دیکھا اور آنسو جو آنکھوں میں جمع تھے تیزی سے گالوں پر پھیلنے لگے۔ میں جانتی ہوں میں نے آپ کو ہرٹ کیا، لیکن مجھ سے غلطی ہو گئی اور میں اس کے لیے شرمندہ ہوں کیا آپ مجھے معاف نہیں کر سکتے۔“ وہ اتنی معصومیت سے اس سے پوچھ رہی تھی کہ صہیب کا خود پر قابو رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

”ایک شرط پر اگر تم میرے سوالوں کا صحیح صحیح جواب دو۔“ اس نے تیزی سے سر ہلایا صہیب نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔ علینہ

نروس ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

”تمہیں مجھ پر اعتبار ہے۔“

”جی۔“

”کتنا۔“

”اتنا کہ آئندہ زندگی میں کبھی آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔“ وہ بنا سوچے سمجھے دل سے بولی تھی۔ اس کے ہاتھ پر صہیب کے ہاتھوں کی گرفت سخت ہو گئی۔

”اور محبت کرتی ہو مجھ سے۔“ صہیب کی نظریں

صدف آصف

سیراویج



”نوید! جلدی کریں تاکہ دیر ہو رہی ہے۔“ ایمان نے سنی کی نیچی تبدیل کرتے ہوئے اٹیچ بائو کے بند دروازے کو دیکھا اور دوسری بار آواز لگائی۔

”آگیا۔ آگیا۔ جان۔ چلو بس نکلتے ہیں۔“ نوید نے بالوں میں برش پھیرتے ہوئے جلدی سے گاڑی کی چابی اٹھائی اور اس کی طرف دیکھا وہ سبز اسٹائنلس اوپن ٹرٹ اور بلیک گھیر وار شلواریں میں ملبوس کیل کائنوں سے لیس ہوش اڑائے دے رہی تھی۔

”زبردست۔ آپ پر یہ لائٹ براؤن ٹرٹ کتنی بچ رہی ہے۔“ ایمان نے پیار بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے الٹی اس کی تعریف کر دی تو وہ ہنس پڑا اور اتر کر کالر کمرے کر دیے۔ ایمان اپنے گلابی گالوں کے ڈمپل پر انگلی رکھ کر اسے دیکھے چلی گئی۔ یہ اوانوید کے دل پر بڑی بھاری پڑی۔

”مجھے پتا ہے آگیا۔ میں بہت گنڈ لکنگ ہوں۔ پر اب ایسا بھی کیا کہ فریز ہو جانا۔“ نوید نے شرارت سے ایمان کی چھوٹی سی ناک پکڑی اور گالوں سے انگلی ہٹا دی۔ وہ اس کی طرف مکمل طور پر متوجہ ہوئی۔ دونوں ایک دوسرے میں گم ہونے لگے کہ اچانک۔

”دھڑام۔ دھڑام“ زوردار آواز نے ان کی محویت توڑ کر رکھی دی، مڑ کر دیکھا۔ سنی بستر سے نیچے گرا ہوا۔ زور زور سے منہ پھاڑ کر رو رہا تھا۔

”اوہ۔ میرا بچہ۔ دکھاؤ خون تو نہیں نکل رہا۔“ ایمان بے اختیار آگے بڑھی۔ نوید سنی کو اٹھانے میں لگ گیا۔ اس کا ہونٹ ایک جگہ سے ہلکا سا پھٹ گیا تھا وہ ٹشو سے صاف کرنے لگا۔

”میرا بچہ۔ گھر سے نکلتے ہوئے کیسی بد شگونی ہو گئی۔“ وہ ایک دم پریشانی میں بولتی ہوئی سنی کو دیکھنے لگی۔ اس کی نگاہیں نوید سے ٹکرائیں تو شرمندہ ہو کر بات کو درمیان میں ہی چھوڑنا پڑا۔

نوید کے موڈ پر چھایا چونچال پن ایک دم سرد مری میں بدل گیا۔ ایمان کو اچھی طرح سے پتا تھا کہ شوہر کو ایسی فضول باتوں سے چڑھنے، مگر وہ عادت سے مجبور بولتی چلی گئی۔

اس کے ساتھ، کچھ نہ کچھ ایسا ہو رہا تھا کہ مزاج پر عجیب مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ پہلے نوید کی کمپنی کے ہاتھ سے کیمیکل کا بہت بڑا آرڈر نکل گیا جس کے لیے اس نے دن رات ایک کیے ہوئے تھے۔

”کاروبار میں اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے۔“ نوید نے اس کے اظہار افسوس کو دو جملوں میں ختم کرنا چاہا، مگر وہ جو ہر بات اپنے اوپر سوار کرنے والی مشہور تھی کافی دنوں تک اسی بات کو چبھتی رہی۔ اس کے بعد ان کا بڑا بیٹا عرش ایسے موقع پر بیمار پڑ گیا جب وہ اسکول میں ہونے والے کونز مقابلے میں مسلسل جیتنے کے بعد فائنل تک جا پہنچا۔ دونوں میاں بیوی بیٹے کی اس کامیابی پر بہت خوش تھے، نوید تو پھر جذبات کا برملا اظہار نہیں کرتا تھا، مگر ایمان کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ اس نے عرش کے دوھیال، ننھیال میں فون کر کے اپنی خوشی سب سے شیئر کی۔

وہ شروع سے ہی عرش کی نصالی اور غیر نصالی سرگرمیوں کو بہت سنجیدگی سے لیتی آئی تھی۔ ایگزٹم کے دوران ان کے گھر پر کرفیو لگ جاتا۔ اپنے بیٹے کو ہمیشہ نمبروں کی پوزیشن پر دیکھنے کے لیے اس نے ٹیوٹر کے ساتھ ساتھ خود بھی اسے پڑھانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ جب شہر کے بڑے بڑے اسکولوں نے بچوں کی ذہنی آزمائش کے لیے ایک کونز مقابلے کا اعلان کیا تو اس نے عرش کے اسکول فون کر کے ٹیچر سے ریکورڈس کی کہ ان کے اسکول کی ٹیم میں عرش کو بھی شامل رکھا جائے۔

”ایم۔ جان خیال رکھنا۔ کہیں۔ عرش کی جگہ تم کو زوالے دن نہیں چلی جانا۔ یوں مصروف ہو جیسے بیٹے کی جگہ تمہیں حصہ لینا ہے۔“ ایمان اس معاملے میں اتنی ایکسٹینڈ تھی کہ نوید اسے پیار سے چھڑتا، مگر وہ سنی ان سنی کیے مسلسل عرش کے پیچھے لگی رہتی۔ بیٹے کو ٹائیک کے متعلق معلومات فراہم کرنا، سوال جواب یاد کرنا، دودھ میں بادام پیس کر روز رات میں پلانا۔ باپ بیٹے کو وارننگ دے کر ایک ہفتے کے لیے کارٹونز اور ٹی وی پروگرامز دیکھنے پر پابندی لگا دی گئی۔

لگتی ہوں۔" ایمان نے اپنی کمزوری کا برملا اعتراف کیا۔

"چلو۔ میں تمہیں آج ایک سچا قصہ سناؤں۔ اس میں موجود کردار تمہارے آس پاس پھیلے ہوئے ہیں۔ تمہیں یہ سب سن کر بہت مزا آئے گا۔" نوید نے کچھ سوچا اور آنکھیں میچ کر نرمی سے کہا۔ ایمان نے نا سمجھنے والی نگاہوں سے شوہر کے ہلتے ہونٹوں کو دیکھا۔

"دیکھو جان۔ راہ حیات میں۔ ایک "میں" کے سارے نہیں جی سکتے۔ بلکہ بہت سارے۔ "تم" بھی ضروری ہوتے ہیں جن کے ساتھ گزارے مل ہی۔ حاصل زندگی بن جاتے ہیں۔ تو۔ سمجھو یہ قصہ "میں" اور "تم" کا ہے۔" نوید نے پیار سے بات شروع کی تو ایمان مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔



سراج انوار کو وہ سرخ بالوں والی عورت پہلی نگاہ میں ہی بری لگی، جس نے سارے بالوں کو کانٹوں کے پیچھے اڑس کر سرخ لٹ نکالی ہوئی تھی۔ ان کے بس میں ہونا تو وہ قریب جا کر اسے ایسے بے ہودہ فیشن کرنے پر لمبا لیکچر پلاتے۔ مگر خود پر ضبط کیا۔ وہ کہتے بھی تو کیا۔ اسی لیے۔ نگاہیں دوسری طرف پھیر لیں۔ ویسے بھی ان کی ذہنی تفکرات اتنی بڑھ چکی تھیں کہ آج کل وہ مزاج کے خلاف حرکتیں کر رہے تھے، جس کی ماضی میں ان سے توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔ لہجہ ٹائم ختم ہونے والا تھا، انہوں نے بے دلی سے سینڈویچ کونا کترا۔ چہرے پر ناگواری چھائی ہوئی تھی۔

سراج انوار ایک بڑی کیمیکل فیکٹری میں نیچر کی پوسٹ پر فائز تھے۔ وہ جس جگہ لچ کرنے آئے تھے، یہ ایک فوڈ کورٹ تھا، جو ان کے آفس کے ٹاپ فلور پر واقع تھا۔ یہاں ہر طرح کے لوگوں کا آنا جانا تھا، ان کے پاس کوئی ایسا اختیار نہیں تھا جس کی بل پر وہ ناپسندیدہ اشخاص کا داخلہ بند کر سکتے۔ جیسے کہ "نوید علوی"۔ وہ

جنگ فوڈز بند کرادیے گئے کہ کہیں بیٹا بیمار نہ پڑ جائے مگر۔۔۔ کمزوری اتنی بڑھ گئی کہ وہ اسکول جانے کی پوزیشن میں ہی نہیں رہا۔ اسکول والوں نے عرش کی خرابی طبیعت کی وجہ سے مجبوراً اس کا نام کمپینیشن سے آؤٹ کر دیا۔ ایمان اس لمحہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اس کی ساری محنت ضائع ہو گئی۔ نوید نے پیار سے سمجھایا، مگر اس نے پورے ہفتے اس بات کا سوگ منایا اب وہ بہت دنوں بعد خوشی خوشی میسجے جا رہی تھی کہ چھوٹا میا سنی گر گیا۔

"پاپا کی جان۔ کچھ نہیں ہوا میرا بہادر بیٹا۔ آجائے۔ میں اپنے ہیرو کے بال دوبارہ بنا دوں۔" نوید نے سنی کے سنہری سکی بالوں میں نرمی سے برش پھیرتے ہوئے اسے بہلایا۔ وہ ایسا بچہ تھا جو بالوں میں برش کروا کر بہت خوش ہوتا۔ سنی روتا بھول بھال مزے سے اپنے بالوں کے اسپانک سوار کرتھوڑی ہی دیر میں برش سے ٹھیلنے لگا۔

"چلیں۔ دیر ہو رہی ہے۔" ایمان کو نوید کے مہوؤ آف ہونے کا اندازہ ہوا تو جیسے سے کہا وہ کچھ کہے بغیر سنی کو گود میں اٹھا کر باہر نکل گیا۔ "مما۔ پلیز یہ پھر کھل گیا۔" عرش نے اپنے جوتے کی طرف اشارہ کیا تو ایمان نے جاگرز کے لہسز دوبارہ باندھے اور خود بھی شوہر کی تقلید میں گھراک کرتی ہوئی نکل گئی۔ نوید نے بہت آف موڈ کے ساتھ گاڑی اشارت کی۔ تھوڑی دیر سفر خاموشی سے گزرا تو وہ واپس اپنی جوتوں میں لوٹ آیا۔ یہ ہی اس کی سب سے اچھی عادت تھی چیزوں کو بہت دیر تک خود پر سوار نہیں کرتا تھا۔

"تمہیں پتا ہے۔ امی۔ جان۔ ہمارا ذہن ایک ایسے شفاف چمکدار برتن کی مانند ہے، جس میں اگر تو توہمات اور مایوسی کی گرد بیٹھ جائے تو شعور کا ٹھنڈا صاف پانی بھی اس میں گدلا دکھائی دینے لگتا ہے۔" نوید نے اس کے نرم ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر پچھلی رات پڑھی گئی ایک بک کی لائن سنائی۔ ایمان نے سر ہلایا۔ "سوری۔ میں بہت جلد مایوس اور پریشان ہونے

شیشے کے دروازے کے پار سے ہاتھ ہلاتا ان کی طرف بڑھنے لگا۔ سراج جھنجھلا اٹھے۔ انجان بن کر دوسری طرف دیکھنے لگے۔ مگر وہ ”چپکو“۔ (یہ خطاب انہوں نے دل ہی دل میں اسے دے رکھا تھا) مسکراہٹ بکھیرتا قریب پہنچ گیا۔

”ایکسکیوزی۔“ سر۔ کیا۔ میں آپ کو جوائن کر سکتا ہوں؟“ نوید علوی کے شائستہ انداز پر انہیں سر اٹھا کر دیکھنا ہی پڑا۔

”بالکل نہیں۔ میں یہاں کچھ دیر۔ تنہا بیٹھنا چاہتا ہوں۔“ سراج انوار نے دل کی آواز کو دباتے ہوئے اخلاقاً۔ اثبات میں سر ہلادیا۔ اس کی موجودگی کے ساتھ ہی خوشبو کا ایک دلفریب جھونکا ان کے ارد گرد پھیل گیا۔

”بیٹھ جاؤ۔“ سراج نے مجبوری میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”میں اپنے کھانے کے لیے رول لے کر آتا ہوں۔“ کیا۔ آپ کو کچھ اور چاہیے؟“ چند لمبے خاموشی کی نذر ہو گئے تو نوید نے خوش خلقی دکھائی۔ انہوں نے لفٹی میں سر ہلادیا۔ وہ اپنی کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا، پورے ہال میں وہ اپنے دراز قد اور کسرتی جسم کی وجہ سے نمایاں دکھائی دے رہا تھا۔

سراج انوار نے عینک درست کرتے ہوئے اس کا جائزہ لیا۔ نوید علوی۔ بلیو ڈریس پینٹ، گہرے شرٹ پر بلیو ٹائی لگائے۔ ہاتھ میں۔ بلیک فولڈر والا قیمتی سیل فون تھا۔ سرونگ کاؤنٹر کی طرف بڑھ رہا تھا، گوکہ اس وقت نوید کی موجودگی انہیں بے زار کر رہی تھی مگر وہ دل ہی دل میں اس کی پراثر شخصیت کو سراہے بغیر نہ رہ سکے۔ ”پلیز۔ آپ کے لیے بھی یہ کافی لایا ہوں۔“

نوید کے ہاتھوں میں بھری ہوئی ٹرے اور چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی، وہ کرسی کھینچ کر ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ ”سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے نا“ سراج انوار نے اخلاق کا دامن پکڑنے کی کوشش کی۔ نوید نے بے تکلفی سے سر ہلادیا، انہوں نے اسے جانچا۔ وہ بڑا پرسکون اور فریش دکھائی دیا۔ نوید کو

انسانوں کو سحر میں مبتلا کرنے کا فن آتا تھا۔ وہ ہمیشہ سے مرعوب ہونے کی جگہ دوسروں کو مرعوب کرتا آیا۔ ڈائریکٹرز کے ساتھ مہینہ گز میں سراج انوار ان کے ہم عصر ساتھی جتنے تناؤ کا شکار ہوتے، وہ اتنا ہی ریلیکس انداز میں نہ صرف اپنا موقف بیان کرتا، بلکہ اکثر اپنی بات منوا کر اٹھتا۔ اسی وجہ سے اس کے اور دفتر میں کام کرنے والے کچھ پرانے ملازمین کے درمیان ایک خلیج سی آگئی تھی۔

”دنیا کتنے ایسے لوگوں سے بھری ہوئی ہے، جن کا غم سے کبھی دور کا واسطہ نہیں پڑا۔ اور۔ ایک میں ہوں بد نصیب۔ بس جلتا رہتا ہوں۔“ سراج انوار کی سوچ رائگ ٹریک پر چل پڑی۔ انہیں اس نوجوان پر رشک آیا۔ وہ نوید کے بارے میں اچھی خاصی معلومات رکھتے تھے ان لوگوں کا اپنا فیملی بزنس تھا۔ اسے کوئی معاشی مجبوری نہیں تھی۔ بلکہ یہ نوکری اسے کے کیریئر ٹریننگ کا حصہ تھی، اسے ایک سال یہاں خاص پروجیکٹ پر کام کر کے، تجربہ حاصل کرنا تھا، اسی لیے نوید نے اپنے والد کے دوست نظام علی کی یہ فیکٹری جوائن کی۔ ٹریننگ مکمل ہونے کے بعد اسے اپنی فیکٹری سنبھالنی تھی۔ وہ نوید کو دیکھ کر احساس کمتری کا شکار ہونے لگتے، اتنے برسوں کی نوکری کر کے بھی ترقی کی دوز میں پیچھے رہ گئے، وہ چار دن سے آفس آنے لگا اور سب پر برتری ثابت کر بیٹھا اسی لیے انہیں بہت برا لگتا تھا۔

”یہ آج کل کی عورتوں کو کیا ہو گیا ہے، جانے کس قسم کے جتن کرنے لگی ہیں، اب سامنے بیٹھی محترمہ کو دیکھو، ان کے رنگے ہوئے بال زہر سے بھی بدتر لگ رہے ہیں۔“ سراج انوار نے لاشعوی طور پر نوید کا غصہ اسی اجنبی عورت پر کیا اور۔ منہ سے بے ساختہ ایک چھوٹی بات نکال دی۔

نوید کافی کا کپ سامنے رکھے دم بخود انہیں گھورنے لگا۔ اس کے شاداں و فرحاں چہرے پر یکلخت سنجیدگی کی لہر چھا گئی۔ وہ اپنے سینئر کی بہت عزت کرتا تھا مگر سراج انوار سے ایسی ہلکی بات سننا اسے بہت برا لگا۔

”سوری۔ سر۔ مگر۔ میرے خیال میں تو یہ محترمہ کا ذاتی معاملہ ہے، اگر انہیں ایسے بال پسند ہیں تو اس اوکے ہمیں کسی پر تبصرہ کرنے کی کیا ضرورت؟“ نوید نے مزید کچھ کہنا چاہا مگر ان کے بدلتے انداز دیکھ کر ایک دم خاموش ہو گیا۔

”میاں۔ کہنا کیا چاہ رہے ہو ذرا، کھل کر کہو۔“ سراج انور کے ہاتھ ایک چابی لگی۔ وہ ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھے۔

”میں تو بس یہ کہہ رہا ہوں، ہمیں ان سے کیا مطلب۔ آپ کی۔ کافی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ جلدی سے پی لیں۔“ نوید نے سر کھجاتے ہوئے بڑی رسائیت سے انہیں ٹالا مگر وہ تو آگ بگولا ہو گئے۔

”بات سنو۔ میں کوئی کل بچہ نہیں ہوں سب سمجھ رہا ہوں۔ تم میرے بارے میں کیسا سوچتے ہو؟ اپنے اخلاقیات کے فلسفے جا کر کسی اور کے سامنے پیش کرو۔“ وہ نوید پر برسنے لگے۔

”سر۔ یہاں بات فلسفے کی نہیں۔ میں تو بس خواتین کا احترام کرتا ہوں۔ اسی لیے۔“ نوید نے سنجیدگی سے انہیں دیکھ کر کہا۔

”میں بھی یہ بات جانتا ہوں۔ خاندانی آدمی ہوں کوئی نیچا بچا نہیں۔ ایک چیز بری لگی اس کا برملا اظہار کر دیا۔ تم نے تو میاں بٹنگڑ ہی بنا ڈالا۔“ سراج انور نے انگلی اٹھا کر اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کڑک دار انداز میں کہا۔ وہ کافی جذباتی ہو کر کھڑے ہوئے، غصے کے مارے ہاتھ لگنے سے کافی کاکپ بھی نیچے گر گیا۔ فرش پر ایک دم چھٹکا ہوا۔ بال میں مل بھر کے لیے خاموشی طاری ہوئی۔ سب لوگ ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ نوید کو ایک دم شرمندگی نے آگھیرا۔ سراج انور کو بھی اپنی یہ حرکت کچھ غیر مناسب لگی، کچھ اور سمجھ نہیں آیا تو وہ جلدی سے گاڑی کی چابی اٹھا کر کاؤنٹر کی طرف بل کے پیسے دینے چل پڑے۔

”سچ ہے جوش میں ہوش کھونے کے بعد انسان کے ہتھے صرف شرمندگی ہی لگتی ہے۔“ نوید نے لمحے میں ان کی ذات کا تجزیہ کر ڈالا۔

منفی سوچ، حد سے بڑھ جائے تو، کبھی ندامت تو کبھی خفت ساتھ لاتی ہے، سراج انور بھی اسی کیفیت میں مبتلا ہو کر اپنے کیبن میں داخل ہوئے۔



”سجائے۔ کہاں ہو؟ ایمان۔ بیٹا اسد۔ سب ایک ساتھ کہاں غائب ہو گئے؟“ سراج انور نے گھر میں داخل ہوتے ہی سب کو پکارا، جواب ندار۔ ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔

”گھر میں تینوں ہی نہیں ہیں۔“ وہ تشویش میں مبتلا ہوئے۔ پہلے ہی دفتر سے بہت خراب موڈ کے ساتھ لوٹے تھے۔ عادت کے مطابق اپنی چابی سے لاک کھولا۔ گھر خالی پایا تو کوفت نے آگھیرا، انہیں اچانک یاد آیا کہ آج تو وہ اپنے بڑے سالے کی طرف ڈنر پر انوائٹڈ ہیں۔

”میں ایسے ہی ہول رہا ہوں۔ سب وہیں گئے ہوئے ہیں۔“ سراج نے بڑبڑاتے ہوئے استری شدہ کرتا شلووار اٹھایا جو ان کی بیوی الماری پر ہنگ کر کے گئی تھیں۔ سجانہ نے رات کو ہی انہیں بھاتی کے گھر وقت پر پہنچنے کی تاکید کی تھی، کیوں کہ وہ اپنے سسرال والوں سے کئی فٹ دور بھاگتے تھے۔ شاید اس طرح وہ سجانہ کو کچھ جتنا چاہتے تھے۔

ایک گلاس پانی غٹا غٹ پی کر وہ فریش ہونے کی خواہش لیے تیزی سے واش روم کی طرف بڑھے مگر دروازے کی گھنٹی زوردار طریقے سے بجی۔

”کیا مصیبت ہے اس وقت کون آگیا؟“ بڑبڑاتے ہوئے دروازے کی سمت بڑھے۔ ان کا اس وقت کسی سے بھی خوش اخلاقی برتنے کا کوئی موڈ نہیں تھا۔

”بجائے جاؤ۔ میں دروازہ ہی نہیں کھولتا ہوں۔“ دل میں خواہش ابھری۔ مگر کوئی بہت ڈھیٹ ہستی تھی۔ بیل بجے جا رہی تھی۔ بادل ناخواستہ جا کر دروازہ کھولنا پڑا۔

”اوس۔ بھائی صاحب آپ۔ کیا۔ سجانہ بھابھی گھر پر نہیں ہیں؟“ دروازہ کھلتے ہی سامنے والی سویرا بھابھی

کا جوش سے بھرا گول مٹول چہرہ دکھائی دیا۔ وہ تیزی سے اندر داخل ہونے لگیں۔ مگر سراج انوار کو گیٹ پر استادہ دیکھا تو ایک دم جھجک کر پیچھے ہو گئیں۔

”سبحانہ۔ تو ڈنر پر اپنے بھائی کی طرف گئی ہوئی ہیں۔“ سراج نے جلدی جلدی مدعا بیان کر کے جان چھڑانا چاہی اور اس کے ہاتھ میں تھامے مٹھائی کے ڈبوں کو حیرانی سے دیکھا۔

”پہلیں کوئی بات نہیں میں یہ مٹھائی دینے آئی ہوں۔ اصل میں انزلہ کی بات پکی کر دی ہے تو اسی خوشی میں سب کا منہ میٹھا کر رہی ہوں۔ بھابھی آئیں تو یہ دے دیجیے گا۔“ سویرا ایک ڈبا انہیں پکڑا کر تیزی سے اوپر جانے والے زینے کی طرف بڑھ گئیں۔

سراج انوار گرم سم کے رہ گئے، مبارک باد دیتا۔ یاد رہا نہ ہی نہانا۔ بس ایک ناک مٹھائی کے اس چھوٹے سے ڈبے کو گھورنے لگے۔ جیسے اس میں کوئی بم ہو۔ ڈبے پر لگی لٹری پنی کی چمک ان کی نگاہوں میں چبھنے لگی۔

”صبح دفتر جاتے ہوئے ساتھ لے جاؤں گا۔“ وہ ہر روز اتے ہوئے اٹھے اور ڈبے کو اٹھا کر لیفٹ میں پیچھے کی طرف چھپا دیا۔ ادا سی بڑھنے لگی۔

”سراج بیٹا اچھا انسان وہ ہی ہے جو دوسروں کی خوشیوں کو مقدم جانے لوگوں کی خوشیوں کو روندنے والا کبھی خوش نہیں رہ پاتا۔“ وہ شیو بنارے تھے کہ آئینے میں بابا کی شبیہ لہرائی۔ ایک دم ٹھٹک گئے، ریزر ہاتھ سے چھوٹ کر واش بیسن میں جاگرا، دل کو دھکا لگا۔ کچھ پل یوں ہی گزرے پر دعوت کا خیال آیا تو ہاتھ تیزی سے چلے وہ خود سے نگاہیں چراتے، تولیہ سے منہ پونچھنے لگے۔



”آپ نے مجھے انزلہ کی منگنی کا کیوں نہیں بتایا؟“ سراج چہل قدمی کر کے واپس لوٹے تو سبحانہ غصے میں لال پیلی ہونے لگیں، انہوں نے بھولنے کا بہانہ کیا۔ مگر وہ ان کے داؤ میں کب آتی تھیں۔ ہونٹ چباتے ہوئے شوہر کو دیکھے گئیں۔ سراج مڑ کر صوفے پر

براجمان ہوئے۔ ”بیٹا ایک گلاس پانی دیتا“ انہوں نے ایمان کو پکارا۔

”جی بابا۔“ اس نے افسردگی سے سر ہلایا تو سراج انوار کو معاملہ بگڑنے کا احساس ہوا۔

”آج پھر سبحانہ کو دورہ پڑا ہے۔ ماحول کچھ کشیدہ ہے۔“ انہوں نے سب کو چپ چپ دیکھا تو اندازہ لگایا۔ دونوں بیٹیوں کا چہرہ اترا ہوا تھا، بلکہ ایمان کی آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں۔ اسد بھی کاؤچ پر بیٹھا، کتاب کھولے خلاؤں میں گھور رہا تھا۔

”میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے؟“ سبحانہ کمر پر ہاتھ رکھے، تن کر میاں کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔

”ارے بابا۔ سبحانہ کا موڈ بگڑ چکا ہے میری خیر نہیں۔“ سراج انوار نے ایک نئے معرکے کے لیے خود کو تیار کیا۔

”غضب خدا کا۔ آپ کے لیے یہ معمولی بات ہے اور وہ سویرا بھابھی پوری بلڈنگ میں گاتی پھر رہی ہیں کہ سبحانہ بھابھی میری بیٹی کی منگنی سے جل گئیں، مٹھائی رکھ لی مگر جھوٹے منہ مبارک باد دینے نہیں آئیں۔“ انہوں نے اپنے گرم ہونے کی وجہ بتائی۔ سراج انوار چور سے ہو گئے۔

”ایسے ان کی کسی ہوئی باتیں تم تک کیسے پہنچیں؟“ وہ ایک دم سے بن کر بیوی سے پوچھنے لگے حالانکہ ان کی ”سورس آف انفارمیشن“ کو اچھی طرح سے جانتے تھے۔ وہ کوئی اور نہیں اس بلڈنگ میں کام کرنے والی ماسی وزراں تھیں، جس کا من پسند مشغلہ ادھر کی ادھر کرنا تھا۔

”شرلاک ہو مزی طرح جاسوسی کرنا چھوڑیں کہ کس نے بتایا۔ کس نے نہیں؟ اصل معاملے پر دھیان دیں۔ سارے زمانے کی کالی پیلی لڑکیوں کی شادیاں ہو رہی ہیں، منگنی کے لڈو بٹ رہے ہیں۔ رشتے طے ہو رہے ہیں۔ ایک ہمارے یہاں کس بات کی اندھیر بڑی ہوئی ہے۔ جو آتا ہے لڑکی دیکھتا ہے۔ پسند بھی کر لیتا ہے، مگر گھر جا کر انہیں ایسے پسو پڑتے ہیں کہ پلٹ کر جواب ہی نہیں دیتے، اس فروری میں

ایمان پورے چوبیس برس کی ہو جائے گی۔ میرا تو سوچ سوچ کر برا حال ہے۔ کروں تو کیا کروں؟“ وہ ایک دم سے شروع ہوئیں ماں کے انداز فکر پر ایمان اذیت کا شکار ہوئی اور امداد طلب نگاہوں سے باپ کی طرف دیکھا جو خود اس وقت مجبور دکھائی دیے۔

”فکر کیوں کرتی ہو۔ سب ہو جائے گا۔ تمہارے ہاتھ ہونے سے گھر کا ماحول ہی خراب ہوتا ہے۔ مسئلہ تو حل نہیں ہوتا نا۔“ سراج نے رسائی سے سمجھایا۔

”آپ ہی بتائیں پھر کیا کروں؟ شایان بھی اس سے بس ایک سال چھوٹی ہے۔ مگر قد کاٹھ کی وجہ سے ایمان سے بھی بڑی دکھائی دیتی ہے بڑی کا کچھ ہو تو چھوٹی کے لیے بھی سوچا جائے۔“ سراج کی نرمی پر سبحانہ کے مزاج کی گرمی بڑھی۔

”یہ عورت بھی نا۔ اپنے آگے کسی کی نہیں سنتی۔ تم لوگوں کے اب سمجھ میں آیا کہ میں نے انزلہ کی مٹھائی کیوں چھپائی؟ کسی کی منگنی شادی کی خبر آجائے یہ آپ سے باہر ہو جاتی ہے۔“ سراج انوار بھی بھک کر بیوی پر چڑھ دوڑے۔

”آپ کو تو فکر نہیں۔ میں ماں ہوں دن رات جلتی کڑھتی رہتی ہوں۔ دنیا والے تو مجھ سے سوال کرتے ہیں۔“ سبحانہ نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

”تمہارا ہر دفعہ کا یہ ری ایکشن اب ناقابل برداشت ہوتا جا رہا ہے۔“ سراج انوار نے انہیں وارننگ دینے کے لیے انگلی اٹھائی۔

”اسد میرے بچے کاش۔ تم ان بہنوں سے بڑے ہوتے تو مجھے کچھ حوصلہ ملتا۔ تمہارے بابا۔ کو کوئی فکر نہیں۔ بس گھر سے دفتر۔ دفتر سے گھر آ جا کر سمجھتے ہیں کہ تیرا مارنیا۔“ سبحانہ نے بیٹے کی طرف دیکھ کر دیہاتی وی۔ اسد ایک دم اپنی جگہ سے اٹھا اور ماں کو لپٹا کر سلی دینے لگا۔

سراج نے ٹھنڈی سانس بھری۔ سبحانہ ہمیشہ سے ایسی ہی جذباتی واقع ہوئی تھی۔ انہیں اندازہ تھا کہ انزلہ کی منگنی کی بات چھپنے والی نہیں مگر آج کل ان کی مثال

اس شتر مرغ کی سی تھی جو رست میں منہ دے کر خود کو محفوظ سمجھتا ہے۔ انہیں خود بھی بیٹی کی بہت فکر تھی۔ پر وہ کر ہی کیا کر سکتے تھے۔ گھر کے ایسے حالات کی وجہ سے ہی ان کے ذہنی حالات تباہ حال ہو رہے تھے۔

”سنئے جی۔ اس سے پہلے کہ وقت نکل جائے کوئی اچھا لڑکا ڈھونڈ نکالیں۔ ورنہ مجھے کچھ ہو جائے گا۔“ سبحانہ شوہر کی حالت سمجھے بغیر بولے جا رہی تھیں۔ ان کی بات پر دونوں بہنوں نے دہل کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ سبحانہ اپنی باتوں سے اہل خانہ کا مورال گرانے پر تل گئیں۔ ایمان کی برداشت جواب دے گئی وہ وہاں سے ہٹ گئی۔

”کیا کروں؟ سب سے تو کہہ رکھا ہے۔ مجھے لگتا ہے کسی نے ان دونوں پر تعویذ کرا کر رشتوں میں بندش کرا دی ہے۔ سوچ رہی ہوں وزیراں کے ساتھ اس کے پیر بابا کے پاس جاؤں۔ سنا ہے ایسے کاموں کے توڑ میں بڑی شہرت رکھتے ہیں۔“ وہ افسردگی سے سر پر ہاتھ مار کر بولیں تو سراج کو ان کی دماغی حالت پر شبہ ہونے لگا۔ اسد نے بھی پریشان نگاہوں سے پہلے ماں کو پھر شایان کی طرف دیکھا جو زرد ہو رہی تھی۔

”لاحول ولا قوتہ۔ سبحانہ اسی کی کسر رہ گئی ہے۔ جہالت کی انتہا ہے۔ اور یہ بابا کی ساری کرامتوں کے بارے میں جس تمہیں وزیراں نے بتایا ہو گا۔ وہ ایسے ہی گھر گھر گھس کر غورتوں کی نفسیات سے کھیلتی ہے۔ اسی لیے تو کہتے ہیں گھر میں کسی بزرگ کا ہونا ضروری ہے۔ مگر تم ایسی باتیں کہاں سنتی ہو۔“ سراج انوار کی برداشت ایک دم زیر و تنک جا پہنچی انہوں نے بیوی کو بری طرح سے جھاڑا۔

”بس۔ ہر بات کے بیچ میں اپنے باپ کا ذکر لے آیا کرو۔“ وہ منہ ہی منہ میں بولیں۔ سب خاموشی سے ایک دوسرے کو ٹکنے لگے اچانک۔ ”میرے۔ اللہ۔ پا۔ پا“ ایمان کی چیخ سنائی دی۔ وہ سب کچن کی طرف بھاگے۔ ایمان پر کھوتا ہوا دودھ گر گیا تھا۔ پاؤں پر سرخ سرخ نشان پڑ گئے تھے۔ وہ اپنے آنسوؤں کو روکشی کمال ضبط کا مظاہرہ کرتی سلپ تھامے کھڑی تھی۔ اس کا

خوب صورت گلابی چہرہ برداشت کی شدت سے سرخ پڑ گیا۔

”بیٹا۔ یہ کیسے ہوا؟ میری بچی تکلیف تو نہیں ہو رہی۔“ سراج نے اسے کرسی پر بٹھایا اور بے قراری سے پوچھا۔ اور ایمان کے پاؤں پڑنے والے آبلوں پر پھونکنیں مارنے لگے۔ سبحانہ نے آگے بڑھ کر بیٹی کا سر سینے سے لگا لیا۔ اسد جلدی سے ٹوتھ پیسٹ لینے بھاگا تاکہ چھالوں پر لگا دے۔ پورا گھر ایمان کی تکلیف پر مچل اٹھا۔

”بابا۔ جلنے سے زیادہ تکلیف۔۔۔ ماما کی باتوں کی وجہ سے ہو رہی ہے۔“ ایمان نے ایک نگاہ ماں کو دیکھا پھر لب کاٹتے ہوئے شکوہ کیا۔ سبحانہ کا سر جھک گیا اچانک سراج انوار کے سر کے پچھلے حصے میں ایسا درد اٹھا کہ برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔ انہوں نے سر پر ہاتھ رکھا۔

”میری کرسی یہاں سے کہاں گئی۔ کس نے ہٹائی ہے؟“ سراج انوار سردرد کی بنا پر آفس لیٹ پہنچے۔ کیبن میں داخل ہوتے ہی ان کا موڈ مزید آف ہو گیا۔ نیبل کے ساتھ رکھی بیٹھنے کی کرسی غائب تھی۔

”عارف صاحب۔۔۔ میری چیئر کون لے گیا؟“ انہوں نے اپنے کیبن سے باہر آکر اپنے ماتحت عارف سے پوچھا تو اس نے کاندھے اچکا کر نفی میں سر ہلا دیا۔ فائل پر جھک کر کام کرنے لگا۔ وہ ہونٹ بھیج کر ارد گرد کا جائزہ لینے لگے۔ سب اپنی اپنی دنیا میں مگن تھے۔

”میری کسی کی نگاہ میں کوئی اہمیت ہی نہیں رہی۔“ سراج انوار کو اتنے لوگوں کے بیچ میں اپنا آپ تنہا لگا تو غصہ عود آیا۔

”کوئی میری بات کا جواب دے گا یا نہیں۔ میری چیئر کہاں گئی؟“ وہ ہال کے بیچ میں کھڑے ہو کر تیز لہجے میں بولے تو سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ نوید ان ہی کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے صورت حال کو فوار ہی بھانپا اور نیبل دے کر حمید چہر اسی کو بلایا۔ ان کی چیئر لانے کا کہا۔ ”سر۔ ہم نے تو نہیں دیکھی حمید بھائی سے

پوچھیں۔“ عارف نے ایک دم گھبرا کر جواب دیا۔ ”حمید۔ حمید؟“ وہ ایک دم دروازے کی طرف منہ کر کے گرے اتنی دیر میں حمید باہر سے ان کی چیئر دھکیلتا ہوا آیا، کیبن میں لے جا کر رکھ دی۔ ”آپ کس کی اجازت سے اسے یہاں سے اٹھا کر لے گئے تھے؟“ سراج نے اپنے اندر کی کھولن حمید چہر اسی پر اندھلے ہوئے انسانی فطرت کا مظاہرہ کیا۔ جس کے تحت ہر شخص اپنے سے کمتر کو ہی دباتا ہے۔

”سرتی۔ اس دن آپ کہہ رہے تھے کہ میز کرسی کے نیچے بہت جالے ہو گئے ہیں صاف کر دینا۔ آج آپ آئے نہیں تو میں نے سوچا۔ شاید چھٹی کا ارادہ ہے۔ بس اسی لیے۔“ حمید سے آگے بولا ہی نہیں گیا، گلے میں پھندا سا پڑ گیا۔ سراج انوار نے اس بوڑھے اور کمزور سے آدمی کے جھکے سر کو دیکھا تو دل مزید خراب ہونے لگا۔ حمید ایک لفظ کے بغیر باہر جا کر بیٹھ گئے۔

سراج انوار اپنے شیشے کے بنے کیبن میں پلٹ گئے۔ سسٹم آن کیا۔ مگر دل کام کرنے پر مائل ہی نہیں ہوا۔ ساری دنیا زہر سے بھی بدتر لگ رہی تھی۔ ایمان کی اتری صورت بار بار نگاہوں میں پھر رہی تھی۔ ان کی بیٹیاں بہت معصوم تھیں۔ کبھی کسی کچھ کا شکوہ کیا نہ ہی گلہ۔ پتا نہیں قسمت میں کیا لکھا تھا۔ نوید نے کی بورڈ پر تھرکتی انگلیوں کو روکا اور سراج صاحب کے کیبن کی طرف نگاہ دوڑائی۔ کافی دیر سے منہ میں پین دبائے ایک ہی انداز میں بیٹھے کسی خیال میں گم دکھائی دیے۔

”سر کے ساتھ لگتا ہے کوئی خاص بات ہوئی ہے ورنہ وہ اس سے پہلے تو یوں کبھی کسی پر نہیں برا بھلا بے چارے حمید بھائی کا بھی منہ اتر گیا۔“ نوید کی ہلکی براؤن آنکھیں ان کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ کچھ سوچ کر۔ انٹر کام اٹھا کر کسی سے بات کی پھر چلتا ہوا ان کی میز کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ ”چپکو پھر آگیا۔“ سراج انوار نے اسے دیکھ کر کوفت سے سوچا۔

”سراج صاحب۔ چلیں ذرا تازہ ہوا میں چلتے ہیں۔ میں نے سر کو انفارم کر دیا ہے۔“ نوید نے ان کا ہاتھ تھاما اور زبردستی کیمین سے باہر نکل کر لفٹ کی طرف بڑھا۔ ”یہ اپنی بات منوائے بغیر جان نہیں چھوڑے گا“ وہ مسکرائے۔ کسی بچے کی طرح اس کے ساتھ گھٹے چلے گئے۔ انہیں اس کا یہ انداز برا نہیں لگا شاید وہ خود بھی فرار چاہ رہے تھے۔

نوید کو سراج انوار ہمیشہ سے بہت اچھے لگتے تھے۔ ان میں ایک کشش تھی۔ پر اسے کبھی کبھی لگتا۔ بظاہر مکمل دکھائی دینے والے سراج انوار کی شخصیت میں کچھ لمبی سی ہے۔ جیسے تصویر کا ایک حصہ گم ہو گیا ہو۔ ان سے نظریں ملانے پر تشنگی کا احساس جاگتا تھا۔

وہ دونوں آس کی بلڈنگ سے نکلے تو سامنے پھیلے احاطے میں موجود سبزہ زار اور رہلاتے خوش رنگ پھول پودے راہ میں آگئے۔ نوید کے اندر تازگی کا احساس جاگا۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے تھکے ہوئے دماغ کو سبزہ توانائی اور نگاہوں کو تراوش بخش رہا تھا۔ اس نے مڑ کر خیالوں میں کھوئے سراج انوار کو دیکھا۔ مجال ہے جو ان پر فطرت کے نظاروں نے کوئی اثر ڈالا ہو۔ ”بیٹا۔ یہ تو بڑا بگڑ ہوا کیس ہے۔ ان پر تو مایوسی کا طویل دورہ پڑا ہوا ہے۔ فوری علاج کی ضرورت ہے۔ مسرت کے کیمپول‘ پیار کی ڈرپ اور امید بھرے انجکشن لگانے سے شاید کچھ افاقہ ہو سکے۔“ نوید نے کیفے ٹیریا جا کر ایک میز سنبھالتے ہوئے مزے سے سوچا۔ وہ اپنے گھر انہ کا سب سے منفرد سوچ رکھنے والا فرد تھا۔ اسے لوگوں کی نفسیات سے بڑی دلچسپی تھی۔

”اب بتائیے۔ آخر مسئلہ کیا ہے؟“ نوید نے چائے کا گرم گرم سب لیتے ہوئے جی کڑا کر کے پوچھا۔

”کوئی بات تمہیں۔ کوئی مسئلہ نہیں۔“ چپکو۔ ”سراج انوار نے روکھے پن سے جواب دیا۔“ چپکو“ انہوں نے دل میں ہی کہا۔ اور چائے کی پیالی میں جھانکنے لگے، جس میں انہیں ایمان کی اتری صورت دکھائی دے رہی تھی۔ آنکھیں بھر آئیں، گلا خشک ہونے لگا۔ اس لمحے دل اچاٹ ہو گیا۔

”ایک بات کہوں۔ باتیں شیئر کرنے سے کچھ اور ہونہ ہو دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔“ نوید کی جانچتی نگاہوں نے سمجھ لیا کہ اندر ہی اندر کوئی لاوا پک رہا ہے۔ اسی لیے ان کی کلائی کو چھو کر ایک دم دلا سا دیا۔ وہ چونکے۔ نوید کا پیار بھرا لمس اچھا لگا۔ اس کے وجہ سے چہرے پر اپنائیت کے رنگ بہت بھلے لگے یا شاید ان کو کسی کاندھے کی ضرورت تھی۔ وہ دھیرے دھیرے سب بتاتے چلے گئے۔

”ہونہ۔ اچھا تو یہ بات ہے۔ اچھا۔ ایک بسکٹ کھائیں۔ یوں چائے میں ڈبو کر مزا آجائے گا۔ اس کے بعد میرے ایک سوال کا جواب دیجیے گا۔“ نوید ان کی ساری باتیں سننے کے بعد ایک دم سوچ میں پڑ گیا۔ ریلیکس ہوتے ہوئے ان کو بسکٹ کھاکر خود چائے میں ڈبو کر کھا کر دکھایا وہ اس کی شرارتی اسٹائل پر بہت دنوں بعد دل کھول کر رہے۔ اس کی تقلید میں خود بھی چائے میں بسکٹ ڈبو کر کھانے کا مزا لینے لگے۔ غم اڑن چھو ہو گئے اور کافی بہتر محسوس ہوا۔

”ہمیں چاہیے کہ ہم اللہ سے اچھی امیدیں لگائے۔ آپ کا اس بات پر تو کامل یقین ہے نا؟“ نوید نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔

”اچھا۔ بتائیں۔ کیا آپ کے غصہ کرنے سے حالات بدل جائیں گے؟“ نوید نے سوال کر کے انہیں اشارہ دیا وہ عیش مند تھے۔ ایک دم شرمندہ ہو گئے۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹا۔ میں واقعی گناہ گار انسان ہوں، جو امید چھوڑ بیٹھا۔ ورنہ جس رب نے میری بیٹیوں کو پیدا کیا ہے اس نے ہی یقیناً ان کا جوڑ بھی بنایا ہو گا۔“ سراج اپنا کتھار سس کرنے لگے تو فکر اور غم خود ساختہ لگے۔

”وہ رحیم و کریم ہے۔ اپنے بندوں کو کبھی نہیں بھولتا۔ ہم ہی ناقص سوچ رکھنے والے ہیں۔ جو بے جا مایوسی کو اپنے اوپر سوار کیے رہتے ہیں۔“ نوید نے دلاسا دیا۔

”چپکو۔ اتنا برا بھی نہیں۔“ اسے بغور دیکھتے ہوئے سوچا۔ مزے سے ٹانگ پھیلا کر ریلیکس انداز

میں بیٹھ گئے۔ نوید کو ان کے اشائل پر ہنسی آگئی۔

”صحیح بات ہے۔ بس تمہاری آنٹی۔ بہت پریشان رہتی ہیں۔ کبھی بدشگونئی ٹھہراتی ہیں تو کبھی رشتوں میں بندش جیسی فضول بات پر یقین کرنے لگتی ہیں۔ مجھے کسی پیر بزرگ کے پاس جانے کا کہتی ہیں۔“ انہوں نے لا چاری سے کہا۔

”سراج سہ۔ جب تک انسان زندہ ہے اس کے روح میں روشن امید کا دیا بجھنا نہیں چاہیے ایک پیر بابا خود ہمارے اندر چھپا بیٹھا ہوتا ہے جو ہمیں برائی سے دور لے جا کر سچائی کے قریب کرتا ہے۔ وہ ہمارا ضمیر ہے۔ بس کبھی کبھی اپنے اندر جھانک کر اسے پہچاننے کی ضرورت ہے۔“ نوید کے منہ سے الفاظ کے موتی سراج انوار کے دامن میں ٹوٹ ٹوٹ کر برسنے لگے۔ وہ اس کی ہر بات سے اتفاق کرتے چلے گئے سینے پر دھری بھاری سلیس ایک دم سرک گئی۔ گھٹن سے نجات ملی تو ایک زوردار سانس اپنے اندر کھینچی۔

”بیٹا۔ تم تو واقعی کمال ہو۔“ انہوں نے پہلی بار اسے پیار سے پکارا۔ نوید سرشار ہو گیا۔

”سرجی۔ میں کمال نہیں۔ نوید علوی ہوں۔“ وہ ایک دم اتر کر بولا اور گھڑی پر نگاہ دوڑائی کافی ٹائم ہو چکا تھا۔

”ویسے اتنی کم عمری میں ایسی گہری اور پختہ سوچ۔ حیران کن ہے۔“ دونوں واپسی کے لیے اٹھنے لگے تو سراج انوار نے اسے سراہا۔

”یہ میرے دادا مرحوم کی تربیت ہے۔ وہ بہت علم والے تھے۔ میں نے کافی وقت ان کے ساتھ گزارا ہے۔ ممانے ہمیشہ بزرگوں کے سائے کو رحمت سمجھا۔ اسی لیے ان کی دادا جی سے بہت بنتی تھی۔“ نوید کی نگاہیں اپنے دادا کے ذکر پر نرم ہوئی۔

”چلیں۔“ سراج انوار سر ہلاتے ہوئے کھڑے ہوئے تو نوید ایک دم رک کر تذبذب سے انہیں دیکھنے لگا۔

”بیٹا۔ کچھ اور بھی کہنا ہے؟“ سراج اس کی ہچکچاہٹ بھانپ گئے۔

”سرجی۔ آج ذرا سوچیں گے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی کا دل دکھا ہوا یا کوئی آپ کی وجہ سے تکلیف میں مبتلا ہو بس معافی میں تاخیر معاملات کو بگاڑنے کا سبب بن سکتی ہے۔“ نوید کی آواز ان کی روح تک اترتی چلی گئی، انہیں لگا ذہن پر بڑا سیاہ غلاف کسی نے نوچ ڈالا ہے، روشنی دماغ تک پہنچیں تو وہ باتیں بھی یاد آگئیں جنہیں وہ بھولے نہیں تھے مگر مصلحتاً ”نظر انداز کیے جارہے تھے۔ دیر ہو چکی تھی مگر اتنی بھی نہیں کہ تلافی نہ ہو سکے۔ وہ کھل کر مسکرائے۔

”بیٹا بڑی نیک ماں کی اولاد ہو۔“ سراج انوار نے ایک دم نوید کے سر پر مشفقانہ انداز میں ہاتھ پھرتے ہوئے کہا۔

”آپ نے سچ کہا، میری ماما بہت نیک خاتون ہیں۔ انہوں نے مشکل حالات میں بھی امید کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیا۔“ وہ ان دنوں کو نہیں بھولا جب والد کی بیماری کے بعد نوکروں کی غفلت کی وجہ سے کاروبار میں ایک دم گھٹا ہونے لگا مگر ماما کا اطمینان بھر انداز اور یقین سے لبریز لہجہ۔ ان سب میں زندگی کی نئی لہروڑا گیا۔ وہ ایک دم میدانِ عمل میں اتر آئیں اور کاروبار کے تمام معاملات اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ آج سب کو ان کی کامیاب زندگی دکھائی دیتی ہے، ماضی کے دکھ بس منظر میں چلے گئے۔

”اب تو تمہاری فیملی سے ملنے کی خواہش پیدا ہو رہی ہے۔ واقعی تمہارا تعلق اچھے خاندان سے ہے۔“ وہ بشارت سے گویا ہوئے۔ نوید کے دل میں ایک خیال آیا۔

”یہ کوئی ایسی مشکل بات نہیں۔ کیا میں کل شام اپنی مام کے ساتھ آپ کی طرف چائے پیئے آسکتا ہوں؟“ نوید نے بڑی محبت سے سوال پوچھا تو ان سے منع نہیں کیا گیا۔ ایمان کا تذکرہ سن سن کر جانے کیوں۔ اسے دیکھنے کی خواہش من میں جاگی۔

”ہاں۔ کیوں نہیں۔“ سراج انوار نے جھجکتے ہوئے حای بھری۔ اثبات میں سر ہلا کر اجازت دے دی

”یہ چپکے میرا مطلب ہے نوید۔ سچ کہتا ہے اچھی امیدیں انسان کے زوال کو کمال تک پہنچانے میں لمحہ نہیں لگاتیں۔“ وہ شرارت سے سوچتے ہوئے اسے دیکھ کر مسکرا دیے۔



”دادا جان۔ واہ بھئی۔ واہ۔“ اسد نے دروازہ کھولا تو باپ کے ساتھ۔ انوار صاحب کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر جوش سے چلایا ”اندر سلائی کرتی سجانہ کے ہاتھ میں سوئی چبھ گئی۔“

”اوہ! باپا جانی۔ آپ نے۔ یہ بہت شاندار کام کیا۔“ ایمان اور شایان بھی باپ اور دادا کے گرد بیوانوں کی طرح چکرانے لگیں۔ وہ سب اتنے ایکسائٹڈ ہو رہے تھے کہ وہیں کھڑے ہو کر سوال جواب کرنے لگے۔

”ہاں۔ بچے۔ دیر آید درست آید۔“ سراج انوار بھی شوخ ہوئے۔

”بیٹا! کیا بات ہے۔ ہو ملنے نہیں آئیں؟“ انوار صاحب نے تھوڑی دیر انتظار کیا پھر بے چینی سے پوچھا۔ سراج بیوی کی حرکت پر باپ کے سامنے سرمنڈھ ہونے لگے۔

”شاید مماندر کہیں بڑی ہیں۔“ شایان نے دادا کا دل رکھنے کے لیے بہانہ گھڑا۔

”اتنے سال گزرنے کے باوجود سجانہ میں تبدیلی نہیں آئی۔ ہم اسی لیے معراج کچھ گھر سے یہاں آنے کو منع کر رہے تھے۔ چلو ایک دو دن بچوں کے ساتھ رہ لیں۔ پھر ہمیں چھوڑ آنا۔“ انوار صاحب پھکی سی مسکراہٹ چہرے پر سجائے دکھ سے بولے۔ ہاتھ میں تھامی ہوئی چھڑی پھسلی۔ ایک دم لڑکھائے۔ اسد نے آگے بڑھ کر انہیں سہارا دیا۔ دوسری طرف سے سراج نے باپ کو تھام کر جلدی سے نرم صوفے پر بٹھا دیا۔

”نہیں۔ بابا۔ اتنے سال میں اس عورت کی ضد کی خاطر آپ سے دور رہا اب مزید نہیں۔ چھوٹے

نے اپنا فرض خوب نبھایا۔ اب کچھ ثواب مجھے بھی سمیٹنے دیں۔ میں پہلے ہی بہت گناہ گار ہو چکا ہوں۔ اس لیے آپ نے جانے کی بات کی تو اپنا سامان ساتھ ہی باندھ لوں گا۔“ ان کی زوردار آواز میں دی گئی دھمکی گھر بھر میں گونج اٹھی، سجانہ کے کانوں تک پہنچی تو وہ شوہر کا فیصلہ سن کر گھبرا گئیں۔ ایمان دادا کی خاطر تواضع کے لیے کچن کی طرف چل دی۔

”نہیں بیٹا۔ ایسی باتیں نہ کرو۔ ہم نہیں چاہتے کہ بلاوجہ تمہارے گھر کا ماحول ایک بار پھر خراب ہو جائے۔“ انہوں نے دلی زبان میں بیٹے کو سمجھاتے ہوئے ہر طرف ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ اپنے بڑے بیٹے کے گھر میں انہوں نے بہت کم عرصہ گزارا تھا۔

سجانہ کو شروع سے اپنی پرائیویسی میں کسی کی دخل اندازی پسند نہ تھی۔ انوار صاحب بہت خوددار تھے۔ بیوی کے انتقال کے بعد جلد ہی اپنے چھوٹے والے معراج کی شادی بھانجی سے کر دی اور دل پر پتھر رکھ کر ہمیشہ کے لیے اس کے گھر شفٹ ہو گئے۔ وہاں بہت آرام تھا مگر جب بھی سراج کی یاد آتی تو من میں ایک کسک سی جاگ اٹھتی۔

”بابا! پہلے بچے چھوٹے تھے تو میں ان کی وجہ سے مجبور ہو جاتا تھا، مگر اب وقت بدل گیا ہے۔ چاہے سجانہ آپ کی خدمت نہ کرے۔ پر مجھے اب یہ اطمینان رہے گا کہ میرے تینوں بچے مل کر اپنے دادا کا خیال رکھ سکتے ہیں۔“ سراج نے ہاتھ اٹھا کر فیصلہ سنایا اور اسد کو سامان اندر لے جانے کا اشارہ دیا۔

”اللہ تم کو اپنی رحمتوں کے سائے میں رکھے۔“ انوار صاحب کی عمر بھر کی تھکن جیسے مٹ گئی۔ سب کے جانے کے بعد انہوں نے بیٹے کو گلے لگا کر دعا دی۔ ”بابا۔ میری بیٹیوں کے حق میں بھی دعا کریں۔ شاید میرے گناہوں کی سزا ہے جو انہیں یہ سب بھگتنا پڑ رہا ہے۔“ وہ باپ کا ہاتھ تھام کر آنسو بہانے لگے۔ دیے ہی جیسے بچپن میں چوٹ لگنے پر بابا سے لپٹ کر روتے تھے۔

”میرے بچے اللہ نے ہر کام کا ایک وقت مقرر کر

رکھا ہے۔ مایوسی کفر ہے، رب کائنات سے اچھی امیدیں وابستہ رکھو۔ مرادپوری ہونے میں دیر سی مگر اندھیر نہیں ہوگی۔“ انہوں نے بیٹے کو ایک بار پھر سینے سے لگا کر دلا سہ دیا۔



سیٹ پر بیٹھ کر سراج انوار نے کمپیوٹر آن کیا۔ مختلف لیبارٹریوں سے بھیجی گئی ای میل کو چیک کرنے لگے، حمید سب کی میز پر چائے کا کپ رکھتے ہوئے ان کی طرف بھی آئے اور خاموشی سے کپ کو نے برنگا کر جانے لگے، سراج انوار کے لبوں کو مسکراہٹ چھو گئی۔ ”حمید بھائی۔ ذرا ادھر آئیے گا۔“ سراج نے تھوڑا جھک کر سائیڈ کارٹر سے ایک شاپر نکالا اور انہیں پکارا۔ ”جی صاحب۔“ وہ کچھ ہراساں سے ہو گئے۔

سراج انوار کے دل میں طمان سنا جاگا۔ ”یہ۔ میں آپ کی پسندیدہ وال پچوری لایا ہوں۔“ انہوں نے حمید چپراسی کی طرف شاپر بڑھایا جو ناراض ناراض سے دکھائی دے رہے تھے۔

”صاحب۔ یہ تکلف کیوں کیا؟“ حمید کے لیے میں ایک دم کھنک سی آگئی، مسکراتے ہوئے تکلف سے کام لینے کی کوشش بھی کی۔

”تکلف کیسا۔ آپ ہم سب کا اتنا خیال رکھتے ہیں۔ پچوریاں گرم گرم بن رہی تھیں۔ بس مجھے بھی آپ خیال آگیا۔“ سراج انوار نے انہیں سر اٹھا کر دیکھا۔

”صاحب۔ بہت شکریہ۔ ہماری۔ بٹیا کیسی ہیں؟ دعائیں دیجئے گا۔“ سراج انوار کے چھوٹے سے عمل سے حمید چپراسی کی آنکھوں میں جگنو چمکنے لگے۔ وہ دعائیں دیتے کاندھے پر پڑے کپڑے سے ان کی میز صاف کرنے لگے۔

”حمید بھائی۔ ایک بات اور۔“ وہ خالی کپ اٹھا کر جانے لگے تو سراج انوار نے پیچھے سے آواز لگائی۔

”جی۔ صاحب۔“ وہ ایک لمحہ ٹھٹھکے اور مرکز انہیں سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”اس میں آپ کے پسندیدہ پائوں کا بندل ہے۔“ سراج انوار نے بچوں کی شوخی سے انہیں بتایا تو ایک دم شرما کر سر ہلاتے ہوئے چل دیے۔ سراج کو چپراسی حمید کی پان کھانے کی عادت اور اس میں شامل نمبا کو زردی کی مہک سے چڑھی۔ وہ اکثر ان کو آتے جاتے پیک مارتا دیکھ کر ٹوکتے، مگر آج جانے کیا ہوا خود ہی پان کی دکان سے بندل خرید لیا۔



”دادا جی۔ میں نے وضو کا پانی گرم کر دیا ہے۔“ ایمان نے مسکرا کر دادا کو بتایا۔ اس کے چہرے پر بڑی پیاری مسکان پھیلی ہوئی تھی۔

”میرا بچہ۔ خوش رہو۔ بڑی خدمت کرتی ہو۔ اللہ۔ تمہارے نصیب کھولے۔“ انوار احمد نے دعا دی اور پوتی کا سہارا لے کر کھڑے ہو کر بالوں پر بوسہ دیا۔ ایمان خوش ہو گئی۔ ان کے ساتھ اندر چل دی۔ سراج نے انہیں دیکھا۔ طمانیت بھرا سانس لے کر شکر ادا کیا۔

”سنیں۔ وہ جو نوپد کی فیملی ایمان کو دیکھنے آئی تھی۔ کیا انہوں نے کوئی جواب دیا؟“ سبحانہ نے شوہر کو جوس کا گلاس پکڑاتے ہوئے عجلت میں پوچھا۔

”نہیں۔ ابھی تک تو کوئی جواب نہیں دیا۔“ سراج نے انکار میں سر ہلا دیا۔ سبحانہ کے چہرے پر ناامیدی سی چھا گئی۔

”کتنے اچھے لوگ ہیں۔ لڑکا بھی لاکھوں میں ایک۔ کاش انہیں ایمان پسند آجاتی۔ وہ بھی دوسروں کی طرح نکلے۔ ایک مہینہ گزر گیا مگر کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ انکار ہی کر دیتے کم از کم اس تو ٹوٹ جاتی۔“ سبحانہ نے شوہر کی جانب دیکھ کر دکھ سے کہا۔ سراج انوار بھی اس معاملے میں ان کے ساتھ تھے۔

”مجھے بھی نوید۔ ایمان کے لیے بہت مناسب لگا۔ پر کسی کے ساتھ زور زبردستی نہیں کر سکتے نا ان کی مرضی تم پریشان مت ہو اور والا ہمارے ساتھ ہے۔“ سراج نے بیوی کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے آسمان کی

جانب ا"شارہ کیا اور تسلی دی۔

نوید کی فیملی سے مل کر وہ سب بہت مطمئن ہو گئے تھے مگر جب اس دن کے بعد سے وہاں سے کوئی جواب نہیں آیا تو سراج نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ آفس میں ان کی سوالیہ نگاہیں بارہا نوید سے ٹکراتیں مگر کوئی حوصلہ افزا جواب نہ پا کر انہوں نے بھی منہ سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ بیٹی اتنی بھی بھاری نہیں تھی۔ نوید کے بھی نرالے انداز۔ زمانے بھر کی باتیں کرتا مگر مجال ہے جو ایمان کے رشتے کے حوالے سے اقرار یا انکار کرتے۔

"کیا کروں۔ میری تو نیندیں اڑ گئی ہیں لوگوں کی معمولی صورت والی لڑکیاں بیاہی جا رہی ہیں ہماری تو دونوں بیٹیاں کتنی خوب صورت ہیں۔" قسمت کے پھیرے سرخ بالوں والی خاتون کی باوا بھری۔ وہ بھی تو اس دن ایسے ہی اپنے نصیب سے نالاں دوسروں کو بھلا برا کہنے میں مصروف تھے۔

"ایک بات کہوں سچانے۔ دوسروں کی خوشیوں میں خوش ہونے والے لوگوں پر ہی اللہ کی رحمت برسی ہے، حسد و رشک میں مبتلا رہنے سے سوائے دکھوں کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ وہ ساری بچیاں بھی پیاری ہیں۔ ان کی خوشیوں کے صدقے میں رب کائنات ہماری ایمان اور شایان کا نصیب بھی کھولے گا۔ تم دوسروں کے بارے میں سوچنے کا انداز بدل ڈالو۔ یقین رکھو۔ ہماری کلفتیں دور ہو جائیں گی۔" سراج انوار نے بہت سنجیدگی سے اہلیہ کو با آواز کرایا تو وہ تھوڑی شرمندہ ہو کر سوچ میں پڑ گئیں۔



"سنیں۔ مجھے آپ سے کچھ بات کرنی تھی۔" نوید نے ایمان کے قریب جا کر کہا وہ اپنی جگہ سے اچھل پڑی خوشبو کا ایک جھونکا اس کے ارد گرد پھیل گیا۔ ایمان آج بہت دنوں بعد یونیورسٹی آئی تھی۔ ابھی ہسٹری کی کلاس شروع ہونے میں کچھ دیر باقی تھی۔ تو وہ وقت گزاری کے لیے گارڈن کی بیچ پر بیٹھ گئی۔

خواتین کے لیے خوبصورت تحفہ

خواتین کا گھریلو افسانہ کلرینٹیا

کانا ایڈیشن قیمت - /750 روپے

کے ساتھ کھانا پکانے کی کتاب

گھانا گھریلو

قیمت - /250 روپے بالکل مفت حاصل کریں۔

آج ہی - /500 روپے کا منی آرڈر سال فرمائیں۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول



ایک موم دل کی لپٹی

رنگ گلابی جگلا

قیمت - /300 روپے

نحلیں حلیہ میں



فاخرہ جبین

قیمت - /400 روپے

بند بوزاک نگار کے لئے

کتبہ عمران ڈائجسٹ

33 اردو بازار کراچی 74000

”آپ یہاں۔۔۔ میرا۔۔۔ مطلب۔۔۔ ہے۔“  
ایمان کے سمجھ میں نہیں آیا کہ اپنے سامنے کھڑے  
اس خوب لڑکے سے کیا کہے۔ جو پچھلے مہینے اپنی فیملی  
کے ساتھ ان کے گھر آیا تھا۔

”اگر میں آپ سے شادی کرنا چاہوں تو آپ کو کوئی  
اعتراض تو نہیں ہوگا۔“ وہ بڑی دلکش مسکراہٹ سے  
اسے دیکھنے لگا۔ جس کا چہرہ نرم گرم دھوپ میں چھپا رہا  
تھا۔ نوید کا دل چاہا اسے دیکھتا رہے تاہم اس کے حسن  
کی بارش میں اپنا تن من بھگوتا رہے مگر احترام لازم تھا  
اس لیے سر جھکا کر جو توں سے زمین کی نرم مٹی  
گریڈ نے لگا۔

”وہ۔۔۔ میں سمجھی نہیں۔“ ایمان ایسی انوکھی  
صورت حال پر کھپکھپا اٹھی۔ لرزتے ہاتھوں سے نیم کا  
درخت تھاما وہ دونوں جس کے نیچے کھڑے محو گفتگو  
تھے۔

”دیکھیں۔۔۔ ہمیشہ۔۔۔ لڑکوں کی پسند و ناپسند کو اہمیت  
دی جاتی ہے۔ مگر میں آپ سے پوچھنا چاہ رہا ہوں۔ اگر  
تاہم مجھ جیسے ہینڈ سم بندے کی رفاقت قبول ہو تو۔۔۔  
میں سراج انکل تک اپنی ماما کا پیغام پہنچا دوں۔“ وہ  
سنجیدہ بات کو ہلکے پھلکے انداز میں کرتا ہوا۔ ایمان کے  
دل میں اتر گیا۔ وہ بغیر جواب دیے شرمائی ہوئی جانے  
کے لیے کھڑی ہو گئی۔

”اچھا۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔ تو میں اچھا نہیں لگا۔  
چلیں۔۔۔ کوئی بات نہیں ماما کو انکار کر دیتا ہوں۔“ وہ پکا  
منہ بنا کر بولا تو ایمان ایک دم گھبرا کر مڑی۔ کوئی بے  
وقوف لڑکی ہوگی جو نوید جیسے شخص کا ہاتھ تھامنے سے  
انکار کرے گی۔ وہ اتنی بھی بے وقوف نہیں تھی۔  
”میں۔۔۔ میں۔۔۔ نے کب انکار کیا۔“ وہ ایک دم  
روانی میں بول بیٹھی۔ پھر ایک دم جھینپ گئی۔

”اچھا۔۔۔ تو اقرار کیا ہے۔۔۔ مادام۔۔۔ کا شکریہ۔۔۔ کچھ  
باتیں بعد کے لیے رکھ دیتے ہیں۔“ وہ دل پر ہاتھ رکھ کر  
ہلکا سا جھکا اور ہاتھ ہلاتا ہوا وہاں سے چل دیا۔ ایمان  
ایک ٹک اسے جاتا دیکھنے لگی۔

”سراج صاحب۔۔۔ آئیے ذرا مزے دار سی کافی  
پینے چلتے ہیں۔“ لٹچ ٹانم میں نوید ان کے پاس آیا اور  
معنی خیز انداز میں بولا۔ وہ بغیر حیل و حجت کے ساتھ  
چل بیٹے۔

”نوید بیٹا۔۔۔ گھر میں سب خیریت ہے؟“ انہوں  
نے جھاگ والی مزے دار کافی کا سپ لیتے ہوئے خود  
ہی بات نکالی۔

”جی۔۔۔ اللہ کا شکر ہے۔۔۔ سب سے پہلے تو معذرت  
کہ اتنا ٹانم گزر گیا اور میں نے اس سلسلے میں آپ کو  
کوئی معقول جواب نہیں دیا۔“ نوید نے شرمندگی سے  
کہا۔

”ارے نہیں رشتے ناٹے تو نصیبوں کی بات ہے۔  
اس میں کسی سے کیا شکوہ؟ اگر ایمان تمہاری ماما کو پسند  
نہیں آئی تو کوئی بات نہیں شاید یہ ہی اس کے حق میں  
بہتر ہوگا۔“ سراج انوار کے وجود پر پھیلا اطمینان دیکھ کر  
نوید مسکرا دیا۔ ان کی شخصیت کی کمی آج پوری ہو گئی،  
وہ ایک مکمل اور مضبوط انسان دکھائی دے رہے تھے۔  
بالکل۔۔۔ اسی طرح کے جیسا نوید انہیں دیکھنا چاہتا تھا۔  
”یہ ہی تو مسئلہ ہے کہ۔۔۔ ایمان ماما کو تھوڑی  
سی۔۔۔ بہت زیادہ پسند آگئی ہے۔“ اس نے  
سینس قائم کیا اور ر غبت سے برگڑ لکھانے لگا۔

”سوری۔۔۔ انکل۔۔۔ اب تو انکل کہہ سکتا ہوں نا۔“  
اس نے شرارتی انداز اپنایا۔

”ہاں۔۔۔ کیوں نہیں۔“ سراج انوار نے پہلو بدلا اور  
سر ہلا کر اجازت دی۔

”ان لوگوں کا کل آپ کے گھر یا قاعدہ رشتہ لے کر  
آنے کا ارادہ ہے۔۔۔ اب تک ماما۔۔۔ سبحان آنٹی کو کال  
بھی کر چکی ہوں گی۔“ وہ مکھل کر مسکرا دیا۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔۔۔ پر تم مجھے پہلے ہی بتا  
دیتے تو کوئی حرج نہیں تھا۔“ سراج انوار کا خوشی کو کوئی  
عالم نہیں تھا، انہوں ہلکا سا شکوہ کرنا ضروری سمجھا۔

”ماما۔۔۔ نے جب تک کنفرم نہیں کیا۔۔۔ میں نے  
آپ سے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔۔۔ اب جب کہ  
وہ خود آنا چاہ رہی ہیں تو۔۔۔ بتا دیا۔“ نوید نے ممانت سے

تو میں تو نہیں کانہ رہتا۔ نا۔“ نوید نے جذب کے عالم میں بولتے ہوئے اس کے گھنے بال پیار سے بکھیر دیے۔

”آپ سچ مجھ سے پیار کرتے ہیں؟“ ایمان نے معصومیت سے دوبارہ یقین دہانی چاہی۔ کئی بار اس کے منہ سے پیار بھرا اقرار سن کر بھی اس سے یہ ایک ہی سوال پوچھتے جاتی۔ من کو شانتی ملتی تھی حالانکہ اس کی محبت لٹاتی نگاہیں حال کہنے سے گریزاں نہ تھیں۔

”بال۔۔۔ جان۔ بالکل سچ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں سراج انکل کی پریشانی دیکھ کر ماما کو تمہارے گھر لے کر آیا۔ مگر جب تمہیں دیکھا تو وہیں دل ہار بیٹھا۔ ماما اس دوران اور لڑکیوں کو بھی دیکھ رہی تھی مگر میں اڑ گیا شادی کروں گا تو ایمان سے ورنہ نہیں۔ اسی کشمکش میں پورا مہینہ نکل گیا مگر آخر میری بات مانی گئی۔“ نوید نے شوخی سے بتایا۔

”ایسے ہی بنا رہے ہیں۔“ وہ مصنوعی منہ بنا کر کہنے لگی تو نوید نے جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”سنو۔۔۔ جان۔ تمہیں احساس نہیں کہ تمہارے ساتھ زندگی گزارنا۔ میری محبت کی معراج ہے۔ کیوں کہ۔۔۔ میں۔۔۔ اور۔۔۔ تم۔۔۔ ایک دوسرے کے لیے ہی بنے ہیں۔“ نوید نے اس کا ہاتھ تھام کر پیار سے کہا تو وہ کھلکھلاتی ہوئی ہاتھ چھڑا کر بچوں کو اٹھانے لگی۔

کہا تو وہ فخریہ اسے دیکھنے لگے آخر وہ ان کا ہونے والا داماد جو ٹھہرا۔

سراج انوار کا دل چل کر نہیں اڑ کر گھر پہنچنے کو بے تاب ہوا۔ وہ مسکراتے ہوئے نارمل انداز میں چل پڑے۔ اپنا بھرم جو قائم رکھنا تھا۔ خوشی خوشی گھر میں داخل ہوئے تو اہل خانہ کے چہرے پر پھیلی چمک اور تازگی نے انہیں بتادیا کہ نوید کی ماما کا فون آچکا ہے۔

”بے درد لمحوں کی کڑواہٹ میں امید کی چاشنی ہی زندہ رہنے کی وجہ بنتی ہے۔“ سراج انوار نے جس نوجوان سے زندگی کا یہ مثبت فلسفہ سیکھا وہ اب ان کے خاندان میں داماد کی حیثیت سے شامل ہونے جا رہا تھا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے راستے سے خریدا ہوا گلاب جامن کا ڈبا بابا کے ہاتھ میں پکڑایا۔ جن کی دعاؤں سے یہ خاندان اپنے مرکز کی طرف لوٹ آیا۔



”جان۔۔۔ یوں تم میری زندگی میں بہار بن کر آئیں۔“ نوید نے گاڑی ایمان کے میکے کے دروازے پر روکتے ہوئے کہانی مکمل کی۔

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ نے پیار کی وجہ سے مجھ سے شادی کی۔ میری لیے آپ کے دل میں کوئی جذبہ نہیں تھا۔“ ایمان نے یہاں عورتوں والی اٹنی مت کا استعمال کیا۔

”اوہ پاگل خانی۔ کیا یہ ہماری لومیرج تھی۔؟“ نوید نے حقیقتاً اپنا ماتھا پیٹا اور خوب ہنسا۔ ایمان کا پیار اسامہ مزید لٹک گیا۔ بچے دوران سفر سوچکے تھے اسی لیے گاڑی میں سکون تھا۔

”نہیں۔۔۔ تو۔“ ایمان نے ہونٹ لٹکا کر بچوں کی طرح کہا تو نوید کا دل اس کی جانب ہمکا۔

”وہی ایمان جان۔ ایک سچائی سے پردہ اٹھاؤں۔ تمہیں دیکھتے ہی پہلی نظر کی محبت کا شکار ہو گیا تھا۔ جب ہی تو یقین دہانی حاصل کرنے یونیورسٹی آیا تھا۔ سارا کام یکے طریقے سے کرنا چاہتا تھا۔ تم انکار کر دیتی

## حمیرا لکھی لکھی



### فرحت اشتیاق

قیمت - 300 روپے

# وہ طویل سال

کون سا سکون مل جائے گا۔ ”وہ روہاسی ہو کر بولی۔  
سر سئی نین کٹورے لبالب نمکین پانیوں سے بھر گئے،  
پیاز اتنے کڑوے تو نہ تھے۔

”کملی بالکی تو تو ہے۔ میں تیری ماں ہوں۔ پانچ بچے  
جنے ہیں میں نے، لوگ کپڑا اتنا خریدتے وقت سواری  
جانچ پرکھ کرتے ہیں اور میں ایسے ہیرے درگی بٹی  
کوڑیوں کے مول دے دوں۔“ صغریٰ نے سالن کے  
لیے تیار شدہ چیزیں اوپن ایئر کچن میں رکھنا شروع کر  
دی تھیں۔ سہ پہر نے شام کا چولا پہنا تو سائے مشرق کی  
طرف سے لمبے ہوتے جا رہے تھے۔

”کوڑیوں کے مول؟“ نورینہ کو دھچکا لگا تھا ماں کی  
بات سن کر۔

”اماں! سوچ سمجھ کے تو بات کر۔ فیروز میں کس چیز  
کی کمی ہے، پرہا لکھا، سمجھ دار اور برسر روزگار۔“  
اسے حقیقتاً ”ماں کی بات سے صدمہ پہنچا تھا۔

”اور یہ پرہا لکھا، سمجھ دار اور برسر روزگار فیروز رہتا  
کہاں ہے؟“ خشک لکڑیاں توڑ توڑ کر چوہے میں رکھتے  
ہوئے صغریٰ ترخ کر بولی گئی۔ بے حد جارحانہ انداز  
میں سلگتی لکڑیوں کو پھونکس مارنے لگی۔

”زمین پہ رہتا ہے اور کہاں رہتا ہے اس نے، جیسے  
ہم سب رہتے ہیں۔“ نورینہ نے سادگی سے کہا تو  
صغریٰ کا جی چاہا کہ آگے بڑھ کر اسے ایک پھنرر سید کر  
دے جو بلا وجہ اس کا دماغ خراب کیے جا رہی تھی۔

”نہیں وہ چک تیمنتری میں رہتا ہے جہاں صرف  
ایک کچی پکی سڑک جاتی ہے، جہاں کے تالابوں کلاپانی  
انسان اور جانور ایک ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ ایک

”پلیز اماں! مان جاؤ نا!“

انتہائی کجاست سے کہتے ہوئے اس نے صغریٰ کے  
گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ دیے۔

”ہاں تو میں کب منع کر رہی ہوں۔ لے لے دو ہزار  
کالینن کا جوڑا۔ اگلے ماہ کمیٹی نکلنے والی ہے۔ ادھار چکا  
دوں گی۔“ وال صاف کرتے ہوئے صغریٰ نے  
مصروف انداز میں جواب دیا۔

”اماں! زیادہ بن مت تو اچھی طرح جانتی ہے، میں  
جوڑے کی بات نہیں کر رہی۔“ اب کے وہ ضبط کرتے  
ہوئے بولی تھی۔

”اوہ اچھا! تو بال کٹوانے کا کہہ رہی تھی۔ ہے تو اپنی  
مرضی کی مالک، مگر مجھے تیرے لمبے ریشمی بال زیادہ پسند  
ہیں۔“ صغریٰ کا انداز ہنوز تھا۔ وال صاف کرنے کے  
بعد وہ پیاز چھیلنے لگی۔

اماں! تو اچھی طرح جانتی ہے۔ میں جوڑے لینے  
اور بال کٹوانے کی بات نہیں کر رہی۔“ اب کے وہ ذرا  
بلند آواز میں بولی۔ ماں کے مسلسل تجاہل عارفانہ نے  
اسے تپا کے رکھ دیا تھا۔

”جوڑا خریدنے یا بال کٹوانے کے لیے میں نے  
پہلے کبھی تیرے ترے کے ہیں جواب کروں گی؟“  
”اور تو میرا جواب اچھی طرح جانتی ہے۔ کبھی  
نہیں مر کر بھی نہیں۔“ اب کے صغریٰ نے سیدھا  
سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھا اور صاف اور دو ٹوک  
انداز میں بولی۔

”مگر کیوں اماں! تو کیوں بالک ہٹ۔ اڑی ہوئی  
ہے۔ میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی چھین کر رکھے

محل حویلیوں کے خواب ہو نہ۔ "اس نے سر جھٹکا۔  
 "السلام علیکم! کیا ہو رہا ہے؟" ایک بھرپور تازہ دم  
 آواز یہ وہ دونوں متوجہ ہو میں۔ سامنے شاہدہ کھڑی  
 تھی۔ اس کے ہاتھ میں سالن کی کٹوری تھی۔  
 "ہماری اماں! پالک کا ہفتہ منار ہی ہیں امید کرتی  
 ہوں آپ کی ہانڈی مجھے مایوس نہیں کرے گی۔"  
 شگفتگی سے کہتے ہوئے شاہدہ پیڑھی گھسیٹ کر بیٹھ  
 گئی۔

کمرے کا دواخانہ جہاں پہ صرف سردرد اور مروڑ کی  
 ٹکیاں اور زرد سرخ کڑوا محلول ملتا ہے۔ "صغریٰ کا  
 انداز سرا سرتانے اور اسے یاد دلانے والا تھا۔  
 "اچھا وہ چک تیغتری میں رہتا ہے اور جیسے میں تو  
 یہاں گلبرگ یا ویفیس میں رہتی ہوں نا!" نہ چاہتے  
 ہوئے بھی نورینہ کا لہجہ طنزیہ ہو گیا تھا۔  
 "ساری زندگی آدھ کنال کے کچے بکے گھر میں گزار  
 دی۔ شکر سے کھایا پینا برتا اور آگے زندگی کے لیے



”ہاں بچی! وال قیمہ بنا رہی ہوں۔ ذرا اس عقل کی پیری کو بھی سمجھاؤ، ماں تو اسے دشمن لگ رہی ہے اپنی خوشیوں کی قاتل۔“ صغریٰ تھکے ہارے انداز میں بولی۔

”بائے نوری! تو ابھی تک اسی کملے پن میں ڈوبی ہوئی ہے؟“ شاہدہ نے بے حد تعجب سے اسے یوں آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تھا جیسے اس کے چہرے سے اس کی ذہنی حالت کا اندازہ لگانا چاہ رہی ہو۔

”نہ تو میں چلتی ریل کے آگے لیٹ رہی ہوں اور نہ ہی کہیں میں چھلانگ لگا رہی ہوں جو کہیں اتنی حیرت ہو رہی ہے۔“ وہ رونے کی وجہ سے سرخی کی آمیزش لیے سرخ چہرے کے ساتھ از حد خفگی سے بولی۔

”سراسر تہذیب و تعلیم سے کوسوں دور بنیادی سہولتوں سے محروم، انتہائی پسماندہ گاؤں میں تاحیات رہنا میرے نزدیک خود کشی ہرگز نہیں مگر زندگی کو کٹھن بنانا ضروری ہے۔“ شاہدہ صاف گوئی سے بولی۔

”دو کنال کا اتنا بڑا گھر، واحد بالن گور کے اپنے جگہ جگہ مرغیوں کی بیٹ دھول مٹی۔ تم وہاں کیسے ساری زندگی رہ پاؤ گی نوری!“ انتہائی دلسوزی سے بولتے ہوئے شاہدہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

”مگر تم یہ کیوں بھول رہی ہو کہ اس دو کنال کے گندگی سے اٹے، سہولیات تو کیا ضروریات سے محروم گھر میں فیروز بستا ہے۔ فیروز۔ جو میرے گلستانِ دل کا مالی ہے۔ جس کے سوا میں کسی اور کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ شعور کی سیڑھی پہ پاؤں رکھتے ہی میرے دل نے اس کے نام کی تسبیح پڑھنا شروع کر دی تھی، وہ چاہے چک تینتری میں رہے یا کسی پہاڑ کی کھوہ میں، میں نے زندگی اسی کے ساتھ بتائی ہے اور بس۔“

وہ شاہدہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے انتہائی مضبوط اور اٹل لہجے میں بولی۔

کچن کے زرد بلب اور آگ کے لہراتے شعلوں کی روشنی میں شاہدہ اس کے چہرے کو دیکھتی رہی جس پر

اس کے کئے الفاظ کی صداقت صاف دکھائی دے رہی تھی۔

”بجلی نہیں ہے، پانی نہیں ہے، جیسے یہاں تو ہر وقت چوبیس گھنٹے بجلی موجود رہتی ہے۔ ابھی کل ہی طاہر مسجد کے ”بور“ سے پانی بھر آیا وضو کے لیے منہ میں ڈالا تو مانو جیسے زہر کا گھونٹ بھر لیا ہو، یہاں تو شرموت زلال پیا جا رہا ہو اور اعتراض تالابوں کے پانی پر۔“ شاہدہ پہلے تو توجہ سے اسے تیز تیز بولتے دیکھتی رہی پھر اس کے خاموش ہونے پر ہنستی چلی گئی۔

”توبہ ہے نوری! محبت انسان کو اتنا بد تمیز اور بے لحاظ بنا دیتی ہے۔ میں پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔“

”یار تم نے اور اماں نے مجھے گاؤں گاؤں کر کے نفسیاتی طور پر اتنا پریشاں کر دیا ہے کہ میں فوراً ادب آداب بھول بیٹھتی ہوں۔“ وہ قدرے خفیف ہو کر بولی۔

”ہائے تم وہاں کیسے رہو گی؟ بابا ویسے رہوں گی جیسے چاچا امین کی فیملی برسوں سے رہتی آ رہی ہے۔“

شاہدہ نے مصنوعی تاسف زدہ سانس کھینچی۔

”خالہ! تیری بیٹی کا کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ اب سمجھنے سمجھانے کی حدود سے نکل چکی ہے۔ بہتر ہے کہ اب کی بار چاچا جی ممتاز آئے تو اسے ہاں کہہ دے۔“

کھانا تقریباً تیار ہو چکا تھا۔ شازمینہ اور دوسرے بچے چولہے کے گرد گھیرا باندھ کر بیٹھ گئے۔

”ہاں بچی! اس نے ماں کو اسی ڈھٹائی سے چپ کروا دیا ہے تو کس کھیت کی سول ہے۔“ صغریٰ نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کوریوں میں سالن ڈالنا شروع کر دیا۔

”ہماری جیٹھانی صاحبہ خوب پھل، سبزیاں، مرونڈے اور مٹھائی سے لدی پھندی تاریخ مانگنے علی آئیں۔ جیسے ان ساری چیزوں سے میں متاثر ہو جاؤں گی۔ میں نے سات توے مانگ لیے۔ جسم سے جاں تو نکل کے رہ گئی ہوگی۔ اب آئیں تو پتا چلے۔“ صغریٰ لطف لینے والے انداز میں بولی۔

”اماں! تو زیادتی کر رہی ہے۔ اتنا سونا وہ کیسے چڑھا

سکتی ہیں ایک ہی تو فیروز کمانے والا ہے۔ اتنا بوجھ تو نہ ڈال ان پر۔“ وہ جیسے منت کرتے ہوئے بولی۔ ماں کا مطالبہ اسے سراسر ظالمانہ ہی لگا تھا۔

”تو چپ کر۔ بڑی آئی ماں کو صلاح دینے والی۔“ صغری جھڑک کر بولی۔

”بقول تیرے کہ فیروز بھی تیرے عشق میں گوڑے گوڑے ڈوبا ہوا ہے تو سات کیا دس کے بھی زیور بنوا سکتا ہے۔ ساتھ رخیم ثانی نے بھی اپنی بہو کو آٹھ تولے کے زیور چڑھائے ہیں۔“

وہ لب بھینچے ماں کو بولتے دیکھتی رہی۔ صغری کا ایک ایک لفظ اس کے دل کو ڈبوئے جا رہا تھا۔

”اتنی منگائی ہے۔ یہ شادی تو نہ ہوئی، کوئی سودا ہو گیا۔ تو ایسی مانت پرست اور زر اندوزانہ خواہش کیوں رکھ رہی ہے۔“ مہم سی آواز میں بولتے ہوئے اس نے روٹی کا نوالہ توڑا اور بے بسی سے منہ میں منتقل کیا تھا۔ شاید سالن تبدیل کروا کر جا چکی تھی۔

”نہ صرف سات تولے سونا بلکہ بڑی بھی شان دار ہونی چاہیے۔ میں نے بھابھی جی کو صاف بتا دیا گاؤں میں پھیری لگانے والوں سے میری بیٹی کا ایک جوڑا تک نہیں لیتا۔ سب کچھ شہر سے خریدا ہوا ہو۔ ایک دم بڑھیا اور خوب صورت۔“ صغری نے اپنے مطالبات پر ڈٹی ہوئی تھی۔

”ہائے ماں! اتنی کنھور اور بے مہر نہ بن۔“ وہ جیسے کراہ اٹھی تھی۔



”اچھا اور بہترین کپڑا؟“

سیلز مین نے فیروز کے الفاظ دہرائے پھر تفصیلی انداز میں سارے کو جنبش دینے کے بعد ڈھیروں جوڑے صائمہ اور بسم کے آگے پھیلا دیے۔ خوب صورت، نفیس، مہین ملبوسات، مگر دونوں بہنوں کو کچھ نہ پسند آیا ”یہ ایسے پھکے، لے رنگوں والے کپڑے ہم بھالی کی شادی پر پہنتی، اچھی لگیں گی؟“ صائمہ منہ بنا کر بولی۔

”تو اور کیا؟ پنڈ والے کیا کہیں گے کہ ملتان سے

ایسی شاپنگ کر آئی ہیں۔ نہ رنگ نظر کو بھلا لگ رہا ہے نہ کام دل کو۔“ بسم کلاتھ شاپ پہ ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے بولی۔

”جلدی سے کپڑے پسند کرو اور بھی بہت کچھ خریدنا ہے۔“ فیروز بہنوں سے مخاطب ہوا۔ نور بیک کے لیے اس نے عین اس کی پسند کے مطابق خریداری کی تھی بوتیک کے ڈیزائنر جوڑے۔ بے حد نفیس اور دلکش کڑھت سے سجے۔

”کیسے پسند کر لیں۔ دکان کپڑوں سے بھری ہوئی ہے، مگر ایک بھی کپڑا دل کو نہیں لگ رہا۔ وے بھرا! تو ہمیں ایسے کپڑے دکھانا جنہیں۔ پسند کر لگے کہ ہم دلہی کی بہنیں ہیں تاکہ دور پرے کی سگھیاں۔“

بسم اب کے سیدھے سیدھے سیلز مین سے مخاطب ہوئی تو اس نے نگاہ بھر کر دیکھا اور ان کے سامنے ”مطلوبہ“ مال ڈھیر کر دیا۔

دونوں کے چہرے ایک دم کھل اٹھے تھے۔ گہرے شوخ رنگوں والے بھڑکیلے کپڑے، جن پہ سیروں کے حساب سے موتی ستارے اور نگ تھپے ہوئے تھے۔ بے حد بو جھل اور کاہدار اپنے فوق و پسند کے عین مطابق سرخ، زرد، نارنجی جوڑے شاپ کے قدر آور آئینوں میں ساتھ لگا کے دیکھے تو کپڑوں کی چمک، دمک اور بھاری پن نے ان کے اندر ہیجان پیدا کر دیا تھا۔

خواتن وہ اتنا ٹائم ضائع کیا کام کی چیز تو بعد میں دکھائی۔ ”دونوں بے حد مسرور تھیں۔ بل کی ادائیگی کے وقت ممتاز دوکان دار سے اچھ بڑی۔“

”ناں پتر! تو نے تو کہا تھا کہ آپ چیز پسند کریں، خوب رعایت کریں گے، مگر تو نے تو میرے بیٹے کے کھمبے سے ہزاروں روپے نکال لیے۔“

وہ کمر پہ ہاتھ رکھ کر اپنی مخصوص پاٹ دار آواز میں بولی تو دکان میں موجود گاہکوں نے چونک کر انہیں دیکھا تھا۔ فیروز خفیف سا ہو کر رہ گیا۔

”ماں جی! جتنی رعایت بنتی تھی۔ میں نے کی، صرف جائز قیمت وصول کی ہے۔“ سیلز مین نہایت ادب و شائستگی سے بولا۔

”ہونہ! اگر مناسب قیمت لگاتا تو پھر چھوٹے پتر کی بری بھی تیری دکان سے آکر خریدتی مگر تو نے واپسی کی راہ خود ہی بند کر دی۔“

”اماں! بس چلو یہاں سے۔“ فیروز بازو سے تھام کر انہیں باہر لایا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور ابھی بہت کچھ خریدنا باقی تھا۔

”کڑیو! دیکھو تو کیسے انہوں نے پتلوں کو کپڑے پہنا کر کھڑا کیا ہوا ہے۔“ گلاس ڈور کے قریب کھڑے ڈمی کو اشتیاق سے دیکھتے ہوئے ممتاز بیٹیوں سے مخاطب ہوئی۔

”اگر تم لوگ ہر پانچ قدم بعد رک کر چیزوں کا جائزہ لینے اور بصرہ کرنے رک گئیں تو مجھے نہیں لگتا کہ آج رات تک ہم گھر واپس پہنچ سکیں گے۔“ فیروز انتہائی ضبط سے ماں بہنوں سے مخاطب ہوا۔

مارکیٹ میں تیز قدموں سے چلتے ہوئے جوتوں کی دکان پر پہنچ کر معا” اسے احساس ہوا کہ اماں لوگ تو اس کے ساتھ ہیں ہی نہیں۔ اٹنے قدموں لوٹنے پر وہ اسے تھڑے پہنچی آرائشی اشیاء دیکھنے کے ساتھ ساتھ دکان دار سے بحث کرتی پائی گئیں۔

”اند! اتنی مزنگائی۔ ان وڈے شہروں کے نام بس سننے میں اچھے لگتے ہیں۔ مگر یہ تو اچھے بھلے آدمی کو کنگال کر دیں۔“ ممتاز نے ہلکے سے گال پیٹے۔

”اب دیکھو یہ شیشوں والا پراندہ اپنے پنڈ میں پچاس روپے تک آرام سے مل رہا ہے اور یہاں پورے دو سو ہیں۔“

”جب تم لوگوں نے جو چیز لینی ہی نہیں۔ اس کی قیمت پوچھ کے کیا کرنا ہے۔“ فیروز اچھا خاصا جھلایا ہوا تھا۔

”پتر! اب کرایہ بھر کر آئے ہوئے ہیں۔ ادھر ادھر دیکھیں گے تو سہی۔ اب جو بھی خریدے گا۔ بھاؤ تاؤ میں خود کروں گی۔ تو بڑا سیدھا اور بھولا بھالا ہے۔ یہ شہری لوگ ہمیں پنڈ کا سمجھ کر ٹھگنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر اب میں دیکھتی ہوں۔۔۔ اولی ماں مر گئی۔“ ممتاز بے ساختہ درو سے دہری ہو کر ماتھا تھام کے بیٹھتی

چلی گئی۔ شوز ہاؤس کی چمکتی دھمکتی دکان میں لپک کر داخل ہوتی ممتاز کو گلاس وال نظر ہی نہ آئی تھی۔

”اماں! تو میرے ساتھ چل۔ تجھے بتایا تو تھا کہ یہاں دکانیں شیشے کی بنی ہوتی ہیں۔“ ماں کو دونوں بازوؤں سے تھام کر اٹھاتے ہوئے فیروز نرمی سے بولا۔

تبسم اور صائمہ ماں کی حالت سے بے نیاز گھوم کر اسٹائلش جوتے دیکھ رہی تھیں۔

سر سے اٹھتا درد نظر انداز کیے ممتاز دکان دار سے رعایت کی یقین دہانی براہ راستی رہی۔

”دور دراز کے گاہکوں کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ ہمیں دیکھو ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ مرغ بانگ ویلے سے موٹر پکڑی۔ صرف ایک چاء کی پیالی پی کر ادھر آئے ہیں۔“

”اماں! تو اپنے لیے کوئی چپل پسند کر پھر چلتے ہیں۔“ فیروز جزبہ ہو کر بولا۔

چلتے سے صائمہ کو ٹگینوں سے مزین ایک کلچ پسند آیا تھا۔ فیروز نے مطلوبہ قیمت چار سو روپے دوکان دار کی طرف بڑھائے ہی تھے کہ راستے میں ممتاز نے پیسے جھپٹ لیے۔

”نہیں سو روپے کی رعایت لینی ہے۔“ ایک سو روپے نکال کر بقایا تین سو دوکان دار کی طرف بڑھائیے۔

”نہیں! جی! بالکل مناسب ریٹ لگایا ہے۔ آپ میسریل بھی تو دیکھیں نا۔“ دکان دار شائستگی سے سو روپے کا طلب گار ہوا۔

”بس! انہیں کافی سمجھو۔ راہ چلتے پچی کو پسند آگیا۔ ورنہ لینے کا ارادہ نہ تھا۔ کرایہ بھی بچانا ہے، ہم نے۔“

دکان دار نے ایک سانس بھر کر کاؤنٹر سے تین سو روپے اٹھالے ممتاز نے داد طلب نظروں سے فیروز کو دیکھا۔ مگر سو روپے کی بچت کی ساری خوشی شاپنگ مال کے چکنے صاف اور تھکیلے ماربل فلور نے غرق کر کے رکھ دی۔ بے حد جما جمائے چلنے کے باوجود بھی گاؤں کی کچی اور ناہموار زمین پہ چلنے کی عادی ممتاز بی بی کے پاؤں بالا خربٹ ہی گئے۔

”ہائے فیروز میں مر گئی۔“

فیروز کے تیزی سے آگے بڑھ کر ماں کو سنبھالنے سے پہلے ہی ممتاز چپنے فرش پر دراز ہو چکی تھی۔



آخر مارچ کی تپتی چبھتی دھوپ سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔ کھیتوں میں سرسوں خوب کھل پھول رہی تھی۔ روڈ کو بیوں سے میراب ہوتی گندم کی بالیاں بے نوی سے جھومنے لگیں تو من کے اندر بھی جیسے سورج کے تھال سے رنگین شعاعیں سی منعکس ہو رہی تھیں۔ درختوں پر نئی کوئٹہ بڑھوتری کی طرف مائل کلیاں مکھ کھول مسکا رہی تھیں۔

”اللہ! بھابھی آپ کتنی سوہنی لگ رہی ہیں۔“ تبسم اس کے کمرے میں داخل ہوئی اور بے ساختہ تعریفی انداز میں بولی۔ وہ شخص انکسائی سے مسکرا دی۔ بنارس شیفون فیبرک میں گہرے زرد اور آتش گلابی رنگوں کے امتزاج سے مزین گیارہ فراک اور جوڑی دار پاجامے میں وہ واقعی بے حد خوب صورت لگ رہی تھی۔

لبے دراز ریشمی بال ڈھیلی ڈھالی چوٹی کی صورت گندھے ہوئے تھے۔ وہ پہلے ہی خوب صورت اور دلکش تھی اب تو فیروز کی والمانہ چاہت و محبت نے وہ سندر تا بخشی تھی کہ نظر نکائے نہ نکلتی۔ آنکھوں میں جلتے محبت کے جھل مل کرتے دیوں نے روش روش موسم گل کی راج دھانی قائم کر دی تھی۔

اور جب زندگی پہ موسم گل کا پہرا لگ چکا ہو تو خوب سجتے سنورنے کا اہتمام تو لازم تھا۔

فیروز نے بری کے سارے ہی جوڑے بہت ہی دیدہ زیب اور شانلش خریدے تھے جنہیں زیب تن کرنے کے بعد اسے ہر ایک کی نگاہوں میں اپنے لیے ستائش نظر آتی۔ تبسم اور صائمہ نے جب فیروز کو نوریہ کے لیے ڈیزائن کے دھیسے اور ہلکے کام والے کپڑے خریدتے دیکھا تھا تو خوب ناک بھوک چڑھالی تھی۔

”بھلا دلہنیں ایسے کپڑے پہنتی ہیں؟ منگھوں سے کھلے لمبے چغے۔“ اپنے بھاری اور کلمدار کپڑوں کو جتنے چاؤ اور ناز سے تن پہ سجایا تھا اتنی ہی خواری اٹھانی پڑی تھی۔

بے حد نوکیلے ستاروں سے مزین کپڑوں نے صرف ان کے چہرے اور بازوؤں پہ جا بجا خراشیں ڈال دی تھیں بلکہ ساتھ سے گزرنے والی ہر لڑکی اور خاتون کے لباس سے بری طرح الجھ جاتے تھے۔ ساری شاوی بس اپنے کپڑے ہی چھڑاتے گزری۔

دونوں بہنوں نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ شاوی کے فوراً بعد ان جوڑوں کو نذر آتش کرنا ہے جو وہاں دکان میں تو خوب جگر جگر کر رہے تھے اور اب یہاں جھلسا ہٹ نام کی کوئی چیز نہ تھی ان میں جس پہ وہ مر مٹی تھیں۔

”اماں! ٹھیک کہتی تھی یہ شہری لوگ بڑے جالاک ہوتے ہیں۔ ہم دھاتیوں کو بھولا بھالا سمجھ کر ٹھگ لیا۔ مطلب کی چیز پھر بھی نہیں دی۔“ صائمہ تقریباً رونے والے انداز میں بولی تھی۔

صرف صائمہ اور تبسم ہی نہیں بلکہ ان کی سیلیوں کو بھی نوریہ خوب پسند آئی تھی۔ خوب صورت خوش اخلاق ہنس مکھ۔ کوئی لڑکی خالی ہاتھ نہ آتی۔ براندے، دستی شکھے، رلیاں، کڑھی چادریں۔ نوریہ کے پاس تحائف کا ڈھیر لگ گیا۔ وہ ان سب کی محبتوں کی دل سے ممنون تھی۔

”آئیں نا بھابھی! بھائی ہمارے فوٹو بنا رہا ہے تم بھی بناؤ۔“ تبسم اس کا ہاتھ تھام کے باہر لے آئی۔ فیروز نے اسے باہر آتے دیکھا۔ واری عددتے جاتی نظریں وہ دھیسے سے مسکرا دی۔

اپنے موبائل سے فیروز نے اس کی گھر کے ہر فرد کے ساتھ ڈھیروں تصاویر لیں۔

”چلو آؤ اب میرے ساتھ ایک فوٹو اسے برتا کر کے میں کمرے میں لگاؤں گا۔“

فیروز کہتے ہوئے اس کے پیچھے آکھڑا ہوا۔ اور اس کے شانے پر چہرہ نکا کے سامنے ہاتھ میں پکڑے

موبائل پہ تصویر بنائی۔ وہ اس درجہ قربت پہ سرخ پڑ گئی۔

”پتا ہے نوری! مجھے یقین نہیں آیا کہ ہم دونوں ایک ہو چکے ہیں۔“ وہ دونوں چلتے چلتے گھنی بیری کے نیچے آگئے۔ نوری نے نگاہ اور اٹھی تو فیروز نے ہاتھ برہا کر گئی بیروڑ کر اس کی حنائی پھیلی یہ رکھ دیے۔

”کتنے میٹھے اور ریسے ہیں۔“ نوری نے کہ تو منہ میں جیسے شیرینی گھل گئی تھی۔

”اماں کو نجانے کیوں لگتا تھا کہ تم اس ماحول میں سیٹ نہ ہو پاؤ گی۔ مگر میں نے کہا میری محبت میں استاد مضم سے یہاں کیا نوری میرے ساتھ کہیں بھی سیٹ ہونے کو تیار ہو جائے گی۔“ وہ مسکراتے ہوئے بتا رہا تھا۔ نظریں بس حسین مکھڑے کا طواف کیے جا رہی تھیں۔

”ہاں میری اماں کو بھی کچھ اسی قسم کے خدشات تھے مگر۔“ نوری نے بات اور نوری چھوڑ کر گردن کھجانے لگی تھی۔

”سارے پنڈ میں شہرہ سے کہ فیروز کی دہن بہت باری ہے، بہت اچھی باتیں کرتی ہے۔“ فیروز ہنوز مسکرا رہا تھا مگر اگلے بل پریشان ہوا تھا۔ نوری نے گردن کے ساتھ ساتھ گورے بازوؤں کو کھجلا رہی تھی۔ لمبے ناخن سفید بازوؤں پہ سرخ لکیریں بناتے جا رہے تھے اس کے چہرے پہ اضطراب و بے چینی تھی۔ فیروز پریشان ہوا تھا۔

”نوری! کیا ہو گیا ہے تجھے۔ کہیں کتنی نے پانی تو نہیں پھینک دیا تم پر۔“ فیروز نے پریشانی سے اوپر بیری کو دیکھا تھا۔

”پتا نہیں فیروز! میرے پورے جسم پر خارش اور جلن ہو رہی ہے۔“ مارے اذیت کے آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

”ارے نہیں یار! تمہیں واقعی کتنی کا پانی لگ چکا ہے۔“ فیروز تیزی سے اسے کھینچ کر بیری کے نیچے سے کھینچ لے آیا۔ بیری پہ سینکڑوں کی تعداد میں کھنڈ پلو نما کیرے رنگ رہے تھے جن کے جسموں سے غیر

محسوس ریشہ گرتا رہتا تھا جو انسانی جسم میں ایسی اذیت سے بر جلن پیدا کرنا کہ بندہ کھجلا کھجلا کر خود کو نیم جاں کر بیٹھتا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے نوری نے کے سارے جسم میں خارش پھیل گئی۔ مارے گھبراہٹ کے فیروز کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔

”سارا تیرا قصور ہے۔ دہن تو نئی نوپلی ہے، پر تجھے تو پتا ہے کہ چپت کے موسم میں بیری کھیتوں سے اٹ جاتی ہے۔“ سرسوں کے نمک ملے تیل سے نوری نے کو مساج کرتے ہوئے ممتاز نے فیروز کو خوب لتاڑا تھا۔ نوری نے الگ ناراض نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔



”ہائے نوری! میری جن داٹوٹا دھی، یہ تیرے چہرے کو کیا ہوا؟“ صغریٰ تو ایسے دیکھتے ہی چیخ اٹھیں۔ سارے چہرے پہ سرخ و سفید دھبے چہرے کو عجیب سا چتکبرا بنا رہے تھے۔

”ارے اماں! کچھ نہیں ہوا مجھے۔ بیکھا رہی تھی۔ لارو لے کے جسم کے روئیں سے نجانے کیسا ریشہ گر رہا تھا کہ مجھے خارش شروع ہو گئی۔ ٹھنڈے پانی سے نہ دھونے سے منہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ تو پریشان نہ ہو۔“ اس نے ہلکے پھلکے انداز میں مسکراتے ہوئے ممتاز کو بعد مائی کیفیت سے باہر نکالنا چاہا۔

آج وہ حسب قاعدہ سات دن بعد میکے آئی تھی۔ صغریٰ بتا نہیں اس کی وضاحت سے مطمئن ہوئی یا نہیں مگر آنکھوں میں فکر مندی ہنوز تھی۔

”تو ٹھیک تو ہے۔ وہاں سب ایسے ہیں تیرے ساتھ، ممتاز کوئی زیادتی تو نہیں کرتی تیرے ساتھ۔“

”ارے نہیں اماں! کیسی باتیں کر رہی ہے۔ سب بہت اچھے، میرا خیال کرنے والے ہیں اور فیروز تو بہت ہی ٹوٹ کے مجھ سے محبت کرتا ہے۔ سر آنکھوں پہ بنٹھا رکھا ہے سب نے، تبسم، صائمہ سب مجھے کسی ہفت اقلیم کی دولت سے کم نہیں سمجھتے۔“

وہ بولتے بولتے ہنس پڑی۔ سرشار اور مطمئن انداز

صغریٰ کے دل کو یک گونہ سکون ملا۔

خود کلامی کی تھی۔



”تیرے مرحوم ابا کی طے کی ہوئی نسبت اور تیری فیروز سے دیوانہ وار چاہت۔۔۔ ان سب باتوں نے مجھے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا اور نہ میرا ارادہ تو تجھے جمیل سے بیاہنے کا تھا۔ اچھی بھلی پولیس کی نوکری، دو قدم پہ گھر، آنکھوں کے سامنے رہتی۔ بھابھی رخشندہ کتنی میری منتیں کرتی رہی۔“ صغریٰ جیسے دل مسوس کر بولی تھی۔

”چھوڑا ماں! فیروز میرا نصیب تھا۔ تیری بیٹی خوش ہے، تیرے لیے یہ کافی نہیں کیا۔ تو ماں ہے واقعی میرے لیے بھلا ہی سوچتی ہے، مگر میں کیا کروں میرے دل میں فیروز کے سوا کسی اور کا خیال بھولے سے بھی نہیں آتا تھا۔“

وہ ایک جذب سے بول تھی۔ صغریٰ بس اسے دیکھتی رہی پھر آگے بڑھ کر اس کا چہرہ تھام کر ماتھے پہ بوسہ دیتے ہوئے بولی ”میری بچی! خدا تمہیں سکون آشنا رکھے، خوشیوں کے ہنڈولے میں بھولتی رہو۔“ صغریٰ نے آنکھوں میں آنی نمی صاف کی۔

”فیروز تیرے ابا کا بھتیجا اور جمیل میرا، جمیل کی طرف میرا جھکاؤ صرف اس لیے زیادہ تھا کہ تو میری آنکھوں کے سامنے رہے۔ جب چاہوں تجھے آواز دے کر بلا لوں، اب دیکھو شاہدہ کی منگنی جمیل سے طے ہو گئی ہے، ہر روز ماں کے گھر آیا کرے گی۔ قریبی کا یہ فائدہ ہے۔“

”کیا شاہدہ کی منگنی ہو گئی ہے؟ گھنی، پیسنی اس لیے تو ماں زرینہ کی خوب خد متیں کر لی تھیں۔“ وہ ایک دم خوشی سے بھرپور آواز میں بولی۔ صغریٰ نے خاندان بھر کی دعوت کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ ابھی کچھ دیر میں سب کی آمد ہونے والی تھی۔

نورینہ نے چہرے کے دھبوں کو چھپانے کی خاطر ڈھیر سارا فاؤنڈیشن لگایا تھا۔ کافی تیز بلش آن رخساروں پہ جمایا ”رات کی دعوت ہے۔ میک اپ تیز ہی اچھا لگے گا۔“

ماتھے پہ جھومر نکاتے ہوئے اس نے طمانیت سے

”ناں تو پھر بھر جائی کے کمرے میں آکر جم کے بیٹھ گئی ہے یہ جوائتے کام پڑے ہیں، وہ کون کرے گا۔“ ممتاز اندر آکر اپنی مخصوص کراری آواز میں بولی تو تبسم کے ہاتھ سے لوٹن کی بوتل گرتے گرتے پچی۔

صائمہ کے مقابلے میں قدرے دلکش نقوش اور صاف رنگت کی حامل تبسم تو پہلے ہی سے تجنے سنورنے کی شوقین تھی، اب جو نورینہ کی بہترین اور اعلیٰ کوالٹی کی کاسمیٹکس کی اشیاء دیکھیں تو ہر وقت انہیں خود پہ آزماتی رہتی۔

اب بھی وہ ڈرنگ نیبل کے سامنے بیٹھی مختلف کریمیں چیک کر رہی تھی، نورینہ اپنی الماری کو ٹھیک کرنے میں لگی ہوئی تھی۔

”اماں! ابھی تو برتن دھو کر آئی ہوں، تو صائمہ سے بول ناں، وہ کر دے۔“ نیل پالش چیک کرتے ہوئے تبسم نے ماں کو صفا چٹ جواب دیا۔

”صائمہ بھی تیری ہی بہن ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں جب سے دلہن آئی ہے تم دونوں ناکارہ ہو گئی ہو۔“ ممتاز مخاطب تو اپنی بیٹی سے تھی مگر گھبرا نورینہ گئی۔

”چاچی جی! آپ مجھے کام بتائیں۔ میں کر دیتی ہوں۔“ وہ الماری کو بند کرتے ہوئے شائستگی سے بولی۔

”نہ میری دھی! تو ابھی دلہن ہے۔ یہ سارا گھر تیرا ہے۔ تو نے ہی میری چوکی پر دھی سنبھالنی ہے، مگر ذرا ٹھہر کر۔ ابھی تو تیرے ہاتھوں کی مندی بھی پھینکی نہیں پڑی۔“ تبسم سے بات کرتے ہوئے لہجہ جتنا کھردرا تھا، نورینہ سے اتنے ہی میٹھے انداز میں ممتاز بولی تھی۔

”ارے چاچی! مندی کا کیا ہے، مدہم پڑے بھی کیسے، ہر ہفتے تبسم پھر سے مندی لگا دیتی ہے۔“ وہ مسکرا کر کہتے ہوئے ممتاز کے ہمراہ مل رہی تھی۔

ممتاز کو چکی پہ چنے کی دال دینی تھی۔ ساتھ والی زلیخا پورا ایک تھیلہ چنوں کا دے گئی تھی۔ ممتاز اجرت پہ

سارے محلے کو کبھی دال دل دیتی تو کبھی آٹا پیس دیتی۔ نورینہ ہفتہ بھر میں جان گئی تھی کہ اس گھر کا ہر فرد مشقت بھری زندگی گزار رہا تھا۔ چکی بالکل کمرے کے ایک بالکل تاریک کونے میں تھی۔ نورینہ بچے مٹھی بھر بھر ڈالتی گئی اور ممتاز تیزی سے پاٹ گھماتی رہی۔ کام مکمل کر چکنے کے بعد وہ باہر آئی تو خود کو سر تاپا پسینے سے شرابور دیکھ کر حیران رہ گئی۔

”اس لیے تو میں اماں کا ہاتھ نہیں بٹا رہی تھی۔ کبھی چاول اور باجرے کا آٹا تو کبھی چنوں کا پسینہ وہ بھی من کے من اوپر سے اتنی گرمی۔“ تبسم اس کی حالت دیکھ کر ہمدردی سے بولی تھی۔ کچھ کئے بنا اس نے نہا کر کپڑے چھینچ کر لیے۔

اسے ممتاز کی یہ چکی وغیرہ کی مشقت بلا وجہ اور غیر ضروری ہی لگتی تھی کہ فیروزا گیری کلچر ڈیپارٹمنٹ میں سیڈ کوالٹی انسپکٹر کا اسٹنٹ تھا، سوا اچھی خاصی آمدنی تھی، مگر ممتاز کے پاس بھی اپنی اس اضافی مصروفیت کے خاصے متاثر کن دلائل تھے۔

”پورے گھر کا بار اکیلے فیروز پر ہے۔ خود اس کی تو شادی ہو گئی ہے۔ مگر اگلے چار بھائی بہنوں کا تو فرض پورا کرنا ہے اسے۔ میں اور تم مل کر اس کا بوجھ ہلکا کریں گے تو سارے فرض ان شاء اللہ آسانی سے پورے ہو جائیں گے۔“ اس کا دامن دل محبت، خلوص اور قدر کے انمول موتیوں سے لبالب بھرا ہوا تھا اس لیے تو ساری ذمہ داریاں اسے سہیل محسوس ہوتی تھیں۔

فیروز اس کی صورت کا تو اسیر تھا ہی۔ اب اس کی خوش خلقی، ملنساری اور گھر بھر میں روز بروز بڑھتی اس کی پسندیدگی خاصی باعث راحت و طمانیت تھی۔ ممتاز اس کی نورینہ سے شادی کی مکمل انکاری تھی۔

”ہرگز نہیں“ اتنی نازک مزاج اور نفیس طبیعت لڑکی کو میں تو بہو نہیں بنانے والی۔ سنا ہے صفری نے پھولوں کی طرح رکھا ہے اسے۔ مجھے تو ایسی بہو چاہیے جو میرے ساتھ آکر میری ذمہ داریاں بانٹے۔“

”اماں! نوری ایسی بالکل نہیں ہے، جیسی تو سمجھ

رہی ہے۔ ہاں بس چاچی پہلوئی اولاد ہونے کی وجہ سے اس سے بہت محبت کرتی ہے۔“ وہ اماں کے خدشات کم کرنے کی حتی المقدور کوشش کرتا۔ نورینہ نے اس کی خاطر اماں کے ہر اعتراض کو دلائل کی تلوار سے ختم کیا تھا۔ وہاں اس نے بھی کچھ کمپارز نہ کیے تھے۔ ممتاز تو نورینہ کا نام اس کی زبان پہ سن کر آپے سے باہر ہو جاتی تھی اور جب صفری کی طرف سے سات تولے سونے کا مطالبہ آیا تو وہ بالکل ہی ہتھ سے اکھڑ گئی تھی۔

”دیکھ لیا ناں فیروز! اپنی لالچی فطرت چاچی صفری کو کیسے منہ پھاڑ کر سات تولے مانگ لیے، جیسے میں غریب بیوہ کئی مربعوں زمین کی مالک ہوں نا۔“ ممتاز کو لہجہ حد درجہ کٹھنلا ہوتا۔

”تو تو کہتا تھا کہ نوری کو تجھ سے کئی گنا زیادہ چاہت ہے۔ پھر اماں کو سمجھاتی کیوں نہیں کہ دو تولے پہ راضی ہو جاتے۔ پر ناں حرص ماں کی حرص بیٹی۔“

”اماں! یہ سراسر چاچی کا مطالبہ ہے۔ ورنہ نوری ایسی خواہش رکھنے والی ہرگز نہیں۔ سچے موتیوں جیسا دل ہے اس کا۔ اسے صرف فیروز چاہیے۔“ وہ اماں کو اچھی طرح جتا کر بولا۔ مقابل بھی ممتاز تھی، کئی دنوں تک رولا ڈالے رہی۔ مگر اس کا چند دن کا فاقہ اور خاموش رنگ لے آئے۔ اپنے پورے سات تولے کے زیور پالش کروا کے نئے موتیوں سے مزین کروائے۔ ساتھ ملتان سے ہنسی خوشی اس کی بری خریدنے چل رہی۔

”ہائے یہ جنم دینے والی ہستیاں بھلا ان سے زیادہ سچا اور خالص رشتہ بھلا اور کون سا ہو سکتا ہے۔“ فیروز کو ٹوٹ کے اماں پہ پیار آیا تھا۔ اور اب یہ حال کہ ممتاز کا کوئی بھی کام نوری کے بغیر کرنے کو جی نہ چاہتا۔

”بہو رانی! زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں کلنگاں کو میں رہوں نہ رہوں“ اس لیے تو ہر کام میں کچھ ساتھ رکھتی ہوئی چاہے چکی پیسنا ہو یا جانوروں کا چارہ ٹوکہ۔ بعد میں تجھے کسی کام میں کوئی مشکل تو نہ ہوگی۔“

”جی چاچی! گھر کے کام تو اب میں نے کرنے ہی

ہیں۔“ وہ گائے کے تھنوں کی طرف منہ لگانے کو بے تاب پکھڑے کوری سے بمشکل سنبھالے ہوئے دودھ دوہتی ممتاز کو ادب سے جواب دیتی۔

”باچی! تیری اجلی رنگت میلی ہوتی جا رہی ہے۔ پہلے کیسی دودھ مکھن سا روپ ہوتا تھا تیرا اور اب۔“ فیروز اسے اپنی بائیک پہ ہر ہفتے میکے لے آتا تو شازمینہ اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر دل گرفتگی سے کہتی۔

”شاید آب و ہوا کا فرق ہے اس لیے رنگ سنو لانا جا رہا ہے اور یہ بھی تو دیکھو نا۔ یہاں میں اپنی مرضی سے کام کرتی اگر نہ بھی کرتی تو اماں نے مجھے کبھی ڈانٹ ڈپٹ نہیں کی۔ وہ میرا اپنا گھر سسرال ہے، پہلی بہو ہوں ہر کام ذمہ داری اور توجہ سے تو کرنا پڑے گا۔“ وہ بہن کے بالوں کی لٹ کالوں کے پیچھے اڑتے ہوئے محبت سے بولی۔

اماں کی کسی باتیں بالکل درست نہیں تو ایسی غلط بھی ثابت نہ ہوئی تھیں۔

پو پھٹنے سے پہلے وہ جاگ کر ممتاز کے ہمراہ چولہا سلگانے سے لے کر رات کو سونے تک مسلسل کام کرتی ہی رہتی۔ مگر جب وہ چھروں کو بھگانے کے لیے خشک اپلوں کے ڈھیر میں چند انگارے ڈال کر فیروز کے بازو پر سر رکھ لیٹتی تو دن بھر کی تھکان نجانے کہاں چلی جاتی۔ دھواں دھواں ماحول میں وہ آنکھیں میچے فیروز کی مدھم محبت بھری سرگوشیاں سنے جاتی۔

یہ شازمینہ کی باتوں کا اثر تھا یا کچھ اور۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی آئینے تک آتی۔ بغور اپنا عکس دیکھا۔

”چلو کٹیف پانی کی وجہ سے اسکن خراب ہو گئی ہے، مگر میری آنکھوں کو کیا ہوا۔ ان کے شفاف، چمکیلے پن گدلا ہٹ کیوں آگئی ہے؟“ آنکھ کے نچلے حصے پر انگلی سے کھینچ کر اپنی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے خود سے پوچھا۔

”شاید آگ جلاتے وقت پھونکس مارنے سے دھواں اندر چلا جاتا ہے۔“ وہاں اپنے گھر میں تو آئینہ ایسا کچھ نہیں دکھاتا تھا۔ بس فیروز کی آنکھوں میں ہی اسے اپنا عکس دکھائی دیتا تو وہ مطمئن ہو جاتی۔ ڈرائنگ

میبیل کے آئینے میں خود کو دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی تھی۔ مگر ماں کے گھر کا آئینہ تو بہت کچھ دکھا رہا تھا۔ چہرے کا سانولا پن، آنکھوں کے گرد ملے، گھنی آئی بروز۔ ممتاز کی یہ بات تو غلط ثابت ہوئی تھی کہ وہ وہاں رہ نہ پائے گی۔ وہ ہنسی خوشی رہ رہی تھی۔ البتہ شاہدہ کے دعوے کے مطابق زندگی کٹھن اور صبر آزما ضرور ہو گئی تھی۔



آج اس کا اپنے کمرے کی تفصیلی صفائی کا ارادہ تھا۔ کچے صحن میں جھاڑو پھرنے سے اس کا کمرہ دھول مٹی سے اٹ چکا تھا۔

”دلہن رانی! کیا کر رہی ہو؟“ ممتاز اس کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

”چاچی! کمرے کی صفائی کر رہی ہوں۔ کسی چیز کا اصل رنگ نظر نہیں آ رہا۔“ بیڈ شیٹ بدلتے ہوئے اس نے مصروف انداز میں جواب دیا۔

”مجھے ذرا اپنے جھکے تو دکھا۔ کمیٹی نکلی ہے میری۔ سوچ رہی ہوں مہسم کے لیے چھوٹا موٹا زیور گنا بنواؤں۔ بیٹی کا فرض ہے جتنی جلدی ہوا چھا ہے۔“ ممتاز دھیمے سے بولتے ہوئے صوفے پہ بیٹھ گئی۔ ممتاز کی بات سن کر اس کے مصروف عمل ہاتھ لمحہ بھر کو بھٹم گئے۔ پھر سر کو اثبات میں ہلا کر وہ بیڈ سے اتر آئی۔ پرس سے الماری کی چابی نکالی اور جھمکوں کا ڈبا ساس کو تھمایا۔

”ماشاء اللہ! خاصے وزنی ہیں میں اتنے وزنی بیٹی کو تو زیور نہیں پہنا سکتی۔ بسو کو ہی چڑھائے ہیں۔ میری بہو ہے ہی اتنی سوہنی۔“ محبت سے بولتے ہوئے ممتاز نے جھمکوں سے نظر اٹھا کر اسے دیکھا تو وہ بھی مروتاً مسکرا دی۔

”تو ہر وقت انہیں پہنا رہا کر۔ فیروز نے ضد کی اماں میری دلہن کو پورے سات تو لے چڑھائے ہیں، میں نے بلا چوں چراں ہائے تیرا بیڑہ غرق۔ گندم پر ٹوٹ پڑیں۔“

بولتے بولتے ممتاز کی نظر سامنے صحن پر گئی تھی۔ اس نے کچھ دیر پہلے گندم کے دانے دھو کر صحن میں چٹائیوں پر پھیلائے تھے۔ محلے کی بکریوں کا ایک ریوڑ آ کر گندم کے دانے کھانے لگ گیا تھا۔ شاید دروازہ کھلا رہ گیا تھا۔

”ارے او تبسم! کہاں مر گئی ہو دونوں۔ نکالو بکریوں کو۔“ ممتاز زور زور سے بیٹیوں کو آوازیں دینے لگی۔

”نھرس چچی! میں بکریوں کو نکال آتی ہوں۔“ وہ نرمی سے کہتی باہر چلی گئی۔ الماری کھلی ہوئی تھی۔ اور چابی ہول سے لٹک رہی تھی۔ ممتاز پھرتی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ نورینہ کو بکریوں کو اکٹھا کر کے باہر نکالنے میں دقت پیش آرہی تھی کہ ایک اہر بھاگ رہی تھی تو دوسری ادھر۔ ممتاز نے اعتماد سے چابی ہول سے نکالی اور صابن کی نرم ٹکیہ پہ چابی کو زور دے کر چابی کا نقش لے لیا۔



اگلا ایک ماہ ہی بخیریت گزر سکا۔ ”قسم لے لو فیروز! مجھے نہیں پتا زیور کہاں چلے گئے ہیں۔ میں تو انہیں الماری میں لاک کیے رکھتی ہوں۔“ نورینہ کب سے روئی۔ یہی ایک بات دہرانے جا رہی تھی۔ اس کے علاوہ اور کیا کہتی کہ سچ تو یہی تھا۔ گھنی مونچھوں تلے بھنچے لبوں پہ مٹھی رکھے فیروز کی نظریں سامنے چونچ سے پر سنوارنی چیزیاں جمی تھیں۔ ”کہاں چلے گئے ہیں۔ یہ بول ناں کہ تیری ماں کے بکسے میں منتقل ہو گئے ہیں۔“ ممتاز پھٹ پڑنے والے انداز میں بولی تھی۔ مسلسل اور اونچا بولنے سے سر میں درد ہونے لگا تھا اس کے ”اس لیے تو دوپٹے کو کس کے سر پہ باندھ لیا تھا۔“

”میں بھی کموں ہماری دیورانی صاحبہ کیسے بڑھ بڑھ کر سات تولے مانگ رہی تھی کہ اپنی نیت جو خراب تھی۔ پتا تھا نا کہ مجھ غریب کے پاس سات تولے موجود ہیں۔ اس لیے تو منہ بھاڑ کے مانگ لیے۔ میرا نام بھی

ممتاز ماتی ہے۔ اپنا ایک ایک ماشہ صفری کے حلق میں انگلی ڈال کر نکلاؤں گی۔“ ممتاز سینے پہ زور زور سے ہاتھ مار کر جنونی انداز میں بولی تھی۔ چیزیاں تو کب سے پر سنوار کر اڑ چکی تھی، مگر فیروز کی نظروں کا محور دھریک کی شاخ ہی تھی جس پہ وہ بیٹھی تھی۔ وہ ماں اور نورینہ دونوں کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔

”چاچی! خدا سے ڈر، میری ماں یہ ایسا الزام نہ لگا۔ اسے تو میرے زیور غائب ہونے کا علم نہیں اور اماں کو میرے زیوروں سے بھلا کیا غرض؟“ شدت گریہ سے وہ پھٹی ہوئی آواز میں بولی۔

”کیا غرض؟ اپنے چار بچوں میں تقسیم کرے گی ان کی شادی کے وقت اور کیا۔“ ممتاز اپنے تلخ لہجے میں کڑواہٹ سمو کر بولی۔

”وے فیروز وے زن مرید! بول اپنی بیوی سے کہ سارا گنا میرے سامنے حاضر کرے۔“ آپ کے گم صم اور لا تعلق بیٹھے فیروز کا شانہ بری طرح جھنجھوڑ کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

”تو اس کی شکل پہ رعبہ گیا ہے۔ اس کی سوہنے مکھڑے نے تیری مت مار کے رکھ دی ہے۔ مگر میں چی ان بڑھ، انگوٹھا چھاپ تیری بیوی اور ساس کے چلتر اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔“ ممتاز کی بات پہ اس کی نگاہیں اپنے ہاتھوں پہ گئی تھیں۔ میلے ٹوٹے ہوئے ناخن اور پھٹی ہوئی سانولی جلد۔

”اماں! میں کیا کروں۔ نوری اپنے زیور الماری میں ہی رکھتی ہے میرے سامنے کھولتی اور بند کرتی ہے ڈبے۔ اب میں اس سے زیادہ کیا کہہ سکتا ہوں۔“ وہ بے بسی سے ماں کو دیکھنے لگا۔

”تو یہ کہنا چاہ رہا ہے کہ زیور میں نے اٹھائے ہیں۔“ ممتاز کی آنکھیں ابل پڑیں۔

”اس نے چاچی کہا میں نے بی بی مان لیا۔ ایک دن ساس والا منہ نہیں دکھایا اسے۔ ذرا پنڈ میں جھانک ڈال کے دیکھو۔ ہر ساس اپنی بہو کے گہنے اپنے قبضے میں رکھے ہوئے ہے، چاہے ایک چھٹا ہی کیوں نہ ہو۔ میں نے بھروسہ کیا اس لیے نیر بہا رہی ہوں۔“

بولتے بولتے ممتاز کی چند ہی میلی آنکھوں سے  
آنسو نکل ہی پڑے تھے۔ دونوں ہاتھوں سے سر دباتے  
ہوئے کمرے کی طرف منہ کر کے زور سے آواز لگائی۔  
”وے صائمہ! ذرا اونکیاں تیر والی (ڈسپرین) تو پانی  
میں گھول دے۔ سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔“

سر تو نورینہ کا بھی پھٹا جا رہا تھا۔ یہ سوچ سوچ کر کہ  
چابی اس کے پاس موجود ہوتے ہوئے بھی زیور کس  
نے الماری سے نکال لیے۔

”فیروز! کہیں تم بھی تو یہ نہیں سمجھ رہے ہو کہ میں  
اماں کو زور دے آئی ہوں۔“ ڈبڈبائی آنکھوں سے  
فیروز کا متفکر چہرہ دیکھتے ہوئے اس نے اک اس سے  
پوچھا تھا۔

”ارے پکھی تو نہیں ہو گئیں۔“ فیروز نے ڈپٹے  
ہوئے اس کے آسواپنی انگلیوں سے صاف کر ڈالے۔  
”میں نے تجھ سے محبت کی ہے۔ اگر محبت میں  
اعتماد، بھروسہ اور یقین شامل نہ ہوں تو در فطرت منہ ایسی  
محبت کا۔ میں کب کہہ رہا ہوں کہ تو نے زیور چاچی کے  
پاس رکھوائے ہیں؟“

اس کے نازک ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں لے کر  
گرم جوشی سے دباتے ہوئے اس کی بھگی آنکھوں میں  
دیکھ کر بولا۔

”اور تو یہ بھی تو نہیں کہہ رہا کہ میں نے اماں کے  
پاس زیور نہیں رکھوائے۔“ وہ نرمٹھے پن سے بولی۔  
فیروز کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔

”میرا چن پھڑا! تیرے مامے رفیق نے خود نو شاہ  
کے لیے تیرا نام لیا تھا بد لے میں وہ صدیق اور عتیق  
کے لیے تیری دونوں بہنیں لینے کو تیار تھا مگر تو نے  
نورینہ کا نام لیا میں مان گئی کہ میرے پتر کی خوشی اسی  
میں ہے میرے پورے گھنے مانگ لیے میں نے دے  
دیے، لیکن اتنی اجازت ہر گز نہیں دوں گی کہ میری چیز  
کسی اور گھر میں چھپی رہے۔ میرے مرحوم پیو نے  
مجھے دیے تھے یا تو نوری زیور موجود کرے یا پھر خود ماں  
کے گھر کی راہ لے۔“ ممتاز کے لہجے میں چٹانوں کی سی  
خنتی تھی۔



بے فیضال دی آشنائی کولوں کے فیض نہ پایا  
کیر تے انگور چڑھایا ہر گچھا زخمایا  
”نوری! تجھے کہتی تھی تھی تا یہ اجڈ گنوار دیہاتی تیرے  
جیسی باشعور اور نیک فطرت لڑکی کے لیے کسی طور  
قابل نہیں۔ دکھا دی تا اپنی اصلیت۔“ رونی کے  
چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے مرغیوں کو ڈالتی صغری  
دکھ بھرے لہجے میں بول رہی تھی۔

وہ بان کی کھری چارپائی پہ ٹانگوں کے گرد بازو لپیٹے  
بان کے ڈیزائن پر غور کیے جا رہی تھی۔ خشک ٹھٹھے  
ہوئے ہونٹ باہم پیوست تھے اور کاجل سے ٹھٹھا  
آنکھیں ایک دم ویران۔

ممتاز تو ویسے ہی گفن پھاڑ کر بولتی تھی اب تو معاملہ  
خاصا سنگین اور گمبیر تھا۔

ہمسائے تو پہلے ہی دن سے ہنگامہ سنتے آرہے تھے،  
اناچ پسوانے والی عورتوں ہی کے طفیل بات صغری  
تک پہنچ گئی۔ اسی دن نورینہ کو پنڈ جا کے گھیٹ کے  
لے آئی۔ وہ لاکھ ہاتھ چھڑاتی رہی۔

”اماں! میں نے نہیں جانا تیرے ساتھ مجھے اپنے  
گھر رونا ہے۔“ طیش و غضب کے بھانہ میں جلتی  
صغری پہ بھلا اس کے منمنانے کا خاک اثر پڑتا۔

”غضب خدا کا“ صرف ایک گناہ ہوا اپنی ہیرا صفت  
بیٹی ادھر دھول مٹی میں رول دی تو یہ قدر کہ پوری بستی  
میں چوری کا الزام لگا کر منہ چھپانے پر مجبور کر دیا۔ اگر  
زیور واقعی میرے پاس ہیں تو پولیس میں ریٹ درج  
کروا۔ پھر ملتے ہیں تھانے میں۔“ صغری بھی اپنے نام  
کی تھی۔ کچا آنگن عبور کرنے سے پہلے ممتاز کو خوب  
کھری کھری سنائی تھیں۔



”سلام لہکم! میری بہن پیاری! سداوسدی رہ۔“  
نیچے جھک کر چو لہے میں زور زور سے پھونکیں مارتے  
ہوئے ممتاز کے کانوں میں ایک ناشناسا اور پر جوش آواز  
پڑی تو جھٹکے سے سراپر اٹھایا۔ دھوئیں سے بھری

چند ہیالی آنکھوں کے سامنے ایک لمبا چوڑا وجود نظر آیا۔ ڈبوں والی دھوتی کے اوپر کرتا، گھنگھریالے تیل لگے بالوں میں درمیان سے ٹھلی مانگ، دندا سے رنگ سرخ مسوڑھے اور ہونٹ پیروں میں طلے والی کھیری، مضبوط گھٹا ہوا جسم۔

”اوہ ممتاز بہن! ایسے اجنبی آنکھوں سے کیوں دیکھے جا رہی ہے۔ پہچانا نہیں، میں کالا ہوں۔ تیرا بھرا۔“ ہنس کر کہتے ہوئے اونچا پیڑھا گھسیٹا اور بے تکلفی سے ٹانگیں کھول کر بیٹھ گیا۔ ممتاز نے ایک لمبی سانس بھری۔ چہرے پہ بے زاری چھا گئی تھی۔

”وے بالے! تو ادھر کہاں سے آگیا۔ کہیں پولیس سے چھپتا چھپاتا تو نہیں آگیا۔“

جبرا مسکراتے ہوئے ممتاز نے طنز سے پوچھا۔  
”خدا نا خواستہ پولیس کیوں پیچھے لگے گی۔ اپنی بہن کے گھر آیا ہوں، بس دل طے کو چاہ رہا تھا۔“ مقابل شاید بے حد خوش اخلاق تھا، تبھی تو ممتاز کے طنز کا برا مانے بغیر ہنس کر بولا۔

”کچھ ٹکڑے شکر پوچھ، کوئی چائیاں۔ پہلے تو تو بڑی مہمان نواز ہوتی تھی۔ تیرا بھرا سچ سے بھکا (بھوکا) ہے۔“ وہ رسولی میں نظریں گھماتے ہوئے بہت اپنائیت سے بولا۔

”دیتی ہوں کچھ کھانے کو۔ اور یہ مہربانی کر۔ اپنے آپ کو میرا بھرا نہ بول۔ سلامت رکھے خدا میرے دیر کو۔ رفیق میرا بھرا ہے۔“

رکھائی سے کہتے ہوئے ممتاز نے مونگ کی وال کے سالن سے اسٹیل کی کنوری بھری دیروٹیاں چنگیر میں رکھ کر تقریباً ”سچ کر چنگیر سامنے رکھی تھی۔“

”ہا! بھرا کیسے نہ بولوں۔ تو میری چھپی کی بہن ہے۔ بھلا تیرا میرا بہن بھائی کے علاوہ اور کیا رشتہ ہو سکتا ہے؟“ بڑا سانوالہ منہ میں رکھتے ہوئے بالے نے لگاوٹ سے پوچھا۔ ممتاز کی بے گانگی اور بے زاری تو جیسے اسے لطف دے رہی تھی۔ مجال ہے جو ایک بل ماتھے پہ آیا ہو۔

”اماں! یہ اماں اقبال ہمارے گھر کیوں آیا ہے؟“ فیروز

نے دبے دبے لمحے میں پوچھا تھا۔ صرف ممتاز ہی نہیں بلکہ ہر فرد کے لیے اقبال عرف بالے کی آمد پہلے تو باعث حیرت پھر باعث تشویش بن گئی تھی۔

”میں کیا جانوں، کیوں آیا ہے۔ خود پوچھ لو۔“ ممتاز کا کلیجہ کون سا اس کے آنے سے ٹھنڈا ہوا تھا۔ جلے بھنے انداز میں جواب دیا۔

اقبال پیٹ بھر کر روٹی کھا کے اور دو پیالے چائے پینے کے بعد چارپائی پہ لیٹ گیا۔ پیچھے کو موڑ کر دونوں بازوؤں کے تکیے پر سر رکھے وہ اونچی ٹانگیں اڑا رہا تھا۔  
”وے اک پھل موتیے داما کے جگا سوہنیے!“

یہ گھر میں پھیلی عسرت اور تنگدستی ہی تھی جس نے اقبال کو بچپن میں گھر کی چھوٹی مولی چیزیں سب سے نظر بچا کر اٹھانے پر مجبور کیا تھا۔ بیماری کی کامریض باب ملک عدم آباد کو سدھارا تو ماں چٹائیاں مصلے بن کر گھر کی روزی روٹی چلانے لگی۔ قلیل آمدنی اور نو بہن بھائیوں سے بھرا گھر کبھی پیٹ بھر کر کھانے کو نہ ملتا۔ بھوک سے بلبلا تے پیٹ کو کسی طور تو خاموش کرانا تھا۔ گھر کی چیزیں تو با آسانی ہاتھ لگ جاتیں، مگر روکھی سوکھی روٹی اور پیلے پانی شوربے کو کب تک ہنسی خوشی کھاتا، ہاتھ میں صفائی آئی تو منگلے والوں کی اکثر چیزیں بڑے آرام سے اس کی ملکیت میں آ جاتیں۔

عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ چوری کی عادت بھی بچتے ہوتی گئی۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اقبال کی عرفیت بالاڈکیت مشہور ہو گئی۔ ماں نے اپنی بھانجی سے اس کی منگنی طے کی تھی، اسی نے شہرت سے ڈر کر کہیں اور بیٹی کو بیاہ دیا۔ رشتہ داروں نے گھر کے دروازے اس پہ بند کر دیے۔ پھر اڑتی اڑتی خبریں سارے رشتہ داروں تک پہنچتی رہتیں۔

”بالے نے بنک لوٹ لیا۔ پورے ضلع کی پولیس اس کے پیچھے ہے۔“  
”بالے کو اگلے ماہ سینٹرل جیل منتقل کر دیا جائے گا۔“

ممتاز کا تو سکون ہی غارت ہو کر رہ گیا تھا۔ سارا دن جو کس بیٹھی بالے کی نگرانی کرتی رہتی۔

کے تھے۔ سرخ سرخ کئی دن کھیا ہٹ سے بول ہی نہ پائی تھی۔“

وہ بے دلی سے صغریٰ کی کئی بار کی سنائی اسٹوری کو سنتی رہی۔ چنگیر خالی ہو گئی تھی۔ باتوں باتوں میں صغریٰ اسے پورا دوسہ کھلا چکی تھیں۔

اچانک پاس پڑا اس کا موبائل مدھردھنیں بکھیرنے لگا۔ اس نے ہاتھ برہا کر دیکھا۔ فیروز کا نام ہلنک کر رہا تھا۔ اس کی بے رنگ آنکھوں میں رنگ اترنے لگے تھے۔ اسے مہینہ ہو چکا تھا اسے یہاں آئے ہوئے۔ یہ فیروز کی پہلی کال تھی۔

یہ اس پر خفا کہ ایک بازو اماں کے ہاتھ میں تھا تو دوسرے بازو کو وہ تھام کر اسے روک لیتا۔ جانے نہ دیتا۔ اپنی نظروں سے اوچھل نہ ہونے دیتا اور وہ اس پر حیران۔

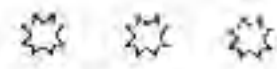
”تم میرے گھر کا آنگن کیسے پھلانگ کر چلی گئیں۔ میں تمہارا ہاتھ پکڑتا تو چاچی اور اماں دونوں کی نظروں میں گستاخ ٹھہرتا۔ تمہیں خود ہی میرا بازو دیوچ لینا چاہیے تھا۔ اب چاچی دونوں کو گھسیٹ کر تو نہیں لے جاسکتی تھیں تم دھان پان کھینچتی چلی گئیں۔“ فیروز کی بات یہ اس نے مسکراتے ہوئے ہنسی اور ہاتھ کر پھیلا دی۔ دو تین زرد پھول اس کی ہتھیلی پر آکرے تھے۔



بے حد احتیاط سے ٹرنک کا تالا کھولا۔ اندر پورے سات تولے کے زبورات موجود تھے۔ جنہیں نورینہ سے حاصل کرنے کے لیے اس نے کتنی ترکیبیں لڑائی تھیں۔ کتنے پاؤں بیلے تھے۔

فیروز جب جب نورینہ کا نام لیتا اس وقت اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی۔ جب اسے اپنی دیورانی صغریٰ ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی تو اس کی بھی کیونکر اچھی لگتی۔ وہ فیروز کے لیے اپنی بیٹی کی نو شاہ کی خواہاں تھی مگر شاید فیروز کی نورینہ سے محبت ہی اتنی زور آور تھی کہ اسے کھٹنے بڑگئے تھے۔

اور جب صغریٰ نے بیٹی کی رخصتی ہی سات تولے



صحن کے وسط میں لگے کیکر کی ہر ڈال زرد پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ وہ کیکر کے نیچے چھاؤں میں رکھی چار پائی پہ گرتے زرد پھولوں کو نجانے کب سے بیٹھی اپنی قمیص کے دامن میں اکٹھے کرتی جا رہی تھی۔

”باجی! اندر آؤ! اماں چاولوں کا دوسہ بنا رہی ہے۔ تیرا پسندیدہ۔“ شازمہ نے کچن کی کھڑکی سے اسے پکارا تھا تو اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا تھا اور پھر سے پھول اکٹھے کرنے لگی۔

انگلے ہی لمحے خود ہی صغریٰ چنگیر میں گرم گرم دوسہ لیے اس کے قریب چار پائی پہ آ بیٹھی۔

”نوری چندا! چل اٹھ کر نما دھولے۔ کب تک ایسی اجڑی حالت میں رہے گی۔“ صغریٰ نے اس کے الجھے بکھرے جھونجھوبالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے محبت سے کہا۔ اپنی پہلوئی اولاد کی ایسی ویران حالت اس کے دل کو کالے جا رہی تھی۔ نہ ہننگ سے کھاتی پیتی نہ زیادہ کسی سے بات بس سارا دن خاموش گم سم بیٹھی رہتی۔

”تو دوسہ کھاناں تیرے لیے میٹھا بنایا ہے۔ شیرہ ڈال کر۔“ صغریٰ نوالہ توڑ کر اس کے منہ میں دینے لگی۔

”یہ ممتاز تو خود ایک نمبر کی بدنیت اور لالچی عورت ہے۔ بہت پہلے جب تیرا ابا زندہ تھا تو رو کو ہیوں نے طغیانی مچائی کہ سارا پنڈ زیر آب آ گیا تھا۔ تیرا چاچا امین بال بچوں سمیت ادھر ہمارے گھر آ گیا۔ دیگر سازو سامان کے ساتھ ممتاز دو مرغیاں بھی بغل میں دابے ہوئے تھی۔ میں نے خود بھی مرغیاں پال رکھی تھیں۔ ایک ہی ڈربے میں مرغیوں کو بند کیا۔ مگر یہ منحوس عورت سارے انڈے خود اپنی جھولی میں سمیٹ لیتی۔ اب میں اپنی مرغیوں کے انڈوں کی کون سی نشانی لاتی۔ بس خون کے گھونٹ بھر کر خاموش رہ جاتی تھی۔

جب انڈوں سے چوزے نکلے تو ساری اصلیت کھل کر سامنے آ گئی اکثر چوزے میری مرغی کے انڈوں

سے مشروط کر دی تو گویا اس کے کلیجے پہ ہاتھ مارا تھا اس نے۔ کماؤ بوٹ بیٹے سے بگاڑ سراسر اسے اپنا ہی نقصان لگا تھا۔ سو بظاہر رضا و رغبت زیور بری میں شامل کر دیے۔

عیاری اس کی گتھی میں پڑی ہوتی تھی۔ ٹھنڈا کر کے کھانے کی عادی تھی۔ تو سارے زیورات بحفاظت اس کی تحویل میں آ چکے تھے۔

”کیسے نورینہ مہارانی میری کل پونجی کی مالک بن بیٹھی تھیں۔ میرے پانچوں بچوں کا برابر کا ان پہ حق ہے۔“

طمانیت سے سوچتے ہوئے ممتاز نے صندوق کو مالا لگا دیا۔

”چلو اچھا ہے۔ میاں کی آمدنی ٹکڑی ہو تو ہر خواہش با آسانی پوری ہو جاتی ہے۔ اب مجھے دیکھو میں نے برآمدے میں جالیاں لگوانے کی فرمائش کی تو جمیل نے اسی ہفتے لگوا دیں۔ تم پرالوتا۔“

بولتے بولتے شاہدہ کو احساس ہوا کہ نورینہ نے بس تھوڑا سا بڑا چکھا ہے۔

”اچھی طرح کھا لو۔ کیا پتا فیروز تمہیں لینے آجائے۔ وہاں گاؤں میں کہاں پڑے ملتے ہیں۔“

شاہدہ خود بڑا سا بانٹ منہ میں رکھتے ہوئے بولی۔

”تمہیں بس میں چلتی ہوں۔“ وہ ایک دم خشک انداز میں کہتی ادھ پیا چائے کا کپ رکھ کر کرسی دھکیل کے اٹھ کھڑی ہوئی۔



بشمول فیروز سارے بہن بھائی ماں کو حق دق زارو قطار روتا دیکھ رہے تھے۔ ممتاز زمین پر بیٹھی سینہ کو پی کے جاری تھی کپڑے مٹی سے اٹ چکے تھے۔

”وے بالا تیرا ککھ نہ رہے۔ پیروں میں چھالے پڑیں ہاتھ ٹوٹیں تیرے جن سے تو نے میری کل جمع پونجی اٹھالی ہائے میرا کج نہیں رہا۔“

”اماں! کچھ بتا تو سہی ہوا کیا ہے۔ تو کیوں اتنے بین ڈال رہی ہے۔“ صائمہ ماں کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئی فکر مندی سے بولی۔ یہ رونا دھونا تو کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”فیروز! تو بالے کا پیچھا کرو زیادہ دور نہیں گیا ہو گا۔“ ممتاز روتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی اور فیروز کا بازو جھنجھوڑ کر بولی۔

”اماں! مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ مامے اقبال کا پیچھا میں کیوں کروں؟“ وہ ہنوز ابھٹن زدہ نظروں سے ماں کو دیکھ رہا تھا۔ ممتاز کا دواویلا خاک پے پڑا تھا۔

”وہ جنم جلا بالا تیری بیوی کے سارے زیور اٹھا کر بھاگ گیا ہے۔ تو جا اس کے پیچھے۔“

”نوری کے زیور تو تین ماہ پہلے ہی غائب ہو چکے ہیں۔ ماما اقبال کے ہاتھ کہاں سے لگ گئے۔“ اس نے

کافی دنوں بعد اس نے شاہدہ کے گھر کا چکر لگایا۔

”ارے آؤ نوری! یہ پرائیویٹ کرو۔ جمیل نے اس تنخواہ پر اوون خرید کر دیا ہے۔“

شاہدہ نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ پورا گھر چم چم کر رہا تھا۔

”جب سے گھر میں ماربل ٹائلز لگوائے ہیں۔ جانو عذاب میں پڑ گئی ہوں۔ ذرا سی دھول واضح نظر آنے لگتی ہے۔ بہت بری لگتی ہے۔ فوراً صفائی کرنا پڑتی ہے۔“

تم خوش نصیب ہو اس معاملے میں پورا گھر گچھا چاہے جتنی دھول مٹی بیٹھے بری تو نہیں لگتی۔“ چائے کا کپ بھر کر اس کی طرف کھسکاتے ہوئے شاہدہ ہنوز مسکرا رہی تھی۔ اس نے گھونٹ بھرتے ہوئے خاموش نظروں سے شاہدہ کا چہرہ دکھا۔

”محبت میں بڑا دم خم ہوتا ہے۔ فیروز تمہیں یہاں بھی گھر لے کر دے سکتا ہے۔ ویسے وہ الگ گھر انورڈو تو کر سکتا ہے نا۔“ شاہدہ نے قدرے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ تو اس کا چہرہ پل بھر کو متغیر ہوا تھا۔

”ہاں کیوں نہیں اچھی خاصی تنخواہ ہے فیروز کی۔“

نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے کبجے میں روکھا پن در آیا تھا۔

جس دن اسے زیورات کی بازیابی کی خبر ملی تھی۔  
ایسی وقت خوشی سے صحن میں جھنریاں ڈال رہی  
تھیں۔

”گھڑی مک گئی اے انتظار دی۔“

مگر صغریٰ اپنے دل کا کیا کرتی جو تنور بنا بھڑبھڑ جلے جا  
رہا تھا۔ ”تو چپ کر نورینہ! زیادہ بولی تو گلا گھونٹ کر  
یہیں صحن میں دقن کر دوں گی تجھے۔“ صغریٰ نے غصے  
سے اسے بری طرح جھڑکا تھا۔

”بھابھی ممتاز نے ہم پر چوری کا الزام لگایا، خاندان  
بھر کی باتیں ہم نے سہی ہیں۔ اب زیور خود کے پاس  
سے نکل آئے تو نوری بازو ہلاتی چل پڑے۔ ناممکن خود  
بھابھی ممتاز آئے گی۔ خاندان کے چار بندوں میں مجھ  
سے معافی مانگنے کی پھر کوئی تصفیہ ہو گا۔“  
صغریٰ کا انداز دو ٹوک اور اٹل تھا۔



وہ عجب مصیبت میں آن پڑی تھی۔  
جب بھی گھر جانے کا نام لیتی، صغریٰ بری طرح  
جھڑک کے رکھ دیتی۔

”قدم نکال کے تو دکھا، نائلیں توڑ کے رکھ دوں گی۔  
میری بھی کوئی عزت ہے یا نہیں۔“ ادھر فیروز ہر ہفتے  
چکر لگاتا اسے لے جانے کی خاطر۔  
”صائمہ کو کچھ لوگ دیکھنے آئے تھے۔ پسند بھی کر  
گئے ہیں۔ مگر اماں چاہتی ہے کہ نورینہ کی موجودگی میں  
رشتے کی بات آگے بڑھائی جائے۔“  
شازمینہ سے چائے کا کپ لیتے ہوئے فیروز صغریٰ  
سے مخاطب تھا۔

”ہاں تیری ماں بخوبی جانتی ہے کہ جس گھر کی بہو  
میکے بیٹھی ہو اور وہ بھی چوری کے الزام میں، تو اس گھر  
کی بیٹی سے رشتہ جوڑتے ہوئے لوگ سوواری سوچیں  
گے تو سہی۔“ صغریٰ گہرے طنز سے بولی تو فیروز اپنی جگہ  
پر پہلو بدل کر رہ گیا تھا۔ تاہم تحمل سے بولا۔  
”ایسی بات نہیں ہے۔ وہ لوگ صائمہ کو پسند کر  
چکے ہیں۔ اماں بھی ان کا گھر بار دیکھ آئی ہے۔ مگر میری

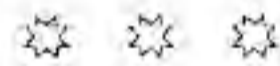
آنکھیں سکیڑ کر ماں کا چہرہ دیکھا۔

”وہ زیور میرے پاس تھے۔ میری صندوق میں۔“  
ممتاز من پر نظریں گاڑے پست آواز میں بولی۔  
”اماں!“ صائمہ اور تبسم کے منہ ایک ساتھ کھلے  
تھے۔ حیرت اور دکھ نے اکٹھے ہلا بولا تو فیروز کے قدم  
لڑکھڑا گئے تھے۔

”اماں! یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟“ اس کے منہ سے  
سر سراتے ہوئے لفظ نکلے تھے۔

”مجھے معاف کر دے بیٹا! میں شیطان کے برکاؤں  
میں آ گئی تھی، میری آنکھوں پر لالچ کی پی بندھ گئی  
تھی۔ تو کچھ کر۔“ بلجی لہجے میں گم صم کھڑے فیروز کا  
چہرہ اپنے ہاتھوں میں بھرتے ہوئے ممتاز پھوٹ پھوٹ  
کر رو پڑی۔

”اماں! تو اشارے میں کہہ دیتی، نوری خود تجھے  
سارے زیور اٹھا کر دے دیتی۔“ بے حد دکھ سے بولتے  
ہوئے اس نے ترحم بھری نظر روتی بلجی ماں پہ ڈالی  
تھی۔



”چاچی! میں تیرے آگے شرمندہ ہوں۔ مجھے سو  
چھتر مار لے۔ پر یہ ظلم نہ کر۔“  
”صغریٰ چارپائی پہ بیٹھی تھی۔ دائیں بائیں کھلے  
بازو سختی سے چارپائی پہ جمے ہوئے تھے۔ چہرے کے  
کھینچے عضلات فیروز کی بات سن کر ڈھیلے پڑے تھے۔ وہ  
چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا عین صغریٰ کے قدموں  
میں جا بیٹھا۔

”تجھے کا ہے کو چھتر لگاؤں۔ لے آنا اپنی ماں کو۔  
اس کا شرمندہ چہرہ دیکھ کر میں نوری کو تیرے ساتھ  
روانہ کر دیتی۔“ وہ فیروز کے جھکے سر کو دیکھتے ہوئے  
گہرے طنز سے بولی۔

”اماں! تو اب زیادتی کر رہی ہے۔ چاچی شرمندہ  
ہے۔ اس لیے تو فیروز چل کر مجھے لینے آیا ہے۔“  
نورینہ تڑپ کر سامنے آئی تھی۔ ماں کا ماش کے اٹے  
کی طرح اٹٹھے چلے جانا اسے پسند نہیں آ رہا تھا۔

تسلی نہیں ہو رہی۔ اماں کی پسند کا دائرہ بس صحن کے لیے چوزے رقبے، گھونٹوں سے بندھی ڈھیر ساری بکریوں اور گندم سے بھرے ڈرم تک ہی محدود ہے۔ میں چاہتا ہوں نورینہ ان لوگوں کے گھر جا کر ان کا رہن سہن اور باہمی میل جول کو دیکھ آئے۔ ”سنجیدگی سے بولتے ہوئے فیروز نے صفری کو آس بھری نظروں سے دیکھا تھا۔

”ہاں تو اپنی ماں سے کہہ ناکہ وہ آئے اور اپنی بہو کو لے جائے۔“ صفری قدرے بے گانگی سے بولی تھی۔ ”وہی مرنے کی ایک ٹانگ۔“ نورینہ اور فیروز دونوں نے ایک لمبی سانس کھینچی تھی۔ فیروز کی بات پہ اسے یاد آیا کہ شازمینہ کو بھی چند دن پہلے کچھ خواتین دیکھ کر گئی تھیں۔ صفری تو خوب ان پہ ریشہ خطنی ہو چکی تھی۔

”اماں! تو شازمینہ کے لیے ہاں کرنے سے پہلے فیروز سے کہہ کر لڑکے کے کردار اور عادات کا پتا کرا لے۔ دیکھیں تو سہی لڑکے کا چال چلن اور حلقہ احباب کیسا ہے۔“ وہ بے ارادہ ہی ماں سے اس موضوع پہ بات کر بیٹھی۔

”چل رہے دے فیروز ساری زندگی دیہات میں پلا بڑھا اور یہ لوگ ادھر رہنے والے۔ ویسے بھی فیروز زراعت کے محکمے میں بیجوں اور سپرے کی بوتلوں کی چھان پھٹک کرنے والا اور ان کا بھائی پولیس میں ملازم کبھی اس شہر تو کبھی اس۔“ اسے ماں کے الفاظ نہیں انداز ضرور برا لگا تھا۔

طاہر شازمینہ سے بوجھ رہا تھا۔

”شازی باجی! کیا تم بھی شادی کے بعد نوری باجی کی طرح ہمارے گھر آؤ گی تو گئے، پاپ کارن، حلوہ اور مروندے لے کر آؤ گی۔“ معصوم و اشتیاق بھرا سوالیہ انداز۔

”نہیں میرے بھائی! میں کوئی دیہات تھوڑی جا رہی ہوں۔ یہ تو خالص دیہات کی سوغاتیں ہیں جو نوری باجی لاتی ہے۔ میں تو شہر شہر پھر کر نئی نئی چیزیں اپنے بھائی کے لیے لاؤں گی۔“

شازمینہ نزاکت سے چہرے پر اسکرب رگڑتے ہوئے پیار سے بول رہی تھی۔ جب سے اس کا پروپونل آیا تھا تب سے وہ جی جان سے خود کو نکھارنے میں لگی رہتی تھی۔

”یہ میں آج کل اتنی زود رنج کیوں رہنے لگی ہوں۔“ آنکھ میں آنی نمی کو صاف کرتے ہوئے اس نے دل میں سوچا۔



شازمینہ کے رشتے کے لیے آنے والی خواتین واقعی اسٹانڈش، سلجھی ہوئی اور باوقار تھیں۔ اسے ان سے مل کر واقعی بہت خوشی ہوئی تھی۔ شرافت رکھ رکھاؤ کبھی ان کے انداز گفتگو سے ظاہر ہو رہا تھا۔

”تمہیں منع بھی کیا تھا کہ تم ان رشتہ لانے والی عورتوں کے سامنے نہیں آؤ گی، پھر کیوں اندر گئیں۔“ مہمان خواتین کے جانے کے بعد صفری نے بڑے سخت انداز میں اس سے باز پرس کی تھی۔

”مگر کیوں اماں! میں تو شادی شدہ ہوں، شازمینہ کی بڑی بہن ہونے کے ناطے ان سے ملنا میرا فرض تھا۔ کوئی یہ صورت حال تھوڑی تھی کہ بڑی بہن کا رشتہ نہ ہونے پہ چھوٹی بہن کو کمرے میں بند کر دیا جائے۔“ ذرا سا مسکرا کر شازمینہ کو دیکھتے ہوئے وہ ماں سے بولی۔

شازمینہ کے چہرے سے بھی ناراضی مترشح تھی۔

”افوہ! تم نہیں سمجھو گی۔“ صفری جھنجھلا کر بولی۔

”تم شادی شدہ ہو۔ یہ میں نے پہلی ملاقات میں بتا دیا تھا۔ اب اگر انہیں اس بات کی کرید لگ گئی کہ تم تین ماہ سے یہاں کیوں میکے میں مقیم ہو تو سوچو وہ محض یہ جواز بنا کر بھی پیچھے ہٹ سکتے ہیں کہ بڑی بہن میکے آنی بیٹھی ہے۔ کہیں دوسری بہن بھی اس مزاج کی نہ ہو۔“

”کس مزاج کی اماں؟“ اس کی آواز بھگ گئی تھی۔

”کم عقل لڑکی! عقل سے تو تجھے سدا کا ویر ہے۔ نیا نیا رشتہ جڑ رہا ہے۔ احتیاط اچھی چیز ہوتی ہے۔ اب ہم

ابن انشاء کی شخصیت اور علمی وادبی  
خدمات پر ڈاکٹر ریاض احمد ریاض کا  
تحریر کردہ مقالہ

## ابن انشاء

احوال و آثار

شائع ہو گئی ہے



قیمت: -/ 1200 روپے

ڈاک خرچ: -/ 50 روپے

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

زیورات والی کہانی انہیں بالفرض سنا بھی دیں تو کون سا  
انہوں نے یقین کر لینا ہے رشتہ پکا ہو لینے دو پھر خوب  
ان سے گپ شپ کر لینا۔ ”صغریٰ اب مہمانوں کی  
خاطرمدارت پہ خرچ ہونے والے پیسوں کا حساب  
کرنے لگی تھی۔

”کم عقل نہ ہو تو“ لڑکیاں شادی کے بعد سمجھ دار  
ہوتی ہیں۔ اور تو اب شادی شدہ ہے کچھ تو سمجھ سے  
کام لے لیا کر۔“ وہ ڈھیلے ڈھالے قدموں سے چلتی  
اندراگئی۔ ”صغریٰ کی آواز اندر تک آرہی تھی۔  
اس نے موبائل اٹھا کر فیروز کا نمبر ملایا۔

”ہاں فیروز! تمہیں یاد ہے جب تم مجھے بایک پہ  
اماں کے گھر چھوڑنے آتے تھے تو ہم نے راستے میں  
میاں جی کے باغ میں کئے مزے کے امرود کھائے تھے  
نا۔“ وہ بچوں کی سی معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔  
”ہاں مجھے یاد ہے، مگر تم۔۔۔“ وہ حیران سا اس کی  
بات پر غور کرتا بس انتہائی کہہ سکا تھا کہ وہ اس کی بات  
کاٹ گئی تھی۔

”میں تمہیں بتا رہی ہوں جب تم مجھے لینے آؤ گے  
تو پنڈ سے اپنے گھر جاتے ہوئے ہم میاں جی کے باغ  
میں ضرور رکھیں گے۔ میرا امرود کھانے کو بڑا دل کر رہا  
ہے۔“

”نوری! چاچی مان گئی ہے؟“ فیروز کی آواز میں بے  
یقینی سی بے یقینی تھی۔

”ہاں فیروز! اماں نے خود کہا ہے کہ میں اب شادی  
شدہ ہوں۔ شادی شدہ لڑکی کو سمجھ داری سے کام لینا  
چاہیے۔ اور اس وقت تمہیں کال کر کے گھر واپس  
لے جانے سے بڑھ کر کوئی اور سمجھ داری کی بات ہو  
سکتی ہے؟“ وہ پراعتماد لہجے میں اس سے پوچھ رہی  
تھی۔

”یقیناً“ نہیں میں بس ابھی آ رہا ہوں۔“ فیروز نے  
مسکراتے ہوئے کال ڈس کنیکٹ کر دی۔



# رکاوٹ

سوبا اور مایا دونوں بہنیں اپنی ماں کے ساتھ گھر کی اوپری منزل میں رہائش پذیر ہیں۔ ان کے والد کی وفات ان کے بچپن میں ہی ہو گئی تھی۔

گھر کی چکی منزل میں ان کے تایا اور تائی اپنی دو بیٹیوں عفت اور نائلہ کے ساتھ رہتے ہیں۔ تایا اکثر بیمار رہتے ہیں۔ حدید، انس، عفت اور نائلہ کے خالہ زاد ہیں۔ نائلہ، انس میں دلچسپی رکھتی ہے۔ مگر انس، سوبا سے شادی کرنا چاہتا ہے اور اپنی پسندیدگی کا اظہار اپنی خالہ اور سوبا کی مائی کے سامنے کر دیتا ہے۔ خالہ کو بے پناہ دکھ کا احساس ہوتا ہے، مگر ظاہر راضی خوشی اس کا رشتہ لے کر اپنی دیورانی کے پاس جاتی ہیں۔ سوبا کی والدہ یہ رشتہ خوشی خوشی قبول کر لیتی ہیں۔ نائلہ باقاعدگی سے اپنے والد کو اسپتال لے کر جاتی ہے۔ وہاں اسپتال کے کلرک شبیر حسین عرف شبوسے روابط بڑھ جاتے ہیں کہ ابھی برے کی تمیز کو بھول جاتی ہے۔

سوبا اور انس کی شادی کی تقریبات بہت اچھے طریقے سے انجام پاتی ہیں اور سوبا رخصت ہو کر انس کے گھر آ جاتی ہے۔ حدید کسی کو ڈراپ کرنے جاتا ہے اور اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔

سوبا کے اکیلے پن کی وجہ سے عفت اس کے پاس رک جاتی ہے۔ گھر کے کاموں کے علاوہ حدید کا بھی خیال رکھتی ہے۔ حدید، عفت کے دل میں اپنے لیے پسندیدگی کو جان لیتا ہے اور سوچ لیتا ہے کہ اس بار خالہ کو مایوس نہیں کرے گا۔ نائلہ، شبیر حسین سے ملنا نہیں چھوڑتی اور آخر کار اپنی عزت گنوا بیٹھتی ہے، جس کا اندازہ اس کی ماں کو بھی ہو جاتا ہے اور وہ اپنی عزت بچانے کے لیے حدید کے ساتھ نائلہ کی شادی کا فیصلہ کر لیتی ہیں اور اس بات کا اظہار انس اور مایا سے بھی کر دیتی ہیں۔

(اب آگے پڑھئے)

## چھٹی قسط





پوری رات آنکھوں میں جاگتے ہوئے کٹ گئی تھی۔  
 ”ایسا“ کسی کی آواز، ہتھوڑے کی مانند اس کے دماغ، سماعتوں اور اعصاب پر برسی رہی تھی۔  
 ”کیا حبیب کسی کے باپ ہیں۔“

وہ رات بھر فکر تشویش اور غم آنکھوں سے پلٹ پلٹ کر حبیب کا محو خواب چہرہ دیکھتی خود سے سوال کرتی رہی تھی۔ بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ دل ماننے کو تیار نہ تھا اور دماغ جھٹلانے سے انکاری۔ اب اصل بات کیا تھی یہ تو صرف حبیب ہی بتا سکتا تھا مگر اس کے چھکا چھک بھاگتے دل کو سکون و قرار آئے بھی تو کیسے؟  
 نرم و ملائم بستر۔ کل تک جس پر گرتے ہی نیند کی مہمان پری اس کی پلکوں پر اپنے پر پھیلا دیتی تھی۔ آج جیسے میدان خاڑا زار بن گیا تھا۔ کسی پل۔ چین نہ تھا۔ کسی کروٹ قرار نہ تھا۔  
 صبح تک اس کی آنکھیں سرخ ہو کر سوج چکی تھیں۔  
 ”ماہا کیا ہوا۔ طبیعت ٹھیک ہے تمہاری۔“ حبیب اسے دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔  
 ”جی ٹھیک ہے۔“

رات کی بہ نسبت صبح اس کا لہجہ حد درجہ روکھا تھا۔ حبیب کو یقین نہیں آیا۔  
 ”کیا بات ہے تم روئی ہو۔“ پوچھنے کی دیر تھی کہ آنسو پھر سے اس کی آنکھوں میں چمکنے لگے لیکن اس سے کچھ بولا نہیں گیا۔

”کیا بات ہے ماہا بولو۔ بتاؤ کیا مسئلہ ہے۔“ وہ بے چین ہو گیا۔  
 ابھی کل رات تو وہ اتنی خوش اور مطمئن تھی۔ اب ایک ہی رات میں کیا ہو گیا تھا۔  
 ”یہ ہے مسئلہ۔ یہ۔“ ماہا تیزی سے کمرے میں جا کر اس کا سیل فون اٹھا لائی۔ جس پر کسی کی کال آرہی تھی۔  
 ”ولی کالنگ۔“ کے الفاظ پوری آب و تاب کے ساتھ جگمگا رہے تھے۔ حبیب نے ایک نظر اسے دیکھا پھر فون آن کر کے کان سے لگایا۔

”جی بیٹا میں ذرا بڑی ہوں۔ بعد میں بات کروں گا۔“  
 ماہا زور سے پیرنچ کر کمرے میں چلی گئی۔ حبیب اس کے پیچھے ہی آیا تھا۔  
 ”ماہا کیا کر رہی ہو یہ۔“  
 اس نے جواب نہیں دیا وہ تیزی سے دارڈروب سے کپڑے نکال کر ریڈ پر پھینک رہی تھی۔  
 ”ماہا کیا ہو رہا ہے یہ۔۔۔ پلیز۔“  
 ”پیکنگ۔“

”کیوں۔“ وہ دو قدم آگے بڑھ آیا۔  
 ”میں اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔“ اس کا انداز قطعی تھا۔  
 ”پاگل ہو گئی ہو تم مجھے۔“  
 ”ہاں آپ یہی سمجھ لیں اور برائے مہربانی میری سیٹ بک کروائیں۔ مجھے فوراً پاکستان جانا ہے۔“  
 ”میری بات تو سن لو ماہا۔ تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“ اس کا لہجہ بے بس تھا۔  
 ”کیا غلط فہمی۔ یہ لڑکا آپ کا بیٹا نہیں ہے۔“  
 کسی موہوم سی امید کے سہارے اس کے ہاتھ ذرا کی ذرا ہتھم گئے۔  
 حبیب چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ پھر مجرمانہ انداز میں سر جھکا کر بولا۔  
 ”ہاں وہ۔ میرا بیٹا ہے۔“

ماہانے ہاتھ میں تھامے کپڑے پھینک کر رونا شروع کر دیا۔  
 ”ماہاپلیز رومت۔“ اس نے قریب جا کر اس کے ہاتھ تھامے۔  
 ”مت ہاتھ لگائیں مجھے۔“ اس نے زور سے حسیب کے ہاتھ جھٹکے۔  
 ”ایک بار میری بات تو سنو۔“

”نہیں نہیں مجھے کچھ نہیں سننا۔ مجھے پاکستان جانا ہے فوراً۔“

”کیوں جانا ہے۔ کیا تم مجھے جھوڑ کے جانا چاہتی ہو۔“

”ہاں میں نہیں رہوں گی۔ آپ کے پاس آپ کے ساتھ۔ میں ایک بٹے ہوئے شخص کے ساتھ نہیں رہ

سکتی۔ میں ایک جھوٹے شخص کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔“

وہ زور سے چلائی۔ حسیب بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

”میں بنا ہوا شخص نہیں ہوں۔ اتنے دن میں تم نے کہاں میری محبت میں کمی دیکھی۔“

وہ جتنا گرم ہو رہی تھی۔ حسیب اتنا ہی دھیمّا پڑ رہا تھا۔

”کیا آپ چاہتے ہیں۔ میں وہ وقت بھی دیکھوں۔ اس کے بعد فیصلہ کروں۔“

”کیسا فیصلہ کیسی باتیں کر رہی ہو تم۔“

”میں آپ کے ساتھ نہیں رہوں گی مجھے پاکستان جانا ہے بس۔“

وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ بات کرنی مشکل ہو رہی تھی۔

”اس سے پہلے کہ آپ کی پہلی بیوی ہاں آئے اور مجھے دھکے دے کر نکالے۔“

”تم بہت جلد بازی میں فیصلہ کر رہی ہو۔ مجھے اپنی صفائی میں کچھ تو کہنے دو۔“

”مجھے کچھ نہیں سننا۔“ حسیب کا ہار اہوا انداز میں اس کے آنسو سکیوں میں بدل گئے۔

حسیب دکھ سے اسے روتے دیکھتا رہا پھر مرے مرے قدموں سے باہر چلا گیا۔



وہ بہت اسٹاک سے صبح کے لیے کپڑے پر لیں کر رہی تھی۔ حدید نے پیچھے سے آکر اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ

لیے۔

”حدید۔“ وہ سنجیدگی سے کہتی ہوئی کام میں لگی رہی۔

”اتنی چپ کیوں رہتی ہونا ملکہ۔“ وہ ہاتھ ہٹا کر اس کے سامنے آگیا۔

”نہیں تو۔“ وہ اس کی شرٹ ہنگ کر رہی تھی۔ صبح کا باسی اخبار کھولتے ہوئے حدید نے اس کے چہرے پر ایک

نظر ڈالی۔

”اچھا تو پھر مجھے ایسا کیوں لگتا ہے۔“

نائلہ کو بید پر بیٹھتے ہوئے الجھن نے گھیرا۔ وہ ایک فضول بات کر رہا تھا۔ بے معنی بے مقصد۔

”چتا نہیں۔ ہو سکتا ہے آپ کا وہم ہو۔“ وہ سونے کی تیاریوں میں تھی۔ اپنے دھیان میں اس نے دوپٹا سائیڈ

نیل پر اچھالا۔ پھر جیسے ہی پیچھے کی طرف ٹیک لگانے لگی۔ حدید نے اسے اپنے قریب کر لیا۔ نائلہ ایک دم سن سی

ہو گئی۔ ایسی بر جستگی کی امید جو نہیں تھی۔

”اگر یہ میرا وہم ہے تو دور کر دو ناں۔“ وہ بہت نرم نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

نائلہ نے بدقت تمام نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ آج بھی حدید سے اتنا ہی جھجکتی تھی۔ جتنا شادی سے

پہلے۔ اس کا چہرہ نائلہ کے بہت پاس تھا۔ اور وجود کی خوشبودار حرارت جو اس مختل کرنے کے لیے کافی تھی۔ ہو ہو وہی عین نقش وہی رنگت، آواز۔ انداز۔ اس کے دل میں کسی نے چٹکی لی۔  
”اگر ہو ہو اس جیسا مل گیا۔ تو وہ ہی کیوں نہیں۔“

حدید بہت غور سے اس کا چہرہ بڑھ رہا تھا۔ جہاں ایک دم ہی بے زاری کے تاثرات نمودار ہوئے۔ اگلے ہی پل وہ کسمسا کر اس کی گرفت سے نکل چکی تھی۔

”میں کیسے دور کروں بلا وجہ ہستی ہوئی تو اچھی نہیں لگوں گی۔“ وہ یونہی ڈرے تنگ سے کوئی کریم اٹھا کر لگانے لگی۔ حدید نے بطور خاص اس کا گریز ملاحظہ کیا۔

”نائلہ! میرے پاس آؤ۔“ اب کے اس کی آواز میں تحکم تھا۔

نائلہ کے ہاتھ ساکت ہو گئے لیکن اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

”آپ کو کوئی کام ہے تو۔۔۔ کہہ دیں۔“

”کام ہنسنے کے لیے ہی بلارہا ہوں۔“

اس نے لوشن کی بوتل بند کر کے میبل پر رکھی اور حدید کے پاس آگئی۔

”تم مجھ سے دور کیوں بھاگتی ہو نائلہ۔“ وہ اس کے قریب ہوتے ہوئے بولا۔

”کیا ناراضی ہے کوئی۔“ نائلہ سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔

”کتنے دن گزر گئے۔ تم سکون سے میرے پاس نہیں بیٹھیں۔“

اس کی آواز دھیمی ہو گئی۔ وہ حدید کی بات کا مقصد خوب سمجھ رہی تھی۔ اس کی گرم سانسیں نائلہ کے

رخساروں سے ٹکراتی اس کی وحشتوں میں اضافہ کر رہی تھیں۔ اسے حدید کی قربت سے اس لیے بھی گھبراہٹ

ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ بالکل اس جیسا تھا اور اس کل بھی اور آج بھی نائلہ کے دل کا مکیں تھا۔

اس نے حدید سے شادی ضرور کر لی تھی۔ مگر اب تک اسے قبول نہ کر پائی تھی۔

”حدید پلیز چھوڑ دیں مجھے۔“ اس نے زور سے حدید کے ہاتھ جھٹک دیے۔ وہ نا بھجی سے اسے دیکھنے لگا۔

”کیا ہوا۔ کیا میں نے کچھ غلط کیا۔“

نائلہ کا چہرہ پسینے سے تر ہو چکا تھا۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح پھل رہا تھا۔

”میرے پاس۔۔۔ مت آیا کریں۔۔۔ آپ۔“ الفاظ رک رک کر ٹوٹ کر اس کے لبوں سے نکلے۔

حدید کے چہرے پر بے یقینی چھا گئی۔

”کیا مطلب۔ کیوں۔“

”بس۔“ اس کی آنکھوں میں ایک ایسی آنسو ابھرے۔

”مجھے اچھا نہیں لگتا۔“

”اچھا نہیں لگتا۔“ اس نے حیرت سے اس کے الفاظ دہرائے۔

”کیا اچھا نہیں لگتا۔“

نائلہ نظریں پچی کیے بمشکل ضبط کر رہی تھی۔

”بولو۔“ اس نے نائلہ کی ٹھوڑی پر انگلیاں انکا کر چہرہ اپنی طرف گھمایا۔

”آپ مجھے چھو کمیں۔ یہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔“ بات مکمل کر کے وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

حدید منہ کھولے اس کے پیچھے تکتا رہ گیا۔

نہیں آنکھوں سے ناراض ہو کے دور جا بیٹھی تھی۔ داہنی طرف کروٹ لیٹے لیٹے اس کا پہلو دکھنے لگا تو اس نے کروٹ بدلی۔ اس کی چوڑی پشت اس کے سامنے تھی۔ اس کی حسرت زدہ نظریں اس پر ٹک گئیں۔ کتنے دن گزر گئے تھے۔ اس نے سوہا کی طرف سے کروٹ بدل کر سونا شروع کر دیا تھا۔ اسے تو یہ بھی یاد نہ تھا کہ آخری بار اس نے محبت سے کب دیکھا تھا۔ اس کی اپنی حالت ایسی تھی کہ ایک عجیب سی بے زاری اور اکٹاہٹ ہمہ وقت وجود پر چھائی رہتی تھی۔

ابتدائی دنوں میں خوش خبری ملنے پر جو ایک سائنسٹ انس نے دکھائی تھی۔ وہ رفتہ رفتہ کم ہوتے ہوئے اب بالکل ختم ہو گئی تھی۔ یا نہ ہونے کے برابر۔

تین دن سے وہ ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے کہہ رہی تھی اور انس مسلسل ٹال رہا تھا۔ اوپر سے اس کے آفس میں اس کے ساتھ ہونے والی زیادتی۔ مگر کیا ضروری تھا کہ وہ خود سے ہوئی نا انصافی کا سارا غصہ سوہا کے وجود پر اتارتا۔ وہ بھی ناملہ جیسی عورت کو اس پر فوقیت دے کر۔

ناملہ جس نے زندگی میں شادی ہی کبھی ماہا اور خود اس کے ساتھ سیدھے منہ بات کی ہو یا ان دنوں بہنوں کو کبھی درخور اعتنا جانا ہو۔

وہ ناملہ آج اس کے گھر کی بھارت کل بنی بیٹھی تھی۔

تینوں ٹائم کے کھانے کی ذمہ داری اس نے سوہا کی طبیعت کو بہانہ بنا کر اپنے ذمہ لے لی تھی۔ دن میں دونوں وقت کا کھانا اس کی مرضی اور پسند کا بنتا۔ سوہا اگر کچھ کھانا چاہتی تو وہ اپنی مرضی سے پکا کر کھا سکتی تھی۔ یہ آسان اختیار بھی ناملہ نے اسے کمال مہربانی سے دے دیا تھا۔

سوہا اس سے یہ سوال بھی نہ کر سکی کہ کیا اس کی اتنی مرضی بھی نہیں چل سکتی کہ ایک ٹائم کا کھانا اس کی مرضی اور پسند کا بن جائے اور سب وہی کھالیں۔ ایک دوبار اس نے ناملہ سے کہنے کی کوشش کی تو اس کی رائے کو ناملہ نے سرے سے رد کر دیا اور اگر اس وقت سامنے ہوتا تو سب سے زیادہ ناملہ کی ہاں میں ہاں ملائے والا بھی وہی ہوتا۔

بعد میں سوہا نے ایسا کوئی بھی ارادہ ترک کر دیا۔

اسے آج کل چائینز اور ملے مسالوں والے کھانے اچھے لگتے تھے۔ سوہا اپنے لیے وہی پکانے لگی۔ مگر انس کو اس کی یہ بات بھی پسند نہیں آتی۔ نہ اس کے ہاتھ کے بنے چائینز کھانے۔ ایک دوبار کے بعد ہی اس نے سوہا سے کہہ دیا تھا کہ وہ سوہا کے بجائے ناملہ کے ہاتھ کا بنا کھانا زیادہ پسند کرے گا۔ ناملہ نے فوراً "بخوشی ذمہ داری سنبھال لی۔"

بظاہر تو اب بھی سب کچھ ٹھیک ہی تھا۔ وہ انس کے آنے کے بعد اس کے ساتھ ہی کھانا کھاتی تھی۔ بلکہ انس کے زیادہ تر کام بھی وہی نمٹاتی۔ صفائی ستھرائی اور برتنوں کی دھلائی کے کام بھی بٹے ہوئے تھے اور دونوں ہی اپنے وقت پر بہ حسن و خوبی اپنے کام انجام دیتی تھیں۔ مگر پھر بھی کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی دراڑ ضرور تھی۔ جو اس کے اور انس کے درمیان کسی اور کو محسوس ہونہ ہو۔ مگر سوہا کو ضرور دکھائی دینے لگی تھی۔ اور اس دراڑ کے پار سے جھانکتا ناملہ کا چہرہ اسے اس سے بدزن اور خوفزدہ کرنے کے لیے کافی تھا۔

بظاہر کچھ نہ ہونے کے باوجود وہ پورے گھر پر چھائی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی۔ اسے بھی اور شاید انس کو بھی۔

رات دھیرے دھیرے اپنا سفر تمام کر رہی تھی۔ اس کا تکیہ کتنی ہی دیر آنسوؤں سے بھیگتا رہا۔ گھٹی گھٹی ہچکیاں دبی دبی سسکیاں۔ انس کی بے اعتنائی کا نام لے لے کر فضا میں بکھرتی رہیں اور وہ بے خبر دشمن جاں اس کی حالت

زار سے بے خبر، محو خواب رہا۔

وہ تاملہ اور اپنا۔ انس سے شاوی سے پہلے اور شاوی کے بعد کے رویے کا موازنہ کرتی رہی۔ اور روتی رہی۔



گرم چائے ٹھنڈی ہو کر بد رنگ ہو چکی تھی۔ تو اس آملیٹ، جیم، مکھن، ناشتے کے سارے لوازمات یونہی سامنے میز پر دھرے تھے۔ جیسے حسیب چھوڑ کر گیا تھا۔ خود اس سے بھی، ان تکلیف دہ ساعتوں کے بعد کچھ کھانا پینا مشکل تھا۔

ماہا کو اس کی کل تک کی محبت اور پروا، آج ایک ڈھکوسلے اور دکھاوے سے زیادہ کچھ نہیں لگ رہی تھی۔ سارا دن ایک گلاس جوس کے علاوہ ایک دانہ تک اس کے منہ میں نہیں گیا تھا۔

دیار غیر میں آج تنہائی کا احساس حد سے سوا تھا اور اوپر سے یہ دکھ کا پہاڑ جس جیون سا تھی کو اپنا سب کچھ جان کر اپنا سب کچھ چھوڑ کر اس کے پیچھے چلی آئی تھی۔ یہاں اور دوسرے بھی اس کے چاہنے والے تھے۔

”بھلا میری کیا ضرورت تھی۔“ ایک نوے کانچ جیسی چھین لیے سوچ اس کے دل میں پیوست تھی۔ اور لہو قطرہ قطرہ نمی بن کر آنکھوں سے بہ نکلتا تھا۔ صبح سے دوپہر، دوپہر سے شام اور پھر رات ہو گئی۔

دھیرے دھیرے سرتی رات اگر اس سے پہلے کبھی حسیب کی غیر موجودگی میں سے پر اپنے قدم وھرتی تو وہ حسیب کو فون کر کر کے پاگل کر دیتی تھی۔ آج جیسے کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔ خیال تھا تو بس اپنی گم ہائیلی کا اور اس جھوٹ کا۔ جس کا پول بہت بھونڈے انداز میں مگر بہت جلدی اس پر کھل گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس سے اپنا دکھ کہے۔

ماں سے۔ جو اسے پردیس بھیج کر مسلسل اس کی خوشیوں کے لیے دعا گو تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ انہیں کب کی نظر لگ چکی۔ یا اپنی بہن سے۔ ایک دن وہ آپسے ہی ازدواجی زندگی کے پر تین راستوں پر قدم جمانے کی کوششوں میں ناکام ہو رہی تھی ماہا سے سوہا کی کوئی بات اور کوئی جذبات چھپے ہوئے نہ تھے۔ انس کے حوالے سے سوہا کے دل پر جو بھی بوجھ تھا وہ صرف ماہا کے سامنے ہی ہلکا کیا جاسکتا تھا۔ اور ماہا کے پاس تو اس جیسا کوئی سامع بھی نہ تھا۔

شام کو آفس سے واپسی پر حسیب کے ہاتھ میں اس کے لیے گجرے تھے۔ ماہا نے تھامتے ہوئے حیرت سے اسے دیکھا۔ اس نے نگاہیں چرائیں۔ اس نے گجرے بے دلی سے ڈرینگ پر ڈال دیے اور خود اس کے لیے چائے بنانے کچن میں چلی آئی۔

کل تک یہاں اس گھر میں حسیب کی آمد کے ساتھ ہی اس کی ہنسی کی چکاریں گونجنے لگتی تھیں۔ مگر آج اس نے پلٹ کر لاؤنج میں بیٹھے حسیب کو دیکھا۔ اس کا دل بھر آیا۔ وہ کتنا مطمئن دکھائی دیتا تھا۔ مگر اصل میں تھا نہیں اس کی نظریں نیوی پر اور سوچیں کہیں اور بھٹک رہی تھیں۔

”کیا مجھے ان کو صفائی دینے کا موقع دینا چاہیے۔“ اس نے خود سے پوچھا۔

”شاید ہاں۔“ دل مضطرب میں اب کوئی کیفیت یقینی نہیں تھی۔ وہ چائے اس کے سامنے رکھ کر پیپ چاپ وہیں بیٹھ گئی۔ حسیب نے نیوی بند کر کے اس کو دیکھا۔

”میری فلائٹ کب کی ہے پاکستان کی۔“ حسیب نے اس کی بات پر ایک گہری سانس لی۔

”تم نے بالکل حتمی فیصلہ کر لیا ہے کہ تم ضرور جاؤ گی۔“

”یہاں رہنے کا کوئی جواز بھی تو نہیں۔“

”مجھ سے بڑا کوئی جواز ہو سکتا ہے۔“

”نہیں۔ آپ یہاں آنے کی سب سے بڑی وجہ تھے اور اب آپ ہی یہاں سے جانے کا واحد اور سب سے

مضبوط جواز ہیں۔“

وہ بے تاثر لہجے میں کہہ کر اپنے ناخن کھرپنے لگی۔

”میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“ اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”تم جانا چاہتی ہو تو بے شک چلی جاؤ۔ مگر میری محبت کو جھوٹ مت سمجھو۔ میں اپنے آپ کو بے قصور تو نہیں

کہوں گا۔ مگر میرا تم سے جھوٹ بولنے یا یہ سب چھپانے کا مقصد تمہیں کوئی دھوکا دینا نہیں تھا۔“

ماہا اسے دیکھتی رہی۔ وہ یوں متذبذب تھا جیسے ابھی مزید کچھ کہنا چاہتا ہے۔

”اب سے قریباً دو سال پہلے میں نے ایک پرنس نیشنل پاکستانی لڑکی کو شادی کے لیے پسند کیا تھا۔ اسے پرپوز

بھی کر دیا تھا۔ اور وہ شادی کے لیے راضی بھی تھی مگر جب اسے ولید کے بارے میں پتا چلا تو وہ۔۔۔ مجھے چھوڑ کر

چلی گئی۔“ ماہا حیرت اور دھڑکے سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

وہ اپنے آپ کو حسیب کی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی سمجھتی تھی مگر پہلے تو کیا وہ تو دوسری بھی نہیں تھی۔ پتا

نہیں تیسری بھی تھی یا۔۔۔ اس کا کون ساواں نمبر تھا۔

”مجھے صرف یہی ڈر تھا کہ اگر تمہیں اس بارے میں پتا چلا تو کہیں تم بھی مجھے۔“ اس نے بات ادھوری چھوڑ

کر سر جھکا لیا۔

”اس لیے آپ نے سوچا کہ مجھے سرے سے لاعلم رکھا جائے۔“

”میں نے سوچا تھا مناسب وقت آنے پر تمہیں بتا دوں گا۔“ وہ جلدی سے بول اٹھا۔

”کون سا مناسب وقت؟ جب اتنی دیر ہو جاتی کہ کسی مجبوری کی زنجیریں میرے پیروں میں پڑی ہوتیں اور میں

بے بسی سے۔۔۔“

”جب میری محبت پر اعتماد تمہارے ایمان کی حدوں کو چھو چکا ہو ما اور تمہارے پیروں میں کسی مجبوری کی زنجیر

نہیں بلکہ تمہارے دل پر میری محبت کی حکمرانی ہوتی۔“

حسیب کا لہجہ لوہے اٹھا مگر ماہا کے لیے اب یہ سب باتیں بے کار تھیں۔

”بہر حال مجھے جلدی پتا چل گیا اچھا ہوا۔ آپ کل ہی میری سیٹ کنفرم کرادیں۔“ چند لمحوں کی خاموشی کے

بعد وہ بولی تو اس کا گلہ رندہ گیا۔ اور وہ تیزی سے اٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔

حسیب اپنی ہتھیلیوں کی خالی لکیوں کو کھونسنے لگا۔

نادانی کی عمر میں فقط ایک قدم بھٹک گیا تھا۔ مگر اسے اندازہ نہ تھا کہ یہ ایک بھٹکا ہوا قدم اسے مستقبل میں کن

اندھیروں میں لے جانے والا ہے۔

”فقط چند لمحوں کی گمراہی کیا زندگی بھر مجھے منزل کی تلاش میں بھٹکائے گی۔“

اسے ایک بے نام سی ٹھکن پورے وجود میں سرایت کرتی محسوس ہو رہی تھی۔



”رات میں جلدی آجائے گا۔ ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔“

انس کے عجیب سے لا تعلق رویے کو دیکھتے ہوئے اس کے لہجے میں خود بخود خفگی جھلکنے لگی تھی۔

”میں نہیں آسکتا۔“

”تو میں کیا کروں۔“ انس نے آئینے میں ایک نظراے دیکھا۔

”تم نائلہ کے ساتھ چلی جانا۔“

”میں نائلہ کی ذمہ داری نہیں ہوں۔“ اس کا حلق کڑوا ہو گیا۔

”تو ایسا کرنا اگر حدید جلدی آجائے تو۔“

”میرے شوہر آپ ہیں۔ حدید نہیں۔“

انس نے بے زاری سے ہینڈ برش ڈرائنگ ٹیبل پر پھینک دیا۔

”کیا بکو اس ہے یہ۔“

”یہ بکو اس نہیں۔ آپ کی زندگی کی وہ حقیقت ہے۔ جس پر شاید آپ کچھ تار ہے ہیں۔“

”میں کیوں کچھتاؤں گا۔“ اسے اچھٹھا ہوا۔ سوہا کی بات پر۔

”یہ تو آپ اپنے دل سے پوچھئے۔“

”انکشاف تو تم نے کیا ہے۔“ وہ جرابیں پہننے لگا۔

”تو غلط تو نہیں ہے نا۔“

سوہا نے بغور اس کی مصروفیت ملاحظہ کی۔ وہ بحث ضرور کر رہا تھا مگر۔ صرف وقت گزاری کے لیے۔

”سوہا تم جانتی ہو میں آج کل کتنا پریشان ہوں۔“ وہ شوژ پہن کر کھڑا ہو گیا۔

”آپ بھی جانتے ہیں جس فیز میں میں گزر رہی ہوں۔“

”یہ فیز تمہارے لیے پریشان کن بہر حال نہیں ہونا چاہیے مگر آج کل آفس میں۔“ اس کا لہجہ مصالحانہ تھا۔

”آفس، آفس، آفس۔ میں تنگ آئی ہوں آفس کی اس گردان سے۔ آفس میں ٹینشن ہے تو اس کا یہ مطلب

نہیں کہ آپ وہ ٹینشن اٹھا کر گھر لے آئیں۔“

”گھر میں بھلا کیا ٹینشن ہے تمہیں۔ بلکہ جتنے ٹھانڈے سے تم رہ رہی ہو۔ لڑکیاں تو خواب دیکھتی ہیں ایسے سسرال

کے جہاں ہل کر پانی بھی نہ پینا پڑے۔“ اس نے بڑے سکون سے سوہا کا سکون تہہ و بالا کیا۔

”تو آپ کے خیال میں میں سارا دن ایسے ہی پڑی رہتی ہوں۔ کوئی کام و ام نہیں کرتی جو آپ ایسے کہہ رہے

ہیں۔“

”کم سے کم مجھے تو یہی دکھتا ہے۔“

وہ اپنے تئیں بات سمیٹ کر باہر نکلا۔ سوہا تیزی سے اس کے پیچھے لپکی۔

”بہتر ہو گا اپنی آنکھوں کا علاج کروالیں آپ۔“

اسے دنیا کا مشکل ترین کام لگا تھا کہ انس کو زبردستی روک کر دن بھر کے کاموں کی تفصیل اسے سنائے بلکہ

جتائے۔

یہ حرکت تو اس سے تب بھی نہیں ہوئی تھی۔ جب امی ماہا کی طرف داری کرتے ہوئے اسے ڈانٹ رہی تھیں۔

حالانکہ وہ تو قریب ترین اور سگے رشتے تھے۔ لیکن اس نے ساری زندگی ہی مل بانٹ کر کام کیا تھا۔ مگر نہ تو کبھی کسی

کا کریڈٹ زبردستی خود لینے کی کوشش کی نہ کبھی اپنی محنت کا میڈل کسی اور کو گلے میں پہنتے دیکھا تھا۔

یہ الٹ پھیر تو زندگی میں پہلی بار ہی ہو رہا تھا۔ لہذا کٹس کر صرف یہی کہہ سکی۔ وہ مڑ کر اسے گھورتا ہوا

سیر دھیاں اتر گیا۔



# Italiano<sup>®</sup>

Permanent Hair Colour Cream

*Colour Your  
Life*

*Es. La Gupta*

- ✓ Gives strength to hair
- ✓ Soft and glossy hair
- ✓ Even coverage
- ✓ No greys



Itali Ita Italic Ita Italiano Italiano no no no no

**Nourishment for Hair With Silk Protein, Vitamin E & Hair Conditioner**

\*Available in **10** Different Shades



ماہا کا فون تھا۔ سوہا کو سن کر حیرت نے آگھیرا۔ لیکن اس حیرت کے پیچھے سے خوشگواریت کے بجائے تشویش بھانک رہی تھی۔  
 ”خیریت تو ہے۔“

”خیریت نہیں ہے سوہا۔ میں پاکستان آگئی ہوں۔“

”کیا۔“ سوہا کے پیٹ میں درد کے گولے اٹھنے لگے۔ کیوں کا سوال بے آواز لبوں کی پھڑپھڑاہٹ میں دب گیا۔  
 ”اتنی جلدی۔“

وہ کیوں آگئی پاکستان کس لیے آئی ہے اور۔۔۔ اور کیا اکیلی؟ وہ بے جان لائن سے ٹوں ٹوں کی آواز بے دھیانی میں سن رہی تھی اور ٹھنڈے سینے اس کا وجود بھگور رہے تھے۔  
 دوپہر کے قریب امی کا فون آیا۔

”سوہا بیٹا۔ ماہا گھر آگئی ہے۔“

”جی امی۔ کچھ بتایا اس نے۔ ایسے کیسے آگئی اتنی اچانک۔ بغیر کسی پیشگی اطلاع کے۔“

اس کے دل کو پہلے ہی پنکھے لگے ہوئے تھے۔ اس نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

”ارے نہیں کیا خاک بتایا بس ہستے ہستے مل کر رو دی اور کہنے لگی کہ بہت یاد آرہی تھی تو“ سر پر انزوے دیا۔“

امی از حد پریشانی کے عالم میں بتا رہی تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ انہیں ماہا کی بات پر رتی برابر یقین نہیں آیا ہے۔

”میری بات کرو امیں اس سے کیا انس یا حدید بھائی میں سے کسی کو بتایا آپ نے۔“

”نہیں ابھی نہیں بتایا اور وہ تو نہادھو کر سونے چلی گئی۔ دروازہ بند ہے۔ اب اٹھے گی تو پوچھوں گی۔“ انہیں اس کا سامان دیکھ دیکھ کر ہول اٹھ رہے تھے۔

”آپ حوصلہ کریں امی سب خیریت ہی ہوگی۔“ اسے خود اپنے لفظوں کے کھوکھلے پن کا اندازہ تھا۔

”ارے کیا خاک حوصلہ کروں۔ وہی کوئی یہاں رکھا ہے دوسری گلی میں۔ ٹکٹ ویزے کی مصیبتیں اور ابھی تو

گئی تھی۔ مشکل سے مہینہ گزارا ہوگا۔ حسیب کو فون کروں؟ اس نے بھیج کیسے دیا اتنی دور اکیلے۔“ کوئی ایک فکر ان کی جان کو لاحق تھی۔

سوہا کا دل چاہا ماہا کو جا کر جھنجھوٹ ڈالے۔ جبکہ وہ بند کمرے میں سرخ آنکھوں سے مسیج لکھ رہی تھی۔

”امی کو ساری بات کا کچھ علم نہیں اور علم ہونا بھی نہیں چاہیے۔ فی الحال میں کسی کو پریشان نہیں کرنا

چاہتی۔“ مسیج سینڈ کر کے موبائل پھینک کر وہ گھٹی گھٹی آواز میں سسک اٹھی۔



انس اور حدید رات میں دونوں ہی دیر سے واپس آئے۔ نائٹ سوئے کے لیے جا چکی تھی۔ سوہا نے اسے ماہا کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ البتہ وہ خود جلتے پیر کی ملی بنی پورے گھر میں گھومتی رہی۔ اسے کسی مل قرار نہ تھا۔ جانے کس خدشے کی بے چینی اس کی رگ دے میں اودھم مچا رہی تھی کہ اس سے سکون سے بیٹھنا محال تھا۔ اس پر اسے انس کا چند لفظی مسیج ملا کہ وہ اور حدید گھر جا رہے ہیں۔ واپسی میں دیر ہو جائے گی۔

اس کے بعد اس نے کتنی ہی دفعہ دونوں کے موبائل پر بار بار کال ٹرائی کی۔ مگر نبل جاتی رہی اور کسی نے ریسیو نہیں کیا۔ اس کے دل کو پنکھے لگے ہوئے تھے۔ رات کو ساڑھے گیارہ بجے کے قریب دروازہ کھلا۔ وہ جیسے اڑتی ہوئی صحن پار کر کے ان تک پہنچی تھی اور دونوں کے سنجیدہ اور کس حد تک اترے ہوئے چہرے دیکھ کر دھک سے رہ گئی۔ باری باری دونوں نے اپنی بائیک اندر رکھڑی کیں۔

”کھانا لاؤں۔“ اپنا سوال اسے خود بھی بے تکالفا۔  
 جدید جواب دیے بغیر کمرے میں چلا گیا۔ وہ سوالیہ نظروں سے انس کا چہرہ کھوجتی، اس کے قدموں کے نشان پر  
 پیر رکھتی کمرے میں آئی تھی۔ صبح سے دل میں جو پکڑدھکڑ ہو رہی تھی۔ اس کا ماخذ یقیناً ”کوئی بری خبر تھی۔“  
 ”یا اللہ خیر!“ اس کے دل سے بے آواز صدا نکلی۔

”پتا تو چل گیا ہو گا تمہیں۔ ماہا بالکل اچانک ہی آج صبح پاکستان پہنچی ہے۔“  
 ”جی۔“ اس نے یوں مجرمانہ انداز میں سر جھکایا جیسے اس میں اسی کا قصور ہو۔  
 ”وہ کہہ رہی ہے کہ حبیب۔۔؟“

وہ چند لمحے رکا۔ گویا سوہا کی سانسیں بھی رک گئیں۔  
 ”حبیب نے وہاں شادی کر رکھی ہے۔ اور اس کا ایک بیٹا بھی ہے۔“  
 سوہا نے بے ساختہ لبوں پر ہاتھ رکھ کر اپنی چیخ کو دبایا۔  
 ”کیا۔۔۔ سچ ہے۔“

وہ بے یقین نظروں سے ’سرہاتھوں میں گرائے انس کو دیکھ رہی تھی۔  
 ”انس بتا میں نا۔ یہ سچ ہے کیا۔“ اس نے اس کا کندھا ہلایا۔ اس نے سر اٹھا کے سوہا کی ڈبڈباتی ہوئی آنکھیں  
 دیکھیں۔  
 ”پتا نہیں۔“

اس نے دونوں بازو کھول کر سوہا کو سمیٹ لیا۔ وہ بے قراری سے اس کے سینے سے لگ کر رو پڑی۔  
 انس اس کا سر سہلاتے ہوئے دیکھی دل سے سوچ رہا تھا کہ ’حبیب نے انہیں اندھیرے میں رکھا۔ کیوں۔  
 اسے یہ دھوکا دی کر کے کیا ملا۔“



انس نے وہی فون کر کے حبیب سے بات کرنے کی کوشش کی۔ مگر اسے سخت مایوسی ہوئی۔ حبیب نے اس  
 سے ’اس موضوع پر کوئی بھی بات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔  
 ”دیکھو میں مانتا ہوں غلطی میری ہے۔ مجھے یہ بات چھپانی نہیں چاہیے تھی۔ ایٹلیسٹ ماہا ہے۔“ اس نے  
 ایک گہری سانس لی تھی۔

گویا خبر کے غلط ہونے کا جو ننھا منسا امکان تھا۔ وہ بھی جل بجھا۔  
 ”مگر اب جبکہ ماہا کو سب پتا چل ہی چکا ہے۔ تو ماہا کو چاہیے تھا کہ وہ ہمیں رہ کر اس غلط فہمی کو دور کرنے کی  
 کوشش کرٹی جو میرے لیے اس کے دل میں جڑ پکڑ چکی ہے۔ مگر یا۔۔۔“ حبیب تھوڑا رک گیا۔  
 ”اے ہم دونوں کے معاملے کو ہاٹ ایشو بنانے سے پہلے یہ تو سوچنا چاہیے تھا کہ اس طرح بات بننے کے  
 بجائے بگڑ بھی سکتی ہے۔“

”حبیب پلیز۔ غلطی تمہاری ہے اسے ایکسپٹ کرو۔“ انس نے ایک دم سنجیدگی سے اسے ٹوکا۔  
 ”میں کرتا رہا ہوں۔ میرے بات چھپانے سے نقصان صرف ماہا کا ہوا ہے۔ میں صرف اسے وضاحت دینے کا  
 پابند ہوں۔ ساری دنیا کو نہیں۔“

”ساری دنیا تم سے کوئی وضاحت نہیں مانگ رہی۔“ اس نے مصالحانہ انداز اختیار کیا۔  
 ”مگر جس طرح سے وہ آئی ہے۔ اس کے گھر میں صرف اس کی والدہ ہیں۔ کوئی مرد گھر میں نہیں ہے۔ اس لحاظ

سے ان کی پریشانی ایک فطری عمل ہے۔“

”میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں۔ اتنے سارے لوگوں کو پریشان کرنے کے بجائے اگر وہ یہیں معاملہ کلیئر کر لیتی تو شاید اب تم کو مجھ سے اس طرح بات نہیں کرنی پڑتی۔“

”آئی ایم سوری۔ وہ میرے لیے بہنوں جیسی ہے اور میں۔“

”اگر وہ تمہارے لیے بہنوں جیسی ہے تو پلیز اس سے اصرار کرو کہ ایک بات میری بات سن لے۔“ انس چند لمحے سوچتا رہا۔

”ٹھیک ہے میں پھر بات کروں گا اس سے بھی اور تم سے بھی۔“

”بہتر ہو گا کہ ماہا مجھ سے پہلے بات کرے۔ باقی سب تو پھر بعد کی باتیں ہیں۔“ حسیب نے ڈھکے چھپے الفاظ میں جتا دیا کہ اس معاملے میں ماہا کے علاوہ کسی کی سننے کو تیار نہیں۔

انس فون بند کر کے گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

حسیب کی ذات اور اس کے مزاج کا ایک بالکل نیا پہلو اس پر منکشف ہو رہا تھا۔



حدید نے نائلہ کے قریب جانے کی دوبارہ کوشش نہیں کی۔ نائلہ کی بات نے اس کا دل بہت دکھایا تھا۔ وہ اس کے گریز کی وجہ سے لاعلم ہی تھا۔ اور اسے جاننے سے قاصر بھی۔ مگر جب تک لاعلم تھا تب تک خیر تھی۔ مگر جب اسے وجہ کا علم ہو جاتا تو اسے جاننے کے بعد وہ جس کرب و اذیت سے گزرتا۔ اس کے لیے دکھ بڑا معمولی لفظ ہوتا۔ ابھی تو وہ یہ بات از خود فرض کیے بیٹھا تھا کہ شاید نائلہ نے اپنے اور اس کے تعلق کو دل سے قبول نہیں کیا۔ اسے قبول کرنے کے لیے تھوڑا وقت درکار ہے۔ جب نائلہ اس رشتے کو دل سے قبول کر لے گی تو خود ہی اس کی طرف قدم بڑھا دے گی۔ وہ بہت صبر سے اس وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ جب نائلہ خود اس سے اپنی محبت کا اقرار کرتی اور نائلہ کا معاملہ بالکل ہی الگ نکلا۔

اس کے دل و دماغ میں حدید کی شرافت اور خاموشی کو دیکھتے ہوئے کچھ اور ہی شیطانی منصوبے بالا ہی بالا تشکیل پانے لگے تھے۔ جن پر وہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑی کامیابی کے ساتھ عمل پیرا تھی۔

انس واضح طور پر تو نہیں مگر ڈھکے چھپے انداز میں اکثر سوہا کی ست طبیعت سے بے زاری کا اظہار کر جاتا تھا۔ نائلہ کو انتظار تھا کہ جب بے زاری پہلے کھل کر سامنے آتی اور پھر اس کے بعد نفرت میں بدل جاتی۔ تب سوہا کو انس کی زندگی سے نکال باہر کرنا بہت آسان ہوتا۔ لیکن ایسا کرنے کے لیے اس کے پاس وقت بہت کم تھا۔

خود چاہے وہ حدید سے الگ ہو کر انس کی بنیاتی یا نہیں لیکن سوہا اور انس کو ضرور جدا کر دینا چاہتی تھی۔ ایسا کر کے وہ اپنے تئیں انس سے خود کو ٹھکرانے کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ کیونکہ اسے لگتا تھا انس اور سوہا کو ایک دوسرے سے جدا کر کے وہ اسی طرح تنہا کر دے گی۔ جس طرح اس نے تنہائی کا عذاب بھگتا۔ اور اس عذاب سے جان بچانے کے لیے ایک تھرڈ کلاس شخص سے دھوکا کھایا اور پھر ایک ایسے آدمی کی زندگی میں جاہتے ہوئے داخل ہونا پڑا۔ جس کے بارے میں اس نے بھی نہیں سوچا تھا۔



موسم کی مزاج میں حدت آتی جا رہی تھی۔

صبح سورج چڑھتے وقت بلا کی تپش ہوتی۔ پھر کہیں شام ڈھلتے ڈھلتے ٹھنڈی ہوا چلتی تو وہ صحن میں کرسی ڈال کر بیٹھتی تو وہیں مغرب اور پھر عشا کر دیتی۔ سوچوں کا ایک نہ رکنے والا تسلسل اور یادوں کا نہ رکنے والا دھارا اس کی

نکا ہوں کے سامنے بہتا رہتا۔  
 امی آتے جاتے اسے دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہتیں۔  
 وہ گھر کے کاموں میں ذرہ برابر ہاتھ نہیں بٹاتی تھی۔ بس خاموش بیٹھ کر خلاؤں میں گھورتی رہتی یا روتی رہتی۔  
 شروع میں انہوں نے بات کرنے کی کوشش کی تو اس نے ایسی چپ سادھ لی۔ جولاکھ سر پٹخنے پر بھی نہ ٹوٹی۔  
 پہلے دن اچانک آکر اس نے ان کے سر پر جو قیامت توڑی تھی۔ اس کے بعد اس کے اپنے وجود پر موت کا سا  
 سناٹا طاری تھا۔ وہ خود بھی کسی دکھ کے ماتم کے زیر اثر تھی۔ ابھی بھی اس کے سامنے رکھی چائے ٹھنڈی برف ہو  
 چکی تھی اور یہ روز کا معمول بن گیا تھا۔  
 امی نماز پڑھ کر کمرے سے نکلیں تو ایک نظر ڈال کر کچھ کہنا چاہا پھر سر جھٹک کر پکچن میں چلی گئیں۔ اس نے کھٹکے  
 پر سر اٹھایا۔ اوپر ہی سیڑھی پر عفت کھڑی تھی۔ امی کو سلام کر کے وہ اس کی طرف آگئی۔  
 ”کیسی ہو ماہا!“

وہ خود بھی ہر وقت ہنستی مسکراتی نہیں رہتی تھی۔ مگر اس وقت اس نے خود کو ماہا سے بہتر حالت میں محسوس کیا۔  
 اس کی اپنی آنکھوں میں بہر حال اتنے گہرے حلقے نہیں تھے کہ پچھلے رتے جگموں کی گواہی دے سکیں۔  
 ”ٹھیک ہوں۔“ ماہا نے پیڑھی زدہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر مسکراتے کی ناکام کوشش کی۔  
 ”مگر تم کیسی ہو۔“

”میں بھی۔“ اس کا حال خود کو سا ماہا سے جدا تھا۔  
 دل کی نگری تو دونوں کی ہی اجڑ چکی تھی۔ ترق صرف یہ تھا کہ ماہا اس کا کھل کر اظہار کر سکتی تھی اور کر رہی  
 تھی۔ اور عفت تو اپنے اوپر کسی حادثے کے گزرنے کا پتا بھی نہیں دے سکتی تھی۔  
 ”تم کبھی نیچے ہی آجایا کرو۔ سارا دن اکیلی بورہوتی ہوگی۔“

اس کی آواز میں کوئی تاثر نہ تھا۔ بس یونہی جیسے بہت سوچ بچار کے بعد ہی بات سمجھ آئی کرنے کے لیے۔  
 ”تم آجایا کرو ناں اوپر۔“ ماہا نے جیسے ادھار دکایا اور پھر دونوں خاموش ہو بیٹھیں۔ اپنے اپنے دھیان میں گم۔  
 اپنی اپنی گتھیوں کو لے کر سلجھانے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی۔ پھر عشاء کا وقت ہوا تو وہ جس طرح اوپر آئی تھی۔  
 اسی طرح خاموشی سے اٹھ کر نیچے چلی گئی۔ نہ اس نے امی سے کلام کیا۔ نہ ماہا ہی سے کچھ بولی۔  
 امی نے جویوں خاموشی سے ڈھیلے ڈھالے انداز میں اسے دیکھا تو انہیں برا محسوس ہوا۔ جانے کیوں گھر  
 کی تینوں لڑکیوں کے گھر بس جانے کے بعد انہیں عفت سے خود بخود ہمدردی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ وضو کرنے  
 کا ارادہ ملتوی کر کے بگڑے ہوئے تیور لیے اس کے سر پر آموجود ہوئیں۔  
 ”ماہا! میں پوچھتی ہوں ایسا کب تک چلے گا۔“ ماہا ایک دم گڑبڑا سی گئی۔  
 ”پتا نہیں۔“

”کیا پتا نہیں۔ تم حسب سے بات کیوں نہیں کر لیتیں۔“  
 ”کیا بات کروں میں سمجھ میں نہیں آتا۔“ وہ واقعی ابھی ہوئی تھی۔ امی کو اس پر ترس آگیا۔  
 ”اس سے پوچھو تو سہی کچھ۔“ وہ کرسی پر بیٹھ گئیں۔  
 ”کیا پوچھوں۔“ وہ النان ہی سے پوچھنے لگی۔  
 ”یہی کہ اس نے یہ بات چھپائی کیوں کہ وہ شادی شدہ اور ایک بچے کا باپ ہے۔“ اسے بولنے پر آمادہ دیکھ کر وہ  
 ایک دم مستعدی ہو گئیں۔  
 ”اب یہ پوچھنے کا کیا فائدہ۔ پتا تو چل ہی گیا ناں۔“ وہ ابھی ابھی سی تھی۔

”تو پھر یہ پوچھو کہ آگے کا ارادہ کیا ہے۔ اسے طلاق دے گا یا دو کشتیوں کا سوار رہے گا۔“  
 ”قطعاً نہیں۔ میں کبھی ان کی پہلی بیوی کی موجودگی میں ان کے پاس نہیں جاؤں گی۔“ وہ تنگ گئی۔  
 ”تو پھر۔“

”ڈائورس دیں اس کو۔“

”اور نہ دے پھر۔“ امی کے خدشے میں برسوں کا تجربہ بول رہا تھا۔

”تو پھر مجھے دیں۔“ بمشکل اس کے لبوں سے نکلا۔

”کیا بک رہی ہو۔ ہوش میں ہو۔“ امی تڑپ ہی تو گئیں۔

ابھی دن ہی کتنے ہوئے تھے اسے باعزت طریقے سے دہلیز پار کیے ہوئے اور اب وہ اتنی جلدی واپس آکر

مستقل انہیں ہولارہی تھی اور آج اس کی یہ بات۔ وہ اچانک ہی منہ پر دوپٹا ڈال کر رو پڑیں۔

”خدا کا واسطہ ہے تجھے ماہا۔ رحم کر میرے حال پر۔“ ماہا بری طرح گھبرا گئی۔

”ای! ای! رو میں تو مت۔“

”روؤں نہیں تو اور کیا کروں۔ ساری زندگی دو بیٹیوں کا بوجھ سل کی طرح سینے پر اٹھا کر مرو کے بغیر زندگی پھونکی

ہے۔ اب اس عمر میں اگر مٹی رو لے گی میری۔“

ان کی بھرائی ہوئی آواز اور رندھا ہوا گلا اسے بے حد دکھ سے ہمکنار کر گیا۔ اور اس رات کئی راتیں گزارنے

کے بعد ایسا ہوا تھا کہ حیدب کی کال آئی تو وہ بنا سننے ڈس کنکٹ نہیں کر سکی۔



نائلہ آئی بیٹھی تھی۔

اماں اس کے لیے خاص طور پر کھڑے مسالے کا بھنا بھنا سالن عفت سے پکوا رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر ابا کے

پاس بیٹھی خیر خیریت پوچھتی رہی۔

”اب تو تیری ماں جاتی ہے میرے ساتھ ہسپتال، دو گھنٹے لگ جاتے ہیں فارغ ہوتے ہوتے۔“

ابا کی وہی باتیں تھیں۔ بے ضرر، بے بسی اور محبت سے بھری۔ بظاہر عام سی مگر نائلہ کے لیے کسمپلی یادوں

سے بھرپور۔ وہ کچھ ہی دیر میں گھبرا کر اٹھ گئی۔ اماں نے اس کا گھبراٹا بظور خاص نوٹ کیا۔

”ارے تم یہاں کیوں آ گئیں۔ اندر بیٹھو ناں۔“ عفت نے اسے کچن میں آتے دیکھا تو، پسینہ پونچھتی ہوئی

بولی۔

چولہے پر دھرے توے سے نکلتی تیش سے اس کا چہرہ بھبک رہا تھا۔ نائلہ اس کا چہرہ ٹٹولتی پتا نہیں کیا کھوجتی

رہی۔ عفت حدید کی خیریت پوچھ رہی تھی مگر نائلہ کو اس کے چہرے پر کوئی خاص رنگ نظر نہیں آ رہا تھا۔ یا تو اس

نے اپنے آپ کو سمجھا لیا تھا۔ یا پھر بہت ٹرینڈ کر لیا تھا۔

”ماہا کا پتا تو چلا ہو گا تمہیں۔“ عفت کی آواز میں افسوس تھا۔

”ہوں۔“ نائلہ کے سر سری انداز میں کوئی تاسف نہ تھا۔

عفت اس کے کوئی تبصرہ نہ کرنے پر گہری سانس بھر کے رہ گئی۔ وہ جان گئی تھی کہ نائلہ کو اس کی زندگی میں

آئے اس دکھ بھرے موڑ سے کوئی دلچسپی نہیں تو پھر اس بات پر دکھ کیا ہو گا۔

”حدید آئیں گے مجھے لینے ابھی۔“

کچن سے نکلتے نکلتے اس نے عفت کو دیکھ کر اس کے لہجے اور انداز میں کوئی تبدیلی محسوس کرنے کی کوشش کی۔

مگر وہاں سوائے گرمی سے بے زاری کے اور کوئی تاثر نہ تھا۔ وہ چڑی گئی۔  
اسے یاد تھا۔ اس کی اپنی شادی سے پہلے عفت حدید میں دلچسپی رکھتی تھی۔ شاید اب بھی۔  
مگر وہ جان نہیں سکی کہ عفت کے دل میں اگر ابھی بھی حدید کے لیے کچھ ہے تو اس سے خود اس کو کیا دلچسپی  
ہے۔ اور کیوں؟



حسب پاکستان آچکا تھا۔  
جس شام اسے ماہا سے ملنے کے آنا تھا۔ وہ چاہنے کے باوجود کوئی اہتمام نہ کر سکی۔ حالانکہ امی نے بہت کہا کہ کم  
از کم لپ اسٹک ہی لگالو۔ مگر وہ صرف ایک نیا جوڑا پہن کر بال بنا کر تیار کھڑی تھی۔  
”کیس باہر چلیں ڈنر کے لیے۔“ ماہا نے ایک نظر اسے دیکھ کر نگاہ چرائی۔  
وائٹ شرٹ اور ڈارک گرے کلر کی جینز میں اس کی شخصیت کے نکھار پر کسی نے اسی کا عطر چھڑک دیا تھا۔  
ماہا کو ڈر ہوا کہ وہ کیس ہنس کر اتنی بڑی بات فراموش نہ کر دے۔  
یہ محبت ایسی ہی نامرأشے ہے۔ جسے اپنے سر آنکھوں پر بٹھاتی ہے۔ اسے کبھی بھی گھٹنے ٹیکنے، ناک رگڑنے پر  
مجبور بھی کر سکتی ہے۔

وہ جلدی سے نفی میں سر ہلا کر کمرے میں چلی گئی۔ حسیب نے بھی قدم ہٹھائے۔  
”بیٹا۔“ امی اسے کمرے میں جا آدیکھ کر سامنے آگئیں۔  
”جی۔“ وہ مودب سا کھڑا تھا۔

”جو بھی بات کرنی ہے۔ آج صاف کر کے اسے اپنے ساتھ لے کر ہی جانا۔ میں نیچے جا رہی ہوں۔ تم اطمینان  
سے بات کرلو۔“

ان کے مشفق لہجے میں ماؤں والی مٹھاس بھی تھی اور بیٹی کی اول والی بے بسی بھی۔ وہ سر جھکا کر سوچتا ہوا اندر  
داخل ہوا۔ ماہا سامنے ہی بیٹھی تھی۔

”کیسی ہو تم۔“ وہ اس سے ذرا فاصلے پر بیٹھا۔

”ٹھیک ہی ہوں بس۔“ اس کا لہجہ خفا سا تھا۔

”آپ کا بیٹا کیسا ہے۔“ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ اس نے یہ سوال کیوں کیا۔ وہ چند لمحے سراٹھا کر اسے دیکھتا  
رہا۔ پھر دھیرے سے بولا۔

”وہ ٹھیک ہے۔“

”اور وائٹ۔“ وہ ایک بار پھر اس کا چہرہ تک رہا تھا۔

”اس کی ماں میری بیوی نہیں ہے۔“ حسیب کا لہجہ بڑا ٹھنڈا سا تھا۔

”یعنی۔ آپ اسے چھوڑ چکے ہیں۔“ (اب تک دل خوش فہم کو ہیں تجھ سے امیدیں)

”نہیں۔ اس سے میری شادی کبھی ہوئی ہی نہیں تھی۔“

حسیب بہت تھکر کر بولا اور ماہا کو لگا کمرے کی چھت اس کے سر پر آن گری ہے۔

”یعنی۔ یعنی۔۔۔ وہ آپ کی ناجائز۔۔۔؟“ اس سے جملہ مکمل نہیں کیا گیا۔ اس کی آواز کسی سہمی ہوئی سرگوشی  
سے زیادہ نہیں تھی۔

حسیب کا جھکا ہوا سر اور ہارا ہوا انداز اس نے کس دل سے دیکھا۔ پر شاید اس کا اپنا دل ہی جانتا تھا۔

اسے لگا۔ اس کا اپنے کردار پر زندگی بھر کا فخر ملیا میٹ ہو گیا ہو جیسے۔۔۔  
 ”میرا خیال ہے اب آپ کو چلے جانا چاہیے واپس۔“ کمرے کی بو جھل فضا میں تیرتی خاموشی ٹوٹی بھی تو ایک انتہائی سرد آواز اور مایوس کن بات ہے۔

”اما! میں جانتا ہوں۔ تم اس بات سے۔۔۔“  
 ”پلیز حبیب۔۔۔ پلیز آپ کا بہت احسان ہو گا مجھ پر“ آپ چلے جائیں۔ یہاں سے۔“ اس کی بلند آواز کسی چیخ سے مشابہ تھی۔ رندھا گلا اور ڈبڈباتی ہوئی چھلک پڑنے کو بے تاب آنکھیں۔  
 حبیب نے کھڑے ہو کر ایک نظر اس کی من موہنی صورت پر ڈالی۔  
 اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اپنی زندگی کا یہ پہلو اسے دکھائے گا۔ مگر ماہا جان گئی تھی۔ نہ صرف جان گئی تھی بلکہ بہت بے تک انداز میں اور بہت غلط موقع پر بھی۔ بلکہ شاید کچھ جلدی۔  
 شدت ضبط سے اس کا سرخ چہرہ اندرونی اکھاڑ بکھاڑ کا غماز تھا۔ ہاتھ کپکپا رہے تھے۔  
 حبیب کا دل چاہا اس کے نازک، سرد و سفید ہاتھ ایک بار اپنے ہاتھوں میں دبا کر محبت کی حرارت سے اس طرح بھروسے کہ ماہا پھر ہاتھ چھڑانہ سکے مگر۔ وہ جس طرح آیا تھا۔ اسی خاموشی سے واپس پلٹ گیا۔  
 ماہا اس کے جاتے ہی بستر پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ وہ پاکستان آنے کے بعد آج پہلی بار یوں ٹپ کر روئی تھی۔ جیسے کوئی کسی بہت اپنے جان سے پیارے، کسی دیرینہ رشتے کے نکھڑ جانے پر روئے۔ دائمی جدائی پر بین کرے۔



اک ایک لمحہ، آگے سرکنا وقت کو دوہوں، ہفتوں اور مہینوں کی دوری میں ڈھالتا چلا گیا۔ سوہا اور انس کی دھوپ چھاؤں جیسی زندگی میں انس کی محبت کی چھایا کبھی کبھی چھاتی۔ زیادہ تر دھوپ کا راج رہتا۔ اور اس پر سلگتے روسیے کی تیش اپنے وجود پر جھیلی وہ نڈھال ہوتی چلی گئی۔  
 رنگ روپ خواب ہوا اور آنکھوں میں مستقل حزن آن ٹھہرا۔ سوکھے لبوں پر پھکی مسکراہٹ کبھی کبھی چھب دکھلاتی۔ زیادہ تر وہ سنجیدگی سے اپنے کام میں مشغول رہتی۔ ہاں ایک چیز جس کی وہ بڑی سختی سے پابندی کرتی۔ وہ انس کے کام تھے۔ جنہیں وہ ہر حال میں اپنے ہاتھوں سے انجام دیتی۔  
 اسی کوشش میں اس کی ناملہ سے ایک دوبار جھڑپ بھی ہوئی۔ حسب توقع انس نے تمام چیخ و پکار کا ذمہ دار اسی کو ٹھہرایا۔ حدید البتہ غیر جانبدار رہا اور ناملہ بظاہر خاموش۔  
 سوہا کو لگنے لگا تھا اس کے اور انس کے درمیان ناملہ نہ ہوتے ہوئے بھی کیسے موجود ہے۔ حدید اور ناملہ کے تعلقات کی سرد مہری اپنے عروج پر تھی۔ حدید کو لگتا اس کی زندگی میں ایک ایسا خلا در آیا ہے۔ جو کسی تیسرے کو ہم راز بنائے بغیر سہا نہیں جاسکتا۔ لیکن وہ تیسرا شخص کون ہو سکتا ہے۔  
 وہ اپنے چاروں طرف نظر دوڑاتا مگر کسی کو اس کسوٹی پر پورا اترایا نہیں پاتا۔ ہاں مگر ایک مہربان چہرہ۔  
 دوبار بار چاہتے ہوئے بھی نظروں سے سامنے آنے سے اجازت نہ چاہتے ہوئے بھی سر جھٹک دیتا۔  
 ماہا کی زندگی ایک صحرا کی مانند تنہائی کے بگولوں کی نظر ہونے لگی تھی۔ امی کو دن رات اس کی خاموشی اور ادا سی ہولائی رہتی۔ انہوں نے بہت سرخشا مگر وہ انہیں کچھ بتانے پر آمادہ نہیں تھی۔  
 کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس شام ان دونوں میں کیا بات ہوئی۔ کیا نتیجہ نکلا۔ یا فیصلہ ہوا۔ اس کے پاس موجود تمام ہی محبت بھرے رشتے خاموش تماشا کی بنے رہنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ماہا نے سب کو سختی سے حبیب سے بات



کرنے سے منع کر دیا تھا۔

ایک ماہ بعد سوہا کی ڈیوری تھی۔

انس کو بہت مشکل سے اس کے چیک اپ کا ٹائم مل سکا۔ اتنے دن بعد دکھانے اور لاپرواہی کا مظاہرہ کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ لی پی زیادہ تھا۔ اور ایچ بی کم۔

لیڈی ڈاکٹر نے پہلے سوہا اور بعد میں انس کو بلا کر ٹھیک ٹھاک جھاڑ پلا دی۔ سوہا ڈاکٹر کی باتیں سن کر شکوہ کناں نگاہوں سے انس کو دیکھتی رہی۔ بالا خربید ریست پر آکر بات رکی۔

انس کا موڈ ایسی پر بہت اچھا نہیں تھا۔ اس کے لیے دودھ جو سزاور پھل خریدتے ہوئے بظاہر تو وہ اس کے لیے فکر مند تھا۔ مگر سوہا کو لگا جیسے وہ مارے باندھے یہ سب کر رہا ہے۔ ڈاکٹر نے اسے بائیک پر زیادہ سفر کرنے سے بھی منع کر دیا تھا۔ گھر آ کے وہ کمرے میں لیٹ گئی۔ بار بار سیڑھیاں اترنے چڑھنے پر بھی پابندی لگ گئی تھی۔ یوں بھی اس سے بار بار چکر نہیں لگتے تھے۔

انس بہت دور سے اوپر آیا۔

”یہ میڈیسن رکھی ہیں۔“ انس نے سائیڈ ٹیبل پر لفافہ رکھا۔

”آپ کہاں تھے۔“

”کھانا کھا رہا تھا۔“ وہ دانش روم میں گھس گیا۔

”مجھے تو بتایا ہی نہیں آپ نے کہ نیچے کھانا کھا رہے تھے۔ میں بھی کھا لیتی۔“

وہ باہر نکلا تو سوہا کہہ بیٹھی۔

”وہ تو حدید کھا رہا تھا۔ تو نائلہ نے مجھے بھی بٹھایا۔ تم ان کے ساتھ کھانا کب پسند کرتی ہو۔“

سوہا نے انس کو دیکھتے دیکھتے بے زاری سے منہ پھیر لیا۔ اب اسے انس کی اس قسم کی باتوں پر حیرت بھی نہیں ہوتی تھی۔ ہاں دکھ کا احساس اپنی جگہ رہتا تھا۔

”وہ مجھے اپنے ساتھ کھانا پسند نہیں کرتی۔“ وہ کہے بنا رہ نہیں سکی۔

”دنیا کی ساری برائیاں اسی میں ہیں۔“ انس طنزیہ انداز میں بولا۔

”اگر مجھ میں کھیں تو شادی کیوں کر لی۔“ وہ کلس کر بولی۔

آج کل اس کا دل انس کی باتوں سے بہت برا ہوتا رہتا تھا۔ اور اس وقت تو اور بھی زیادہ جب وہ بلا وجہ نائلہ کی طرف داری کرتا۔

”پہلے پتا نہیں چلا۔“ انس اپنی طرف سے تیر چلا کر باہر چلا گیا۔ غالباً ”نیچے“ مگر سوہا سے اب برداشت کرنا مشکل تھا۔ وہ نقاہت کے باوجود اس کے پیچھے پہلی سیڑھی تک آئی۔

”اے! بھی بھی کچھ دیر نہیں ہوئی ہے۔ اگر اتنا شوق آ رہا ہے تو آفر کر کے دیکھ لیں۔ کیا پتا قسمت کھل جائے۔“ وہ زور سے چلائی۔

لاؤنج میں نی وی دیکھتے حدید تک اس کی آواز پہنچی اس نے پلٹ کر دیکھا تو انس آخری سیڑھی پر تھا۔ انس کے اندر غصے کی شدید لہر اٹھی۔ وہ جس کے بارے میں بات کر رہی تھی۔ وہ حدید کی بیوی تھی۔

”بکواس بند کر لو سوہا۔ اندر جاؤ۔“

”میں تو اندر ہی تھی۔ آپ کی بکواس سن کر ہی آئی ہوں۔“

حدید کو غیر معمولی سا احساس ہوا۔ اس نے سنجیدگی سے انس کی شکل دیکھی۔ پھر اپنے کمرے کے بند دروازے کو۔ نائلہ اندر بتا نہیں سوری بھی یا جاگ رہی تھی۔

”منہ بند کرلو سوہا۔ ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“

”اچھا اب تک جو ہو چکا ہے میرے ساتھ وہ کیا بہت اچھا تھا۔ اب تو پتا چل گیا ناں آپ کو۔ کتنی بری ہوں میں۔ تو ٹھیک ہے جائیں۔“

”سوہا!“

انس ایک دم طیش میں آئے واپس اوپر چڑھا۔ حدید نے تیزی سے اپنی جگہ چھوڑی۔ اور انس کو پکارتا ہوا پیچھے لپکا۔ سوہا اپنی جگہ پر جمی کھڑی تھی۔ انس بالکل اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ قریب تھا اس کا ہاتھ اٹھ جاتا مگر حدید دو سیڑھیاں پھلانگتا اس کے پاس پہنچ گیا۔ گوکہ اس کو شش میں اسے کافی وقت تو ہوئی مگر اس وقت اسے نظر انداز کرنا ہی بہتر تھا۔ حدید نے انس کو بروقت پکڑا تھا۔

”سوہا اندر جاؤ آپ۔“

اس نے تیزی سے سوہا سے کہا وہ ایک دم پلٹ گئی۔ انس خود کو چھڑانے کی کوشش میں تھا۔

”چھوڑو مجھے حدید۔ میں ابھی اسی کی زبان بند کرنا ہوں۔“

”ہاں ہاں اسی کی تو کسر رہ گئی ہے۔ بار بار کی تکلیف سے بہتر ہے ایک ہی بار گلابا دیں میرا۔“ اب کی بار وہ پوری قوت صرف کر کے اتنی زور سے چلائی کہ اس کے حلق میں خراشیں پڑ گئیں۔

”کیا ہو گیا سوہا پلیز۔“ حدید نے زبردستی انس کو بھیج کر خود اندر آکر دروازہ بند کر دیا وہ اب بری طرح رو رہی تھی۔

”آپ نہیں جانتے۔ اٹھنے بیٹھنے مجھے برا بھلا اور نالہ کی تعریفیں۔ کان پک گئے ہیں میرے سن سن کر۔ وہ اچھی ہے تم بری ہو۔ اگر وہ اتنی اچھی ہے تو مجھ سے شادی کیوں کی۔“ وہ ایک بار پھر چیخی۔

حدید سامنے کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

”ابھی ابھی انہوں نے کہا ہے مجھ سے کہ پہلے پتا نہیں چلا۔ ورنہ۔۔۔ ورنہ کیا کرتے۔ اور میں کوئی غلط تھوڑا ہی کہہ رہی ہوں۔ ابھی کون سی بہت دیر ہوئی ہے۔ آفر کر کے دیکھ لیں۔“

”سوہا خدا کے لیے چپ ہو جاؤ وہ میری بیوی ہے۔“ حدید نے ایک دم بات کاٹی۔

”میں بھی تو ان کی بیوی ہوں۔ جب تم کو اس بات کا احساس ہے کہ وہ تمہاری بیوی ہے۔ تو انہیں کیوں نہیں ہوتا۔“

حدید نے پاس جا کے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”چپ ہو جاؤ تم۔ مجھے معلوم ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں اسے سمجھاؤں گا۔“

حدید کو احساس ہو رہا تھا کہ وہ اسے آپ کے بجائے تم کہہ گئی ہے۔ اس کے غم و غصے کا اندازہ ہوا۔ اس نے آج تک حدید کو تم کہہ کر بات نہیں کی تھی۔

”آپ کو بتا ہے میری طبیعت خراب ہے۔ ان کو پتا نہیں ہے جن کی وجہ سے میں ان حالوں کو پہنچی ہوں۔“

حدید کے پاس اس کی مایوسی کے جواب میں کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ وہ چند لمحوں کے بعد نیچے چلا گیا۔



انس نیچے حدید کا ہی منتظر تھا۔

”یکہ تم نے کس قدر گھٹیا ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے اس نے۔“

”کیوں اُبھتے ہو اس کے ساتھ۔ تمہیں پتا ہے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ حدید نے دھیرے سے اسے سمجھایا۔

”کوئی دنیا سے انوکھی ماں نہیں بننے جا رہی وہ۔“

”اس طرح کی بات کرو گے تو جو بھی عورت ہوگی اسے برا ہی لگے گا۔“

انس چپ ہو گیا مگر چہرے پر رقم ”میں ٹامانوں“ والے تاثرات صاف ظاہر ہو رہے تھے۔  
 ”بچھتا رہے ہو اس سے شادی کر کے؟“  
 ”نہیں یار۔“

”تو پھر تم نے یہ کیوں کہا کہ تمہیں پہلے پتا چل جاتا تو۔“  
 ”میں نے یہ نہیں کہا۔“

”مطلب تو یہی نکلتا ہے ناں۔ ایک عورت جو تمہاری بیوی ہے اس کا سب سے زیادہ حق ہے تم پر۔ تمہارے بچے کی ماں بننے جا رہی ہے تو اسے سب سے زیادہ تمہاری محبت اور توجہ کی ضرورت ہے۔ اور تم ہو کہ اس کے سامنے ایک دوسری عورت کی تعریفیں کر رہے ہو۔ جو اس کے خیال میں ماضی میں تمہیں پسند بھی کرتی رہی ہے اور اب تمہارے بھائی کی بیوی ہے۔ خد کو مانو اس۔ کچھ نہیں تو یہی خیال کر لو کہ اب وہ میری عزت ہے۔“  
 حدید کے انداز سے ناراضی ظاہر تھی۔ اگر اسے سوہا کی بات بری لگی تھی تو اس کا ذمہ دار بھی وہ سراسر انس کو ٹھہرا رہا تھا۔ اور یہ کوئی ایسا غلط بھی نہیں تھا۔

”جاؤ اب جا کے مناؤ اسے چاہے جتنا بھی غصہ کرے وہ۔ محبت سے بات کرو اس سے۔ ناراضی ختم کرو اور شکر ادا کرو خدا کا کہ اولاد جیسا خوب صورت رشتہ عطا کر دیا ہے تمہیں۔“ انس کو اس کے لہجے میں کسی محرومی کی پیش سی سلگتی ہوئی دکھائی دی۔

”ایک بات پوچھو۔“ انس کا دھیان ایک ایسی کسی اور جانب مڑ گیا۔ حدید سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔  
 ”تم نے اب تک خوش خبری نہیں سنائی۔“

حدید اس سوال کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ چپ کا چپ رہ گیا۔ البتہ اس کے چہرے کے تاثرات سے انس نے فوراً ہی کوئی غیر معمولی احساس بھانپ لیا۔

”سب خیریت ہے ناں۔“ انس گہری نگاہوں سے اس کا وجود ٹٹول رہا تھا۔ حدید گولگا کسی نے بخ بستہ پانی اس کے وجود پر انڈیل دیا ہے۔

اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح انس کو آگاہ کرے۔  
 ”سب خیریت ہے مگر۔“

”مگر۔؟“

وہ چند لمحے اپنے پیر کے انگوٹھے کو دیکھتا رہا۔

”نا ملے ابھی یہ سب نہیں چاہتی۔“

”نا ملے نہیں چاہتی۔ کیوں؟“ انس کی حیرانی بجا تھی۔

”شاید ذمہ داری کے لیے تیار نہیں۔“

انس کی خاموشی بول رہی تھی کہ اسے حدید کی بات پر یقین نہیں آیا۔

”اب اس سے ذرا ڈھنگ سے بات کرنا۔“ وہ انس کو جاتے دیکھ کر پیچھے سے بولا۔

”کیا ہوا سوہا کیوں چلا رہی تھی۔“ کمرے میں نائلہ حدید کی منتظر تھی۔

”انس سے جھگڑا ہو گیا تھا۔“

اسے جاگتا دیکھ کر حدید کے دل میں کسی محرومی کا احساس کروٹیں بدلنے لگا۔ وہ جان بوجھ کے نائلہ کے نزدیک

آیا۔ وہ فوراً دوسری طرف مڑ کر میبل لیمپ آف کرنے لگی۔ حدید نے وہیں رک کر کسی منہ زور جذبے کی لگامیں

کھینچیں۔ اور دوسری طرف نائلہ کے لبوں پر ابھرتی معنی خیز مسکراہٹ نہیں دیکھ سکا۔

موسم ابر آلود سا تھا، مگر جس کی وجہ سے گرمی بھی بلا کی تھی۔  
 بہت عرصے بعد اس نے اس کے کپڑے دھونے کی غرض سے واشنگ مشین لگائی تھی۔ لاؤنج میں ٹائل ٹیٹھی  
 لی وی دیکھ رہی تھی۔ یوں تو اس نے کافی عرصے سے اس کے ناشتے کی ذمہ داری اٹھائی تھی۔ مگر آج سوہا کو کپڑوں  
 کے ڈھیر سے نبرد آزما دیکھ کر بھی لاطعلقی سے اپنا کام کرتی رہی۔  
 سوہا کو اس سے مدد کی امید تھی نہ توقع۔ وہ صرف اس کی موجودگی میں برہہ چیزہ کر کام کرتی تھی اور سوہا اس کی  
 چالاکیوں کو خوب سمجھتی تھی۔ یہ اور بات کہ وہ یہ لاطعلقی اس کو دکھا نہیں سکتی تھی۔ وہ اس بات سے لاعلم تھی کہ  
 اس تو نہیں مگر حدید کی نظروں سے اس کی حرکتیں پوشیدہ نہیں ہیں۔  
 کافی دیر بیٹھنے کے بعد سیدھا کھڑا ہونا مشکل تھا۔

وہ بمشکل کپڑوں سے لدی بالٹی لے کر باتھ روم کے دروازے سے میڑھیوں تک آئی۔ صحن میں کپڑے ڈالنے  
 پر ٹائل نے ہی پابندی لگائی تھی کہ یہاں اندر داخل ہونے والوں کو کپڑے لٹکتے دکتے ہیں تو برا لگتا ہے اور پھر سوہا  
 نیچے سے سوکھے کپڑے اتار کر اوپر کمرے تک لے جانے میں اتنی آکسی دکھاتی ہے کہ دھوپ میں پڑے پڑے  
 کپڑوں کا رنگ خراب ہو جاتا ہے۔ لہذا وہ اپنے اور اس کے کپڑے اوپر ہی پھیلائے اور وہیں سے اتار کر تہ  
 کر لے۔

ٹائل نے جھانک کر اسے ہانپتے ہوئے دیکھا اور منہ پھیر لیا۔  
 اسی وقت صحن کا دروازہ کھلا اور حدید نے اندر قدم رکھا۔ وہ اس وقت بالکل غیر متوقع طور پر جلدی گھر آگیا تھا۔  
 ٹائل کی جو اس پر نظر پڑی تو وہ بجلی کی ی تیزی سے اٹھی، مگر دیر ہو چکی تھی۔ حدید سوہا کو دیکھ چکا تھا اور اب  
 ملامت بھری نظروں سے ٹائل کو دیکھ رہا تھا۔ ٹائل اس کی نظروں کا مفہوم سمجھتے ہوئے سوہا کے پاس آئی۔  
 ”لاؤ میں ڈال دوں۔“ اس نے سوہا سے زبردستی بالٹی چھینی۔

اس کے چہرے کے بگڑے تاثرات اس کے مزاج کی برہمی کے گواہ تھے۔ مگر فی الحال سوہا کے اندر اتنی طاقت  
 نہیں تھی کہ وہ ٹائل سے بالٹی واپس لیتی۔

ٹائل ایک ایک میڑھی چڑھتی دل ہی دل میں اپنی کھولن دبا رہی تھی۔ پچھلے چند دنوں سے اسے سوہا سے سخت  
 چڑسی محسوس ہونے لگی تھی۔ کچھ دن پہلے جب اس کا اس سے جھگڑا ہوا تھا تو اس کا خیال تھا کہ ان دونوں کے  
 تعلقات کافی دن تک سرد رہیں گے اور ٹائل کو اپنی کارکردگی دکھانے کا کھل کر موقع ملے گا۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا اور  
 اس کی امیدوں پر پانی پھر گیا جب اس نے دوسرے ہی دن صبح اس کو بہت خوش گوار مڑ میں سوہا سے باتیں کرتے  
 کھانا ڈھنگ سے کھانے اور دو وقت پر لینے کی تاکید کرتے دیکھا۔

ابھی یہ ہی غم غلط نہ ہوا تھا کہ حدید کی ملاستی نظریں یاد آ گئیں۔ گو کہ حدید نے کبھی ٹائل کو سخت ست نہ سنائی  
 تھیں، مگر اس کے لیے اس کی نظریں ہی کافی تھیں۔

ایک اسٹیپ پر بالٹی ذرا کی ذرا لٹکا کر اس نے مڑ کر دیکھا۔ سوہا بمشکل پھولے ہوئے سانس کو قابو کرتی اس کے  
 پیچھے ہی آرہی تھی۔ اس کے شیطانی ذہن میں اچانک ہی ایک بے حد خطرناک سوچ نے سراٹھایا اور اس نے بے  
 سوچے سمجھے عمل بھی کر ڈالا۔ اس کا پیر معمولی سا لڑکھڑایا۔ اس نے سنبھلنے کے لیے ریٹنگ تھامی اور کپڑوں سے  
 بھری بالٹی چھوٹ کر سوہا کے سر پر آگری۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

لمبے لہراتے حسین بال ہمیشہ کے لئے۔

# MEDICAM SHAMPOO

مہینے بھر کا شیمپو



3 Plus SHAMPOO

SHIKAKAI

ANTI  
DANDRUFF

AMLA

HERBAL

ANTI-LICE

EGG

KALONJI

# میں تجھ کو نہیں لکھیں تھیں

## ۳ تیسری قسط

اپنی باری کا انتظار کیا۔ بہت سی لڑکیوں کے والدین نے خود اپنے منہ سے کمال کے رشتے کا کہا، پر وہ ایسا سعادت مند کہ کہا مجھے اپنے والدین کی پسندیدہ اعتبار ہے، جسے وہ میرے لیے چنیں، میں اسی سے شادی کروں گا۔

کمال کے گھر والوں کو ہماری زیان بہت پسند آئی ہے۔ کیونکہ ان کی باتوں سے بار بار اظہار ہو رہا تھا۔ میں نہیں چاہتی کہ اتنا اچھا لڑکا ہاتھ سے نکل جائے۔“ زرینہ نے مجازی خدا کو متاثر کرنے اور کمال کے لیے ہموار کرنے میں ایزی چوٹی کا زور لگا دیا۔

”زیان پڑھ رہی ہے، وہ ابھی بیس سال کی بھی پوری نہیں ہوئی ہے اور کمال لڑکا نہیں پورا مرد ہے۔ مجھے اس کے گھر والے بھی پسند نہیں آئے۔ عجیب شو آف سطحی محسوس ہوئے ہیں مجھے۔ کیسے زیان کا رشتہ دے دوں انہیں۔“ امیر علی نے لگی لپٹی رکھے بغیر صاف انکار کر دیا۔ زرینہ کی کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔

”ٹھیک ہے کمال کی عمر تھوڑی زیادہ ہے پر اتنی بھی زیادہ نہیں ہے۔ اٹھائیس سال کا ہے صرف۔“ انہوں نے میا لہجے کی انتہا ہی تو کر دی۔ ”اس کی بڑی بہن بتا رہی تھی کہ محنت کر کر کے اور پڑھائی میں جان ماری کی وجہ سے کمال زیادہ عمر کا لگنے لگا ہے۔ ورنہ اٹھائیس سال کوئی ایسی بھی زیادہ عمر نہیں ہے۔ آپ بھی تو مجھ سے چھ سال بڑے ہیں۔ میرے ماں باپ نے تو آپ کی عمر اور ساتھ پہلی بیوی کی بیٹی یہ بھی اعتراض نہیں کیا تھا۔ آپ نے زیان کو ساری عمر گھر بٹھا کر رکھنا ہے کیا؟ اس کی شادی ہوگی رائیل اور مناہل کی باری آئے گی نا۔“ شروع میں زرینہ بہت غصے میں

زیان ان کی اگلی کوئی بات سنے بغیر اٹھ کر آگئی۔ دیے بھی وہ زرینہ بیگم کے سامنے آنے سے احتراز ہی کرتی تھی۔ اس کی کوشش ہوتی وہ بات بھی کم سے کم کرے۔ پھر بھی زرینہ بیگم کو اس کے وجود سے تکلیف ہی ہوتی۔

زرینہ نے بھڑا دروازہ مکمل طور پر بند کیا اور پھر سے امیر علی کے پاس اپنی جگہ بیٹھ گئیں۔ ان کا انداز انتہائی رازدارانہ اور چوکنا تھا۔ امیر علی بھی انہیں غور سے دیکھنے لگے۔

”آپ نے لڑکا اور اس کی فیملی دیکھی کیسے لگے آپ کو؟“ وہ آہستہ آواز میں دلچسپی سے پوچھ رہی تھیں۔ جیسے کسی کے سن لیے جانے کا ڈر ہو۔

”پہلی ملاقات میں ہی کسی کی اچھائی یا برائی کا فیصلہ کیسے کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی بتایا جاسکتا ہے کہ کوئی کیسا ہے۔“ امیر علی نے خاصے محتاط الفاظ کا سہارا لیا تھا پر زرینہ کو پھر بھی ان کی بات یا رائے پسند نہیں آئی۔

”میں نے تو صرف یہ پوچھا ہے کہ کمال کے گھر والے آپ کو کیسے لگے رہی بات اچھائی برائی کی تو بیگم اختر نے ان کی بہت تعریفیں کی ہیں۔ کمال اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے، کھاتے پیتے خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ بہت شریف لڑکا ہے۔ بظاہر کوئی عیب بھی نہیں ہے۔ بے غرض اور بے لوث عادات کا مالک ہے۔ پہلے اپنی تین بہنوں کی شادیاں کیں اور صبر سے

تھیں۔ لیکن آخر میں مصلحت کے تحت نرم پڑ گئیں۔

”رائیل اور منال ابھی بہت چھوٹی ہیں، جس طرح زیان میری بیٹی ہے۔ اس طرح وہ بھی میری ہی اولادیں ہیں۔ میں ان کے بارے میں بھی سوچتا ہوں۔ وقت آنے پہ سب کام ہو جائیں گے۔ تم خواہ مخواہ ہلکان مت کیا کرو خود کو۔“

”کیسے ہلکان نہ کروں میں خود کو۔ آپ بیمار رہتے ہیں گھری بھر کا پتا نہیں ہے۔ میں نے ہر مشکل وقت

میں آپ کا ساتھ دیا ہے۔ دکھ سکھ کے سب موسم آپ کے ساتھ گائے۔ مجھے کوئی شکوہ و شکایت نہیں کی۔ میں زیان کی دشمن تھوڑی ہوں۔ اچھے رشتے بار بار نہیں ملتے۔ میں تو صرف اتنا چاہتی ہوں کہ وہ آپ کے جیتے جی اپنے گھر کی ہو جائے۔ آپ اسے بہت پیار کرتے ہیں۔ لاڈلی ہے وہ آپ کی۔ میں سب جانتی ہوں، تب ہی تو بیگم اختر کو کہلو کر کمال کو پہلی ملاقات میں ہی آپ سے ملوانے کے لیے گھر بلوایا۔ میں چاہتی ہوں زیان قدروان سسرال میں جائے۔ پہلی بار ہی



کمال کے گھر والے اس پہ واری صدقے ہو رہے تھے۔ اچھے لوگ ہیں۔ زیان عیش کرے گی۔ کمال عمر میں زیان سے تھوڑا بڑا ہے، پر یہ کوئی ایسا عیب نہیں ہے جس کو وجہ بنا کر رشتہ ٹھکرا دیا جائے۔ زیادہ عمر کے شوہر بیوی کو خوش رکھتے ہیں۔ آپ نہیں چاہتے تو میں انکار کھلوادوں گی کمال کے گھر والوں کو۔“

امیر علی ان کی باتوں اور دلائل سے قائل ہوتے جا رہے تھے تب ہی تو زرینہ نے انداز دیا تھا۔ پھر اس کے بعد وہی ہوا جو زرینہ بیگم چاہ رہی تھیں۔ امیر علی ایک دم نرم پڑ گئے۔

”ٹھیک ہے، تم لڑکے کے گھر جاؤ اسے دیکھو، رہن سہن کا جائزہ لو، چھان بین کراؤ، اس کے بعد دیکھا جائے گا۔“ امیر علی نے صاف رضامندی تو نہیں دی تھی، پر انکار بھی نہیں کیا تھا۔ زرینہ بہت مسرور تھیں۔ ان کے لیے اتنا ہی بہت تھا۔ باقی کے مراحل آسان تھے۔ امیر علی کی حیثیت ویسے بھی کمزور ہو گئی تھی۔ انہوں نے بیماری کے دوران تمام جائیداد کا وارث زرینہ بیگم کو بنا دیا تھا۔ اس وقت حالات کا تقاضا ہی یہ ہی تھا۔ زرینہ آسانی سے مختار کل بن گئی تھیں۔ وہ خوش تھے کہ ان کی شوہر پرست شریک سفر زیان کا حق نہیں مارے گی۔ وہ یاں کی طرح ہی سوچے گی پر زرینہ کی نیت بدل چکی تھی۔ ان کی پہلی کوشش یہ ہی تھی۔ زیان کی جلد از جلد شادی ہو جائے۔ اس سے پہلے کہ کسی کمزور لمحے میں امیر علی کی محبت جاگ پڑے اور وہ پھر سے وکیل کو بلوائے وصیت تبدیل کروادیں۔

زیان جب تک یہاں تھی اس کا امکان سو فیصد تھا۔ اس کی شادی کے بعد یہ خطرہ بھی نکل جاتا اور بعد میں اگر امیر علی وصیت میں تبدیلی کا بولتے تو کون سا انہوں نے انہیں یہ کام کرنے دینا تھا۔ ایک مفلوج معذور انسان کی کسی صحت مند ہاتھ پاؤں والے کے سامنے کہاں چلتی ہے۔ امیر علی کو رام کرنے کے بہت سے طریقے تھے اور وہ ان کے دلائل سے قائل ہو بھی جاتے تھے۔

”ہاں ٹھیک ہے، میں روینہ آپا کو ساتھ لے کر بہت

جلد خود کمال کے گھر جاؤں گی۔ ہر چیز کو دیکھ بھال کر پرکھ کر خود بتاؤں گی آپ کو۔ اگر مجھے کہیں ذرا سی بھی گڑبڑ لگی تو آپ سے پہلے میں خود انکار کروں گی۔“

”تم کتنی اچھی ہو زرینہ۔ میں سوچتا ہوں تم میری زندگی میں نہ ہوتیں تو میری زندگی کتنی مشکل ہوتی۔“ وہ دل سے ان کے شکر گزار احسان مند تھے۔

”ارے آپ ایسی باتیں نہ کریں۔“ زرینہ دل میں بہت خوش تھیں۔

”تم ٹھیک کہتی ہو زیان کی شادی ہو جانی چاہیے۔“ اس بار وہ تلملا کر رہ گئیں، کیونکہ امیر علی کے لہجہ اور آنکھوں میں زیان کے لیے فکر مندی تھی۔ پر وہ وقت جذبات کے اظہار کے لیے مناسب نہیں تھا۔ انہیں کمال کے رشتے کے لیے راہ ہموار کرنی تھی۔ امیر علی سے زیادہ مشکل کام زیان کو منانے کا تھا۔ وہ نگلی تلواری تھی، کسی وقت کچھ بھی کر سکتی تھی۔ پھر وہ اب اس کے حصول کے لیے ہر راستہ اختیار کرنے کے لیے تیار تھا۔ وہ اب کے کوئی قدم اٹھانے سے پہلے انہیں زیان کی شادی کرنی تھی۔



زیان نے مٹھی میں تھامے نوٹ گنے بغیر ٹیبل پر پھینکے۔ جس مقصد کے لیے اسے یہ روپے دیے گئے تھے۔ وہ اس وقت اس کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہ رہی تھی۔ مگر داغ تھا کہ گھما پھرا کے ادھر ہی لیے جا رہا تھا۔ زرینہ آنٹی نے اسے ابو کے پاس سے اٹھا دیا تھا۔ یقیناً انہوں نے آج آنے والے مہمانوں بلکہ خاص الخاص مہمانوں کے بارے میں ہی ان سے بات کرنی تھی۔ خوشی سے زرینہ آنٹی کا چہرہ چمک رہا تھا۔ جسے آج ہی میدان مار کے رہیں گی۔ زیان مضطرب تھی۔ بوا رحمت کی ڈھکی چھپی نصیب تھیں، زرینہ بیگم کی خوشی، امیر علی کی لائقیت و بے نیازی آئے والے مہمانوں کی دلچسپی اس کی پریشانی کو برہمارہی تھی۔

شادی کے بارے میں وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ یہ اس کا ٹارگٹ یا مقصد نہیں تھا۔ پھر کیوں

زرینہ بیگم اس کے پیچھے پڑ گئی ہیں۔ وہ خوش ہے،  
 بر سکون ہے، اسے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے،  
 لیکن زرینہ بیگم اس کی ہر خوشی چھیننے کے درپے  
 ہیں۔

مرد کی ضرورت اگر زندگی کا خاصہ و لازمہ ٹھہرتی  
 ہے، تو اس کے سامنے مرد کا روپ باپ کی صورت میں  
 موجود تھا۔ پر باپ کے ہوتے ہوئے بھی اس نے خود کو  
 اکیلا کمزور اور بے بس ہی تصور کیا تھا۔ ماں کے حوالے  
 سے طے ہی سنے تھے۔ حقارت ہی سمیٹی تھی۔ اس  
 نے سب حقارت، ذلت بے بسی اکیلے ہی برداشت کی  
 تھی۔

امیر علی نے تو اسے کبھی بھی زرینہ بیگم کی نفرت  
 سے نہیں بچایا، نہ اس کی مدد کو آئے۔ اب وہ اب جو  
 اس کے بارے میں انتہائی حد تک جا کر سوچ رہا ہے،  
 تب بھی تو وہ اکیلے ہی رہ رہی ہے۔ پھر وہ کیوں زرینہ  
 بیگم کے سامنے جھکے، سر نہ ڈر کرے۔ وہ اس کے ساتھ  
 زبردستی نہیں کر سکتیں۔ باقی جو دل چاہے کریں، پر وہ  
 کوئی ترنوالہ نہیں ہے۔ اتنی آسانی سے تو کسی صورت  
 بھی ہار نہیں مانے گی۔ ناکوں چنے چبوا دے گی۔ امیر علی  
 اپنی بیگم کے سامنے بے بس ہوں گے۔ وہ بالکل بھی  
 نہیں ہے اور وہ انہیں ایسا کر کے دکھائے گی۔

فیضان کے لبوں پہ زہر میں ڈوبا تبسم رقصاں تھا۔  
 زرینہ بیگم اگر اس وقت اس کے چہرے کو دیکھ لیتیں تو  
 ایک ٹانہ کے لیے ڈرتیں ضرور کہ فیضان نے ہار نہ  
 ماننے کا تہیہ کر لیا تھا اور یہ تو وہ بھی اچھی طرح جانتی  
 تھیں کہ فیضان ضد میں اپنی منواتی ہے۔ بے شک وہ ان  
 سے خائف بھی، دہتی بھی، پر اس کے سرکش خیالات  
 بدلے نہیں جاسکتے تھے۔



زرینہ، روینہ آیا سے فون پر بات کر رہی تھیں۔  
 موضوع گفتگو کمال اور اس کی فیملی ہی تھی۔  
 ”کیسے ہیں لڑکے والے؟“ روینہ نے سوال کیا۔  
 ”مجھے تو سب بہت اچھے لگے ہیں۔“

”اور امیر بھائی کیا کہتے ہیں؟“

”مجھے تو لڑکا بہت پسند آیا ہے، پھر آپ کے بھائی  
 صاحب کہتے ہیں کہ اچھی طرح چھان بین کروا کے  
 بات آگے بڑھائی جائے۔ انہیں کمال کی عمر پہ بھی  
 اعتراض ہے۔ اپنی بیٹی ننھی، چوڑی لگ رہی ہے، پر  
 فیضان ایسی بچی تو نہیں ہے کہ شادی جیسی ذمہ داری بھی  
 نہ اٹھا سکے۔“

زرینہ نے بتاتے ہوئے جیسے ناک بھوں چڑھائی  
 تھی۔ روینہ نے متفق ہونے میں دیر نہیں لگائی۔  
 ”ویسے بھی لڑکیاں جلدی سیانی ہو جاتی ہیں۔“  
 ”آپ کو اگلے ہفتے میرے ساتھ کمال کے گھر  
 چلنا ہے۔ میں نے اسی لیے آپ کو فون کیا تھا۔“

زرینہ نے باتوں باتوں کے دوران اچانک انہیں بتایا  
 تو وہ پریشان سی ہو گئیں۔ ”کس دن جانا ہے؟“  
 ”آپ آج فکرمات کریں، جب وہاں آفس میں  
 ہو گا، ہم تب چلیں گے۔ آپ کے بھائی نے فضول کی  
 پنچ لگا دی ہے کہ لڑکے کے گھر جاؤ، سب سے ملو، جائزہ  
 لو۔“ زرینہ ان کی پریشانی کی وجہ جانتی تھیں۔ تب ہی تو  
 فوراً ”اسی دی۔“

”تم رہانے سے ایک دن پہلے مجھے بتا دینا۔“  
 ”ہاں میں بتا دوں گی۔“ روینہ غائب دماغی سے سر  
 ہلانے لگیں۔



راعنہ رات سے ماپوں بیٹھ رہی تھی۔ ٹھیک سات  
 دن بعد اس کی بارات آئی تھی۔ وہ سب چنڈال چوڑی  
 بہت خوش اور پر جوش تھی۔ کول اور رنم نے روایتی  
 انداز کے سوٹ سلوائے تھے۔ کول تو خاص طور پر  
 پر جوش تھی۔ اس کی تیاریاں ختم ہونے کا نام نہیں  
 لے رہی تھیں۔ پر اندے کو اس نے سو سو بار کندھے  
 کے آگے پیچھے ڈال کے دیکھا۔ جبکہ اس کے برعکس  
 رنم ہمیشہ کی طرح پراعتماد تھی۔ سبز چوڑی داریا جائے،  
 پیلی شرٹ، ہم رنگ دوپٹا اوڑھے وہ برا مشرقی اور الگ سا  
 تاثر پیش کر رہی تھی۔ بالوں میں پراندہ اور موتیے کے

گجرے دیکھ کر فراز اور اشعر نے بے اختیار ہی ”واؤ“ کہا۔ اس کی آنکھوں میں اعتماد کا رنگ کچھ اور بھی گہرا ہو گیا۔

جوان لڑکیوں کے تقریبی قہقہے شور، ہنگامہ، موجِ مستی، ماحول پہ چھائے خوب صورتی کے رنگوں کو اور بھی برہمار ہے تھے۔ ڈھولک کو مل کے قبضے میں تھی۔ راعنہ کی کزن کے ساتھ مل کر اس نے شادی بیاہ کے گانوں کی خوب ہی ٹانگ توڑی۔ راعنہ ان سب کے درمیان بیٹھی مسکرا رہی تھی۔

رغم ہنگامے، شور شرابے سے تھک بار کر راعنہ کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ راعنہ نے سر سے ڈھلکتا آنچل ٹھیک کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”کیا بات ہے، تم سب کے ساتھ انجوائے کیوں کر رہی ہو؟“

”میرا دل چاہ رہا ہے تمہارے پاس بیٹھوں باتیں کروں، تمہاری شادی ہو جائے گی تو کہاں ہاتھ آوگی۔“

رغم مسکراتے ہوئے شگفتہ انداز میں بولی۔

”شادی کے بعد میں نے شہریار کے کھ رہی جاتا ہے اور تو کوئی جگہ نہیں ہے۔ تم جب چاہو آ سکتی ہو۔“

راعنہ مسکرائی۔ رغم نے ایک نظر ڈھولک بجالی لڑکیوں پہ ڈالی۔ ان میں کوئل سب سے پیش پیش تھی۔ اسے ہنسی آگئی۔ راعنہ بھی مسکرا رہی تھی۔

کوئل ایسی ہی تھی، زندگی کے ہر بل سے خوشی کشید کرنے والی، شرارتی، ہنسوڑ جذباتی۔

چند لمحوں ڈھولک بجاتی کوئل کو دیکھنے کے بعد رغم پھر سے راعنہ کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”تم نے پرائیڈل لے لیا؟ شوروم والے نے کل کی ڈیٹ دی تھی۔“ اسے

اچانک یاد آیا۔ ”نہیں۔“ راعنہ نے نفی میں سر ہلایا۔

”شہریار نے منع کر دیا ہے۔“

”کیوں کس وجہ سے؟“ وہ حیران ہو کے بولی۔

”فنکشن ختم ہو جائے تو بتاؤں گی۔ ویسے شہریار کے گھر والے میرا پرائیڈل اور دیگر سب چیزیں لے آئے ہیں۔ ادھر سے فارغ ہو کر دکھاؤں گی۔“ راعنہ

کی بات پہ وہ سر ہلانے لگی۔ راعنہ نے تقریب ختم

ہونے کے بعد کچھ بتانے کا بولا تھا۔ رغم کو شدت سے انتظار تھا کہ کب فنکشن ختم ہوتا ہے۔

رات کے آخری پہر جاری ہنگامہ ختم ہوا تو ان سب کی آنکھیں نیند سے بند ہوئی جا رہی تھیں۔

راعنہ کے کمرے میں ہی رغم اور کوئل کا بستر تھا۔ وہ تو آتے ہی بیڈ پہ ڈھیر ہو گئی۔ پر رغم کو راعنہ کا کچھ گھنٹے پہلے والا پراسرار انداز، ہضم نہیں ہوا تھا۔ تب ہی تو اس نے فوراً ”یاد دہانی کرائی۔“ ”تم نے مجھے کچھ بتانا تھا راعنہ؟“

”اوہ ہاں۔“ وہ فوراً ”بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اتنے میں اس کی گھریلو ملازمہ کافی کے تین مکڑے میں رکھے ان کے لیے لائی۔ رغم نے تو بے تابی سے اپنا مک اٹھایا۔ راعنہ ملازمہ کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔

اس کے جانے کے بعد راعنہ نے اپنا مک اٹھایا۔

”برائیدل اور جیولری سب ماما کے روم میں ہے۔ میں نے ملازمہ کو لانے کے لیے بھیجا ہے۔“ وہ رغم کو بتا رہی تھی۔

”کیسا برائیدل اور جیولری؟“ کوئل نے حیرانی سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ اسے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی ملازمہ شاہرزادہ اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔

”ادھر سامنے ٹیبل پر رکھ دو۔“ راعنہ نے اشارہ کیا تو اس نے ٹیبل سے بائی سب سامان اٹھا کر تمام شاہرزادہ وہاں رکھ دیے۔

راعنہ نے شاہرزادہ کوئل کو سب سامان باہر نکالا۔ کوئل حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بہت سے سوال چل رہے تھے۔

”یہ ہے میرا پرائیڈل جو شہریار نے خود لیا ہے۔“ راعنہ نے ایک عام سا عروسی سوٹ دیکھنے کے لیے ان کی طرف برہمایا۔

”یہ تمہارا پرائیڈل ہے اتنا عام سا۔“ کوئل کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ راعنہ کا شادی کا جوڑا اتنا کم قیمت بھی ہو سکتا ہے۔ یہ ٹھیک کہ راعنہ کے سرمائی اسٹینڈس میں راعنہ کے پایا کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ پر ان کی

حالت ایسی گئی گزری بھی نہیں تھی کہ وہ اپنی بہو کے

لیے شان دار سا برائیدل نہ بنا سکتے۔ رنم کی آنکھوں میں بھی وہی کومل والا سوال تھا۔

”یہ برائیدل شہریار نے خالصتاً اپنی کمائی سے خریدا ہے۔ اتنا کم قیمت بھی نہیں ہے پورے تیس ہزار کا ہے۔ حالانکہ پیانے جیولری برائیدل سینڈلز ہر چیز کا آرڈر کر دیا تھا، شہریار نے منع کر دیا۔ انہوں نے پیانے کو صاف صاف کہہ دیا ہے کہ وہ نہ جینز لیں گے نہ اپنے سرال والوں کی کوئی مدد لیں گے اور تو اور شہریار نے اپنے گھر والوں کو بھی منع کر دیا ہے کہ وہ میرے لیے کچھ مت لیں۔ شہریار نے میرے لیے سب کچھ خود اپنی کمائی سے لیا ہے۔“ راعنہ کے لہجہ میں بے پناہ فخر اور غرور تھا۔

شہریار کی خریدی گئی قیمت چیزیں ان چیزوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھیں جو وہ اپنے پیانے کے گھر میں استعمال کرتی رہی تھی۔ ”کوئٹ ایمیزنگ راعنہ“ رنم حیرانی کے حصار سے باہر آئی۔

”شہریار نے پیانے سے بولا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ خود سب کچھ بنالیں گے۔ فی الحال ان کے پاس جو کچھ ہے وہ انہیں قبول کرنا ہو گا۔ انہوں نے ولیمہ کا جوڑا بھی خود خریدا ہے۔“ وہ ایک کے بعد ایک ناقابل یقین خبر سنا رہی تھی۔

”اور تمہارے پیانے نے شادی ہے جو لگژری فلیٹ تمہیں گفٹ کرنا تھا اس کا کیا بنا؟“ رنم کو اچانک یاد آیا۔

”شہریار نے منع کر دیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ تم پیانے سے کچھ مت لینا۔ میرے پاس جو ہے تم اسی میں گزارا کرو گی۔ وہ بہت خوددار ہیں رنم۔“ راعنہ کی آواز میں ایک خاص قسم کا فخر اور غرور تھا۔

”تم کو کوئی اعتراض نہیں ہے؟“ کومل نے سوال کیا۔

”نہیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، بلکہ میں تو بہت خوش ہوں کہ شہریار اتنے خوددار ہیں۔ کوئی اور ہوتا تو خوشی خوشی ان سب چیزوں سمیت مجھے قبول کرتا، لیکن شہریار کو اپنی محنت پہ بھروسہ ہے۔ وہ

سرال کے بل بوتے پہ ترقی کرنا آگے بڑھنا نہیں چاہتے۔“

”تم گزارا کر لو گی؟“ رنم نے سوال کیا۔

”ہاں میں شہریار کے ساتھ ہر قسم کے حالات میں گزارا کر لوں گی، کیونکہ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔“ راعنہ کے چہرے پہ دلکش مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

رنم بے پناہ حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ یہ سب اس کے لیے بہت انوکھا اور حیران کن تھا۔ راعنہ جیسی آسائشوں میں پلی بڑھی لڑکی محبت کے بل بوتے پہ اپنے شوہر کے ساتھ ہر حال میں رہنے کا عزم کر چکی تھی۔ وہ شہریار کی طرف سے آئے عام سے عروسی سوٹ اور زیورات کے باوجود خوش تھی اور شہریار جیسے خوددار کردار تو صرف کہانیوں، فلموں اور ڈراموں میں ہی نظر آتے ہیں جو گھر آئی لکشمی کو ٹھکرا دیتے ہیں جو اپنے زور بازو پہ بھروسہ کرتے ہیں۔ باقی رات رنم کو نیند ہی نہیں آئی۔ وہ شہریار اور راعنہ کے بارے میں ہی سوچتی رہی۔



”رنم تیار ہو کر روینہ آپا کے گھر آگئی تھیں۔ وہاب حسب معمول اپنے آفس میں تھا۔ رنم نے اس کی عدم موجودگی سے اطمینان سا محسوس کیا۔ کیونکہ اس کی موجودگی میں کچھ جھپٹاؤ شوار تھا۔ ایک دفعہ زیان کے ساتھ کمال کا رشتہ طے ہو جاتا، پھر بعد کی بعد میں دیکھی جاتی۔ فی الحال رنم وہاب کے تیور اور دھمکی دونوں سے خائف تھیں۔“

”آپا جلدی کریں نا۔“ وہ بڑے صبر سے روینہ آپا کو بالوں میں برش کرنا دیکھ رہی تھیں۔ انہیں کمال احمد کے گھر جانے کی جلدی تھی۔ وہ اسی مقصد کے لیے روینہ آپا کی طرف آئی تھیں۔ کل رات بطور خاص انہیں فون پہ یاد دہانی کروائی تھی کہ میرے آنے سے پہلے تیار رہیں گے۔ ابھی آنے سے پہلے بھی انہوں نے آپا کو فون کیا تھا کہ میں گھر سے نکل رہی ہوں۔ یہاں

پہنچی تو وہ اطمینان سے بیٹھی ہوئی چائے پی رہی تھیں۔ ان کے شور مچانے پہ انہوں نے کپڑے بدلے۔ بال بنانے کے بعد انہوں نے پورے آرام سکون کے ساتھ چادر اوڑھی، مرس اٹھایا اور آئینے میں اپنا تنقیدی جائزہ لیا۔ ”چلیں“ روینہ، زرینہ کی طرف مرس جو اضطراب کے عالم میں تھیں۔ ”ہاں آپا چلیں“ پہلے ہی کافی دیر ہو گئی ہے۔ ”زرینہ پہ عجلت سوار تھی۔ کمال کے گھر ان کا استقبال سب سے پہلے گیٹ پہ متعین چوکیدار نے کیا۔ زرینہ اندر آکر جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ گھر پرانے وقتوں کا تعمیر شدہ تھا۔ اس لیے اس میں جدیدیت مفقود ہی تھی۔ کمال کی والدہ عفت خانم انہیں دیکھ کر پریشان اور ہراساں سی نظر آئیں۔ حالانکہ زرینہ نے دو دن پہلے ہی اپنے آنے کی اطلاع کر دی تھی۔

انہوں نے خیر مقدمی چہرے پہ سجاتے ہوئے حال احوال پوچھنے کے بعد دونوں بہنوں کو ڈرائنگ روم میں لا بٹھایا۔ یہاں جگہ جگہ بے ترتیبی نظر آرہی تھی۔ شاید صفائی کرنے والی نہیں آئی تھی۔ زرینہ نے دل ہی دل میں اندازہ لگایا جو بعد میں درست بھی ثابت ہوا۔ عفت خانم شرمندہ انداز میں بتا رہی تھیں کہ صفائی کرنے والی پورے ہفتے سے غائب ہے۔

”تب ہی گھر کا یہ حال ہے۔“ زرینہ نے دل میں کہا۔ عفت خانم گزشتہ چالیس منٹ سے اپنے دکھڑے رو رہی تھیں۔ اس دوران انہوں نے ایک بار مرو تا ”بھی دونوں بہنوں سے چائے پانی کا نہیں پوچھا۔ بہت دیر بعد جب روینہ نے بے زار ہو کر زرینہ کو آنکھوں آنکھوں میں آنکھنے کا اشارہ کیا تو تب عفت خانم کو مہمانوں کی خاطر مدارات کا خیال آیا۔

”اصل میں ہماری کھانا بنانے والی پچھلے ہفتے سے اپنے گاؤں گئی ہوئی ہے۔ کھانا بنا کر وہ فریج میں رکھ گئی تھی۔ کمال اور میں گرم کر کے کھا لیتے ہیں۔ روٹی کمال ہو مل سے لے آتا ہے۔ میں صرف چائے ہی مشکل سے بنا پاتی ہوں۔ جوڑوں کے درد نے لاچار کر دیا ہے“ کچھ بھی نہیں ہوتا مجھ سے۔ لیکن آپ دونوں تو خاص

الخاص ہیں ہمارے لیے۔ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ عفت خانم وضاحت دینے کے بعد باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔

روینہ کی نگاہ پورے ڈرائنگ روم کا جائزہ لے رہی تھی۔ سامنے رنگ اتری دیوار پہ ایک تصویر فریم میں لٹکی تھی۔ انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے بہن کی طرف دیکھا، جیسے پوچھنا چاہ رہی ہوں کہ یہ کس کی ہے۔ زرینہ نے فوراً ”ان کا سوال سمجھ لیا۔

”یہ کمال کی فوٹو ہے“ عفت خانم کا بیٹا تین بہنوں کا اکلوتا بھائی جس کا رشتہ زیان کے لیے آیا ہے۔“ روینہ سر ہلا کر رہ گئیں۔ وہ معنی خیز نگاہوں سے زرینہ کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ انہیں عفت خانم، گھر اور کمال کی فوٹو کچھ بھی پسند نہ آیا تھا۔ بندہ مہمانوں کا ہی خیال کر لیتا ہے۔ پورے ایک گھنٹے بعد عفت خانم کو چائے پانی کا خیال آیا تھا۔ روینہ اٹھنا چاہ رہی تھیں۔ پر زرینہ نے ہاتھ پکڑ کر اس عمل سے باز رکھا۔

وہ کون سا یہاں خوشی سے بیٹھی تھیں۔ رشتے کا خیال نہ ہوتا تو کب کی یہاں سے جا چکی ہوتیں۔ فطرتاً ”وہ صفائی پسند اور سلیقہ مند عورت تھیں۔ یہاں جگہ جگہ گرد، مٹی، دھول اور بے ترتیبی دیکھ کر ان کی نفاست پسند طبیعت خراب ہونا شروع ہو چکی تھی۔ اسی وجہ سے عفت خانم کی بنائی چائے کے چند کھونٹ زبردستی پیے۔ کالی، بد رنگ، بد ذائقہ چائے تھی ساتھ باسی فروٹ لیک۔ حالانکہ زرینہ آتے ہوئے ان کے گھر کیک، مٹھائی اور کافی سارا موسمی فروٹ بھی لائی تھیں۔ عفت کو اتنی لوسٹ نہیں ہوئی کہ ان میں سے ہی کچھ مہمانوں کے آگے رکھ دیتیں۔

چائے پی کر عفت خانم کے لاکھ روکنے کے باوجود دونوں وہاں سے اٹھ آئیں۔ باہر نکل کر سکرن کا سانس لیا۔ جیسے جیل سے رہائی لی ہو۔ عفت خانم کے گھر عجیب سی بساند پھیلی ہوئی تھی جو وہاں بیٹھے مسلسل محسوس ہوتی رہی، پھر زرینہ نے ایک پار بھی اظہار نہیں کیا۔ انہیں گھنیا سی خوشی ہو رہی تھی۔ زیان کو کمال کے گھر میں جو جو مسائل پیش آنے تھے اس کا

اندازہ زریںہ کو قبل از وقت ہی ہو گیا تھا۔ زیان کا سارا غرور، خیرہ، اکڑ دھری کی دھری رہ جانے والی تھی۔ امیر علی اپنے باپ کے گھر میں اس نے بہت عیش کر لیے تھے۔ اب عفت خانم کے گھر بھگتنے کی باری اس کی تھی۔ زریںہ بہت مسرور تھیں۔



زریںہ، امیر علی کے بیڈ کے پاس کرسی رکھے اس پر بیٹھی آہستہ آواز میں بات کر رہی تھیں۔ سب اپنے اپنے کمروں میں تھے۔

”میں دیکھ آئی ہوں آیا رومینہ کے ساتھ کمال کا گھر!“ اتنا بول کر وہ چپ ہو گئیں۔ وہ دراصل ان کی تجسس کو ابھارتا چاہ رہی تھیں۔ امیر علی خاموشی سے ان کے اگلے جملے کا انتظار کر رہے تھے۔ سوزریںہ خود ہی پھر سے شروع ہو گئیں۔

”اتنے بڑے گھر میں صرف عفت خانم تھیں، کمال آفس میں تھا۔ انہوں نے اتنے اچھے طریقے سے خاطر مدارات کی کہ دل خوش ہو گیا ہے۔ زیان وہاں راج کرے گی راج۔ نہ کوئی روک نہ ٹوک۔ اپنی مرضی سے کرے گی۔ میں تو کہتی ہوں کہ اب کوئی چھوٹی مولیٰ ہی رسم ہی کریں اور ساتھ ہی شادی کی تیاری کریں۔“

”تمہیں اتنی جلدی کیوں ہے؟“ ان کی اتنی باتوں کے جواب میں انہوں نے مختصر سوال کیا پر زریںہ تیار تھیں۔

”کمال بہت اچھا لڑکا ہے، انہیں شادی کی جلدی ہے، ایسا نہ ہو یہاں سے مایوس ہو کر وہ کسی اور طرف کا رخ کر لیں اور زیان بیٹھی رہ جائے۔“ آخری جملے پر امیر علی نے تڑپ کر ان کی طرف دیکھا۔

”میری بیٹی میں کوئی عیب یا کروار میں خرابی نہیں ہے۔ لاکھوں میں ایک ہے وہ۔ بہت اچھا مقدر ہو گا اس کا۔ اللہ نہ کرے وہ بیٹھی رہے۔“ امیر علی اچانک تلخ ہو گئے۔ زریںہ وقتی طور پر خاموش ہو گئیں، امیر علی کا رویہ حیران کن تھا۔ وہ جلدی زیان نامی بلا کو سر

سے اتارنا چاہ رہی تھیں۔ اس میں اتنی ہی رکاوٹیں پیش آرہی تھیں۔ ادھر امیر علی کی محبت جاگ اٹھی تھی۔

”میرا وہ مطلب نہیں ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں۔“ زریںہ نے فوراً ”مصلحت کا لبادہ اوڑھتے ہوئے نرم لہجہ اختیار کیا۔“ زیان ماشاء اللہ خوب صورت ہے۔ تب ہی تو کمال جیسے نوجوان کا رشتہ آیا ہے۔“ انہوں نے بمشکل خود کو ”مرد“ کہنے سے روکا۔

”زیان میں کوئی کمی یا عیب نہیں ہے۔ میں تو ہر وقت آپ کی صحت کی طرف سے پریشان رہتی ہوں۔ میں کہتی ہوں آپ جلدی اس فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔“ بوجھ کہتے کہتے زریںہ نے بروقت فرض بولا تھا۔ دل ہی دل میں خود کو داؤ بھی دی۔

”ہاں دیکھو کیا حکم میرے رب کا۔ وہ اچھی ہی کرے گا۔“ امیر علی نے آنکھیں موند لی تھیں، جیسے اب مزید کوئی بات نہ کرنا چاہ رہے ہوں۔ زریںہ کو دل میں بہت غصہ آیا۔



افشاں بیگم اور ملک جہانگیر دونوں لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ موسم بہت خوب صورت تھا۔ ملک جہانگیر نے بہت دن بعد لان میں بیٹھ کر چائے پینے کی فرمائش کی تھی۔

”ملک صاحب آپ اپنے دوست کے گھر دوبارہ کب جائیں گے۔ پہلے آپ بہت جلدی میں تھے۔“ افشاں بیگم کے دل میں اس وقت اچانک یہ بات آئی تھی۔ انہوں نے قصہ چھیڑ کر ملک جہانگیر کی توجہ پھر سے اس زیر التوا مسئلے کی طرف مبذول کروادی تھی۔ ”ہاں جاؤں گا سیال کی طرف بھی۔ اس نے بولا تو تھا کہ پہلے اپنی بیٹی کی رائے لوں گا۔ اس کے بعد بتاؤں گا۔“ چائے سب کرتے ہوئے ملک جہانگیر نے اطمینان سے افشاں بیگم کو جواب دیا۔

”ویسے معاذ کی جگہ ایک کی بات چلا کر آپ نے اچھا نہیں کیا ہے، ممکن ہے اس کے دل میں یہ بات

ہے، مجھے فخر ہے اس پر۔“ راعنہ اس بار قدرے غصے سے بولی تو کومل جہاں کی تہاں بیٹھی رہ گئی۔

دلہن بن کر راعنہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس کا عروسی لباس اور جیویری اتنی قیمتی نہیں تھی پر ایسی گئی گزری بھی نہیں تھی۔ شہریار کو جواب شروع کیے اتنا زیادہ ٹائم نہیں ہوا تھا۔ اس نے اپنی حیثیت کے مطابق ہی سب کچھ لیا تھا۔ نہ تو اس نے اپنے والدین سے شادی جیسا معاشرتی فرض نبھانے کے لیے کوئی مالی مدد لی تھی اور نہ ہی راعنہ کے پیار سے کچھ لینا گوارا کیا تھا۔ اسے اپنی محنت اور اللہ پہ بھروسہ تھا۔ وہ اکثر نوجوانوں کی طرح شارٹ کٹ جیسے راستوں سے راتوں رات ترقی کی منازل طے کرنے والے خواب نہیں دیکھتا تھا۔ اس نے اللہ کا نام لے کر جاب کے ساتھ اپنا پارٹ ٹائم بزنس بھی شروع کر دیا تھا۔ یہ اسی کی برکت تھی کہ اس نے راعنہ کے لیے شادی کی خریداری کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا چھوٹا سا گھر بھی خرید لیا تھا۔

اسے جب راعنہ کے برابر لا کر بٹھایا گیا تو انجانے سے تقاخر سے اس کی گردن اور سر اوپر اٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں اور چہرے کی چمک بتا رہی تھی کہ راعنہ کے مقابلے میں اپنی حیثیت پر شرمندہ نہیں ہے۔ اس کے پاس راعنہ کے پیار جتنی دولت نہیں تھی، لیکن اس کے انداز اور شخصیت سے کسی بھی قسم کا احساس کمتری نہیں جھلک رہا تھا۔

رغم، راعنہ سے قدرے دور کھڑی اسے دیکھتے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی۔ اگر ایسا برائیدل ڈریس اس کا ہوتا تو وہ اتنے مہمانوں کے بیچ کبھی نہ پہنتی۔ پر راعنہ کتنی مسرور تھی۔ رغم کے لیے تو یہ بات ہی حیران کن تھی کہ شہریار، راعنہ سے کم حیثیت ہوئے کے باوجود سسرال سے کسی بھی قسم کی مدد نہیں لے رہا تھا۔ وہ چاہتا تو بہت آسانی سے سب کچھ حاصل کر سکتا تھا۔ کیونکہ راعنہ کے پیار بیٹی کو گھر، گاڑی، بینک بیلنس، بیش قیمت فریچر، زیورات سب کچھ ہی تو دینا چاہ رہے تھے۔ پر شہریار نے سب کچھ لینے سے انکار کر دیا تھا اور

ہو، تب ہی تو میرا ایک خاموش خاموش سیارہ لگا ہے۔“ افشاں بیگم نے نازک سی بات کر دی تھی۔

”میں ایک کا باپ ہوں، اس کی مرضی کے بغیر اس کی زندگی کا اتنا اہم فیصلہ کیسے کر سکتا ہوں۔“

”آپ کی مہربانی ہوگی، ملک صاحب اگر آپ ایسا کریں تو۔“ جواباً وہ مسکراتے لگے۔ ”تم فکر مت کرو۔“

”ٹھیک ہے ملک صاحب میں فکر نہیں کرتی پر معاذ کے بارے میں بھی سوچیں، وہ پردیس جا کر بیٹھ گیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی گوری بغل میں داب کے لیے آئے۔“ ایک ماں کی حیثیت سے افشاں بیگم کی پریشانی فطری تھی۔

”معاذ کا بھی کرنا پڑے گا کچھ۔ سچ پوچھو تو اچھے سیال کی بیٹی میں نے اس نالائق کے لیے ہی پسند کی تھی۔ وہ ناخلف مجھے مشورہ دے رہا تھا کہ پہلے بڑے بھائی کی شادی کر دیں۔“ ملک جہانگیر تھوڑے تلخ ہو گئے تھے۔ اس لیے افشاں بیگم نے فوراً ہی ان سے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔



راعنہ پارلر جانے کے لیے تیار تھی۔ ملازمہ اس کا عروسی لباس اور دیگر چیزیں رکھ رہی تھی۔ کومل اور رغم دونوں اس کے ساتھ جا رہی تھیں۔ ”تمہیں اپنا برائیدل پسند ہے؟“ گاڑی پارلر جانے والی سڑک پہ مڑ رہی تھی، جب کومل نے گھما پھرا کر تیسری بار یہ ہی سوال کیا۔

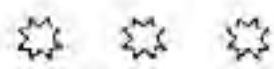
”ہاں مجھے بہت پسند ہے۔“ وہ پورے اعتماد سے بولی۔

”تمہیں اس آرڈینری ڈریس کو پہن کر آکورد فیل نہیں ہوگا؟“ کومل نے اب ایک نئے زاویے سے سوال کیا۔

”کیوں آکورد فیل ہوگا ساری عمر اپنے پیار کے دیے ہوئے پیسوں سے خریداری کی ہے، بے دردی سے رقم خرچ کی ہے۔ یہ شہریار نے اپنی کمائی سے خریدا

راعنہ کو بھی سختی سے منع کیا تھا۔

رنم جلد از جلد گھر جا کر اپنے پیارے یہ خبر شیر کرنا چاہ رہی تھی۔



رومینہ آیا آئی ہوئی تھیں۔ کمال اور عفت خانم کے گھر سے واپسی کے بعد آج زرینہ کے یہاں ان کا پہلا چکر تھا۔ اس کے بعد بہن سے ان کی بات ہی نہیں ہوئی۔ وہ معلوم کرنا چاہ رہی تھیں کہ کمال کے بارے میں امیر علی نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ ادھر ادھر کی باتوں کے دوران رومینہ نے اچانک بہن سے یہ سوال کر لیا۔ ”امیر بھائی نے کیا فیصلہ کیا کمال کے رشتے کے بارے میں؟“

”ابھی تک تو اونٹ کسی کرب نہیں بیٹھا ہے۔ آپ کے بھائی کہتے ہیں کہ اتنی جلدی کا ہے کی ہے۔“ وہ برا سامنہ بناتے بولیں۔

”ویسے سچ پوچھو تو مجھے کمال کی ماں سے مل کر ذرا بھی کسی خلوص یا گرمجوشی کا احساس نہیں ہوا۔ پھر گھر کی حالت کیسی عجیب سی ہے۔ اوپر سے کمال کی جو فوٹو میں نے دیکھی، مجھے کمال بھی پسند نہیں آیا ہے۔ اتنی زیادہ عمر کا لگ رہا ہے۔ کم سے کم لڑکا زیان کے جوڑ کا ہو۔“ رومینہ نے تو بڑے عام سے انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ پر زرینہ بیگم کو بہت غصہ آیا۔ رومینہ آیا، کمال، اس کے گھر اور اس کی ماں عفت خانم کے خلاف بولتے ہوئے درحقیقت زیان کی سائیڈ لے رہی تھیں اور یہ ہی اس معاملے کا اختلافی پہلو تھا۔ ”اتنی بھی زیادہ عمر کا نہیں ہے کمال۔ رہی گھر کی بات تو اچھا کماتا، کھاتا لڑکا ہے۔ گھر بھی ٹھیک کروالے گا۔ زیان کے عیش ہوں گے۔ نندیں اپنے گھروں کی ہیں۔ ساس بوڑھی اور بیمار ہے، اس کا اپنا رائج ہو گا۔“ زرینہ بڑھ بڑھ کر کمال کی حمایت میں بول رہی تھیں۔

پر بہن کے لاکھ چاہنے کے باوجود بھی وہ اس سے متفق نہیں ہو پا رہی تھیں۔ کچھ بھی سہی وہ لاکھ بری ہونے کے باوجود زرینہ کی طرح دشمنی اور بدگمانی میں

اندھے ہو جانے والوں میں شامل نہیں تھیں۔ وہاب ان کا لاڈلا بیٹا زیان کی محبت میں پاگل تھا۔ اس کی خوشی دیکھتے ہوئے رومینہ ماں ہونے کی حیثیت سے چاہ رہی تھیں کہ زیان کا رشتہ وہاب سے ملے ہو جائے پر زرینہ ان کی ماں جالی اس حق میں نہیں تھی۔

رومینہ اپنی بہن کی فطرت، ہٹ دھرمی اور ضد سے اچھی طرح واقف تھیں۔ اس لیے انہیں ایک فیصد بھی امید نہیں تھی کہ زرینہ اس رشتے پہ آمادہ ہوگی۔ اس لیے وہ خاموش ہو گئی تھیں۔ پر کمال کی صورت میں زرینہ نے زیان کے لیے جو رشتہ اسے دکھایا تھا، وہ بھی زیان کے لیے ہر لحاظ سے ناموزوں تھا۔ چپ چاپ خاموش گہری اداس آنکھوں والی زیان پہ نہ جانے کیوں انہیں رہ رہ کر ترس آ رہا تھا۔



زیان کالج سے لوٹی تو گھر میں سناٹا تھا۔ ویسے بھی اس وقت سب کھانا کھا کر آرام کرتے تھے۔ آفاق، رائیل اور منابل اس سے پہلے گھر آتے اور کھانا کھا کر اپنے اپنے کمرے کی راہ لیتے۔ زیان کی کالج سے گھر واپسی پہ کوئی بھی باہر نہ نکلتا، سوائے بوا کے۔ وہ ایک ماں کی طرح اس کا خیال رکھتیں اور ایک ایک چیز کی فکر کرتیں۔ عرصہ دراز سے اس گھر میں تھیں، سو لیکنوں کے مزاج سے واقف تھیں۔

زیان نے بیگم میل پہ رکھا۔ پاؤں جرابوں اور شوز کی قید سے آزاد کیے۔ موسم میں خنکی تھی۔ اس نے لینن کا سوٹ الماری سے نکالا اور درغی فارم اتار کر وہی پہنا۔ کپڑے بدل کر وہ باہر ہی آرہی تھی جب بوا سے مڈ بھٹھڑ ہوئی۔

”السلام علیکم بوا۔“ زیان نے خوش گوار لہجہ میں کہا تو وہ نہال سی ہو گئیں۔ کتنے دن بعد انہوں نے آج اس کا ہلکا پھلکا موڈ دیکھا۔ وہ اداس یا پر مڑہ نظر نہیں آرہی تھی۔

”کیا بات ہے، آج بہت خوش نظر آرہی ہو بیٹی۔“ انہوں نے محبت سے اسے تکتے ہوئے پوچھا۔

”بوا کل سے ہمارے کالج میں اسٹوڈنٹس ویک شروع ہو رہا ہے، میں نے بھی ایک ڈرامے میں حصہ لیا ہے۔ کل وہ ڈراما ہماری کلاں کالج اسٹیج پر ایکٹ کرے گی۔ سب میری بہت تعریف کر رہے ہیں۔ آپ کو کیا بتاؤں۔“ وہ بے پناہ خوش تھی۔

”اچھا تو کل تم ڈرامے میں حصہ لو گی؟“ اسے خوش دیکھ کر بوا بھی خوش تھیں۔

”بوا کل میں اپنی فرینڈز کے ساتھ کالج جاؤں گی ڈراموں کے ساتھ نہیں۔“

”ہاں میں اسے بتاؤں گی تم بے شک اپنی سہیلیوں کے ساتھ چلی جانا۔ اب تم آؤ ہاتھ منہ دھو کر میں کھانا لارہی ہوں۔“

”بوا آج مجھے بھوک نہیں ہے۔“

”کیسے بھوک نہیں ہے، میں نے تمہاری پسند کی چیزیں بنائی ہیں۔“ بوا نے پیار بھرا اصرار کیا۔

”رات کو کھانوں گی نا، یہی بھی بھوک نہیں ہے۔ آپ چائے کے ساتھ دو کباب فرانی کریں مجھے۔“ بوا مایوس سی ہو گئیں تو زیان سے رہا نہیں گیا، جھٹ چائے کا بول دیا۔

”میں ابھی لاتی ہوں۔“ بوا کا چہرہ پھول کی طرح کھل اٹھا۔ وہ بچن میں گئیں تو زیان پھر سے کل کے دن کے خیال میں ڈوب گئی، جب کل اسے اسٹیج پہ ڈراما ایکٹ کرنا تھا، اپنا رول ادا کرنا تھا۔



رات سیر آگئی تھی اور نیند تھی کہ آنے کا نام نہ لے رہی تھی۔ کرو میں لینے کے باوجود نیند کا نام و نشان تک نہ تھا۔ زیان بستر سے اٹھی اور کپڑوں کی الماری کے ساتھ مصروف ہو گئی۔ کچھ دیر بعد وہ اسے کھول چکی تھی۔ اوپر والے خانے میں ایک کالا شاپر رکھا تھا۔ زیان نے ہاتھ بڑھا کر وہ شاپر اتارا۔ اندر شاپر میں امیر علی کا براؤن کرتا اور سفید شلوار تھی۔ ایک چھوٹے لفافے میں مونچھیں تھیں ساتھ ہی استعمال کے عام چپل بھی تھے، جو سائز میں اس کے نرم و نازک پاؤں

سے تھوڑے زیادہ تھے۔ اس نے یہ ہی سوٹ پہن کر اور نقلی مونچھیں لگا کر ریسرپل کی کھی اور سب نیچرز سا تھی طالبات سے خوب داد وصول کی تھی۔ آواز بدلنے میں اس کا کافی تجربہ ہو گیا تھا۔ یہ ہی وجہ ہے جب وہ اپنے مکالمے بول رہی تھی تو بالکل بھی نہیں لگ رہا تھا کہ یہ آواز کسی لڑکی کی ہے۔ بالکل مردانہ آواز محسوس ہو رہی تھی۔

زیان نے شاپر بستر پہ اپنے سر ہانے رکھ لیا۔ لائٹ بند کر کے وہ پھر سے بستر پر دراز ہو گئی۔ اس بار نیند کے مہمان ہونے میں دیر نہیں لگی تھی۔

صبح اس کی آنکھ معمول سے پہلے کھولی، لیکن اس کے لیے یہ مناسب وقت تھا۔ وہ دوبارہ سوئی نہیں۔ ہاتھ روم میں جا کر کپڑے تبدیل کیے۔ اب اس کے جسم پر براؤن مردانہ کرتا اور سفید شلوار تھی۔ کرتا بہت گھلا اور شلوار لمبی تھی۔ شلوار اس نے نیچے والی جگہ سے موڑ کر اندر کر لی۔ اب اس کی لمبائی اتنی زیادہ نہیں لگ رہی تھی، مگر کرتا جوں کا توں تھا۔ یہ بات اس کے حق میں جارہی تھی، کیونکہ کھلے کرتے نے اس کے جسمانی نشیب و فراز کو کافی حد تک چھپا لیا تھا۔ ویسے بھی تو وہ دلی پکلی سی تھی۔

اب بالوں کا مسئلہ تھا۔ زیان کے بال لمبے کمرے نیچے تک جارہے تھے۔ اس نے موڑ کر بل دے کر چٹیا سی بنائی۔ پھر اسی چٹیا کو بل دے کر سر کے گرد گولائی میں لپیٹ کر سر کے بالوں پر مضبوطی سے ڈھیر سی پٹی لگا دیں۔ اب بالوں کا آسانی سے کھلنا کافی مشکل تھا۔ پھر زیان نے اپنی سفید چادر نکالی، اسے لمبائی میں لگا کر درمیانے سائز کے دوپٹے کی شکل دی۔ اب اسی چادر نما دوپٹے کو اس نے سر کے گرد پگڑی کی صورت میں لپیٹ دیا۔ اب اس کے سر کے بال مانتے کے اوپر والا حصہ پگڑی میں چھپ گیا تھا۔ کانوں میں پٹی لگی جھوٹی چھوٹی بالیاں وہ رات کو ہی نکال چکی تھی۔ بانی کسی قسم کی جیولری وہ پہنتی ہی نہیں تھی۔ ہاں کلائی میں ایک موٹا سا کڑا خاص طور پہ پہنا تھا، جو لڑکے عام طور پہ پہنتے ہیں۔

ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کے ناخن وہ کاٹ چکی تھی۔ تیار ہونے کے بعد اس نے خود کو آئینے میں دیکھا تو ایک ٹائیپ کے لیے پہچان ہی نہیں پائی کہ آئینے میں نظر آنے والی صورت اسی کی ہے۔ مونچھیں لگانے سے رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی۔ اب کہیں سے بھی وہ لڑکی نہیں لگ رہی تھی۔ بلکہ دبلا پتلا نو عمر لڑکا نظر آرہی تھی۔

ڈھیلے ڈھالے کرتے اور نقلی مونچھوں کے اضافے نے بہت کچھ چھپا لیا تھا۔ وہ اپنے بہروپ سے پوری طرح مطمئن تھی۔ بس گھر سے نکلنے کا مرحلہ باقی تھا۔ بوا کو اس نے رات میں ہی کہہ دیا تھا کہ صبح وہ ناشتا نہیں کرے گی نہ ڈرائیور کے ساتھ کالج جائے گی۔ چھ سات ماہ سے وہ ڈرائیور کے ساتھ کالج جا رہی تھی، ورنہ پہلے وین اسے کالج چھوڑتی اور گھر واپس لاتی تھی۔ جب سے نیا ڈرائیور آیا تھا تب سے وہ اس کے ساتھ جاتی تھی۔

پر آج ڈرائیور کے ساتھ کالج جانا اس کے پروگرام میں شامل نہیں تھا۔ صبح کے سات بجتے ہی زیان نے اپنے کمرے کا دروازہ ذرا سا کھول کر خود کو پیچھے کیے کے باہر جھانکا، کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ رائیل، منابل اور آفاق تینوں آٹھ بجے ڈرائیور کے ساتھ گھر سے نکلتے۔ زیان بھی ان کے ساتھ ہوتی تھی۔ وہ سب سے آخر میں زیان کو کالج چھوڑتا۔ پر آج زیان نے پروگرام بدل لیا تھا۔

بوا اٹھ چکی تھیں اور ناشتے کی تیاری میں لگی تھیں۔ ان کے ساتھ مدد کروانے کے لیے شیمینہ بھی تھی۔ گویا زیان کے لیے میدان صاف تھا۔ اس نے ڈرائیونگ سیکل پہ پڑی امیر علی کی مردانہ ریسٹ وایج اٹھا کر اپنی کلائی پہ باندھی یہ قیمتی مردانہ گھڑی اس کی کلائی میں کافی ڈھیلی تھی۔ پر زیان کو غنیمت لگ رہی تھی۔ امیر علی کی یہ گھڑی کافی پرانی تھی۔ کچھ دن پہلے ہی زیان کو دراز میں سب سے پچھلے حصے میں پڑی نظر آئی تو اس نے اٹھا کر اپنے کمرے میں رکھ دی۔ یہ ریسٹ وایج اس مردانہ بہروپ پہ بہت کام آرہی تھی

جو زیان نے اس وقت دھارا ہوا تھا۔

پاؤں میں ناپ سے قدرے بڑے سلپپر پہن کر اس نے آخری بار آئینے میں خود کو تنقیدی نگاہوں سے دیکھا۔ بہروپ مکمل تھا۔ اس نے مطمئن ہو کر گھر سے نکلنے سے قبل ایک بار پھر باہر کا جائزہ لیا۔ کچن اس کے بیڈ روم کے مخالف سمت میں قدرے الگ جگہ بنا ہوا تھا۔ وہ اگر اپنے کمرے سے نکل کر بیرونی گیٹ تک جاتی تو کسی کی بھی نظروں میں نہ آتی کیونکہ بوا اور شیمینہ کچن میں اپنے کام میں لگی ہوئی تھیں۔ زرینہ بیگم نو بجے بے وار ہو کر ناشتا کرتیں۔ تینوں بچے اسکول کے لیے تیار ہو رہے تھے، جبکہ ڈرائیور اپنے کوارٹر میں تھا۔ فی الحال کوئی اور نہیں تھا جس کی نظر زیان پہ پڑتی۔ اس نے آہستگی سے دروازہ کھول کر کمرے سے باہر پہلا قدم رکھا اور پھر تقریباً ”بھاگنے والے انداز میں کمرے سے گیٹ تک کا فاصلہ طے کیا۔ گیٹ سے باہر کوئی ذی روح نہ نہیں آ رہا تھا۔

اس کا دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا۔ سرمستی کا احساس رگ و پے میں بھریکا تھا۔ اسے پہچانا نہیں گیا۔ وہ نئے روپ میں قبول کی جا چکی ہے۔ گویا اس نے ذرا مے کے لیے جو مردانہ روپ دھارا تھا وہ سو فیصد کامیاب تھا۔ بہروپ مکمل تھا۔ یہ خیال آتے ہی اس کی چال میں اور بھی اعتماد آ گیا تھا۔ وہ ٹھٹھنے کے انداز میں آرام سے چلنے لگی۔ کچھ آگے چند قدموں کے فاصلے پہ ایک مارکیٹ تھی۔ زیادہ تر دکانیں بند تھیں۔ ایک آدھ ہی کھلی تھی۔ دکانوں سے آگے کنارے پہ کھڑی دو آدمی آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ زیان نے فوراً ”ایک فیصلہ کیا اور عمل بھی کر ڈالا۔ وہ ان دو آدمیوں کے پاس پہنچ گئی۔

”بھائی جان پی سی او کدھر ہے؟“ اس نے لہجے میں حتی الامکان اکھڑپن سمونے کی کوشش کی۔ وہ اچانک ان کے سامنے آئی تھی۔ دونوں اپنی اپنی باتوں میں مصروف تھے۔ جب دبلے پلے لڑکے۔ نہ انہیں مخاطب کیا۔ وہ منتظر نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ موٹی موٹی مونچھوں کے برعکس اس کے چہرے پہ بڑی

ملاحظت تھی۔ مونچھیں کسی طرح بھی اس کی پوری شخصیت کے ساتھ میل نہیں کھا رہی تھیں۔

دونوں آدمیوں میں سے ایک نے بڑے غور سے اس کی سمت دیکھا۔ اس کا رنگ سانولا، جسم مضبوط اور آنکھوں میں سرخی تھی، تیر چھیدی نگاہ تھی اس کی۔ ”یہاں کوئی لی سی او نہیں ہے۔ ہمارے گھر چلو پاس ہی ہے، فون کر لینا ساتھ دو چار باتیں کر پس گے۔ چائے پانی بھی پی لینا۔ ویسے اس شہر کے لگتے نہیں ہو۔“

دوسرے آدمی نے آفر کی۔ یہ پہلے کی نسبت کالا اور بھاری ذیل ڈول کا مالک تھا۔ چہرے پہ چچک کے داغ تھے جو اس کی بدنمائی میں اور بھی اضافہ کر رہے تھے۔ پہلے والے آدمی نے ذیان کے پاؤں میں موجود اس کے سائز بڑے جوتوں کو معنی خیز دھبھتی نگاہوں سے دیکھا۔ اور ساتھ ہی دوسرے آدمی کو ہاتھ سے کوئی اشارہ کیا۔ جسے ذیان بالکل بھی نہیں سمجھ پائی۔ دونوں اب ذیان کے نرم و نازک گلابی پاؤں کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے آپس میں نگاہوں کی زبان میں کوئی بات کی۔ ذیان کے دل میں خدشات کا الارم زور و شور سے بجنے لگا۔

”نہیں بھائی جان! میں آگے جا کر کہیں اور سے فون کروں گا۔“ ان دونوں مردوں کی ہوس ناک نگاہوں کو اس نے عورت کی فطری حس کی وجہ سے فوراً ”بڑھ لیا۔ وہ جلد از جلد ان سے دور ہونا چاہ رہی تھی۔ لیکن ان کے تیور ہرگز ایسے نہیں تھے جو آسانی سے اسے جانے دیتے۔ ایک ذیان کے دام میں اور دوسرا بائیں جانب آکر کھڑا ہو گیا۔

کیا مہمن لمائی لونڈا سے تو یا رہ لگتا ہے اوپر والے نے لڑکی بناتے بناتے بالکل آخری وقت میں نہیں۔ لڑکا بنا دیا ہے۔“ ایک نے ذیان کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے یہ جملہ سو فی صد اسی کے بارے میں کہا تھا۔ اپنے کندھے پہ پڑا ہاتھ ذیان کو کسی سانپ کی مانند زہریلا محسوس ہوا۔ اس نے تیزی سے اس آدمی کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹاتے قدم آگے بڑھائے۔ وہ دونوں بھی اس کے ساتھ چلنا شروع

ہو گئے۔ ذیان کی کوشش تھی جلد از جلد ان سے آگے نکل جائے۔ اگلے موڑ یہ لی سی او نما کھوکھا تھا۔ وہ سوچے سمجھے بغیر اس کی سمت بڑھی۔

اندروں تین آدمی تھے اس کے دل کو ڈھارس سی ہوئی۔ ذیان کو کھوکھے کی سمت لپکتا دیکھ کر وہ دونوں ادھر ہی رک گئے۔ تاہم ذیان اب بھی ان کی نگاہوں کا مرکز تھی۔ ”میں فون کرنا اے“ (مجھے فون کرنا ہے) ذیان نے اپنی طرف سے بڑی گاڑھی پنجابی بولی۔

کھوکھے کے باریش مالک نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور سامنے پڑا فون سیٹ اس کی سمت کھسکایا۔ ذیان نے اعتماد سے اپنی ایک کلاس فیلو کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے کسی ملازم نے فون اٹینڈ کیا۔ ”السلام علیکم طارق گل کروا آں (السلام علیکم! طارق بات کر رہا ہوں۔) وہ دوسری طرف کی سنے بغیر شروع ہو گئی۔“ باریش آدمی نے اپنے سامنے کھڑے دوسرے گاہک کو دیکھا اور پھر باتیں کرتی ذیان کو۔

”اللہ کی شان یہ نرم و نازک نوجوان بالکل لڑکی لگ رہا ہے۔“ باریش شخص نے یہ جملہ اپنے سامنے کھڑے دوسرے آدمی سے ذیان کی سمت اشارہ کرتے ہوئے ادا کیا۔ وہ فون پہ اپنی ہی ہانک رہی تھی۔ ورنہ من کر پریشان ہو جاتی۔ بات ختم کر کے اس نے مطلوبہ رقم باریش آدمی کے ہاتھ پہ رکھی اور آگے کی سمت بڑھ گئی۔

جوں ہی وہ کھوکھے سے باہر آئی وہ دونوں آدمی بھی فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے چل پڑے۔ ان کی نظر ذیان پہ تھی ذیان اس بات سے بے خبر سوزو کیوں کے اڑے گی طرف جاری تھی۔ وہاں بڑی چمپل پہل تھی۔ پاس ہی مین روڈ تھا۔ اسکول و کالج دفاتر میں آنے جانے والے اپنی اپنی گاڑی کے انتظار میں تھے۔ ذیان کو فوراً اپنے کالج کے روٹ کی سوزو کی مل گئی اور وہ اس میں سوار ہو گئی۔ اس کے ساتھ وہ دونوں آدمی بھی سوزو کی میں سوار ہو گئے۔ ذیان سے پہلے دو آدمی گاڑی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ لیڈیز والی ساری سیٹیں خالی تھیں۔ ذیان اس طرف بیٹھی تھی۔ ذرا دیر بعد حواس قابو میں

آئے تو اس کی نگاہ فوراً ان ہی دو آدمیوں پہ پڑی۔ وہ  
ذیان کو ہی دیکھ رہے تھے۔ غلیظ خباثت بھری نگاہیں جو  
ان کے ہوس ناک ارادوں کا پتہ دے رہی تھیں۔ وہ کسی  
طرح بھی اس کا پیچھا چھوڑنے کے موڈ میں نہیں تھے۔  
اگلے اسٹاپ سے عورتیں سوار ہوئیں تو کلینر نے ذیان  
کو مردوں والے حصے کی طرف آنے کا اشارہ کیا۔

”بھائی وہاں بیٹھو یہ لیڈیز سیٹیں ہیں۔“ ناچار ذیان  
مردوں والے حصے کی آخری سیٹ پہ بیٹھ گئی۔ بھاری  
ڈیل ڈول رکھنے والے آدمی کا کندھا اس کے کندھے  
سے ٹکرا رہا تھا۔ وہ جان کر مزید اس کے قریب ہوا تو  
ذیان بالکل کونے کی طرف ہو گئی۔ پہلی بار اسے اپنی  
حماقت کا احساس ہوا۔ سوز کی دوبارہ چلنے لگی۔ آگے  
جا کر ذیان کی دو کلاس ٹیلور سوار ہوئیں تو اس کی جان  
میں جان آئی۔ وہ جھٹ اپنی سیٹ سے اٹھی اور ان کے  
برابر بیٹھ گئی۔

”اندھے ہو کیا نظر نہیں آتا۔ یہ عورتوں کی سیٹ  
ہے۔“ اس کی کلاس فیلو سدرہ دھاڑ سے مشابہہ آواز  
میں غرائی۔ ذیان کے چہرے پہ سینے کے قطرے ابھر  
آئے۔ کیونکہ سب مرد اسے دیکھ رہے تھے۔ کیا خبر  
سدرہ کے شور مچانے پہ اس کی ٹھکانی ہی نہ شروع  
کر دیتے۔

”سدرہ یہ میں ہوں ذیان۔“ وہ سرگوشی سے  
مشابہہ آواز میں بولی۔ سدرہ نے اسے غور سے دیکھا،  
جی بھر کے حیران ہوئی وہ اسے پہچان چکی تھی۔ آواز سو  
فیصد ذیان کی تھی۔ کیونکہ وہ اصلی آواز میں بولی تھی۔  
غور سے دیکھنے پہ نقوش بھی مانوس لگے۔ مگر ذیان کی یہ  
بے تکی حرکت اور گیٹ اپ اسے بہت الجھا رہا تھا۔ پر  
اس وقت وہ سوال کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔  
ذیان نے ہونٹوں پہ انگلی رکھتے ہوئے خاموش رہنے کا  
اشارہ کیا۔

گاڑی میں موجود سب مردوں کی نگاہیں ان ہی کا  
طواف کر رہی تھیں۔ وہ دبلا پتلا نو عمر لڑکا جس کے چہرے  
پہ موجود مونچھیں عجیب سا تاثر دے رہی تھیں۔ ان دو  
لڑکیوں کے ساتھ بیٹھا تھا اور وہ لڑکیاں اب شور بھی

نہیں کر رہی تھیں۔ جو کہ خلاف عقل تھا۔ سب اپنی  
عقل کے مطابق قیاس کے گھوڑے دوڑا رہے تھے۔  
سانولا کالا آدمی اور اس کا دوسرا ساتھی مایوس ہو چکے  
تھے کہ زوردار لونڈا ان کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ اس  
کم بخت کا آنکھ مٹکا تو ایک ایک نہیں دو دو لڑکیوں کے  
ساتھ تھا۔

کالج گیٹ کے سامنے جوں ہی سوز کی رکی تو ذیان  
سب سے چھلانگ مار کر اتری۔ تیزی سے اترنے کی  
وجہ سے اس کی مونچھ کی ایک سیٹڈ جلد سے الگ ہو کر  
اس کے ہونٹوں پہ جھک آئی تھی۔ ذیان غراپ سے  
کالج گیٹ سے اندر غائب ہو چکی تھی۔ سوز کی میں  
موجود سب لوگ ادھر ہی دیکھ رہے تھے۔ ان دو  
آدمیوں کی حالت دیکھنے والی ہو رہی تھی جو ذیان کا پیچھا  
کرتے یہاں تک پہنچے تھے۔



گیٹ سے اندر چوکیدار ذیان سے سوال جواب کے  
لئے تیار تھا۔ سدرہ اور نائلہ پیچھے پیچھے تھیں۔ چوکیدار  
سے کلیئر ہونے کے بعد تینوں آگے بڑھیں۔

”میں نے تو صرف ایڈوسنجر میں آکر ایسا کیا کہ  
دیکھوں اس روپ میں کوئی مجھے پہچانتا ہے کہ نہیں۔  
سب سے پھب کر گھر سے نکلی ڈرامیور کو بھی منع کر دیا  
کہ دوستوں کے ساتھ جاؤں گی۔“ وہ انہیں اپنی بے  
وقوفی دوسرے الفاظ میں ایڈوسنجر کے بارے میں بتا رہی  
تھی۔

”تمہاری اس بے وقوفی کی وجہ سے تمہیں اگر کچھ  
ہو جاتا تو۔“ نائلہ غصے سے بول رہی تھی۔

”ہوا تو کچھ نہیں بس ان دو آدمیوں کی وجہ سے  
پریشان ہو گئی تھی۔ لیکن اب ٹھیک ہوں۔“ وہ اندرونی  
خوف و بزدلی پہ قابو پاتے ہوئے (جس سے کچھ دیر پیشتر  
وہ دوچار ہوئی تھی) ہنس دی۔ پر سدرہ اور نائلہ دونوں  
کو اس کی بات پہ یقین نہیں آیا۔

”اس وقت تو ہوائیاں اڑ رہی تھیں چہرے پہ  
کیسے گاڑی میں میرے ساتھ چپکی جا رہی تھی۔“

سدرہ چمک کر بولی۔

”اچھا جو بھی ہے یہ بتاؤ لگ رہا ہوں نہ لڑکا؟“ ان کے سامنے اکڑ کر زیان اشاکل سے کھڑی ہو گئی۔ اس پاس سے گزرنے والی طالبات بھی رک کر انہیں دیکھنے لگ گئی تھیں۔

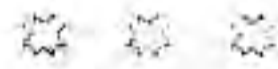
”ہاں لگ تو رہے ہو نرم نرم سے لڑکے۔“ سدرہ قدرے چمک کر عاشقانہ انداز میں بولی۔ زیان نے جینیب کر اسے ایک دھپ لگائی۔

”مجھے تمہاری اس حماقت پہ ابھی تک یقین نہیں آ رہا ہے۔ صرف اس شوق و تجسس میں کہ اس گیٹ اپ میں تم لڑکا لگتی ہو کہ نہیں، تم صبح سویرے گھر سے ایسے نکل آؤ گے۔ نتائج تک کی پروا نہیں کی۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ نائلہ اسے سمجھانے کے موڈ میں تھی۔

”آئندہ ایسے نہیں کروں گی۔ یہ تو ڈرامے کی وجہ سے اچانک میرے دل میں یہ عجیب خیال آیا۔“ عجیب نہیں واہیات نامعقول خیال کہو۔“ سدرہ نے تیزی سے کہا۔

”شکر کرو بچ گئی ہو۔“ نائلہ نے ایک بار پھر اسے فمائش نگاہوں سے دیکھا۔ زیان نے جان چھڑانے والے انداز میں ان کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

تینوں بال میں پہنچ چکی تھیں۔ جہاں سب طالبات اور ٹیچرز جمع تھیں۔ زیان ڈرامے کی ٹیم کی طرف آگئی۔



احمد سیال کھانا کھا رہا ہے تھے۔ رنم انہیں راعنہ کی شادی کی روداد سن رہی تھی۔ ”پاپا! راعنہ کے ان لاز نے کوئی ڈیمانڈ نہیں کی ہے اور نہ کوئی جیمز لیس گے وہ لوگ۔“

”اچھا۔“ احمد سیال کو سن کر حیرانی نہیں ہوئی۔ وہ نارمل موڈ میں تھے۔ رنم کا چہرہ سمجھ سا گیا۔ اس نے اپنے تئیں اتنی زبردست عجیب و غریب شاکڈ کرنے والی بات بتائی تھی، لیکن پیپا نے کوئی خاص رسپانس ہی

نہیں دیا۔

”تم کب تک فری ہوگی؟“ احمد سیال نے کھانا کھاتے کھاتے سوال کیا۔ ”کیوں پیپا؟“

”تم راعنہ کی شادی کی مصروفیت سے فری ہو جاؤ تو انفارم کرنا۔“ وہ مبہم سے انداز میں بولے۔ ”کیوں پیپا؟“ اس نے پھر سوال کیا۔

”میں نے تمہیں بتایا تو تمہارے دوست جمانگیر ملک نے تمہارے لیے اپنے بیٹے کا پروپوزل دیا ہے۔ تمہارے ایگزام کے دوران وہ آیا تھا۔“

”ہاں مجھے یاد آ رہا ہے آپ نے ذکر کیا تھا۔“ اس نے بھی احمد سیال کے انداز میں کہا۔

”میں ملک جمانگیر کی فیملی کو بلواتا ہوں کسی دن، تم بھی مل لو۔“ وہ نیپکن سے ہاتھ صاف کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔

رنم نے ان کی بات کا جواب نہیں دیا تو انہوں نے سیدھے اسٹڈی روم کا رخ کیا۔ رنم ادھر ہی بیٹھی دل ہی دل میں پیپا سے خفا ہو رہی تھی۔ برا بھی اس کے پاس لمبی چوڑی ناراضی دکھانے کا ٹائم نہیں تھا، کیونکہ کل راعنہ اور شہیار کا ولیمہ تھا۔ اسے تیاری بھی کرنی تھی۔ اس موضوع پہ پیپا سے بعد میں بھی بات کی جاسکتی تھی۔



ولیمہ پہ شہیار نے بہت زیادہ مہمانوں کو انوائٹ نہیں کیا تھا۔ راعنہ کی فیملی اور ان دونوں کے مشترکہ رشتہ دار اور کچھ دوست احباب تھے۔ کھانے میں چار ڈشز تھیں۔ راعنہ کے ولیمہ کا جوڑا بہت نفیس پر زیاہ قیمتی نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ بے پناہ خوش نظر آرہی تھی۔ راعنہ کے گھر والے بھی مسرور تھے۔ شہیار کے کسی بھی عمل پہ انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ بلکہ راعنہ کے پیپا بے پناہ خوش تھے کہ انہیں شہیار کی صورت میں اپنی بیٹی کے لیے خوددار غیرت مند شوہر ملا ہے۔ وہ سب دوست راعنہ اور شہیار کا گھر دیکھنے بھی گئے۔ یہ گھر کسی پوش علاقے میں نہیں تھا۔

پر صاف ستھری کالونی میں تھا۔ چھوٹا سا مناسب اور موزوں فرنیچر سے آراستہ تین کمروں کا گھر راعنہ اور شہریار کی محبت کے وجود سے سج گیا تھا۔

رغم حیرانی سے ایک ایک چیز کو دیکھ رہی تھی۔ شہریار کے پاس سیکنڈ ہینڈ گاڑی تھی۔ راعنہ کو شہریار کے ساتھ اس گاڑی میں بیٹھتے ہوئے ذرہ بھر احساس کمتری نہیں تھا۔

”میری یہ لائف پاپا کے گھر کی لائف سے بالکل ڈیفرنٹ ہے۔“ انہیں کھانے پینے کی سب چیزیں خود سرو کرتے ہوئے راعنہ خوشی سے بتا رہی تھی۔

”تم یہاں آرام سے رہ لو گی؟“ رغم نے نگاہیں اس کے چہرے پر نکادیں۔

”میں یہاں رہنے ہوئے بہت کمفرٹبل فیل کر رہی ہوں۔ پاپا مجھے اور شہریار کو بہت کچھ دینا چاہ رہے تھے، مگر شہریار عام مردوں کی طرح لالچی نہیں ہیں۔ ورنہ ہمارے طبقے میں اکثر شادیاں بزنس ڈیل ہوتی ہیں۔ پر ہماری شادی بزنس ڈیل نہیں ہے، ریشل شادی ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے تحمل سے رغم کے جواب دے رہی تھی۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو ہمارے سوشل سرکل میں شادی بزنس ڈیل ہی ہوتی ہے۔“ اس نے تائید کی۔

”تمہارے لیے بھی تو ایک جاگیر وار فیملی سے رشتہ آیا ہے۔ بہت اونچا ہاتھ مارا ہے تم نے۔“ کومل کو یاد آیا۔ رغم کے ماتھے پہ بل پڑ گئے۔

”میری شادی پاپا میری مرضی سے کریں گے۔“ وہ غصے سے بولی۔ پاپا انہیں کومل کے عام سے جملے پہ وہ کیوں ہانپو ہو گئی تھی۔

”ہاں تمہارے پاپا تمہاری شادی اپنی مرضی سے اپنے کسی دوست کے بیٹے سے کریں گے۔ جو ان کی طرح بزنس مین ہو گا بہت امیر۔“ کومل اسے تنگ کر رہی تھی۔ رغم ناراض ہو کر وہاں سے اٹھ آئی۔



رغم احمد سیال کے پاس بیٹھی پورے ایک گھنٹے سے

مسلل بول رہی تھی۔ ”پاپا، راعنہ کے ہر منڈنے کچھ نہیں لیا ہے نہ جینز نہ گاڑی نہ بنگلہ نہ بینک بیلنس۔ شہریار بھائی نے خود راعنہ کے لیے شادی کا جوڑا اور جیولری خریدی۔ وہ شہریار بھائی کے لائے ہوئے جوڑے میں ہی اپنے پاپا کے گھر سے رخصت ہوئی۔ پاپا میں بہت حیران ہوں، پر یہ سب مجھے بہت اچھا لگا ہے۔“ احمد سیال اس کی حیرانی سی پھیلی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے مسکرائے۔ ”راعنہ کا شوہر خود دار اور سیلف مڈ ہے، اسے اپنے زور بازو پہ بھروسہ ہو گا تب ہی اس نے کسی قسم کی ہیلپ نہیں لی ہے۔“ احمد سیال نے تبصرہ کیا ”اور ہاں وہ جہانگیر کے گھر والے آنا چاہ رہے ہیں تمہیں دیکھنے۔“ انہیں اچانک یاد آیا۔

”پاپا میری خواہش ہے، میری شادی جس شخص کے ساتھ ہو۔ وہ شہریار بھائی کی طرح خود دار ہو۔ کسی قسم کی ہیلپ نہ ملے۔ سب کچھ اپنی محنت سے بنائے۔“ رغم اپنی دھن میں بول رہی تھی۔ اس نے احمد سیال کی بات سنی ہی نہیں۔

”میں اتنی زیادہ دولت و جائیداد کا کیا کروں گا رغم۔ اگر تم کچھ لیے بغیر میرے گھر سے رخصت ہو جاؤ گی۔“ احمد سیال کو اپنی لاڈلی کی یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔

”پاپا آپ جہاں میری شادی کریں گے، کیا ان کے پاس گھر، دولت، جائیداد یہ سب کچھ نہیں ہو گا؟“ وہ اچانک سنجیدہ ہوئی۔

”میری جان بے شک سب کچھ ہو گا، لیکن میں اپنی اکلوتی اولاد کو کسی بھی چیز سے محروم نہیں کر سکتا۔ میں تمہاری شادی دھوم دھام سے کروں گا۔ میرا سب کچھ تمہارا ہے۔ میں تمہیں اس گھر سے خالی ہاتھ رخصت نہیں کروں گا، ایسا جینزوں کا کہ دنیا دیکھے گی اور تمہاری شادی ہمارے سوشل سرکل کی شان دار اور یادگار شادی ہو گی۔“ احمد سیال باتوں باتوں میں بہت دور نکل گئے تھے۔

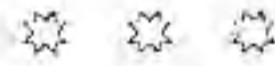
”مجھے کچھ نہیں چاہیے، پاپا مجھے شہریار بھائی جیسا لائف پارٹنر چاہیے بس۔“ وہ جھنجھلا سی گئی۔

”تمہاری سوچ بچوں والی ہے۔“ وہ مسکرائے۔ احمد

سیال اسے بچوں کی طرح ہی ٹریٹ کر رہے تھے۔  
 ”پیپا میں سیریس ہوں۔“ وہ اپنی بات پہ زور دے کر  
 بولی۔

”اپنی وسے میں ملک جہانگیر کے گھر والوں کو  
 انوائٹ کروں گا۔ تم ان کے بیٹے کو دیکھ لینا مل لینا۔“  
 احمد سیال نے اس کی بات کو اہمیت نہیں دی۔ رنم کو  
 بے طرح غصہ آیا۔

”میں کسی سے نہیں ملوں گی پیپا۔“ وہ دھم دھم  
 کرتی وہاں سے چلی آئی۔ احمد سیال اس دروازے کو  
 دیکھ رہے تھے جہاں سے وہ نکل کر ابھی ابھی گئی تھی۔  
 وہ اس کے غصے کا سبب تلاش کرنے کی کوشش کر رہے  
 تھے۔ اچانک نہ جانے اسے کیا ہو گیا تھا۔ جب سے وہ  
 راعنہ کی شادی ایشید کر کے آئی تھی۔ تب سے اس  
 کے پاس ایک ہی موضوع تھا کہ شہیار نے سسرال  
 والوں سے اپنی کم حیثیتی کے بارہو کی قسم کی مالی  
 امداد قبول نہیں کی ہے۔ وہ اس پہ غور کر رہے تھے۔  
 رنم نے ملک جہانگیر کی فیملی سے ملاقات کرنے کے  
 ضمن میں کسی قسم کی رضامند نہیں دی تھی۔



ملک ارسلان شہر گئے ہوئے تھے۔ عنیزہ کچھ دیر  
 افشاں بیگم کے پاس بیٹھی رہیں۔ ویسے بھی ارسلان  
 کے بغیر ان کا جی گھر میں گھبراتا اس لیے اس طرف  
 آجاتیں۔ شام اپنے پر پھیلانا شروع کر چکی تھی جب  
 انہوں نے افشاں بھابھی سے اجازت چاہی۔

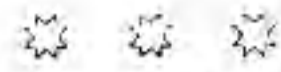
حویلی میں سناٹا طاری تھا۔ ملازم کام نہ پٹا کر اپنے اپنے  
 کوارٹرز میں تھے جو حویلی کے مشرقی حصے میں بنائے گئے  
 تھے۔ گھر میں اس وقت دو خاتون ملازمین تھیں جو  
 عنیزہ کو دیکھ کر فوراً ہی متحرک نظر آنے لگیں۔  
 عنیزہ انہیں نظر انداز کرتی اپنے بیڈ روم میں چلی  
 آئیں۔ انہوں نے دروازہ لاک کر کے اپنی دیوار گیر  
 الماری کھولی۔ سب سے نچلے حصے میں ایک خفیہ خانہ  
 تھا۔ عنیزہ نے اسے اپنی طرف کھینچا اور چابی گھمائی۔  
 لاک کھل چکا تھا۔ اندر ایک پیکٹ موجود تھا۔ عنیزہ

نے پیکٹ اٹھا کر باہر بیڈ پہ رکھا۔ اس پیکٹ کی حفاظت  
 اٹھارہ سالوں سے وہ قیمتی خزانے کی طرح کرتی آرہی  
 تھیں۔ نرم آرام ہاتھوں سے انہوں نے پیکٹ کھول  
 کر اندر موجود اشیاء باہر نکالنی شروع کیں۔ بیڈ پہ ننھے  
 منے کپڑوں، بے لی پاؤڈر، آئل سوپ اور دو عدد چھوٹے  
 چھوٹے شوز کے جوڑوں کا چھوٹا سا ڈھیر لگ گیا تھا۔  
 سب چیزیں پرانی اور استعمال شدہ تھیں۔ بے لی آئل  
 بوتل میں آدھے سے کم بچا تھا۔ پاؤڈر کا ڈبہ بھی تقریباً  
 خالی تھا۔ چھوٹے چھوٹے شوز قدرے میلے تھے۔  
 پرانے کپڑوں، فرائکس، نیکر کا رنگ اتنے سالوں میں  
 مدھم بڑ گیا تھا۔ گتے کے ڈبے میں ایک فیڈر بھی تھا۔  
 کچھ کھلونے بھی تھے۔

عنیزہ نے اس چھوٹے سے ڈھیر کو سمیٹ کر سینے  
 سے لگا لیا۔ آنسوؤں کا جھرنا اس کی آنکھوں سے  
 پھوٹ پڑا۔ وہ ایک ایک چیز کو بار بار چھو رہی تھیں، چوم  
 رہی تھیں، سونگھ کر کچھ محسوس کرنے کی کوشش  
 کر رہی تھیں۔ جیسے ان کپڑوں اور بے جان کھلونوں  
 میں کوئی زندہ وجود ہو، ان کا لمس ہو۔ وہ اب سک  
 سک کر رو رہی تھی۔ ہڈی ہال انداز میں روتے ہوئے  
 وہ بیڈ کے ہی ایک کونے میں کٹھڑی بن کر لیٹ گئی۔  
 اس عالم میں گھنٹہ، ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا۔ دل کا غبار کم ہوا  
 تو انہوں نے اٹھ کر سب چیزیں سمیٹیں اور پہلے کی طرح  
 ایک پیکٹ بنایا۔ الماری میں رکھ کر پہلے کی طرح  
 الماری لاک کر کے چابی اپنی مخصوص جگہ پہ رکھ دی۔  
 اسی اثنا میں عشاء کی اذان ہونا شروع ہو گئی۔ وہ وضو  
 کر کے اپنے رب کے حضور جھک گئیں۔ دل کا سارا  
 درد آنسوؤں میں بہہ رہا تھا۔ یہاں انہیں دیکھنے والا  
 کوئی نہ تھا۔ وہ جی بھر کر اپنے رب سے مال دل کہہ  
 سکتی تھیں۔ فریاد کر سکتیں۔ دنیا کے دربار میں اس کی  
 شنوائی نہیں تھی۔ پر وہ جس کے دربار میں تھیں وہ  
 پاک، ہستی لا محدود اختیار کی مالک تھی۔

”میرے اللہ میرے اللہ۔ میرے مالک تو خوب  
 جانتا ہے، خوب سمجھتا ہے۔ مجھ پہ میری طاقت سے  
 زیادہ بوجھ مت ڈالو۔ میں تھک گئی ہوں اس آبلہ پائی

ہے۔ میرے مالک میری آزمائش ختم کر دے مجھے، شکر گزار بنا۔“ روتے روتے وہ اپنی جملوں کی تکرار کر رہی تھیں۔ ”میرے مالک میں تھک گئی ہوں اب مجھے اس اذیت اس کرب سے نجات دلا دے۔“ اپنی فریاد رب کے حضور پہنچا کر انہیں قدرے سکون حاصل ہوا۔



ملک ارسلان رات گھر واپس آئے تو عنیزہ بخار میں تپ رہی تھیں۔ بہت زیادہ رونے اور ٹینشن کی وجہ سے ان کی یہ حالت ہوئی تھی۔ انہوں نے ان کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

”میں تمہیں اچھا خاصا چھوڑ کر گیا تھا کیا ہوا ہے تمہیں؟“ وہ ان کی سوئی منورم آنکھیں دیکھ رہے تھے۔

”بخار ہو گیا ہے تھوڑا اور تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائیں۔

”صرف بخار نہیں ہوا تمہاری طبیعت اچھی خاصی خراب ہے اور تم روتی بھی رہی ہو، تمہیں پتا ہے تمہارا روتا میں برداشت نہیں کر سکتا۔“

”میں نہیں روتی ہوں۔“ عنیزہ نے بے اختیار ان کی بات کالی۔

”میں تمہارے مزاج کے ہر رنگ سے واقف ہوں۔ محبت نہیں عشق کیا ہے تم سے۔ عیاں ہو تم پوری کی پوری۔“ وہ لہجہ اور نروٹھے پن سے اسے دیکھ رہے تھے۔ عنیزہ کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو اچانک پھیلے اور وہ ارسلان کے سینے سے لگ گئیں۔ ”میں آج بہت اذیت میں ہوں۔“ وہ بری طرح رو رہی تھیں۔ ارسلان نے انہیں اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

”تم ماضی کو بھول کیوں نہیں جاتیں ماضی کی اذیت کی وجہ سے مجھے اپنے آپ کو کیوں نظر انداز کرتی ہوں۔ تمہارا ماضی دفن ہو گیا ہے۔ میں تمہارا فیوچر ہوں۔ اپنی آنے والی زندگی کے بارے میں سوچو۔“

تمہیں مجھ پر ترس نہیں آتا۔ تمہارے آنسو مجھے کتنی تکلیف دیتے ہیں، تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہے۔“ وہ اس کے آنسو صاف کر رہے تھے۔ اسے بہلا رہے تھے۔ یہ سب باتیں وہ پچھلے اٹھارہ برس سے کرتے آ رہے تھے۔ ہریار عنیزہ خود کو سمیٹنے کا عہد کرتیں اور ہریار بکھر جاتیں۔ اس ٹوٹی پھوٹی محبوب بیوی کو سمیٹنے کا ہنر ملک ارسلان کے ہی پاس تھا۔

”ملک صاحب میرے پاس آنے والی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں ہے۔ نہ کوئی خوشی نہ امید نہ روشنی کے جگنو میں آپ کو ایک بچہ تک نہ دے سکی۔ میرے کرب کو آپ کیا سمجھ پائیں گے۔“ وہ ایک بار پھر رونے لگیں۔ ملک ارسلان نے جگ سے پانی گلاس میں انڈیل کر انہیں پلایا۔

”میری محبت ہمیشہ تمہارے ساتھ ہے اور رہے گی۔ تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ تم جس دن جان جاؤ گی اس دن اپنی قسمت پر رشک کرو گی۔ باقی ہماری اولاد نہیں ہے تو کیا ہوا میں اس کے بغیر بھی تمہارے ساتھ بے پناہ خوش ہوں۔ میری زندگی میں تم ہو اور صرف تمہاری وجہ سے میں پوری زندگی ہنسی خوشی گزار سکتا ہوں۔ تم اکیلی نہیں ہو۔ میں ہمیشہ سے تمہارے ساتھ ہوں۔“

وہ ہمیشہ کی طرح اپنے محبت کے سہارے ان کے سب دکھ سب کانٹے جتے جا رہے تھے۔ ملک ارسلان کی محبت کو عنیزہ کبھی بھی نہیں سمجھ سکتی تھیں۔ وہ گہرے پرسکون سمندر کی اند تھیں۔ بہت دیر بعد ارسلان کی کوشش سے وہ نارمل ہوئیں۔



دو دن سے اس کی پیپا کے ساتھ کوئی بات بھی نہیں ہوئی تھی۔ نہ اس نے ان کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔ یہ اس کی طرف سے مکمل ناراضی کا اظہار تھا۔ احمد سیال ایک ڈیلی کیشن کے ساتھ مصروف تھے۔ اس لیے رنم کی خاموش ناراضی ان کے علم میں نہیں تھی۔ رنم فی الحال دو دن فری تھی، کیونکہ یونیورسٹی

سے چھٹی تھی۔ اس نے شام ڈھلتے ہی فراز کو کال کی۔  
 ”میں تم سے ملنا چاہ رہی ہوں۔“ اس نے کسی بھی  
 سلام و دعا کے تکلفات میں پڑے بغیر تیزی سے کہا۔  
 ”میں جم میں ہوں ایک گھنٹہ تک فارغ ہوں گا۔“  
 ”مجھے تم سے ابھی ملنا ہے۔ مون لائٹ ریسٹورنٹ  
 میں پہنچ جاؤ۔ میں پندرہ منٹ میں گھر سے نکل رہی  
 ہوں۔“ رنم صدی انداز میں بولی۔

دوسری طرف موجود فراز گہری سانس لے کر رہ  
 گیا۔ اسے پتا تھا کہ اسے ابھی اور اسی وقت جم سے  
 اٹلنا ہو گا اور اگلے پندرہ سے بیس منٹ میں مون لائٹ  
 ریسٹورنٹ جانا ہو گا۔ ”اوکے تم پہنچو میں بھی آرہا  
 ہوں۔“ فراز نے ہار ماننے والے انداز میں کہا۔  
 رنم کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ اسے پتا تھا کہ  
 فراز اس کی بات ٹال نہیں سکتا۔ وہ گنگناتے ہوئے بال  
 سنوارنے لگی۔



فراز اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھا پوری سنجیدگی  
 سے اس کی بات سن رہا تھا۔ رنم نے الف بتا دیا۔ سب  
 بتا دیا تھا۔ ”پاپا نے کوئی رسپانس نہیں دیا، بلکہ اٹا کہا“  
 تمہاری سوچ بچوں والی ہے۔ میں تمہیں دھوم دھام  
 سے رخصت کروں گا۔ لیکن مجھے کچھ نہیں چاہیے۔  
 میں چاہتی ہوں کہ راعنہ کی طرح میری شادی جس  
 شخص سے ہو وہ چیز کے نام پر کچھ بھی میرے پیارے نہ  
 لے۔ بس مجھے ایسے ہی قبول کر لے۔ مجھے جینر لینا  
 بہت سائینک بیلنس کار کو ٹھنی، بنگلہ، شادی کے گفٹ  
 کی صورت میں لینا کسی صورت بھی منظور نہیں۔ پاپا  
 کے فرینڈ بہت امیر ہیں، ظاہر ہے ان کا بیٹا بھی دیرسا ہی  
 ہو گا۔ انہیں بھلا کسی چیز کی کیا ضرورت ہے۔“ وہ ایک  
 ہی سانس میں تیز تیز بول رہی تھی۔ فراز نے ایک بار  
 بھی اسے نہیں ٹوکا اور نہ ہی خود درمیان میں بولا۔  
 جب وہ خاموش ہوئی، تب فراز نے خاموشی توڑی۔  
 ”میں سمجھ گیا ہوں تم کیا چاہتی ہو۔“  
 ”ریلی فراز تم اتنی جلدی سمجھ گئے ہو، میرے

بیسٹ فرینڈ ہونا۔ پر پاپا میری بات کو کیوں اہمیت نہیں  
 دے رہے ہیں۔“  
 ”اچھا یہ بتاؤ تمہارے پاپا کے وہ دوست کب آرہے  
 ہیں؟“ فراز نے اس کی رو ہانسی صورت نظر انداز کر کے  
 بالکل غیر متوقع سوال کیا۔  
 ”میں نے پاپا کو کوئی رسپانس ہی نہیں دیا۔“ وہ منہ  
 بنا کے بولی۔

”ایسے تو کام نہیں چلے گا۔ کچھ نہ کچھ کرنا تو ہو گا۔“  
 وہ پرسوج لہجہ میں بولا۔  
 ”سو کمپل میں ایسے انسان سے شادی ہی نہیں  
 کروں گی جو مجھ سے ان سب چیزوں کے بغیر شادی  
 نہیں کرے گا۔“

”اس کا مطلب ہے تم کسی ٹل کلاس نوجوان سے  
 شادی کر لو گی؟“

”ہرگز اب ایسی بھی کوئی آفت نہیں آئی، میرا ایک  
 اسٹینڈرڈ ہے۔ مجھے بس ایک ایسا انسان چاہیے جو  
 شہر یا رہائی کی طرح ہو۔“ فراز اس بار اپنی مسکراہٹ  
 نہیں روک سکا۔ اس نے مشکل سے اپنے قہقہے کا گلا  
 گھونٹا تھا۔

”تم کیوں ہنس رہے ہو؟“ رنم نے اسے گھور کر  
 دیکھا۔

”ٹل کلاس نوجوان سے تم شادی کرو گی نہیں،  
 کیونکہ وہ تمہاری کلاس سے نہیں ہے اور تمہارے  
 سوشل سرکل میں ایسا اکاؤنڈنٹ سے بھی نہیں  
 ملے گا جو تمہارے پیپا کی سپورٹ سے فائدہ نہ اٹھائے۔  
 دولت دولت کو کھینچتی ہے اور جس کسی کی بھی شادی  
 تمہارے ساتھ ہوگی۔ اسے تمہارے ساتھ ساتھ  
 بہت ساری دولت بھی ملے گی۔“ فراز نے حقیقت  
 بیان کی تھی۔

”میں ایسے کسی بھی شخص سے شادی نہیں کروں  
 گی۔“ رنم کا انداز قطعی اور دو ٹوک تھا۔  
 ”ویسے ایسا شخص تمہیں مل سکتا ہے۔“ فراز خلا  
 میں کسی غیر مرئی چیز کو دیکھ رہا تھا۔  
 ”کہاں ملے گا ایسا شخص۔“ رنم اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے

پن ہے، اب تم بھی یہ ہی چاہتی ہو کہ راعنہ کی طرح خالی ہاتھ رخصت ہو۔ تمہارے خاندان میں ملنے جلنے والوں کے لیے یہ ایک حیرت انگیز واقعہ ہوگا کہ احمد سیال جیسے کامیاب بزنس ٹائیکون کی بیٹی جینز کے نام پہ ایک تنکا بھی لے کر نہیں گئی۔ یہ خبر ہر جگہ ڈسکس ہوگی۔ تم اور تمہاری شادی گرما گرم موضوعات کا حصہ بنے گی اور تم سب کو چونکانے میں کامیاب رہو گی۔ تمہارے لیے یہ سب وقتی ایڈونچر ہے۔ کیونکہ تم جدت پسند ہو، ایکسٹینڈ ہو رہی ہو کہ تمہیں ایسا شخص ملے جو کہے کہ میں تین کپڑوں میں قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اس کے بعد کیا ہوگا، تمہیں نہیں معلوم۔ راعنہ کی شادی اپنی فیملی میں ہوئی ہے۔ بعد میں شہریار کا طرز عمل کیا ہوگا، ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ جبکہ تمہارے لیے آؤٹ آف فیملی پروپوزل آیا ہے، تمہیں نہیں معلوم وہ لوگ کیسے ہیں۔ تمہارے بابا کا ایک نام ہے۔ عزت ہے وہ بھلا اپنے منہ سے کیسے کہہ سکتے ہیں کہ میں اپنی بیٹی کو کچھ نہیں دوں گا یا میری بیٹی کو یہ سب پسند نہیں ہے۔ ہمارے معاشرے میں معاشی لحاظ سے گیارہ گزرا گھرانہ بھی بیٹی کو جب رخصت کرتا ہے تو اپنی حیثیت کے مطابق سب کچھ دینے کی کوشش کرتا ہے، بیٹی پیدا ہوتے ہی اس کے لیے جینز جمع کرنا شروع کر دیا جاتا ہے۔ ایسے ہی تمہارے بابا کی بھی خواہش ہے کہ تمہیں شایان شان طریقے سے رخصت کر سکیں۔ تمہاری سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی۔

فراز بہت رسان سے بات کر رہا تھا۔ رنم کے چہرے سے لگ رہا تھا۔ وہ اس سے ذرا بھی متفق نہیں ہے۔ بس بحالت مجبوری اس کی بات سن رہی ہے۔ سب ہی تو فراز کو بولتا چھوڑ کر تھوڑی دیر بعد وہ بیگ اٹھائے چلتی بنی۔ فراز الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک ایڈونچر، ایک تبدیلی، ایک نئے پن، ایک تجربے کی خاطر کچھ بھی کر سکتی تھی۔ اس سے کچھ بھی بعید نہ تھا۔



اچھل ہی تو پڑی۔  
”کوئی ایسا شخص جو تم سے سچی بے پناہ محبت کرتا ہو۔ صرف ایسا شخص ہی تم سے تمہاری دولت کے بغیر شادی کر سکتا ہے۔“ اسے صرف تم سے محبت ہو، تمہاری یا تمہارے بابا کی دولت سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔“ وہ جیسے کھوئے کھوئے انداز میں بول رہا تھا۔  
”ایسا تو کوئی بھی بندہ نہیں ہے جسے مجھ سے محبت ہو۔“ رنم بہت سادگی اور مایوسی سے گویا ہوئی۔  
”ایسا کرو کہ تم کوئی بندہ ڈھونڈو جو تم سے سچی محبت کرے۔ ایک دن پھر اسے اپنے بابا سے ملواؤ۔ آگے کے کام آسان ہو جائیں گے۔ وہ تم سے شادی کر لے گا۔ اپنے گھر لے جائے گا۔“ جانے فراز نے یہ سب سنجیدگی سے کہا تھا یا اس سے مذاق کر رہا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پاتی۔ ”میری وے تم اپنے بابا سے بات کرو۔“ فراز کو اس کے چہرے پہ چھائی مایوسی، خشم نہیں ہو رہی تھی۔

”میں تمہارا بسٹ فرینڈ ہوں نا، میری بات مان لو۔ اپنی ضد سے باز آ جاؤ۔ تمہارے بابا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ تم ان کی اکلوتی اولاد ہو، ہر چیز کی وارث ہو۔ ساری عمر انہوں نے جان لڑا کر اپنے بزنس کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ اس ساری کامیابی کا دولت کا کیا فائدہ جب تم اپنی زندگی کو ہی آسان نہ بنا سکو۔ ہر چیز کو ٹھوکر مار دو، ان کی تو سب محنت اکارت جائے گی۔“ فراز نے اچانک نیا پینٹر ابدلہ تو رنم سے ہضم نہیں ہوا۔  
”فراز رانی ٹوانڈرا سینڈ۔“

”میں تمہیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ ہر نئی چیز دنیا منصوبہ تمہیں اپنی طرف کھینچتا ہے۔ تمہیں لگے بندھے فرسودہ راستوں پہ چلنے سے نفرت ہے۔ تمہیں نئے نئے کام کرنے کا شوق ہے، کچھ ایسا کہ سب حیران ہو جائیں۔ یہ سب خیالات تمہارے ذہن میں راعنہ کی شادی کے بعد آئے ہیں۔ کیونکہ اپنے سرکل میں تم نے راعنہ کے ہونڈ جیسا کوئی نوجوان نہیں دیکھا۔ اس لیے تم شہریار کی خودداری سے متاثر ہو گئی ہو، کیونکہ اس خودداری میں کم سے کم تمہارے لیے نیا

ذیان دوسرے کا کھانا کھانے کے بعد بوا کے ساتھ گپ شپ کر رہی تھی۔ جب وہاب کی اچانک آمد ہوئی۔ بوا اور ذیان صحن میں بیٹھی تھیں۔ وہاب سیدھا ادھر ہی آیا۔ بہت دن بعد اپنے گوہر مقصود کو دیکھا تھا۔ اس کے روم روم میں سکون و راحت طاقت بن کر دوڑنے لگی۔

”السلام علیکم کیسے ہیں آپ لوگ۔“ اس کی چمکتی آواز سے ہی اس کی خوشی صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔ ذیان نے ہلکی آواز میں سلام کا جواب دیا۔ جبکہ بوا اگر مجبوری سے اس سے حال احوال پوچھ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد بوا اس کی خاطر مدارات کے لیے اٹھ گئیں تب وہاب نے بڑی فرصت سے ذیان کو دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کی یہ حرکت ذیان سے کیسے پوشیدہ رہ سکتی تھی۔ زریںہ بیگم نے اسے قبل از وقت ہی وہاب کے ارادوں سے آگاہ کر دیا تھا۔ اس لیے وہاب کی نظروں نے اسے بے پناہ غصے سے دوچار کر دیا تھا۔ وہ اچانک اپنی جگہ سے اٹھی۔ وہاب کو بتا تھا، ذیان یہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی جائے گی اور پھر اس کے جانے کے بعد ہی باہر نکلے گی۔ اس کے لیے اس نے کمال جرات سے کام لیتے ہوئے اچانک اپنا ایک بازو آگے کر دیا جیسے اسے جانے سے روکنا چاہتا ہو۔

”یہ کیا ہے؟“ وہ کڑوے لہجے میں بولی۔

”تمہیں گھر آئے مہمان سے ذرا بھی خوش اخلاقی برتنا نہیں آتی۔“ وہاب اس کا تپا چہرہ دیکھتے ہوئے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ سامنے سنگ روم میں بیٹھی زریںہ نے گلاس وندو سے یہ منظر پوری وضاحت کے ساتھ دیکھا۔ نفرت میں ڈوبی مسکراہٹ ان کے لبوں پہ آئی۔ ذیان کو جلدی یہاں سے بھگانا پڑے گا۔ ورنہ وہاب جھکڑے کھڑے کر سکتا ہے۔ وہاب کے چہرے کے والہانہ تاثرات نوٹ کرتے ہوئے زریںہ کے دل میں اس خیال نے جڑ مضبوط کر لی۔



بہت زوردار طوفان تھا ہوا کے بہت تیز جھکڑ چل

رہے تھے۔ بند دروازوں اور کھڑکیوں کے باوجود ہوا کی زوردار سائیں سائیں کی آواز اندر کمروں تک آرہی تھی۔ عنیزہ ایک کونے میں سکڑی کٹی خوف زدہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ حویلی میں کام کرنے والی ایک نوکرانی ان کے پاس تھی۔ ارسلان باہر زمینوں پہ ڈیرے کی طرف تھے وہیں سے وہ اپنے ایک دوست کی دعوت پہ اس کے گھر چلے گئے تھے۔ سرشام سے ہی موسم کے تیور بدلے تھے پہلے آہستہ آہستہ ہوا چلنا شروع ہوئی پھر اس نے زوردار طوفان کی شکل اختیار کر لی۔ عنیزہ نے فوراً حویلی کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کروائیں۔

باہر سے زوردار آواز آئی تھی شاید کوئی درخت ٹوٹ کر گرا تھا۔ عنیزہ نے سسم کر بند دروازے کی طرف دیکھا جیسے طوفان دروازے سے اندر کا رخ کر لے گا۔ نوکرانی اپنی مالکن کے خوف کو بہت اچھی طرح محسوس کر رہی تھی اور اسے ہمدردی بھی تھی کیونکہ جب بھی آندھی یا طوفان آتا عنیزہ کمرے میں بند ہو جاتیں۔

اچانک ہی لائٹ چلی گئی اور گھپ اندھیرا چھا گیا۔ کھڑکیوں پہ پہلے ہی بھاری پردے پڑے تھے رہی سہی کسر لائٹ نے پوری کر دی۔ نوکرانی نے اٹھ کر ایمر جنسی ٹارچ آن کی۔ تب تک باہر موجود ملازم جزیئر آن کرنے کی تیاری میں جت گئے چند منٹ بعد ہی جزیئر کے چلنے سے حویلی پھر سے جگمگ کرنے لگی۔ عنیزہ اپنے ماضی میں پہنچ گئیں۔ یہاں سے بہت دور بہت سال پہلے کا ایک منظر ذہن کے بند دروازوں پہ رہ رہ کے دستک دے رہا تھا۔

اس کھلے کھلے برآمدے والے گھر میں ایسی ہی ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ بہت تیز طوفان تھا۔ رہ اپنے سامنے پڑے ننھے منے سے وجود کو پریشان نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ جسے طوفان یا تیز ہواؤں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

دروازے کو زور زور سے دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔

عنیزہ کے ذہن میں سب کچھ گڈمڈ ہو رہا تھا۔ دو مضبوط

تو مند ہاتھ، چھینا چھنی، چیخ و پکار، آنسو، آپریں پھر لمبی خاموش۔ دروازے پہ پھر سے دستک ہو رہی تھی مگر یہ ماضی نہیں تھا۔ عنبرہ چونک کر حال میں آئیں۔ نوکرانی دروازہ کھول چکی تھی۔ آنے والے ملک ارسلان تھے۔ عنبرہ نے سکون کی سانس لی۔ کم سے کم ملک ارسلان اس کی زندگی میں طوفان لانے والے نہیں تھے۔



بند کھڑکی کے شیشے سے چہرہ نکائے وہ باہر دیکھ رہی تھی، جہاں تیز ہوا کی شدت سے ہر چیز پھڑپھڑا رہی تھی۔ درخت زوردار طریقے سے ہل رہے تھے۔ بند دروازوں کی دھمک سے عجب سی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ زرینہ بیگم اور سب اپنے اپنے کمروں میں دبک گئے تھے۔ وہ طوفان اور آندھنی سے بہت ڈرتی تھیں۔ یہ ہی حال ہوا کا تھا۔ موسم کے باغی تہہ دیکھتے ہوئے انہوں نے تسبیح اٹھا کر استغفار کا ورد شروع کر دیا تھا۔ وہ اس طوفان کو دیکھتے ہوئے اس کی شدت سے ڈر گئی تھیں۔ زیان کو تیز ہوا اس کی شدت اور طوفان سے ڈرہ بھر بھی ڈر محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ پوری دلچسپی سے ہوا کو مختلف چیزوں کے ساتھ چھیر چھھاڑ کرتے دیکھ رہی تھی۔ پر ہوا کو چین نہیں آ رہا تھا۔ تسبیح اٹھائے ہانپتے گانپتے اس کے پاس پہنچ گئیں۔ سب سے پہلے کچھ پڑھ کر اس پہ پھونک ماری۔

”تم یہاں کھڑکی کے پاس کیوں کھڑی ہو؟ جاؤ وہاں جا کر بیٹھو۔“ انہوں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ ”کیوں ہوا، یہاں کیا ہے، طوفان سے مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔“ اس نے ہنس کر بے نیازی دکھائی۔ ”تمہیں نہیں پتا، میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ طوفان میں بہت سی بلائیں بھی آتی ہیں ہوا کے ساتھ۔“

”ہوا ایسا کچھ بھی نہیں ہے، یہ سب فرسودہ باتیں ہیں۔ ایمان کی کمزوری کی علامت ہے یہ۔“ اس نے ہنس کر بات مٹی۔ ہوا اسے پریشانی سے دیکھ کر رہ گئیں۔

”بہت سال بعد آج پھر وہی ویسا طوفان دیکھ رہی ہوں۔ اللہ خیر کرے۔“ ہوا کا ہاتھ اپنے سینے پہ تھا۔ ”کیا بہت پہلے بھی ایسا طوفان آیا تھا؟“ وہ دلچسپی سے بولی۔

”ہاں ایسا ہی ہوا، ناک و حشت ناک طوفان تھا وہ۔“ ”میں تب کہاں تھی، مجھے کیوں نہیں پتا اس طوفان کا؟“ اس کے لبوں پہ ڈھیروں سوال چل رہے تھے۔ ”تب تم چھوٹی سی تھی، اتنی سی۔ تمہیں طوفان کا کسے پتا چلتا۔“ ہوا نے بمشکل جتن کر کے آنکھوں میں پھٹکنے والی نمی کو روکا۔ زیان پھر سے کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ ہوا نے شکر ادا کیا، ورنہ اس کے مزید سوالوں کا جواب دینا نہایت کنھن ہوتا۔



رومینہ زرینہ سے فون پہ بات کر رہی تھیں۔ زرینہ ہمیشہ کی طرح اپنے دکھڑے رو رہی تھیں۔ آدھے گھنٹے سے وہ مسلسل زیان کے موضوع سے چمٹی ہوئی تھی۔ کافی دیر بعد وہ زرینہ سے بات کر کے فارغ ہوئیں تو وہاب کو غور سے اپنی طرف دیکھتے پایا۔

”امی آج کل خالہ آپ سے کچھ زیادہ ہی قریب نہیں ہو گئی ہیں۔“ وہ استفسار کر رہا تھا۔

”کیوں کیا ہوا ہے؟“ رومینہ نے پوچھا۔

”آج کل جب دیکھو آپ ان ہی کے ساتھ فون پہ بات کر رہی ہوتی ہیں۔ ویسے ایک لحاظ سے اچھا ہی ہے۔ بہت جلد آپ دونوں بہنیں ایک اور رشتے میں منسلک ہو جائیں گی۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ رومینہ فوراً ”اس کی بات کی تہ میں پہنچ گئیں۔“

”یہ خواب دیکھنا چھوڑ دو وہاب۔“ بیٹے کی بات۔ ان کے دل کو کچھ ہوا، مگر اسے سمجھانا بھی ضروری تھا۔ ”اماں یہ خواب نہیں ہیں، مجھے خوابوں کو حقیقت میں کیسے بدلنا ہے، مجھے اچھی طرح اس کا علم ہے۔ آپ زرینہ خالہ کے گھر جانے کی تیاری کر لیں۔ بہت جلد ہی آپ کو میرا رشتہ مانگنے جانا ہے۔“ اس کے لبوں پہ پراسرار مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ رومینہ سر پکڑ کر

بیٹھ گئیں۔ وہ اب تو کسی صورت بھی پیچھے ہٹنے یا ان کی ماننے والا نہیں لگ رہا تھا۔



احمد سیال زندگی میں پہلی مرتبہ سخت غصے میں تھے۔ انہوں نے رنم کو بہت بار سمجھایا، لیکن وہ ماننے میں نہیں آرہی تھی۔ انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی فضول سی ضد چھوڑنے کے لیے تیار کیوں نہیں ہے۔ تھک ہار کر وہ رنم کے علم میں لائے بغیر راعنہ اور شہریار سے ملے۔ احمد سیال کی پریشانی کی وجہ جان کر وہ دونوں خور بھی فکر مند ہو گئے۔ راعنہ نے تو یوں ورثی میں رنم کو جا بکڑا۔ کچھ دن سے وہ بے حد مضطرب اور تھکی تھکی نظر آرہی تھی۔ اکثر کلاسز تک کر دیتی، جب دیکھو گراؤنڈ میں بیٹھی یہ مرنی نقطے کو دیکھتی پائی جاتی۔ ”رنم کیا بات ہے، کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ۔ مجھے فیل ہو رہا ہے تم بہت اب سیٹ ہو؟“ راعنہ نے کمال ہوشیاری سے بات شروع کی۔

”ہاں اب سیٹ ہوں۔“ اس نے فوراً ”اقرار کیا اور رکے بغیر سب بتاتی چلی گئی۔

”پاپا میری بات نہیں سمجھ رہے ہیں۔ مجھے صرف شہریار بھائی جیسا لائف پارنر چاہیے جو کوئی ڈیمانڈ نہ کرے۔“

”فرض کیا کوئی ایسا شخص مل بھی جاتا ہے جو بغیر کسی ڈیمانڈ کے تم سے شادی کر لے اور پھر کچھ عرصے بعد سب چیزوں کا مطالبہ کر دے، کیونکہ تمہاری احمقانہ ضد تمہیں کسی بھی بڑے نقصان سے دوچار کر سکتی ہے۔“

”مجھے نقصان ہوگا کسی اور کو تو نہیں۔“ وہ نروٹھے

پن سے بولی۔

”رنم تمہاری ضد کا ہر جگہ چرچا ہے بہت سے نوجوان لالچ میں آکر تم سے شادی کرنے پہ تیار ہو جائیں گے کہ جی ہمیں کچھ نہیں چاہیے بعد میں جب تم نکاح کے بندھن میں جکڑی جاؤ گی تو تمہارا شوہر زبردستی دھونس، دھمکی، بلیک میلنگ کے ذریعے

تمہاری سب دولت، جائیداد اپنے نام کروا سکتا ہے۔ تب تم کیا کرو گی۔ انکل سیال کا سب کچھ تمہارا ہی تو ہے، وہ اپنی خوشی سے تمہیں شادی کے موقع پہ ہر چیز دینا چاہتے ہیں۔ تم مان جاؤ۔ ایسا نہیں ہو تا کہ ہر شخص ہی لالچی ہو۔ انکل کسی ایسے ویسے نوجوان سے تمہاری شادی نہیں کریں گے۔“ راعنہ نے اسے ایک اور پہلو سے سمجھانے کی کوشش کی۔

”تو کوئی ایسا ویسا نوجوان مجھ سے میرے پاپا کی دولت کے بغیر شادی کیوں نہیں کر لیتا۔ اتنی بڑی دنیا میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے کیا؟ جیسا مجھے چاہیے۔“ ایک عجیب سی حسرت پنہاں تھی اس کے لہجے میں۔

”مائی ڈیر فرینڈ یہ لائف ہے، کوئی فلم یا ناول کی کہانی نہیں ہے۔“

”تمہاری شادی بھی تو شہریار بھائی سے ہوئی ہے نا۔“ وہ چمک کر بولی۔

”شہریار میرے کزن ہیں۔ بچپن سے دیکھے بھالے ہیں، پھر ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں شروع سے ہی۔ میں نے ان کی محبت میں سب کچھ قبول کیا ہے، کیونکہ شہریار میری فیملی سے کسی قسم کی فائننشل سپورٹ حاصل کر کے زیر بار نہیں ہوتا چاہتے، انہیں اللہ کی ذات پہ محنت پہ بھروسہ ہے۔“ راعنہ نے اسے حقیقت بتائی۔

”ہماری فیملی میں آپس میں بہت سے Conflicts ہیں جس کی وجہ سے شہریار نے یہ سب کہا۔ میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتی، بس اتنا کہوں گی اپنی ضد سے باز آ جاؤ۔“ رنم جواب میں کندھے جھٹک کر رہ گئی۔



بہت دن بعد رنم اور احمد سیال اکٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ ”تم نے مجھے کوئی جواب ہی نہیں دیا ملک جہانگیر کی فیملی کے بارے میں۔“ احمد سیال نے کھانے کے درمیان بات شروع کی۔ رنم نے حیرانی سے انہیں دیکھا جیسے اسے پاپا سے اس سوال کی توقع نہ ہو۔

”پاپا آپ میری بات سے اتفاق کرتے ہیں تو ٹھیک“

ورنہ۔۔۔  
”ورنہ کیا بولو تم۔“ احمد سیال نے غصے میں اس کی بات کاٹ دی۔

”پاپا میں کبھی بھی شادی نہیں کروں گی۔“ اس نے تیزی سے جواب دیا۔ وہ کھانا چھوڑ کر جا چکی تھی۔ احمد سیال نا سمجھی کے عالم میں ابھی تک ادھر ہی دیکھ رہے تھے جہاں سے وہ باہر گئی تھی۔ ان کے چہرے پہ بے پناہ پریشانی تھی۔



بہت تیز ہوا چل رہی تھی۔ رنم بار بار چہرے پہ آجانے والے بالوں کو سمیٹ رہی تھی۔ وہ فراز کے ساتھ پارک میں بیٹھی تھی۔ اسی نے فراز کو کال کر کے پارک میں بلوایا تھا۔ وہ سب کام چھوڑ کر چلا آیا۔ کیونکہ نہ آنے کی صورت میں رنم سے کچھ بھی بعید نہ تھا۔ وہ ہر الٹی سیدھی بات سوچ سکتی تھی۔

اب وہ اس کے سامنے بیٹھا اس کا پریشان چہرہ اور تاثرات دیکھ رہا تھا۔ ”تم میرے پیسٹ فرینڈ ہو، پر تم بھی میرے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔“ اس کا لہجہ رونے والا ہو رہا تھا۔

”میں کیا جواب دوں۔“ وہ ناراض لہجے میں بولی۔  
”انہی دے وہ آرہے ہیں تم خود کو تیار کر لو اس کے بعد خواجہ صاحب ہیں وہ بھی تمہارے سلسلے میں آنا چاہ رہے ہیں۔“ انہوں نے اسے انفارم کیا۔

”پاپا مجھے نہ تو ملک جمانگیر کی فیملی میں کوئی انٹرسٹ ہے اور نہ کسی خواجہ صاحب میں۔ اگر آپ میری بات مانتے ہیں تو میں اس بارے میں سوچوں گی۔“ نہ چاہنے کے باوجود بھی رنم کے لہجے میں تیزی آگئی۔  
”میں تم کوئی اپنی مرضی نہیں ٹھوس رہا، صرف یہ چاہ رہا ہوں کہ مہمانوں سے مل لو، دیکھ لو۔ اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ ہوگا۔“ احمد سیال نرم لہجے میں بول رہے تھے۔

”پاپا۔ آپ چاہتے ہیں کہ میری شادی ہو جائے۔ پاپا میں شادی کروں گی، لیکن میں آپ سے کچھ بھی نہیں لوں گی۔ یہ بات آپ ان لوگوں کو بھی بتادیں جو ہمارے گھر آئیں گے۔ اگر وہ لوگ بغیر کسی جہیز کے مجھے قبول کرنے کے لیے تیار ہیں تو پھر ٹھیک ہے۔“ رنم کا انداز قطعی بے لچک اور ٹھوس تھا۔ وہ ایک انج بھی اپنے موقف سے پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

”رنم کیوں بچوں والی باتیں کر رہی ہو۔ سب لوگ ہمیں گے مجھ پہ۔“ احمد سیال کی قوت برداشت آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی۔

”پاپا آپ کو لوگ عزیز ہیں یا اپنی اکلوتی اولاد؟“ وہ انہیں جذباتی طور پہ بلیک میل کرنے پہ اتر آئی۔  
”مجھے تم پوری دنیا سے عزیز ہو، مگر تمہاری خواہش ناقابل قبول ہے۔“ وہ بے چارگی سے بولے۔

”پاپا آپ میری شادی کسی ملل کلاس غریب خاندان میں تو کریں گے نہیں۔ جہاں بھی کریں گے وہ لوگ ہمارے ہم پلہ ہوں گے۔ ان کے پاس وہ سب کچھ ہوگا جو ہمارے پاس ہے۔ پھر میں کیوں آپ سے کچھ لوں۔“ رنم انہی بات پہ اڑی ہوئی تھی۔  
”رنم میں پاگل ہو جاؤں گا۔ تم مجھتی کیوں نہیں۔“

**سچی بات سچی**

**شرہ بخاری**

قیمت - 300 روپے

32735021

”میں تمہارے لیے ایک ایسا نوجوان ڈھونڈ سکتا ہوں جو تم سے بغیر جینز کے شادی کر سکے۔“ اس نے قصداً ہلکا پھلکا انداز اختیار کیا۔  
”میں یہاں پریشان بیٹھی ہوں اور تمہیں مذاق سوچ رہا ہے۔“

”مذاق کون کر رہا ہے۔“  
”فراز بیپا نے مجھ پہ غصہ کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ لوگ آ رہے ہیں تم ملو اور فیصلہ کرو۔“  
”ہاں تو مل لیتا۔“ اس نے روانی میں کہا تو رنم نے اسے گھور کے دیکھا۔

”میں نے بیپا سے بول دیا ہے کہ اگر آپ نے میری بات نہ مانی تو میں ساری عمر شادی نہیں کروں گی۔“  
”تم نے اپنے بیپا سے بول دیا۔“ وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”ہاں بول دیا ہے۔“ اس نے تصدیق کی۔  
”تم بیپا کی بات مان لو۔“ اس نے خلاصہ دل سے ایک بار پھر پرانا مشورہ دہرایا۔  
”بھاڑ میں جاؤ تم۔“ وہ پاؤں پٹختی اٹھ کھڑی ہوئی۔  
فراز سر پہ ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔

\*\*\*

وہ رانگ چیر پہ بیٹھی آنکھیں موندے ہلکے ہلکے جھول رہی تھی۔ اسے آج فراز پہ بے پناہ غصہ تھا۔ وہ پارک سے نکل آئی تھی بعد میں اس نے رنم کو کتنی بار کال کی پر اس نے غصے میں ریسپونڈ نہیں کی۔  
اچانک دروازے پہ ہلکی سی دستک ہوئی۔ ”یس کم آن۔“

اس نے آنکھیں کھولیں اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔  
آنے والے احمد سیال تھے۔ رنم نے انہیں بیٹھنے کے لیے نہیں کہا۔ وہ بھی اپنے انداز سے بیٹھنے والے نہیں لگ رہے تھے۔

”میں نے کبھی تم پہ اپنی مرضی نہیں ٹھونسی ہے“ لیکن مجبوراً یہ کام کرنا پڑ رہا ہے۔ میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا۔ ملک جہانگیر کی فیملی کو بلوا رہا ہوں

میں۔ بس یہ ہی بتانے کے لیے آیا تھا۔“ احمد سیال کا لہجہ بے لچک اور سخت تھا۔ اپنی بات پوری کر کے وہ جا چکے تھے۔ جھولتی رانگ چیر اب ساکت تھی۔  
”بیپا آپ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔ میں کبھی بھی برداشت نہیں کروں گی۔ تمام عمر آپ نے میرے منہ سے نکلی ایک ایک بات پوری کی ہے اور اب چھوٹی سی بات ماننے میں آپ کو اعتراض ہے۔ کیا شہریار بھائی جیسا ایک ہی مرد تھا دنیا میں۔ اگر ایسا ہے تو میں شادی ہی نہیں کروں گی۔“ رنم غصے کی انتہائی حد پہ جا کر سوچ رہی تھی۔ احمد سیال نے اسے لاڈ پیار سے پالا تھا۔ اس لیے یہ سب اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

اس نے لمحوں میں فیصلہ کیا۔ ویسے بھی فیصلے کرنے میں وہ دیر نہیں لگاتی تھی۔ جذباتی تو شروع سے ہی تھی۔ اس وقت بھی شدید غصے اور جذبات کے زیر اثر اس نے انتہائی فیصلہ کیا تھا۔ وہ اب الماری کے سامنے کھڑی تھی۔ محلے خانے میں کچھ مکیش پڑا تھا۔ ساتھ گولڈ کی جیولری تھی۔ اس نے دونوں چیزیں اپنے ہینڈ بیگ میں ڈالیں۔ پھر کپڑوں کی باری آئی۔ تین چار جوڑے اس نے ایک الگ چھوٹے سے بیگ میں ڈالے جسے آسانی سے اٹھایا جاسکتا تھا۔ دوسرے دروازے سے اس کا اے لی ایم اور کریڈٹ کارڈ بھی مل گیا۔ وہ بھی اس نے ہینڈ بیگ کے چھوٹی پاکٹ میں ڈال دیے۔ اس دوران اس کی آنکھیں دھواں دھار برستی رہیں۔

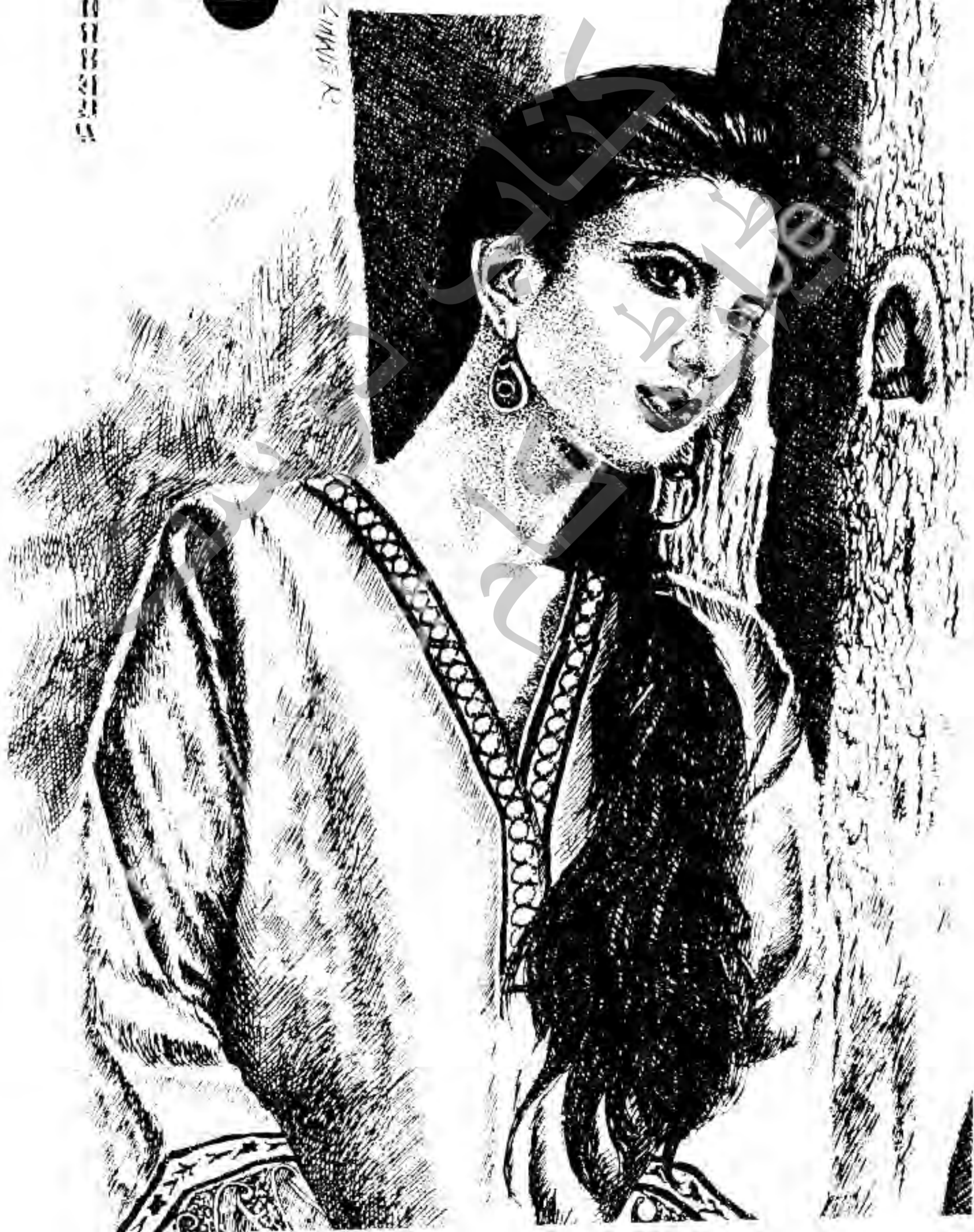
غصے کے عالم میں اس نے اچانک گھر چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس پہ عمل کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھی۔ جانے سے پہلے اس نے آخری مرتبہ اپنے کمرے پہ نظر دوڑائی۔ سائیڈ میبل پہ فوٹو فریم میں اس کی اور بیپا کی ایک یادگار فوٹو بھی ہوئی تھی۔ اس نے دھندلائی نگاہوں سے فوٹو کو آخری بار دیکھا۔  
(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

\*\*\*

سمیرا غزل

گلستاخ

2000



”آئی ایم سوری اماں اب بتاؤ یہ آٹا کیسے صحیح کروں۔“  
اس نے ہی ہار مان کے اماں کو خاموش کرایا اور اماں کے  
مشورے پہ عمل کرتی ہوئی اپنے لٹی نما آٹے کو صحیح  
کرنے لگی۔



”میری بیٹی چائے بہت اچھی بناتی ہے نسرین سچ  
بتاؤں دن بھر کا تھکا ہارا جب لوٹتا ہوں تو مریم کے ہاتھ کی  
بنی چائے میری ساری تھکن اتار دیتی ہے اتنی اچھی  
چائے تو کبھی تم بھی نہیں بناتیں۔“ چائے کا پہلا  
سب لیتے ہی انہوں نے اپنی عزیز از جان بیٹی کے سر پر  
نہایت شفقت سے ہاتھ پھیرا تھا مریم نے فخر سے  
گروں اکرائی تھی۔ وہ اپنے ابا کی بے حد لاڈلی تھی ابا  
ہمیشہ اس کی تعریف کر کے اس کے ہر کام کو سراہتے  
تھے۔

”حد کرتے ہیں آپ بھی بیٹی ذات سے زیادہ  
تعریفیں کر کے سر پہ نہ چڑھائیں کل کو پرانے گھر بھی  
جانا ہے اس نے زیادہ فخر کرے گی تو زندگی میں کبھی اپنی  
غلطی نہیں مانے گی غرور و فخر اسے نقصان نہ  
پہنچا دے۔“

حمید میاں کو گھورتے ہوئے نسرین بیگم نے بڑی  
بے دلی سے پہلو بدلا تھا، مریم دکھ سے انہیں دیکھ کے رہ  
گئی تھی کیا بُرا تھا جو ابا کے ساتھ اماں بھی اس کی  
تعریف کر دیتیں چائے تو وہ واقعی اماں سے بھی اچھی  
بناتی تھی۔

”آپ تو حد کرتی ہیں نسرین بیگم اس کو سسرال جانا  
ہے اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ اس کے پیچھے ہی  
پڑ جائیں۔“ انہیں ان کی بات سخت ناگوار گزری تھی  
نسرین بیگم چپ ہو کر رہ گئیں جو بھی تھا شوہر مادر سے  
بحث کرنا ان کا شیوہ نہ تھا۔

”خیر چھوڑیں یہ سب وہ میرے دوست میں نا  
رانے خالد صاحب۔ یاد ہو گا آپ کو ایک دو بار بھابھی  
کے ساتھ ہمارے گھر بھی آئے تھے ان کا سب سے  
بڑا بیٹا ہے عالیان، ماشاء اللہ بہت اچھا اور سمجھ دار بچہ

”اری او مریم یہ آٹا گوندھ کے گئی ہے یا لٹی بنا کر  
اتنا پتلا کہ روتی ہی بہہ جائے۔ سسرال جائے گی تب  
ہی عقل آئے گی مجھے اللہ حافظ ہے تیرا تو۔“

اپنے ہاتھ میں ریموٹ دبائے وہ اپنا پسندیدہ مارننگ  
شو دیکھنے میں مگن تھی کہ اماں کی کڑک دار آواز سے  
ریموٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹا تھا۔

”اف یہ اماں بھی نا کبھی میرے کسی کام سے خوش  
نہیں ہوتیں ہر چیز میں کیڑے نکال ہی لیتی ہیں سسرال  
جا کے کیا خاک عقل آئے گی مجھے تو اپنا میکہ ہی  
سسرال لگتا ہے۔“

”ارے کہاں مر گئی اب آئے گی بھی یا یہ ٹی وی ہی  
دیکھتی رہے گی گھر کا کام سارا پڑا ہے اور اس لڑکی  
ٹی وی کی پڑی ہے۔“

معمول کی طرح اماں مسلسل اسے کونے میں  
مصروف تھیں اس کی تو صبح دوپہر شام اور رات سب  
ہی اماں کی ڈانٹ و پھٹکار سے پوری ہوتی تھیں۔

”آری ہوں تھوڑا صبر بھی کر لیا کرو ہاں۔ وہاں  
پہنچے میں ایک دو منٹ تو لگتے ہیں نا۔“ ہمیشہ کی طرح  
اس نے بچن کی جانب بھاگتے ہوئے آواز لگائی ”ورنہ  
اماں سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ اپنی چپل لے کر اس کے  
سر پر آ پہنچتیں۔“

”بس یہی کام ہے تیرا ایک تو غلطی کرتی ہے اور  
دوسرے مسلسل زبان چلاتی ہے تو کبھی نہ سدھرے  
گی ایک ہزار دفعہ سمجھایا ہے لڑکھوں کو خاموش رہنا  
چاہیے آگے سے جواب نہیں دینا چاہئے۔ لڑکی میں  
لاکھ خامیاں ہوں لیکن اس کی زبان تیز نہیں ہونی  
چاہیئے مگر تیری تو زبان کو ہی لگام نہیں لگتا خدا ہی  
سمجھائے گا مجھے تو۔“

آٹے کو چھوڑ کے اماں اب اس کی زبان درازی کے  
پیچھے پڑ گئی تھیں نجائے کیوں اسے حسرت سی ہی رہی  
کہ اماں کبھی اس سے پیار سے بات کریں وہ اپنی طرف  
سے تو ہر ممکن کوشش یہ ہی کرتی تھی کہ ہر کام صحیح  
کرے مگر پھر بھی اس سے ہر بار کوئی نہ کوئی غلطی  
ہو جاتی تھی اور اماں اسے ڈانٹنے لگ جاتی تھیں۔

ہے میری کئی بار باضابطہ ملاقات بھی ہوئی ہے اس سے وہ لوگ اس کے رشتے کے سلسلے میں ہماری مریم کو دیکھنے آنا چاہ رہے ہیں آپ کی کیا رائے ہے۔ اس بارے میں۔

چائے کا خالی کپ ٹرے میں رکھتے ہوئے انہوں نے مریم کو جانے کا اشارہ کیا تھا پھر نسرین بیگم کو ساری تفصیلات سے آگاہ کیا۔ مریم نے جاتے جاتے ان کی گفتگو کا کچھ حصہ سن لیا تھا شادی کے نام سے اک انہماک سا خوف اس کے چہرے پر آنکھڑا تھا۔

”ہاں یاد ہے مجھے اچھے لوگ لگتے ہیں وہ تو اور آپ کا آنا جانا بھی ہے وہاں تو اتنا سوچنا کیسا بلا لیں اس منہ کو ان لوگوں کو، ابھی عصیر اکیڈمی سے آجائے گا تو اسے بھی ساری بات بتا دیں گے لوگ کے بارے میں وہ ضروری حیران مین کرے گا۔“

نسرین بیگم کو یہ رشتہ کافی معقول لگ رہا تھا سو فوراً گھر بلائے کا عندیہ دیا۔ باقی انہیں عصیر بھی بھروسہ تھا کہ وہ ساری معلومات صحیح صحیح نکال لے گا۔

عصیر مریم کا بڑا بھائی اور ان کا بڑا بیٹا تھا۔ ان کی کل دو ہی اولادیں تھیں حمید صاحب کا اپنا جنرل اسٹور تھا کچھ نسرین بھی قناعت پسند تھیں ساس سسر کا انتقال ہو چکا تھا حمید صاحب بھی اپنے اماں ابا کے اکلوتے لخت جگر تھے، سوان کا گزر بسر اچھے سے ہو رہا تھا بس اب انہیں مریم کی فکر تھی جو پرائیویٹ لی اے کر کے گھر میں فایرغ بھی سوائے رخصت کرنا ان کی اولین ذمہ داری تھی۔



آج منڈے تھا مالیان کے گھر والوں کی آمد کے سلسلے میں نسرین بیگم صبح سے ہی گھر کی صفائی ستھرائی میں مصروف تھیں۔ مریم کی شامت آئی ہوئی تھی کچن سے لے کر باتھ روم کی صفائی تک، نسرین نے اسے اپنے ساتھ لگائے رکھا تھا کام تو وہ سارا بے چاری مریم سے ہی کروا رہی تھیں، بس کھڑے کھڑے اسے ہدایت نامہ جاری کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے ہر

کام پر تنقید کر کے بار بار کام صحیح کروا رہی تھیں۔ مریم حقیقتاً ”تپ انھی تھی۔“

”امی کیا ہو گیا ہے آپ کو آپ بیٹھ جائیں میں کر لوں گی نا خود سب آپ بے فکر رہیں۔“

”واہ بیٹا واہ! صبح جا رہی ہو تم سے تو اپنی ماں برداشت نہیں ہو رہی ساس کو کیا برداشت کرو گی شادی ہونے والی ہے۔ مگر تم نہ سدھرو گی بیٹا، ساسیں اپنے گھر کا سارا کام بہوؤں سے ان کے سر پر کھڑے ہو گئے ہی کرواتی ہیں اور ویسے بھی تم کون سا اتنی اچھی صفائی کرتی ہو کہ تمہارے بھروسے گھر چھوڑ کے بیٹھ جاؤں جلدی سے کام سمیٹو پھر کھانے کا انتظام کرو میرے ساتھ۔“

وہ بھی اس کی ہی اماں تھیں منٹ میں طبیعت صاف کر دیتی تھیں۔ مریم منہ بسور کے رہ گئی تھی، اماں سے جیتنا اس کے بس میں نہ تھا۔ صفائی ستھرائی سے فارغ ہونے کے بعد وہ ناشتے اور کھانے وغیرہ کے انتظام میں لگ گئی تھی، اماں کو ویسے بھی باہر کی چیزیں پسند نہ تھیں کیک سے لے کر سمو سے تک وہ ہر چیز گھر میں خود بناتی تھیں۔ یوریا خاندان ان کی نفاست پسندی و سکھڑ پن کی تعریف کرتا تھا، اور وہ مریم کو بھی اسی روپ میں ڈھانسا چاہتی تھیں مگر مریم تھی کہ ہر بار اس سے کوئی نہ کوئی غلطی سرزد ہو ہی جاتی تھی۔

آج تو معاملہ ہی کچھ اور تھا پھر بھلا آج کیسے وہ مریم کو کوئی غلطی کرنے دیتیں اس لیے صبح سے ہی اسے ناشتے وغیرہ کے انتظام میں لگا دیا، رول کا سالافرتج میں تیار کروا کے رکھوایا، پھر رول کی پٹیاں بنوائیں، کباب ختم ہو گئے تھے وہ بنوائے ڈی فریزر کر دئے، کپھر بنوائے رات کو ہی انہوں نے فرتج میں رکھوادی تھی۔ اس کے علاوہ کچھ نمکو وغیرہ انہوں نے باہر سے منگوا لیے تھے، اور کھانے کے لیے تندوری چکن کا مینیو رکھا تھا۔

دوبہر میں تمام کام نمشا کے وہ اماں کی اجازت سے کچھ ویر کولیٹ گئی تھی تاکہ شام میں اٹھ کے نہا کے فریش ہو جائے۔ ہلکی گندی رنگت کی حامل اور گھنے

ہی نصیحتیں کی تھیں کیا تھا جو وہ آج اس سے کوئی  
پیار بھری بات ہی کر لیتیں، یہ بات اس کے دل میں  
گانگھ کی طرح بیٹھ گئی تھی اور یونہی روتے روتے وہ  
مریم حمید سے، مریم عالیان بن کے اس کے سنگ چلی  
آئی۔

کچھ ضروری رسموں کے بعد صفیہ بیگم نے اسے  
اس کے کمرے میں بھیج دیا۔ ہلکے آسمانی اور آف  
وہائٹ اسکیم سے سجا کمرہ اس کے شوہر اور ساس کی  
نفاست پسند طبیعت اور سلیقہ پسندی کا منہ بولتا ثبوت  
تھا۔ دھیمے سے بات کرتے، پرکشش شخصیت کے  
حامل عالیان بھی اسے کافی پسند آئے تھے وہ کب سے  
ارد گرد گردن گھماتی کمرے کا جائزہ لے رہی تھی کہ ہلکی  
سی دستک دے کر عالیان کمرے میں آئے اسے دیکھ  
کے وہ مسکرائے اس نے شرما کے گردن جھکالی۔

”آپ میری والدہ کا انتخاب ہیں اس لیے میں جانتا  
ہوں کہ بلاشبہ میرے لیے ایک بہترین شریک حیات  
ثابت ہوں گی۔ اب یہ مت سمجھ لیجئے گا کہ آپ میری  
پسند نہیں بس میری آپ سے صرف اتنی ریکوسٹ  
ہے کہ اس گھر کو اپنا گھر سمجھئے گا۔ ہماری امی نے ساری  
زندگی ہمارے لیے بہت کچھ کیا ہے وہ طبیعت کی سخت  
ہیں، گردن کی بہت نرم اور اچھی ہیں اور بابا تو بہت ہی  
اچھے ہیں مجھے امد ہے آپ میری کمیلی کو اپنا سمجھ کے  
مجھے سرخرو کر دیں گی۔“

مٹھلی کیس میں دو خوب صورت گنگن نکال کے  
انہوں نے اس کی ہتھیلی پہ سجایے تھے، پھر دھیرے  
دھیرے اسے اپنی محبت اور مان سوچ کر انہوں نے  
اس کی تمام مشکلیں آسان کر دی تھیں۔ وہ جو سسرال  
نامہ سن سن کے پریشان تھی عالیان کی دوستانہ باتوں  
سے اب خود کو قدرے ریلیکس فیل کر رہی تھی۔

\*\*\*

دو سو بیس گز پہ مشتمل ڈبل اسٹوری پہ بنا اس کا  
سسرال اس کے میکے سے کافی بڑا تھا، جہاں کی صفائی  
ستھرائی سے لے کر کچن تک کا ہر کام اس کی ساس بڑی

آبشار جیسے بالوں کی بدولت وہ اپنے آپ میں کافی  
کشش رکھتی تھی جو بھی دیکھتا اسے سراہتا ضرور تھا۔  
بس کم عمری کے باعث اس میں کچھ لاپرواہی پن تھا جسے ہر  
وقت سرین بیگم سنجیدگی میں ڈھالنے کی کوشش کرتی  
رہتی تھیں۔ شام میں نما کے اس نے ہلکے آسمانی کٹر کا  
کاشن کا سوٹ زیب تن کیا تھا۔

سلیقے سے سر پہ ڈوپٹا سجائے وہ بے حد پروقار لگ  
رہی تھی صاف ستھرا گھر اور کچن، سلیقہ منداں اور بیٹی،  
خالد صاحب اور ان کی شریک حیات صفیہ کو بے حد  
پسند آئی تھیں اتنا کہ گھر جاتے ہی انہوں نے اپنی  
رضامندی ظاہر کر کے ڈائریکٹ شادی کی تاریخ مانگ لی  
تھی۔ سرین تو اتنی جلدی یہ شکرانے کے نفل پڑھنے  
لگ گئی تھیں۔

ادھر عمید نے بھی تمام معلومات حاصل کر کے  
عالیان کے حق میں فیصلہ دے دیا تھا۔ یوں چند دن ان  
کو انتظار کرانے کے بعد اور عالیان سے باضابطہ  
ملاقات کے بعد انہوں نے رضامندی دے دی تھی،  
اور یوں آٹا فانا شادی کی تیاریاں شروع کر دی گئی  
تھیں۔ تیاریوں کے ساتھ ساتھ اماں کی نصیحتوں میں  
بھی اضافہ ہو گیا تھا، مگر مریم خوش ہونے کے بجائے  
انجانے خوف کے زیر اثر دن بہ دن خاموش ہوتی  
جاری تھی جسے سب شرم سے تعبیر کر رہے تھے۔

\*\*\*

”بیٹا کچھ بھی ہو جائے کبھی کسی سے بد تمیزی نہ کرنا،  
اپنے شوہر کی نافرمانی نہ کرنا، بڑی سے بڑی بات پہ بھی  
صبر کر لینا، مگر کوئی حرف شکایت اپنی زبان پہ نہ لانا۔  
اس کی کو اپنی ماں سمجھنا اور سسر کو باپ سمجھنے کی بڑی بن  
کے جارہی ہو، کبھی مجھے شرمندہ نہ کرانا، ہر کام نہایت  
سلیقہ سے کرنا، یوں کہ میری تربیت پہ کوئی حرف نہ  
آئے۔“

انہوں نے پہلے اسے گلے لگا کر سرین بیگم نے اپنے  
آنسو پھپھاتے ہوئے نصیحت کی۔ مریم حق دق ماں کو  
نہمستی رہ گئی۔ ساری زندگی انہوں نے اسے سسرال پہ

ہی نفاس سے کرتی تھیں۔ صبح سے لے کر رات تک ان کا کام گھر سنبھالنا ہی تھا اور اب یہ ذمہ داری گھر کی بڑی بہو ہونے کی حیثیت سے مریم پر عائد ہوتی تھی۔ اس کے چار دیوڑ تھے البتہ زند کوئی نہ تھی۔ عالیان سے ایک سال چھوٹے ذیشان تھے، پھر ان سے تین سال چھوٹے عدنان اور ان سے تین سال چھوٹے ایمان تھے۔ لڑکوں کا گھر تھا سو بکھیرے ہر وقت تیار رہتے تھے سب کی الگ الگ فرمائشیں تھیں۔ گھر کے حالات بھی اتنے تھے سو کھانے کے لیے سب کی فرمائشوں کا دھیان رکھا جاتا تھا۔ ناشتے میں بھی سب کی الگ الگ پسند تھی کسی کو انڈا بانف فرائی پسند تھا تو کسی کو آملٹ، کسی کو پرائٹ تو کسی کو سینڈویچ کھیر میں ہاتھ لگنے کے بعد سے ہی وہ امر کے کاموں میں جت گئی تھیں۔

فجر سے لے کر رات گئے تک کام کر کے وہ بری طرح ہٹکان ہو جاتی۔ اوپر سے ستم یہ ہوا کہ اس کی ساس کی عادت ہو ہو اس کی اماں جیسی تھیں۔ وہ جھاڑو لگاتی تو صفیہ بیگم پیچھے پیچھے رہتیں کہ بیٹا یہاں سے صبح نکالنا دیاں سے صبح۔ وہ بے چاری چپ چاپ ان کے قسم کی تعمیل کرتی رہتی زبان کھولنے کا سوچتی تو اماں کی نصیحت جھٹ سے یاد آ جاتی۔ وہ روٹی پکاتی تو ساس باتیں کرنے کے بہانے پکین میں موجود رہتیں ساتھ ساتھ اس کے کام پر اپنی رائے دیتی رہتیں۔

وہ ڈر کے مارے اور دل جمنی سے کام کرتی مبادا ساس بھی اماں کی طرح اس کے لٹے لینے نہ لگ جائیں وہ بھی اماں کی طرح اس سے سارے کام ایڈوائس میں کرا کے فریج میں رکھا دیتی تھیں۔ کچھ ہی عرصے میں ساس اس کی سعادت مندی اور سلیقہ مندی کی گرویدہ ہو گئی تھیں۔ عالیان بھی دیکھتا تھا کہ وہ کسی مشین کی طرح اماں کی سرپرستی میں دن رات کام میں جتی رہتی تھی، سرور دیوڑ بھی اس کا دم بھرنے لگے تھے۔ ساس الگ حیران ہوتیں کہ وہ ہر وقت اس کے ساتھ رہتی ہیں، کام یہ نوکری ہیں مگر وہ کبھی پلٹ کے جواب تک نہیں دیتی، کبھی چڑی نہیں اب یہ الگ بات تھی

کہ مریم دل ہی دل میں صبر کے گھونٹ بھر کے رہ جاتی تھی۔ وہ تو اماں کی صحبت میں رہ کے اتنا ٹرینڈ ہو گئی تھی ورنہ ان کی جگہ اماں ہوتیں تو اب تک اس کی زبان درازی سے محفوظ نہ رہتیں۔ ذمہ داریاں بڑی تھیں۔

اس لیے مریم نے جب ساس کو خوش خبری کی نوید دی تو انہوں نے خوشی سے نہال ہوتے ہوتے اپنی عزیز بہو کے ساتھ گھر کی ذمہ داریاں آدھی آدھی بانٹ لیں۔ سب نے ہی اسے ہاتھ کا چھالا بنا کے رکھا اور یوں ننھا اسد ہنستا مسکراتا اس گھر کا مکین بن گیا۔ مریم کے اماں ابا اور بھائی الگ نہال تھے نواسے کی خوشی میں انہوں نے بیٹی اور نواسے کو بے حساب دیا۔ عالیان اور مریم کی تو جیسے زندگی ہی مکمل ہو گئی تھی۔

اسد کی آمد کے ساتھ ساتھ مریم کی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئی تھیں ایسے میں صفیہ بیگم اور خالد صاحب کو ذیشان کی شادی کا خیال آیا تھا یہ ان کا ماننا تھا کہ اگر ایک بہو اور آجائے گی تو دونوں مل بانٹ کے گھر سنبھال لیں گی۔ صفیہ بیگم میں اب اتنا دم نہ تھا کہ وہ گھر کے کام کرتیں ہاں ہر کام پر روز اول کی طرح نظر ضرور رکھتی تھیں مریم خود اس فیصلے سے خوش تھی۔

صفیہ بیگم نے اپنی خالہ کی بھانجی کو اک تقریب میں دیکھا تھا گلابی رنگت کی حامل شانزے انہیں اپنے ذیشان کے لیے بہت پسند آئی تھی دور پرے کے رشتہ دار تھے مریم سمیت سب کی رضامندی سے وہ لوگ رشتہ لے کر گئے اور لڑکی والوں کی پسندیدگی کی سند ملے ہی شادی کی تیاریاں شروع کر دی گئیں اور اک سہانی سی شام کو شانزے ذیشان کے سنگ رخصت ہو کر ان کے گھر چلی آئی تھی۔



وہ نہایت جلدی میں آنا گوندھ کے ٹی وی آن کر کے بیٹھ گئی تھی، مبادا کہیں اس کا من پسند ڈرامہ نہ نکل جائے ابھی اس نے ڈرامہ دیکھنا شروع ہی کیا تھا کہ صفیہ بیگم کی پاٹ دار آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔

”بیٹا یہ آنا کیسا گوندھا ہے شانزے پوری تولی بن گئی ہے اس کی روٹی کیسے بنے گی۔“

صفیہ بیگم آنے کا تسلا اٹھائے شانزے کے سر پہ آن کھڑی ہوئی تھیں۔ آج شانزے کے کام کا پہلا دن تھا اور آج ہی اس کی شامت آن بڑی تھی بے چاری مریم بھی ننھے اسد کو اٹھائے آگئی تھی کہ آج پہلی بار ساس کو غصے میں دیکھا تھا۔

”صحیح تو گوندھا ہے امی آنا ٹھہرنے میں بھی تو ٹائم لگتا ہے اور ابھی — فریج میں رکھ دوں گی تو رات تک خود ہی سخت ہو جائے گا۔“ اپنی غلطی ماننے کے بجائے وہ برابر سے جواب دیتی دوبارہ ریموٹ سنبھال کے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ صفیہ بیگم کو بہو کی ہٹ دھرمی ایک آنکھ نہ بھائی تھی۔

”ایک تو غلطی کرتی ہو اور یہ جواب بھی دیتی ہو۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں اس امی نما آلے سے تم کیسے روٹی بناؤ گی چلو میں تمہیں سکھاؤں بند کرو بیٹی دی۔“

انہوں نے آگے بڑھ کے لی وی بند کیا اور کچن میں آگئیں نہ چاہتے ہوئے بھی شانزے کو اٹھنا پڑا۔ مریم نے حیرت سے سارے منظر کو دیکھا تھا کچھ سال پہلے وہ بھی تو شانزے کی جیسی تھی وہ بھی تو ایسے ہی آٹا گوندھتی تھی ایسے ہی زبان چلاتی تھی وہ تو اس کی اماں نے اسے کوس کوس کے ڈراؤرا کے اتنا عادی کر دیا تھا کہ سسرال میں اس سے خود ہی ہر کام صحیح ہونے لگا تھا اور بالقرع کوئی غلطی ہو بھی جاتی تو اماں کے بتائے ٹوٹے اسے ازبر ہو چکے تھے وہ جھٹ اپنی غلطی سدھار لیتی تھی۔

”تمہاری امی تمہیں نہیں ڈانٹتی تھیں کیا؟“

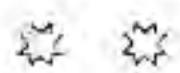
شانزے جب تم غلط کام کرتی تھیں اور کیا انہوں نے تمہیں آٹا گوندھنا روٹی بنانا نہیں بتایا تھا؟“ ساس کے جانے کے بعد اس نے بڑی ہی رازداری سے کچن میں آکر شانزے سے پوچھا تھا۔

”ارے بھابھی کیسی باتیں کر رہی ہیں میں اپنے گھر کی اکلوتی اور اپنی اماں کی سب سے لاڈلی بیٹی ہوں۔ انہوں نے تو آج تک مجھ سے کوئی کام نہیں کرایا بس

شادی سے کچھ دن پہلے جو تھوڑا بہت سکھایا وہ کام آ رہا ہے وہ کہتی ہیں کہ انسان کو ساری زندگی سسرال میں کام ہی کرنا پڑتا ہے پھر شادی سے پہلے وہ میرا ہنسا کھیلنا کیوں چھین گیتی بھلا۔“ اس کے لہجے میں ماں کے لیے محبت ہی محبت تھی۔

مریم چپ ہو کے رہ گئی کچھ ہی عرصے میں صفیہ بیگم نے سب جگہ شانزے کی زبان درازی اور پھوہڑپن کے قصے مشہور کر دیے۔ تھیں تو وہ ساس ہی نا ایک جگہ مریم کی سعادت مندی تھی، سلیقہ مندی تھی دوسری جانب شانزے کی زبان درازی اور پھوہڑپن۔ صفائی کرتی وہ کچر اودھرا دھڑا رہ جاتا، روٹی پکاتی تو کہیں سے جل جاتی تو کہیں سے پکی رہ جاتی۔ کوئی کام اس سے ڈھنگ سے نہ ہوتا، اکثر اس کی ساس جگ آکر کہا کرتیں تھیں کہ اگر شادی سے پہلے تمہاری ماں نے کچھ سکھایا ہوتا، یا تم نے کھیل کود کے بجائے ان سی کچھ سیکھا ہوتا تو یہ طعنے نہ سننے پڑتے تمہیں۔“ اور مریم ساس کی بات سن کر بس یہ ہی سوچا کرتی کہ وہ بھی تو اپنے گھر کی اکلوتی تھی اگر اس کی اماں نے بھی اسے سر پر چڑھایا ہوتا، کام نہ کرایا ہوتا، ہر بات پہ ٹوکا نہ ہوتا، سمجھا سمجھا کے اس کی جواب دینے کی عادت نہ چھڑائی ہوتی تو آج وہ بھی شانزے کی طرح ساس کی نا پسندیدہ بہو ہوتی۔

ہمیشہ اس نے اماں کے لیے اپنے دل میں بدگمانی رکھی تھی کہ اماں اس سے محبت نہیں کرتیں جب ہی ڈانٹتی ہیں مگر وہ کیوں ڈانٹتی تھیں یہ آج اسے سمجھ آگیا تھا۔ آج اس کے دل سے ہر کدورت مٹ گئی تھی اس کی اماں نے اسے ذرا سی ڈانٹ پھٹکار دے کے ہمیشہ کے لیے اس کے نصیب میں سسرال کا مکہ لکھ دیا تھا۔ ماں کی نصیحتیں اس کے دل میں گانٹھ کی طرح بندھ گئی تھیں ویسے ہی جیسے اس کی ساس کے دل میں شانزے کا پھوڑپن گانٹھ کی طرح بندھ گیا تھا اب شانزے جتنی بھی کوشش کرتی رہتی وہ بد زبان ہی، کیونکہ دل میں جو گانٹھ بندھ جائے وہ کبھی نہیں کھلتی۔



# Medora

Perfumed Talc



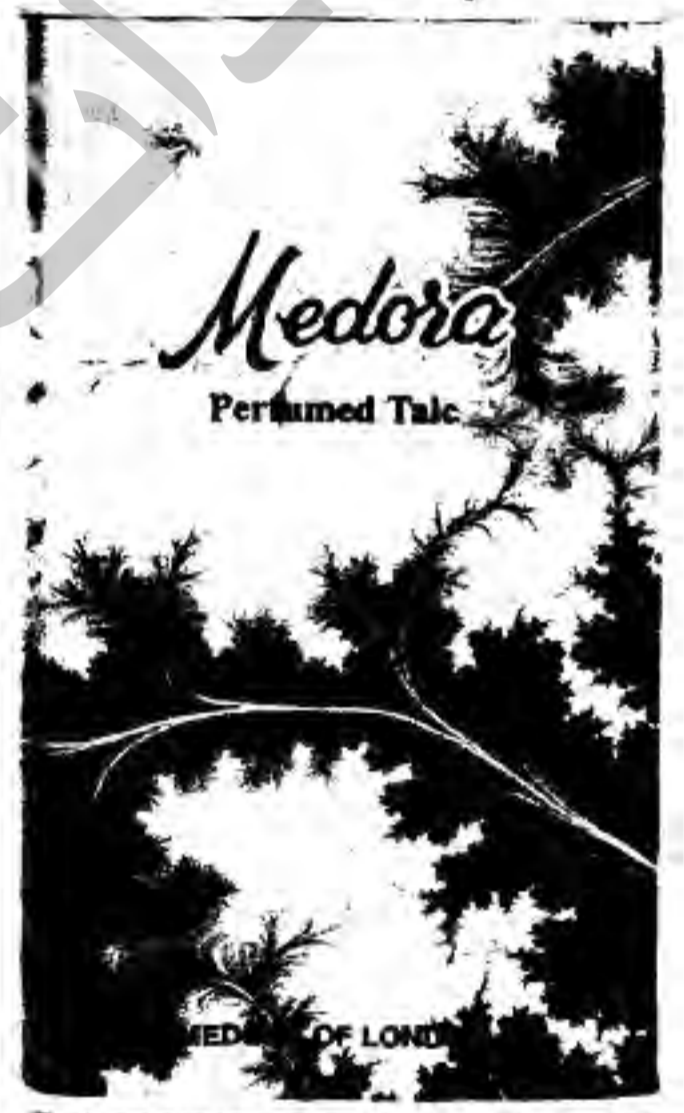
خوشبو جو دل کو پہنائے  
تازگی جو ہر کوئی چاہے

Joy

Cherish



میں اور آپ فیومڈ ٹالک  
کی تازگی جگاتی  
خوشبوؤں سے  
ملے آپ کو مہکتا فرش  
احساس جو رہے دل پہ  
آپ کے ساتھ



8 مختلف دلفریب خوشبوؤں میں دستیاب ہے

Pleasure, Chersih, Joy, Season, Passion جن میں

Salute اور Dignity, Greetings شامل ہیں

MEDORA OF LONDON



تاجیہ کو اپنا فز کس کا جنرل نہیں مل رہا تھا۔ جس کی وجہ سے اٹھانچ کی آواز صحن میں صاف سنائی دے رہی تھی۔

”کہاں چلا گیا۔ یہیں تو رکھا تھا۔“ تاجیہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ پورے کمرے کو گلاس کی طرح اونڈھا کر دے۔

”سلیقہ اور نفاست تو تمہیں چھو کر نہیں گزری۔ مجال ہے جو کبھی ایک بھی کام ڈھنگ سے کیا ہو۔“ کمرے کا یہ نقشہ۔ دیکھ کر ثروت بیگم کو ابال آگیا۔

”میری سلیقہ مندی پر اظہار خیال آپ کسی اور وقت کیجئے گا۔ ابھی میں بہت پریشان ہوں اماں۔“ ایسی ہنگامی صورت حال میں ثروت بیگم کی دل جلادینے والی تحقیر ہمیشہ ہی اسے کوفت میں مبتلا کر دیتی تھی۔

”یہ تو اللہ ہی حافظ ہے۔ میرے بس کی بات نہیں۔“ اس کی جھنجھلاہٹ کے بعد یہ فتوا جاری ہونا عام تھا۔

”راج گیری اور حاکمیت کے علاوہ اور کون سی چیز ہے جو تم نے اپنے بس میں کی ہو۔ آج بچوں کی بد تمیزی پر کڑھتی ہو۔ کل جب ان کی تربیت کا دور تھا تب تو آنکھیں بند کر رکھی تھیں تم نے۔“

کیس جو بھولے بھٹکے ثروت بیگم کا کوئی جملہ اماں بی کے کانوں میں پڑ جاتا تو بھلے تسبیح پڑھ رہی ہوتیں۔ جواب دینے سے نہ چوکتیں۔ ایک طرف یہ ہنگامہ تو دوسری طرف دانش کی چیخ و پکار۔

”میرے موزے کہاں ہیں؟“ وہ وہائی دیتا۔

”میں نے بیچ کر سوٹ بنا لیا۔“ ان سب کے لیے

بہت گہری نیند میں تھی وہ۔ رات کا نہ جانے کون سا پیر تھا۔ جب دلی دلی سسکیوں نے اسے ہوش کی دیا میں کھیٹا۔ آنکھ کھلی مگر گھپ اندھیرا چار اطراف منہ چڑا رہا تھا۔

عفرائیں بھی اماں کے زخموں پہ پھیلا رکھنے کی سکت نہیں تھی۔ اس میں تسلی دینے کا سوچتی تو اپنے آنسوؤں پہ ضبط رکھنا مشکل ہو جاتا۔ اماں بہت مضبوط دل کی تھیں۔ دن بھر اپنے آنسو چھپائے پھر تیں تاکہ ان پر کوئی سوال نہ اٹھ سکے۔ ایسے میں رات کے یہ چند خاموش پہری تو تھے جن سے ان کا دل اپنے غم کے راز

## فَلَوِ لَی

و نیاز کرتا تھا۔ پچیس سال سے ان کے دل پہ دھرا در دھرا رات قطرہ قطرہ آنکھوں سے نکل کر تکیے میں جذب ہوتا تھا۔

عفرا کو تو وہ جان بوجھ کر اپنے غم کی برچھائیں سے بھی دور رکھتی تھیں پر ایسا بھلا کب ممکن تھا۔ وہ انجان نہ تھی مگر انجان بن جاتی تھی۔ ماں کے لیے نہیں اپنے لیے۔

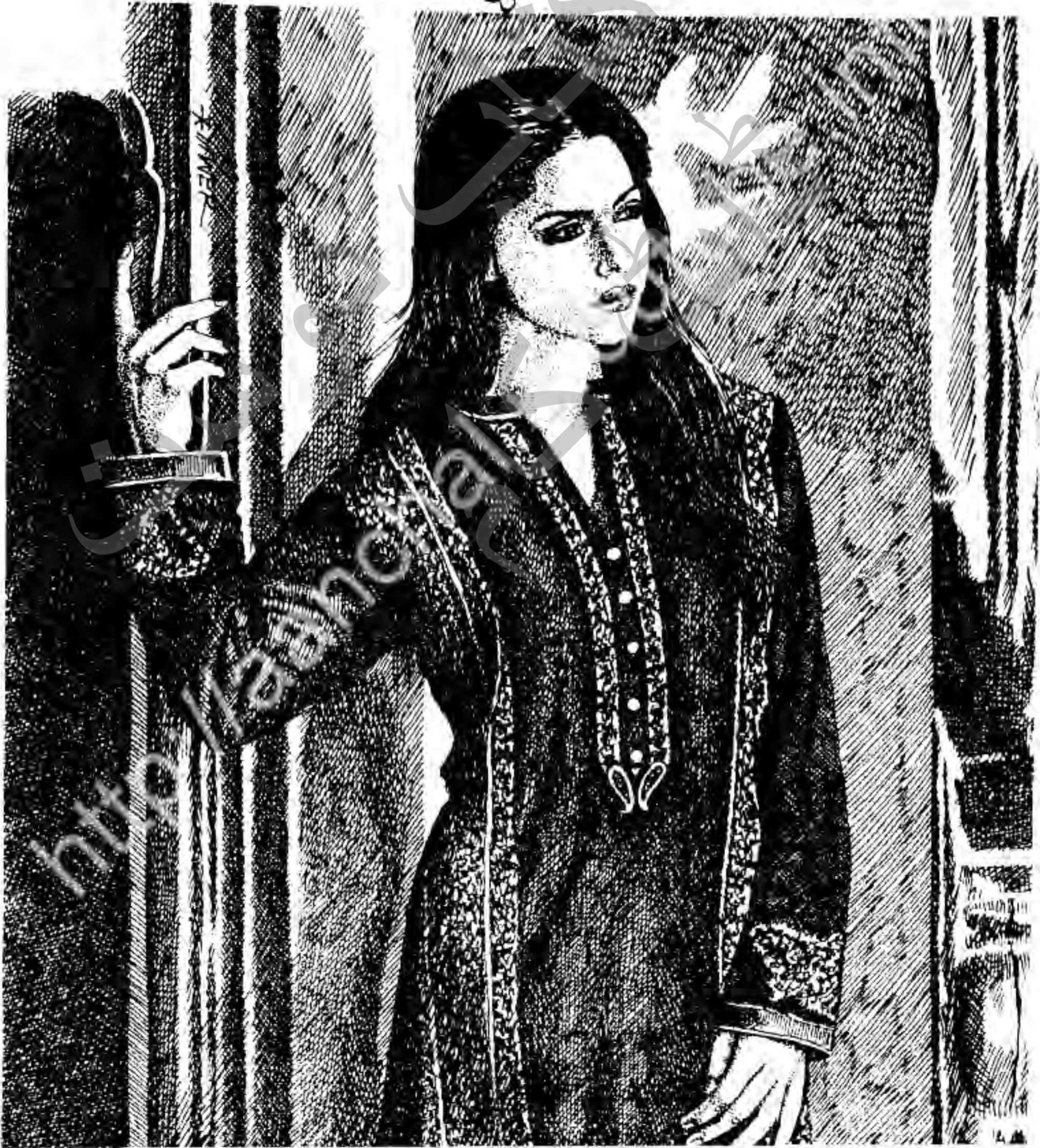
کہتے ہیں دکھوں کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔ کوئی چہرہ نہیں ہوتا۔ کوئی وجود نہیں ہوتا۔ اماں کا دکھ بھی ایسا ہی تھا۔ ان کہا۔ مگر ان جانا نہیں۔



صبح کا آغاز حسب معمول ایک ہنگامے کے ساتھ ہوا۔ رائے کے سر پر کالج پہنچنے کی جلدی سوار تھی۔

آج بھی حسب معمول وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی  
 ہی تھی کہ تایا ابا نے اسے آواز دی۔  
 ”عفرا بیٹی! میرے لیے ناشتا تم لاؤ۔ باقی سب کو تو  
 اپنی ذات کے علاوہ اور کسی کی فکر نہیں۔“ عفرا کو پیار  
 سے بلانے کے ساتھ ساتھ انہوں نے دزدیدہ نگاہوں  
 سے اپنی بیگم کی جانب بھی دیکھا۔  
 ”جی تایا ابا! میں ابھی آپ کے لیے ناشتا لاتی  
 ہوں۔“ وہ فوراً ان کے لیے ناشتا لینے کے لیے چلی  
 گئی۔

پراٹھے بیلتی انہیقتہ حل کر جواب دیتی۔  
 صبح صبح اپنی غیند کی قربانی کا قلق ایسے دل جلے جملوں  
 کی صورت میں سامنے آتا تھا۔  
 ”اوٹھو نس لو۔ میں کسی کی نوکر نہیں کہ باری باری  
 سب کو ناشتا گرم کر کے پیش کرتی پھوں۔“ چائے کا  
 تھرماس اور چنگیر میں گرم گرم خستہ پرائیڈوں کا ڈھیر وہ  
 یوں کھانے کی میز پر پختی گویا وہ کسی دشمن کا سر ہو۔  
 ایسے میں ایک عفرا کا وجود تھا جو سر لیا سکون تھا۔



”بس دوسروں کے ہی گن گاتے رہے گا۔ اپنی اولاد میں تو خامیوں کے علاوہ آپ کو اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔“ ثروت بیگم سے عفران کی تعریف برداشت ہو جائے یہ بھلا کب ممکن تھا۔

”کچھ ہو گا تو ہی نظر آئے گا ناں۔ بائی داوے کچھ دیر پہلے آپ خود بھی اپنی دختر نیک اختر کی جملہ خامیاں گنوا رہی تھیں۔“ انہوں نے جواب دے کر اخبار پھیلایا۔ جس کا مطلب تھا اب وہ مزید اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتے۔

سرہ سلیقے سے دوپٹا لیے کچھ دیر بعد ہی عفران اٹھنے کی ٹرے سے آگئی۔

”جیتی رہو بی سدا خوش رہو۔ تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟“ اس کے سرہ ہاتھ رکھ کر دعاوی تو بے اختیار عفران کی آنکھوں میں نمکین پانی آگیا۔

”نہیں تایا ابا! مجھے آپ کے پیار اور شفقت کے علاوہ اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔“ اس کا ایک ایک لفظ احساس تشکر سے لبریز تھا۔

”سنو ادھر آؤ ذرا۔“ کھڑکی سے اس کے آنچل کی جھلک دکھائی دی تو اماں بی نے فوراً ”پکار لیا۔

”جی اماں بی!“ وہ فوراً ”ان کے کمرے میں آگئی۔

”یہ میری چادر تہ کرو۔ یہاں تو کسی کو میری پروا ہی نہیں ہے۔ سچ سے کسی نے کمرے میں جھانک کر یہ تک نہیں پوچھا کہ ناشتا کب کریں گی؟“ عمر کے حساب سے یہ چڑچڑاپن ان کے مزاج کا حصہ بن گیا تھا۔ وہ جانتی تھی مائی اماں اور ان کی بیٹیاں کتنی ہی لا پروا اور غیر ذمہ دار سہی پر اماں بی کی خدمت سے سرگز کو تاہی نہ کرتیں۔ پر پھر بھی ان کے لبوں پر سب کے لیے شکوے کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ملتی تھی۔

”ساری زندگی ان کے احکامات کو دوڑ دوڑ کر بجالائے پھر بھی بڑی لی کی نظر میں معتبر نہ ٹھہرے۔“ پیٹھ پیچھے ثروت بیگم کے یہ تبصرے بھی اکثر سننے کو ملتے۔

عفران کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اماں بی کی جانب سے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کا ادراک ہونے کے

بعد ان کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھے۔ جب وہ اپنی ماں کی طرف نگاہ دوڑاتی تو اماں بی اسے اپنی مجرم نظر آتیں۔ اس کی ماں آسیہ بانو کو زندگی بھر کے لیے آنسوؤں کا تحفہ دینے والی ان کی ذات ہی تو تھی۔ یہ ان کا زعم تھا یا پھر خود ساختہ انتقام؟

”اماں بی! میں جاؤں؟“ سلیقے سے ان کی چادر تہ کر کے اس نے جانے کی اجازت مانگی۔

”تمہیں کون سی نہر کھودنی ہے جا کر یا پہاڑ توڑنا ہے۔ حد ہوگئی کسی کو دو گھنٹی میرے پاس بیٹھنا گوارا نہیں۔ جاؤ اپنی منحوس ماں کے پاس کسی کی خدمت میں سکون ملتا ہے ناں تمہیں۔“ یکایک ان کی آنکھوں سے نفرت سی ٹپکنے لگی۔

اپنی مظلوم ماں کے لیے ان کے منہ سے منحوس کا لقب سن کر دل میں درد کی لہر اٹھی تھی۔ پر کیسے انہیں کوئی جواب دیتی کہ برداشت کی ہر حد پار کرنے پر بھی اس کی ماں کی طرف سے صبر کی ہدایت تھی مگر نہ جانے کیوں ان کا یہ ظرف اور صبر اماں بی کو دکھائی نہ دیتا تھا۔ چپ چاپ وہ ان کے کمرے سے نکلی اور تقریباً ”بھاگتے ہوئے سیڑھیاں پھلانگی اور پہنچ جاتی گئی۔



دیر اروں پر شام کے سائے پھیلنے لگے تو جس میں کچھ کمی وافر ہوئی۔ وہ پائپ لگا کر صحن دھونے لگی۔

”ہائے عفران! کتنی اچھی بہن ہو تم کہ بغیر ہی فرش دھو دیا۔“ انیقہ جمالی لیتے ہوئے اپنے کمرے سے نکلی تو چمچھاتے گیلے فرش کو دیکھ کر نیند سے بو جھل اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں خوشی سے پوری کھل گئیں۔

”کوئی بات نہیں۔ اتنا چھوٹا سا تو کام تھا۔“ اس نے پائپ سمیٹتے ہوئے کہا۔ ایسے ہی چھوٹے سوتے کام وہ عموماً کہے بغیر ہی کر دیتی تھی۔ ان کے احسانات کا حق وہ ان کی خدمت کر کے ادا کرنے کی کوشش کرتی۔ اوپری پورشن میں تو صرف ایک ہی کمرہ تھا۔ جو کہ کسی زمانے میں کاٹھ کباڑ وغیرہ کے لیے استعمال ہوتا تھا مگر جب اس کے ابا جان نے رحلت فرمائی تو اس کی ماں کا وہ

آشیانہ ٹھہرا۔ ان کے وجود سے اماں بی کو نفرت ہو گئی تھی۔ اس لیے نیچے کاپورشن ان کے لیے شجر ممنوعہ قرار پایا تھا۔ گھر کے دیگر افراد کو بھی ان سے کوئی انسیت نہیں تھی۔ ہر کوئی اپنی دنیا میں مگن تھا۔ ثروت بیگم تو رواجی جٹھانی والے حسد کی بنا پر اوپر کا رخ نہ کرتیں اور ان کے بچے سدا کے لاروا۔

اماں بی تو پچھلے تیس سال سے ان کا چہرہ دیکھنے کی روادار نہ تھیں۔ لے دیے کے ایک نایا ابو تھے۔ جنہیں ان سے ہمدردی تھی۔ اکثر وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر بھی آجاتے اور مجروح سے احساسات میں گھرے معافی کے طلب گار ہوتے۔ مگر جواب میں وہ ان کے آگے ہاتھ جوڑ دیتیں۔

”خدارا! ایسے شرمندہ مت کریں۔ جو کچھ مجھ بد نصیب کے ساتھ ہوا ہے۔ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں۔ میں تو خود کو آپ کے احسانات سے دل محسوس کرتی ہوں۔ مجھ بد نصیب کو یتیم بچی سمیت آپ نے اپنے گھر میں پناہ دے کر ہم پر جو احسان کیا ہے۔ اس کا حق میں تاحیات ادا نہ کر سکوں گی۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں بھابھی! اس آشیانے کی داغ بیل میرے خون پسینے کی مرہون نہیں۔ یہ گھرایا میاں کا ہے۔ جس میں ہم دونوں بھائیوں کا حصہ ہے۔ اور عفرامیرے بھائی جہانگیر احمد کی نشانی ہے۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا جسے آپ احسان کا نام دیں۔ جب آپ کے ساتھ ’نا انصافی ہو رہی تھی میں چپ رہا تھا۔ اس وقت کی چپ دل میں ملال بھر دیتی ہے کاش کہ میں ایک بیٹا بن کر چپ نہ سادھ لیتا۔ بلکہ ایک انسان بن کر حق کی پاس داری کرتا تو آج آپ کی آنکھوں میں یہ آنسو نہ ہوتے۔“ ان کی آواز میں پچھتاوے کے ساتھ ساتھ گہرا دکھ بھی ہوتا۔

آسیہ بانو کے گلے میں پھندے لگ جاتے۔ ماضی کا وہ درد پھر انہیں اپنے شکنجے میں جکڑ لیتا۔

”کیا تم فارغ ہو؟“ رائے کی آواز پر سیڑھیوں کی جانب اس کے بڑھتے قدم رک گئے۔

”نماز پڑھنے جا رہی ہوں۔ تمہیں کوئی کام ہے تو بتا

دو۔“ اس نے رک کر پوچھا۔

”کام تو ہے اور کرنا بھی تم نے ہی ہے۔ زولو جی کی کچھ ڈائیکرام بنا دو۔ تمہاری ڈرائنگ اچھی ہے۔“ وہ بلا تردد بولی۔

”بنا دوں گی کب تک چاہیے؟“ عفرانے فوراً ہائی بھری۔

”کل تک چاہیے۔ اچھی سی بنانا۔“ وہ خوش ہوتے ہوئے فوراً ”جنرل لے آئی۔“



”اماں! کیا کر رہی ہو؟“ اماں کو پرانے صندوق کے پاس کھڑے دیکھ کر عفران کے قریب آکر پوچھنے لگی۔

”کک۔۔۔ کچھ نہیں۔“ ہمیشہ کی طرح بھرایا ہوا انداز تھا ان کا۔ اس کے قریب آتے ہی فٹ سے صندوق بند کر ڈالا۔

عفرابھلا اس بات سے کب انجان تھی کہ اس صندوق میں ان کے باضی کی چند یادیں دفن تھیں۔ اپنے بیٹے کے لیے بنے ہوئے سویٹر اور جرابیں، چھوٹے چھوٹے سوٹ جو انہوں نے بڑی محبت سے گھر میں ہی بنائے تھے۔ دو چار کھلونے اور جھنجھوٹے بچن سے ان کا بیٹا کھیل نہ سکا۔ وہ سب چیزیں انہوں نے بہت سینت کر رکھی تھیں اور جب انہیں حد سے زیادہ اپنے اس بیٹے کی یاد آتی تو حسرت سے ان تمام چیزوں کو چھو چھو کر وہ اپنی ذات کے کرب کو کم کرتیں۔

”اماں! آئیں کھانا کھالیں۔“ عفرانے ان کی کیفیت بھانپ کر ان کا ہاتھ پکڑا۔ اماں کا نیچے جانا ممنوع تھا۔ تایا ابا انہیں ان کی ضرورت کے مطابق اوپر ہی راشن ڈال دیتے تھے۔

”تم چلو، میں آتی ہوں۔“ بھیگی آواز میں آنسو چھپانے کی کوشش کرتے وہ بولیں۔

”نہیں اماں! بہت بھوک لگی ہے۔ ساتھ چلیں۔“ وہ لاڈ کرنے لگی اور انہیں کھینچتے ہوئے لے گئی۔

دونوں نے ساتھ مل کر کھانا کھایا۔ اس دوران

”ہاں اماں ہاں! کچھ نہیں جانتی میں۔ میں کچھ نہیں جانتی۔“



”توبہ ہے ایک تو لوگوں کو بیٹھے بٹھائے لاہور گھومنے کا شوق پتا نہیں کیوں چراتا ہے۔“ گیٹ روم کی صفائی کرتے ہوئے انہی نے انتہائی بد مزگی سے کہا۔

”وہ گھومنے کے لیے نہیں بلکہ اپنے دوست کی شادی میں شرکت کے لیے آرہے ہیں۔ وہ تو اماں جی نے بطور خاص اصرار کر کے انہیں یہاں مزید کچھ دن ٹھہرنے اور لاہور گھومنے کی پیش کش کی۔“ ناجیہ نے بیڈ کا فوم ہٹاتے ہوئے مزید اطلاعات فراہم کیں۔

”ایک تو اماں جی پتا نہیں کہاں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کے رشتے داری نکال لاتی ہیں۔ حد ہے۔“ انہی کا کام کرنے سے ہمیشہ گھبراتی تھی۔ اماں بی کا حکم تھا۔ ورنہ گیٹ روم کی صفائی!

”کیا ہوا انہی! گیٹ روم کی صفائی کر رہی ہو۔“ عفری کی مداخلت نے جلتی پہ تیل چھڑکنے کا کام کیا۔

”اماں بی کے کوئی دور پرے کے رشتے دار قدم رنجہ فرمانے والے ہیں۔ خود تو وہ بس دعوت دینا جانتی ہیں۔ مہمان نوازی اور استقبال کے کھاتے تو ہمارے لیے کھول رکھے ہیں۔“ وہ زہر خند ہو گئی۔

”اوس۔ بے جبر! وہ دور پرے کے نہیں بلکہ پھپھو جانی کے جیٹھ کے بیٹے ہیں۔ یعنی اماں بی کے سگے بھائی کے پوتے۔“ ناجیہ نے پھر سے اطلاع دی تو انہی نے روئے سخن اس کی جانب موڑا۔

”تمہیں بڑی انفارمیشن ہے اماں بی کی پرسل میکر میٹری۔“

”میں تمہاری مدد کروں انہی؟“ ہمیشہ کی طرح عفری نے خود ہی آگے بڑھ کر اپنی خدمات پیش کیں۔

”نیکی اور پوچھ پوچھ۔“ وہ تو جیسے منظر کھڑی تھی۔ فوراً ”جھاڑن اسے پکڑا دی۔“

”نہ جانے کتنے دنوں تک موصوف ہمارا سر کھاتے

دونوں کے درمیان مکمل خاموشی رہی۔ کھانے کے سارے برتن سمیٹ کر بچن میں رکھ آنے کے بعد وہ ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔ آسیہ بانو نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

عفری کے اندر سکون سا اترنے لگا۔ بالوں میں ان کی انگلیوں کی حرکت ایسے تھی جیسے کلیوں کا نرم دنازک لمس دھیرے دھیرے اسے چھو رہا ہو۔

ایکایک اس کے چہرے پر دو بوندیں گریں تو اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔

”اماں۔ کیا ہوا؟“ اس نے کندھوں سے پکڑ کر اماں کو بھجور ڈالا۔ انہوں نے تیزی سے آنسو پونچھے۔

”کیوں چھپاتی ہیں۔ درد۔ پتا ہے مجھے آپ کی یہ ساری بے مابیاں اپنے اس کھوئے ہوئے بیٹے کے لیے ہیں۔ جسے پیدا ہوتے ہی آپ کی گود سے چھین کر کسی اور کے حوالے کر دیا گیا تھا۔“ آج ضبط کے سارے بندھ ٹوٹ چکے تھے۔

”چپ کرو عفری! کیوں بلا وجہ من گھڑت کہانیاں بنا رہی ہو۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔“ انہوں نے اسے جھٹلانے کی کوشش کی۔

”حقیقت یہ بردہ ڈالنے سے حقیقت چھپ نہیں جاتی۔ میں آپ کا دکھ جانتی ہوں۔ آپ دن رات اپنے اس بیٹے کے لیے روتی ہیں تاں جسے اماں بی کے سفاک فیصلے نے غیر ہاتھوں میں سوپ دیا۔“ وہ اپنا چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔

آسیہ بانو نے اس کے قریب جا کر اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

”تم کچھ نہیں جانتی ہو عفری!“ ان کی آنکھوں میں التجا تھی۔ سب کچھ جان لینے کے باوجود انجان بن کر رہنے کی التجا۔ ماں کی حمایت میں کسی کے سامنے لیوں پہ ایک بھی حرف نہ لانے کی التجا۔ اماں بی یا کسی اور کی زیادتی پر کوئی شکوہ نہ کرنے کی التجا۔

عفری نے ٹرپ کر ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگا لیے۔

رہیں گے۔ ”انیقہ کو ایک نئی فکر ستانے ہی لگی تھی۔  
”تمہیں اس کے یہاں رہنے سے کیا تکلیف ہے  
کتنے بڑے بڑس کا اکلوتا وارث ہے۔ پتا ہے  
کروڑوں میں کھیلتا ہے وہ۔ ثروت بیگم نے ٹوکا۔ وہ  
بے حد متاثر لگ رہی تھیں۔

”بڑا بد ذوق آدمی ہے۔ کھیلنے کے لیے شہر میں  
کھلونوں کا کال پڑ گیا ہے جو نوٹوں سے کھیلتا ہے۔ وہ  
بھی اس عمر میں۔ شرم تو آج کل لوگوں کو آتی نہیں۔“  
انیقہ نے عفر اکی مدد سے صوفہ نکالتے ہوئے ٹھٹھا  
اڑایا تاجہ اور رائے بھی کھی کھی کرنے لگیں۔  
”تم لوگ سدھرنے والے نہیں ہوں۔“ حسب  
عادت ثروت بیگم جھجکا کروہاں سے ہٹ گئیں۔

”ایک بات تو طے ہے کہ وہ زیادہ دن لگے گا نہیں۔  
اس لکھتی کا دل ہمارے اس گھر میں تھوڑی نا لگے  
گا۔ جان چھوٹی۔“ انیقہ نے شکر کے سونے پڑھے۔  
جبکہ عفر خاموشی سے کام نبھاتی رہی۔ اس کا وہ بیان  
کہیں اور ہی تھا۔



”اماں! دیکھیں یہ کیسی لگ رہی ہے۔“ عفر اپنی  
قیص سی کر مشین سے اٹھی تو سیدھی پاں کے پاس جا  
پہنچی۔ گلابی پھولوں والی پرنٹڈ لان کی قیص خود سے  
لگائے وہ ان کی رائے لینے لگی تو انہوں نے مسکرا کر  
اپنے گلے سے لگالیا۔

”تم سب کچھ اچھا لگتا ہے۔“ انہوں نے عفر کو  
نظر بھر کے دیکھا۔ گوری رنگت والا چاند سا چہرہ یقیناً  
لاکھوں میں ایک تھا۔

نہادھو کے نیا سوٹ پہن کے وہ نیچے آئی تو سب  
سے پہلے انیقہ نے اسے گھورا۔

”ماشاء اللہ تمہاری تیاریاں تو عروج پر ہیں۔ کہیں  
اس لینڈ لارڈ پے ڈورے ڈالنے کے ارادے تو نہیں۔  
ویسے اطلاقاً عرض ہے کہ موصوف تشریف لائے  
ہیں۔“

”لا حول ولا انیقہ! عفر نے ناگواری سے کہا اور واپس

پلٹنے لگی۔

”اب آہی گئی ہو تو ایک نوازش بھی کرتی جاؤ۔ میں  
اکہلی جان صبح سے کام کر کر کے ادھ موٹی ہو گئی ہوں۔  
تم چائے ہی بنا دو۔“ انیقہ نے کچھ ایسی مظلومیت سے  
کہا کہ چائے کے باوجود وہ انکار نہ کر سکی۔

”پہلی بار آئے ہیں۔ خالی خولی چائے لے جا کر رکھ  
دینا کچھ مناسب نہیں لگتا۔“ سدا کی بامروت عفر کو  
مہمان نوازی کے آداب یاد آئے۔ کینٹ میں جھانکا  
وہاں بسکٹ کا ایک پیکٹ رکھا تھا۔ چائے کو دم دے کر  
اس نے جھٹ سوچی کا حلوہ بنا لیا۔ سلیقہ سے ٹرے میں  
رکھ کر انیقہ کو دیکھا لیکن وہ غائب ہو چکی تھی۔

”وہاں سب خیریت سے ہیں اماں! آپ بالکل  
اطمینان رکھیں۔ چچا اسرار سے تو ہر ہفتے میری بات  
ہوتی ہے اور چچی جان تو آپ سے ہر مہینے باقاعدگی سے  
فون پر بات کرتی ہیں۔“

وہ کمرے میں داخل ہوئی لیکن ان دونوں میں سے  
کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اس کی چچی  
جان اماں بی کی سگی بیٹی تھیں اور اپنی پھپھو کے ذکر پہ  
اس کے کان کھڑے۔ ہو گئے۔

”وہ اب آج کل کیا کر رہا ہے؟ اس کے ماں باپ کو  
کب عقل آئے گی۔ جوان بھتیجی کو انگوٹھی پہنا کر  
اپنے نام تو کروادیا۔ اب شادی کے بارے میں ان کے  
کچھ ارادے ہیں بھی یا نہیں؟“ اپنی نواسی کے منگیتر  
کے لیے اماں بی کے لہجے میں ہلکا سا عصہ شامل ہو گیا تو وہ  
مسکراتے لگا۔

”وہ اب تانیا ابو کے ساتھ ان کے کاروبار میں ہاتھ بٹا  
رہا ہے۔ اس عید کے بعد شادی کا پروگرام پکا ہے۔ چچی  
جان کا بھی بہت دباؤ ہے۔ منگنی تو خیر امریکا میں ہوئی تھی  
مگر شادی کے بارے میں ان کا خیال ہے۔ وہ اسے  
آبائی گھر میں ہی کرے گا۔ کتنا اچھا لگے گا ناں اماں بی!  
چچا جان کی پوری قیمتی آئے گی۔ ورنہ ابھی تک تو  
صرف چچا اور چچی ہی چکر لگاتے رہے ہیں۔ نمبر سدرہ  
اور آؤر نے تو ایک بار بھی اپنے وطن عزیز کو نہیں  
دیکھا۔“ اس کی آنکھوں میں جھانکتی خوشی دیدنی تھی مگر

”عفرا! تم ابھی تک سوئی نہیں؟“ آسیہ بانو نماز عشا اور طویل دعا کے بعد جب پٹنگ کی جانب بڑھیں تو اسے آنکھیں پٹپٹاتے چھت کو گھورتے دیکھ کر حیرت سے پوچھنے لگیں۔  
 ”ابھی آنکھ کھلی ہے اماں۔ مجھے پیاس لگی تھی۔“ بروقت موزوں بہانہ سوجھ گیا تھا۔ پانی پی کر وہ دوبارہ لیٹ گئی۔ ذہن کے پردے پر ماضی کی فلم چل پڑی۔



ابامیاں اور اماں بی کی تین ہی اولادیں تھیں۔ سب سے بڑے بیٹے عالمگیر تھے۔ ان کے بعد جہانگیر۔ دونوں میں ایک سال کا فرق تھا۔ ایک بیٹی کی کمی تھی۔ جسے اللہ تعالیٰ نے عشرت جہاں کے روپ میں پورا کیا۔ ابامیاں سرکاری گوداموں پر ٹھیکیدار تھے۔ اس لیے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی۔ وہ مذہب سے لگاؤ رکھنے والے اصول پسند انسان تھے اس لیے اوپر کی کمائی پر ہمیشہ لعنت بھیجتے تھے۔

ابامیاں جو کچھ کماتے اماں بی کے ہاتھ پر رکھتے۔ اپنی کمائی سے انہوں نے ایک شان دار گھر بنایا اور بچوں کی بہتر تعلیم و تربیت کی۔ ایک طرف وہ جس قدر توحید پرست تھے۔ اماں بی اتنی ہی اوبہام پرست۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بے حد غلط نظریے بتا لیے تھے۔ بلی سے تو وہ بہت چڑتی تھیں۔ اسے نحوست کی علامت سمجھتی تھیں۔ اسی طرح منڈیر۔ آئے پرندوں سے بھی خوفزدہ ہوتی تھیں کہ شاید وہ کہیں بری خبر نہ لائے ہوں۔ یہاں تک کہ انہیں رات کے وقت مرغی کے انڈا دینے سے بھی خوف آتا تھا کہ اس سے گھر میں فاقہ کی نوبت آتی ہے۔ ان کی یہ خور ساختہ منطقیں ابامیاں کی سمجھ سے باہر تھیں۔

”نیک بخت! ایک اللہ کی وحدانیت پہ کامل ایمان ہی سچے مومن کی پہچان ہوتی ہے۔ ان اوبہام پر یقین کرنا بھی شرک کے زمرے میں آتا ہے۔“  
 ابامیاں بہت پڑھے لکھے نہیں تھے مگر پھر بھی ان کی

جہاں پوری فیملی اور بطور خاص آذر کے پاکستان آنے کی خبر نے اماں بی کے چہرے پہ ہوائیاں اڑائیں۔ وہیں عفرا کے ہاتھ میں ٹرے بھی لرز اٹھی تھی۔  
 ”تم یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو؟“ اس کی وہاں موجودگی اماں بی کے غصے کو ہوا دینے کے لیے کافی تھی۔  
 ”وہ۔۔۔ نم میں چائے لے کر آئی تھی۔“ اماں بی کی خوشخوار نظروں سے اسے اپنے وجود کی ساری توانائیاں فنا ہوتی محسوس ہوئیں۔

”چائے لے کر آئی ہو تو رکھ کے چلی جاؤ۔ یہاں کان لگا کر ہماری باتیں کیوں سن رہی ہو۔“ اماں بی کی انگارہ آنکھیں اور نفرت میں سلگتا لہجہ اجنبی کو ورطہ حیرت میں ڈالنے کے لیے کافی تھا۔  
 اماں بی کا جتن آمیز لہجہ وہ بھی باہر کے آدمی کے سامنے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے وہ ضبط کرتی ٹرے رکھ کر تیزی سے باہر نکل آئی۔



آذر کے آنے کی خبر اس کے لیے ایسی ہی تھی۔ جیسے برسوں بعد تپتے صحرا میں بارش کا گمان۔ اس نے دانستہ اس خبر کو اپنی ماں سے چھپائے رکھا کہ اس بار وہ وقت کی شاطر چالوں کو ان کی مامتا کے ساتھ کوئی جواب کھیلنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔

اماں بی بھی آنے والے وقت سے خوف زدہ تھیں۔ آنے والا پہلے کی طرح ایک دن کی عمر نہ رکھتا تھا جس کی قسمت پہ انہوں نے اپنے فیصلے کی مر لگائی تھی۔ وہ اب تعلیم اور شعور کی منزلیں طے کر چکا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ حقیقت کو اس سے آج تک چھپایا گیا تھا۔ اس حقیقت کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش نے آج تک اسے پاکستان آنے نہ دیا۔

آذر اس کی پھپھو کا بیٹا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کی پھپھو کا لے پالک تھا۔ حقیقت میں تو وہ آسیہ بانو کا بیٹا تھا۔ جسے اماں بی نے بڑی بے دردی سے ان کی گود سے چھین کر پھپھو عشرت کے حوالے کر کے ان کی مامتا کو سکھنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔

باتیں عالموں فاضلوں سے کم نہ ہوتی تھیں۔ مگر اماں کی موٹی عقل ان کے مفہوم کی روح تک نہ پہنچ پاتی اور یوں ابامیاں کی یہ باتیں ان کے اوپر سے گزر جاتیں۔ یا پھر وہ دانستہ اپنی روش کو نہ چھوڑتیں۔

وہ اکتوبر کی ایک ٹھنڈی میٹھی صبح تھی۔ جب ابامیاں حسب معمول ناشتے کے بعد گودام کی طرف روانہ ہونے لگے۔ اتفاق سے اس وقت اماں بی سامنے ہی کھڑی تھیں۔ عشرت جہاں کے بیگ میں ناشتے کا ٹفن رکھتے ہوئے انہوں نے ابامیاں کی سائیکل کے آگے سے گلی ملی کو گزرتے دیکھا۔ ان کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

”سنیے تو عالمگیر کے ابا۔“ وہ ان کے پیچھے سرپٹ بھاگیں مگر وہ دروازے سے نکل کر گلی میں غائب ہو چکے تھے۔ عالمگیر اور جہانگیر اسکول کالج جا چکے تھے ورنہ انہیں ہی وہ ان کے پیچھے دوڑا ہوا۔

”ہائے اللہ! آج ضرور کچھ نہ کچھ ہو گا۔“ سینے پہ ہاتھ رکھ کر وہ تھر تھر کانپنے لگیں۔ کسی کام میں دل نہ لگا۔ ہر چیز جوں کی توں پڑی رہی۔

دوپہر کے قریب جب چار آدمی ابامیاں کی لاش چارپائی نیلے صحن میں رکھ گئے تو جیسے ان کی دنیا ہی ویران ہو گئی۔ ابامیاں جو انہیں کامل ایمان کا سبق پڑھایا کرتے تھے۔ ان کا پھرننا اماں بی کو اوہام پرستی پہ یقین کی سند تھا گیا۔

عالمگیر نے شعور پکڑتے ہی گھر کے دگرگوں معاشی حالات کو سدھارنے کا عزم کیا۔ ٹھہکداری میں ابامیاں کے اچھے تعلقات تھے ان ہی تعلقات کی بنیاد پر انہیں ایک چھوٹا موٹا ٹھیکہ مل گیا۔ زندگی کی گاڑی چل رہی تھی لیکن اماں بی کی شخصیت بالکل پیدل چکی تھی۔ ان کی طبیعت میں سختی اور کرحتی آگئی تھی۔ دونوں بہوؤں خود منتخب کیں۔ دونوں بیٹوں نے خاموشی سے ان کا فیصلہ تسلیم کیا۔

ابامیاں کے بعد بچوں اور گھر کی ذمہ داریوں کو تنہا نبھاتے نبھاتے اماں بی کی طبیعت میں حاکیت نے جگہ بنالی تھی۔

ثروت بیگم برآگرجہ عالمگیر صاحب نے اول روز سے آشکار کر دیا تھا کہ انہیں کسی صورت اماں بی کی حکم عدولی نہیں کرنی پھر بھی کبھی کبھار وہ پنچہ مار لیتیں۔ آسیہ بانو البتہ سیدھی سادی دلو قسم کی دہسائی تھیں۔ اس لیے بلاچوں و چڑاماں بی کے رعب میں آگئیں۔ اپنی اکلونی بیٹی عشرت جہاں کو جسے بچپن سے ہی ان کے کراچی والے بھائی صاحب نے اپنے چھوٹے بیٹے اسرار احمد کے لیے مانگ رکھا تھا۔ اس لیے جہانگیر کے بعد سیاہ کرانہوں نے اس فرض سے بھی خود کو سبکدوش کر لیا۔

عالمگیر کے ہاں سب سے پہلے انبیہ کی آمد ہوئی۔ راسخہ پانچ سال بعد ہوئی تھی۔ ان پانچ سالوں میں بہت کچھ بدل چکا تھا۔ اسی بد لاؤ میں پہلی تبدیلی گھر میں ایک اور بیٹی کا اضافہ تھا۔ جو کہ عفرات تھی۔ اور دوسری تبدیلی جہانگیر کی ناگہانی موت! سمجھو آسیہ بانو کی بد قسمتی کی ابتدا تھی۔



آسیہ فطرتاً ایک اچھی خاتون تھیں۔ جہانگیر پڑھے لکھے تھے پھر بھی انہوں نے اپنی نیک فطرت سے ان کا دل بیت لیا تھا۔ عفرات کی آمد نے دونوں کی خوشیوں کے کارواں کو آگے بڑھایا ہی تھا کہ نئے مہمان کی خوشخبری نے ایک بار پھر دونوں کی خوشیوں میں مازگی کی روح پھونک دی۔

آسیہ سلیقہ مند تھیں۔ اماں بی ہر پکار پر بھاگ بھاگ کر لپیک کہتیں۔ پھر بھی نجانے ان میں ایسی کون سی کمی تھی جو اماں بی کو کھٹکتی تھی۔ ایک بار اماں بی نے انہیں ملی کو دودھ پلاتے ہوئے دیکھا تو وہ واویلا مچایا کہ شیطان نے بھی ان کے غریض سے پناہ مانگی ہوگی۔

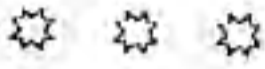
رات کو وہ چپکے چپکے آنسو بہاتی رہیں۔ جہانگیر نے انہیں تسلی دی اور دل جوئی کے لیے ابامیاں کی موت کا واقعہ سنایا۔

”تم آئندہ خیال رکھنا۔ اماں بی کا دل مست و کھانا سوہ جیسا کہتی ہیں تم ویسا کیا کرنا۔“ آسیہ بانو نے میکا کی

سے جھاگ نکلنے لگے اور انہوں نے اپنے بھائی کے ہاتھوں میں دم توڑ دیا۔

اماں بی کے ہاتھوں سے تسبیح چھوٹ گئی۔  
”جہانگیر۔“ وہ چلا کر اپنے تخت جگر کی طرف  
بروہیں لیکن وہ ان کی کوئی بات سنے بغیر ہی اپنے آخری  
سفر کو روانہ ہو گئے۔

دودھ کی دیکھی کھلی رہ جانے کے سبب کوئی زہریلا  
کیڑا دودھ میں گر گیا تھا اور یہ چھوٹی سی لاپرواہی ایک  
جیتے جاگتے انسان کو موت کی نیند سلا گئی۔



”تم ہو میرے بیٹے کی موت کے ذمہ دار! تمہاری  
لاپرواہی کی وجہ سے میرا بیٹا اس دنیا سے چلا گیا۔“ اماں  
بی نے سارا الزام آسیہ پر ڈال دیا۔

”تم ہی ہو منحوس! تمہاری نحوست میرے بیٹے کو  
نگل گئی۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہیں اماں! ہوش سے کام لیں۔“  
عشرت جہاں نے انہیں سنبھالنے کی کوشش کی۔

”چھوڑو مجھے۔ میں اسے بھی یہیں ختم کر دوں گی  
تاکہ میرے آشیانے کے باقی لوگ اس کی نحوست سے  
محفوظ ہو جائیں۔“ وہ سڑیائی انداز میں اس پر جھپٹنے کی  
کوشش کر رہی تھیں۔ ثروت بیگم کے ساتھ ساتھ  
دیگر رشتے دار خواتین نے بھی انہیں تھام کر دور  
بٹھایا۔

”ہوش سے کام لو۔ تمہارے بیٹے کا آج سوئم ہے۔  
گھر میں ایسے تماشے ہونے لگے تو دنیا کیا سوچے گی؟  
یوں انی جگ ہنسائی کروانے پہ تکی ہوئی ہو؟“ ان کی  
سگی بھابھی انہیں دھیمے انداز میں سمجھانے لگیں۔

”دنیا کے آگے پردہ رکھنے کی ضرورت بھی نہیں  
مجھے۔ میں تو پوری دنیا کے سامنے اس کی اصلیت کا  
ڈھنڈورا پیٹوں گی۔ دفع ہو جاؤ میری نظروں سے۔ ورنہ  
میں کچھ کر بیٹھوں گی۔“ اماں بی کی دھاڑ نے ان کی روح  
تک کو سہا دیا۔ اماں بی نے اگر بیٹا کھویا تھا تو سہاگ ان کا  
بھی اجڑا تھا۔

انداز میں سر ہلادیا۔

لیکن اماں بی اتنی آسانی سے اس بات کو فراموش  
کرنے والوں میں سے نہیں تھیں۔ آسیہ بانو کی یہ  
چھوٹی سی خطا اماں بی کی نظر میں انہیں معتبہ بھرانے  
کے لیے کافی تھی۔ اماں بی کی کڑی نظروں کے حصار  
میں وہ گزربڑا جاتیں اور ہر کام صحیح ہونے کے بجائے غلط  
ہو جاتا۔ ایک بار عفر کے رونے کی آواز سن کر وہ  
آخری رونی توے سے اتار بھاگیں تو واپس آ کر تو  
چولہے سے اتارنا بھول گئیں۔ اماں بی نے جو شام کو یہ  
منظر دیکھا تو پورا گھر سر پہ اٹھالیا۔ آسیہ اپنے آسو  
پونچھتی رہیں۔ ادھر نیند سے ہڑبڑا کر اٹھنے کے باعث  
عفر کا بھی رد کر برا حال تھا۔ اگلے دن اسے بخار ہو  
گیا۔

”دیکھا کرو یا بی بی کو بیمار۔ اب تو کلبجے میں  
ٹھنڈک پڑ گئی ناں منحوس! سنی بار کہا ہے چولہے پر تو  
رکھامت چھوڑا کرو گھر میں بیماری پھیلتی ہے۔“ ان  
کی لعن طعن شروع ہو چکی تھی۔ وہ چاہتے ہوئے بھی  
کوئی وضاحت نہ دے سکیں۔

ثروت بیگم اور آسیہ دونوں ہی اماں بی کو ہوش رکھنے  
کی ہر ممکن کوشش کرتیں پھر بھی اماں بی کا برتاؤ اس  
جابر حکمران سے کم نہ ہوتا جس کے قبضے میں دو مفتوحہ  
علاقے آگئے ہوں۔

”یہ دودھ لے لیجئے۔“ آسیہ بانو نے جہانگیر کے ہاتھ  
میں دودھ کا گلاس تھمایا۔ موسم گرما کے دن تھکے گھر  
کے تمام افراد صحن میں پلنگ بچھا کر سوتے تھے۔ وہ اپنے  
پلنگ پہ بیٹھے عالمگیر کے ساتھ کچھ کاروباری باتوں میں  
مصروف تھے۔ جب عفر کو گود میں اٹھائے وہ بڑی پیلی  
سے ان کے لیے دودھ نکال کر لے آئی۔ رات کو  
سونے سے قبل جہانگیر ایک گلاس دودھ پینے کے عادی  
تھے۔ اس کے بغیر انہیں نیند نہیں آتی تھی۔ مگر یہ  
دودھ انہیں ہمیشہ کی نیند سلانے کا سبب بن گیا۔

”کیا ہوا جہانگیر۔ کیا ہوا؟“ دودھ پیتے ہی وہ پیٹ  
پہ ہاتھ رکھ کر دوہرے ہوتے گئے۔ یاس بیٹھے عالمگیر  
نے بدحواس ہو کر انہیں تھامنا چاہا لیکن ان کے منہ

مگراں بی نے کہانی یوں بتائی کہ وہ اپنی جگہ چوری بن گئی تھی۔



عدت کے دن پورے ہوتے ہی انہوں نے ایک خوب صورت گل گوتھنے بچے کو جنم دیا۔ اماں بی نے بڑی بے دردی سے ان سے وہ ننھا وجود چھین لیا۔ ”یہ میری بیٹی کی آخری نشانی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے بچے پر اس منحوس کا سایہ بھی پڑے۔“ ایک بار پھر وہ آپ سے باہر ہوئیں۔ اپنے نو موادرے بچے کی جدائی کو محسوس کر کے اس لمحے انہیں اماں بی کے درد کا ادراک ہوا کہ جنہوں نے اپنے جوان کڑیل بیٹے کو کھویا تھا۔ کہیں نہ کہیں اس سارے عمل میں ان کی غلطی بھی رہی تھی۔ اگر دودھ والے پیلے کو انہوں نے ٹھنڈا کرنے کے لیے کھلانہ رکھ چھوڑا ہوتا تو کوئی رہیلا کیرا اس میں کیسے جاتا؟ آنکھیں میچ کر جیسے انہوں نے خود کو ایک درد سے گزارا تھا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے اماں بی؟“ سدا کے نرم دل عالمگیر کے لبوں سے کمزور احتجاج ہوا۔ ”مجھے اس کی صورت نہیں دیکھنی۔ اس سے کہو ہمارے گھر سے نکل جائے۔ عفر ا کو بھی ہم خود ہی سنبھال لیں گے۔“ وہ خاموش گم صمم کھڑی تھیں۔ ان کی زندگی کی دستاویز پر آخری مہر ثبت ہونے جا رہی تھی۔

آسیہ کو تو انہوں نے اپنی صفائی میں ایک لفظ بھی کہنے کی اجازت نہ دی تھی۔ مرنے سے پہلے تو جلا د بھی سولی پہ لٹکنے والے سے اس کی آخری خواہش پوچھتا ہے مگر ان کے سلسلے میں ایسی کوئی روایت نبھانے کی زحمت نہیں کی گئی۔ اماں بی نے اپنی مامتا کا بدلہ ان کی مامتا کا گلا گھونٹ کر لے لیا۔

اماں بی نے تو ان کے بیٹے کو اس کی نظروں سے

کوسوں میل دور بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے بچہ اٹھا کر عشرت جہاں کے حوالے کر دیا۔ ان کی اپنی نمروا بھی ایک سال کی تھی۔

عشرت جہاں نے ماں کی حالت کو دیکھتے ہوئے کچھ نہ کہا۔

”یہ اماں بی نے ٹھیک نہیں کیا۔“ غم اور ناراضی کے ملے جلے احساسات نے عالمگیر ملول کر دیا تھا۔ ”یہ اس کی سزا ہے۔ اب ذرا اسے بھی تو پتا چلے کہ بیٹے کی جدائی کا زخم کیسا درد دیتا ہے۔“ ثروت بیگم تنفر سے بولیں تو انہوں نے بیوی کو کڑی نظروں سے گھورا۔

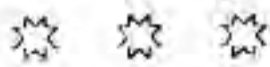
”ایسی باتیں کرتے ہوئے تمہیں ذرا بھی خدا کا خوف نہیں ہو رہا۔ آخر تم بھی تو ایک ماں ہو۔“

”رہنے دیں یہ بلا وجہ کی ہمدردیاں۔ غضب خدا کا ایسی بھی کیا ناولی کہ زہر والا دودھ اٹھا کے شوہر کو پلا دیا۔ کل کو ایسی غلطی بیٹے کے ساتھ بھی کر دی تو؟“ وہ اماں بی کی حمایت میں بول رہی تھیں۔

”لیکن بچے کی پرورش ہمارے اپنے گھر میں بھی تو ہو سکتی ہے۔ آخر کو وہ میرا بھتیجا ہے۔ کیسے اسے غیروں کے ہاتھ میں دے دوں۔ تم بھی تو ہو؟ کیا تم آذر کو نہیں سنبھال سکتیں۔“

”توبہ کریں۔ مجھ میں کہاں ہمت ہے دو دو بچوں کو سنبھالنے کی۔ ابقہ کر تو آپ جانتے ہی ہیں۔ کتنی شرارتی ہے۔ ویسے بھی اماں بی کا کہنا ہے وہ اپنے پوتے پر آسیہ کے وجود کا سایہ بکسی برداشت نہیں کر سکتیں۔“

ثروت نے بات ہی ختم کر دی۔ عالمگیر کے پاس سوائے کف افسوس ملنے کے اور کچھ نہ رہا تھا۔ اماں بی کی شہنشاہیت کے آگے پہلے بھی انہوں نے کم ہی بولنے کی ہمت کی تھی۔ دو سرا جہا نکیر کی ناگہانی موت کے بعد ان کی اپنی ذہنی حالت جس طرح ہو گئی تھی۔ ایسے میں کچھ کہنا خطرناک ہو سکتا تھا۔



”تم نے اچھی طرح سوچ لیا ہے۔ تم کسی نا انصافی کا

آسیہ کے لیے عفرہ کی موجودگی زندگی کی نوید سے کم نہ تھی۔ وہ اسے دیکھ دیکھ کر جیتیں۔ عالمگیر نے انہیں اوپر ہی کمرہ اور پکن سیٹ کر دیا تھا۔ نیچے ان کا آنا ممنوع تھا۔ کیونکہ اماں بی ان کی شکل تک دیکھنے کی روادار نہ تھیں۔

آذر کی جدائی ایک ایسا زخم تھا۔ جس پر تینیس برس گزرنے کے باوجود بھی کھرند نہ آیا تھا۔ وہ آج بھی تازہ تھا۔ لمحہ بہ لمحہ اس کی یادیں اس کا خیال اس کی جدائی کے غم کو بھولنے نہ دیتا تھا اور بھولتیں بھی کیونکر کہ اولاد بھلانے کی چیز نہیں ہوتی۔ آذر کو گود لینے کے بعد عشرت جہاں نے سدرہ کو جنم دیا مگر عشرت جہاں کی سسرال میں کوئی نہ جانتا تھا کہ آذر ان کی نہیں بلکہ جہانگیر کی اولاد ہے۔ ان کے اپنے بچوں کو بھی نہیں پتا تھا ان کی بڑی بیٹی نمرہ کی شادی ان کے بڑے جیٹھ کے بیٹے وہاب سے طے تھی۔ سب کی خواہش تھی کہ یہ شادی ان کے آبائی گھر میں ہو۔ اس لیے ان سب کی پاکستان آمد لازمی ہو گئی تھی۔ عفرہ نے جب سے یہ خبر سنی تھی اس سے اپنی خوشی سنبھالی نہیں جا رہی تھی۔ اسے معلوم تھا اماں بی بھی نہیں چاہیں گی کہ آذر لاہور آئے اور آسیہ بانو اپنے چھڑے بیٹے کی ایک جھلک دیکھ جائیں۔ اس لیے اسے کسی نہ کسی طرح اس شادی میں شرکت کے لیے کراچی جانا تھا۔ وہ ایک بار اپنے بھائی کو بلانا چاہتی تھی۔ اس سے ملنا چاہتی تھی۔



”کوئی مہمان آئے ہیں کیا؟“ وہ نیچے آئی تو پکن میں کانچ کے اضافی برتن دیکھ کر اس نے چہلے کے پاس کھڑی انیقد سے دریافت کیا۔ مگر وہ فردیت پاٹ کے لیے سیب چھیلنے میں اس قدر مصروف تھی کہ اس کی بات کا جواب تک نہ ضروری نہ سمجھا۔

”امی کہہ رہی ہیں ناشتا تیار ہے تو برائے مہربانی لے کر آجائیے۔“ رائے نے پکن میں جھانک کر ثروت بیگم کا پیغام پہنچایا تو عفرہ نے روئے سخن اس کی جانب موڑا۔

حصہ نہیں منے جا رہی ہو۔ تم ایک بھرے پرے سسرال سے تعلق رکھتی ہو۔ اگر کسی نے تم پر بے رحمی کا الزام لگایا۔ اماں بی کی ذات پر انگلی اٹھائی تو تمہارے پاس کیا جواب ہو گا۔“ اسرار احمد ان کے فیصلے سے متفق نہیں تھے۔ اس لیے وہ انہیں دنیا کی اونچ نیچ سمجھا رہے تھے۔

”مجھے کسی قسم کا کوئی پچھتاوا نہیں ہو گا۔ میری ماں نے اپنا بیٹا کھویا ہے۔ میں اس فیصلے میں ان کا ساتھ دوں گی۔ جہاں تک لوگوں کا سوال ہے تو ان کے لیے میں نے سوچ لیا ہے۔ ہم اس بات کی خبر کسی کو نہیں ہونے دیں گے۔ یوں بھی آپ نے امر کا شقٹ ہونے کا پورا ارادہ کر لیا ہے۔ کچھ دنوں بعد ہم روانہ بھی ہونے والے ہیں۔ ہم یہاں سب کو یہی بتا میں گے کہ آذر ہماری اپنی اولاد ہے۔ میرے گھر والوں کے علاوہ اور کسی کو کبھی بھی یہ پتا نہیں چل پائے گا کہ آذر میرا رگ بیٹا ہے یا بھتیجا۔“ وہ تو جیسے ہر حال سوچے بیٹھی تھیں۔

”لیکن اتنا بڑا جھوٹ وہ بھی اپنوں سے۔“ اسرار احمد کچھ ہچکچاہٹ کا شکار تھے۔

”جھوٹ ہے تو جھوٹ سہی۔“ عشرت جہاں جھٹ سے بولیں اور پھر کسی نہ کسی طرح اگلے ایک ہفتے میں انہوں نے اسرار احمد کو اپنا ہم نوا بنا ہی لیا۔ جب وہ آذر کو لے کر نیویارک کے لیے روانہ ہو رہی تھیں تو اسرار احمد کے دل میں ذرا بھی شرمندگی یا ملال نہیں تھا مگر کوئی نہ جانتا تھا وہ لمحے ایک ماں پر کتنے بھاری تھے۔

عفرہ کے ننھے وجود کو بھیج کر وہ اس قدر گھٹ گھٹ کر روئیں جیسے آج ہی سارے آنسو ختم کر دینے کی تمنا ہو۔

آذر کو چھین لینے کے بعد بھی اماں بھی کے انتقام کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ وہ تو عفرہ کو بھی اس کے سائے سے دور رکھنا چاہتی تھیں۔ مگر عفرہ کے رونے اور ضدی پن سے بے زار ہو کر اماں بی نے جلد ہی اس پر بٹھائے سارے پھرے اٹھا دیے۔

”کون آیا ہے؟“

”یہ بھی بھلا پوچھنے والی بات ہے۔ انیقہ بی بی کی مستعدی اور جان توڑ محنت وہ بھی خوش گوار موڈ میں دیکھ کر ہی آپ کو سمجھ جانا چاہیے تھا کہ ان کی پیاری ساس صاحبہ اور ہماری چیمٹی خالہ جان تشریف لائی ہیں۔“ رائے اطلاع دے کر غائب ہو گئی۔ مبادا انیقہ اسے کسی کام سے ہی نہ لگا دے۔

وہ بیکنوں سے نمکونکال کرہلیٹوں میں رکھنے لگی۔ نمکو، کولڈ ڈرنک، فروٹ چاٹ، سمو سے کباب کتنا اہتمام تھا ان کی نزدیک سے آئی خالہ کے لیے اور کل اماں بی کے مہمان کے آگے صرف چائے جا کر رکھ دی وہ بھی اتنی گرمی میں کسی کو ایک کولڈ ڈرنک منگوانے کا خیال تک نہیں آیا۔

تمام چیزیں ٹرے میں رکھتے ہوئے نجانے کیوں یہ سوچ خود بخود اس کے دماغ میں آگئی۔

”میں ایک ٹرے لے جا رہی ہوں۔ پلیز۔ دوسری ٹرے تم لے آؤ۔“ ایک ٹرے اسے تھا کر اس کا جواب سنے بغیر ہی وہ کچن سے نکل گئی۔ عفرانے ٹرے اٹھا کر باہر کی جانب قدم بڑھائے تب ہی دروازے میں اچانک نمودار ہونے والے بندے سے ٹکرا گئی۔

ٹرے چھوٹے ہی کولڈ ڈرنک کے چار گلاسوں سمیت کباب اور چپس بھی فرش پر بکھر گئے۔ وہ ہراساں نظروں سے گانچ اور بکھرے گبابوں کو دیکھنے لگی۔

”آئم ریلی سوری۔ وہ مجھے پیاس لگی تھی۔ میں تو کچن سے پانی لینے کے لیے آیا تھا۔“ شاہ زیب کی شرمندگی سے بھرپور معذرت سن کر بھی اس کے چہرے کے تاثرات نہ بدلے۔ وہ غالباً ”اپنے دوست کی مہندی کے فنکشن میں جا رہا تھا۔ کولڈ ڈرنک کے چھینٹے اس کے سفید کرتے کو بھی کئی جگہوں سے داغ دار بنا گئے تھے۔

”اب کیا ہو گا۔“ انیقہ کے ہاتھوں اپنی متوقع تواضع کا خیال ہی اس قدر خوف زدہ تھا کہ اس کی آنکھوں میں پانی آگیا۔

”ہائے پھوڑ لڑکی! یہ کیا کر دیا تم نے؟“ اس کی بد قسمتی کہ اسی وقت ثروت بیگم اس طرف آنکلیں اور یہ منظر دیکھ کر اس پہ ٹوٹ پڑیں۔

”کام کرنے کا ڈھنگ نہیں ہے تو کام میں ہاتھ ہی کیوں ڈالتی ہو؟ کتنی محنت سے بنایا تھا۔ ساری چیزوں کا ستیا ناس کر دیا اور اب کھڑی کھڑی نظارے سے لطف اندوز بھی ہو رہی ہو۔“ شاہ زیب کی موجودگی کا لحاظ کیے بغیر وہ بے نقط سنائے چلی گئیں۔

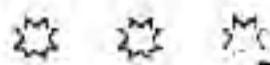
”میں تو بھول ہی گئی میری بیٹی کے سرالیوں کو دیکھ کر اپنے حسد پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہو گا نا۔ یہ گری ہوئی حرکت گر کے تم نے تو سوچ لیا ہو گا کہ مہمانوں کے آگے ہماری عزت گھٹ جائے گی۔ پرلی بی! یہاں معاملہ صرف ساس ہو کا نہیں۔ بلکہ خالہ بھانجی کا بھی ہے۔ اس لیے اپنے یہ اوجھے ہتھکنڈے بند کر دو۔“

ثروت بیگم بات کو کہاں سے کہاں لے گئیں۔ یہ دوسری بار ہوا تھا۔ اس شخص کے سامنے اس کی اچھی خاصی درگت بن گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”ایک سیٹ آئی۔ ایک جو نلی تصور میرا۔“ شاہ زیب نے صورت حال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے مداخلت کرنا چاہی تو ثروت بیگم کو اس کے اجلے اجلے کرتے پر کولڈ ڈرنک کے نمایاں دھبے دیکھ کر دوبارہ غصہ آگیا۔

”ہائے! تمہارے کپڑے بھی خراب کر دیے نا۔ عفران! تمہیں کب عقل آئے گی۔ تمہیں اتنا بھی نہیں پتا کہ چلتے وقت آنکھیں کھلی رکھتے ہیں۔ چلو اب فٹافٹ یہ سارا فرش صاف کرو۔ چلو بیٹا! تم کپڑے تبدیل کر لو۔“ اسے صفائی کی ہدایت دے کر وہ شاہ زیب کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے لے گئیں۔ عفرانے تھکے تھکے انداز میں ٹرے رکھ کر جھاڑوا اٹھالی۔

فرش سے ٹوٹے گانچ چھتے وقت نامعلوم سی اداسی اسے اپنے رگوپے میں اترتی محسوس ہوئی۔



”کون ہے وہاں؟“ آسیہ بانو کو سیڑھیوں کے پاس کوئی ہیولا سا نظر آیا تو کچن کی طرف جاتے جاتے رگ کر پوچھا۔ آج ہی تو بلب فیوز ہو گیا تھا۔ اس لیے گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

”میں شاہ زیب۔“ شاہ زیب کے انداز میں جھجک تھی۔ آج شام جو کچھ بھی ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے دل میں بے حد شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ مندی کے فنکشن میں تمام وقت وہ ندامت کے احساس میں گھرا رہا۔ عفر اکو پڑنے والی تمام ڈانٹ کا ذمہ دار وہ خود کو سمجھ رہا تھا۔

”شاہ زیب۔ آؤ بیٹا! اندر آؤ۔ وہاں کیوں کھڑے ہو؟“ عفر اے سے انہیں کراچی سے آئے اس مہمان کے بارے میں پتا تو چلا تھا مگر ابھی تھیں۔ وہ ان کی تقلید کرتے ہوئے وہ اندر کمرے میں آ گیا۔ اسے اچانک اپنے کمرے میں آتا دیکھ کر عفر اسید بھی ہو بیٹھی۔

”میں دراصل ان سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ آج میری وجہ سے انہیں خوا مخواہ ہی ثروت آئی ہے۔ ڈانٹ بڑھ گئی۔ حالانکہ غلطی سراسر میری تھی۔ لیکن ثروت آئی نے مجھے کچھ بھی کہنے کا موقع ہی نہ دیا۔“

شرمندہ شرمندہ سا وہ اسے براہ راست مخاطب کرنے کے بجائے آسیہ بانو کو پوری کہانی سنا رہا تھا۔ عفر انے اپنا سر پیٹ لیا۔ وہ تو ایسا کوئی ذکر کبھی بھی ماں سے نہ کرتی تھی اور وہ بڑے مزے سے پورا واقعہ سنانے میں مصروف تھا۔

”کوئی بات نہیں بیٹا! وہ عفر کی بڑی ہیں۔ اگر بڑے ڈانٹیں گے نہیں تو بچوں کو ان کی غلطیوں کا احساس کیسے ہو گا۔“ آسیہ بانو نے سہولت سے معاملے کو سنبھالا۔ شاہ زیب کو ان پر حیرت ہوئی۔

”تم بیٹھو بیٹا! میں آتی ہوں۔“ آسیہ بانو اس کے لیے بادام والا شربت بنانے چلی گئیں تو اس نے پھر سے عفر اکو مخاطب کیا۔

”آئی ایم سوری۔“

”اٹس اوکے۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

”مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔ ثروت آئی کا آپ

کو اس طرح ڈانٹا۔“

وہ کچھ اچھا ہوا تھا۔ ثروت جہاں نے جس توہین آمیز انداز میں اس کے لئے لے تھے۔ وہ اس سے ہتھم نہیں ہو پا رہا تھا۔ اس سے پہلے اماں لی بھی ایک بہت ہی معمولی بات پر اسے ٹھیک ٹھاک رگید چکی تھیں۔ آخر اس معصوم صورت والی لڑکی نے ان کا کیا بگاڑا تھا کہ سب یوں اس پر بھڑک اٹھتے تھے۔

اسے پوچھنا مناسب نہیں لگا تو اٹھنے لگا۔

”ارے بیٹھو بیٹا! شربت تو پیتے جاؤ۔“ اسی وقت آسیہ بانو نے آکر شربت کا گلاس اسے پیش کیا تو وہ انکار نہ کر سکا۔

”تھینک یو۔ شربت بہت اچھا تھا۔“ تعریف کے معاملے میں وہ کبھی کنجوسی نہیں کرتا تھا۔



”لی اے تو تم نے بہت اچھے نمبروں سے پاس کیا ہے بیٹی! اگر آگے پڑھنا چاہو تو پڑھ سکتی ہو۔“ عفر اکالی اے کا رزلٹ آیا تو عالمگیر نے اسے بلا کر پیار سے کہا۔

”نہیں تایا اب! مجھے آگے پڑھنے کا کوئی شوق نہیں۔“ اس نے مسکرا کر انکار کیا۔

”سچ کہہ رہی ہو۔ کہیں اس لیے تو انکار نہیں کر رہی ہو کہ تم خود کو کسی کے بوجھ تلے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھنے لگے مگر عفر انے بے چین ہو کر ان کی بات منقطع کر دی۔

”نہیں تایا اب! ایسی کوئی بات نہیں۔“ عالمگیر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کے چلے گئے۔

”کیا ہوا اماں! آپ رو رہی نہیں؟“ اس نے آسیہ کی سوچی آنکھیں دیکھ کر سوال کیا۔

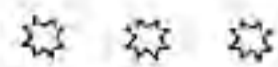
”آنکھ میں تنکا چلا گیا ہے شاید۔“ انہوں نے منہ دوسری جانب پھیر لیا۔

”آج آذر کی برتھ ڈے ہے نا اماں؟“ ایک پھکی سی مسکراہٹ نے اس کے ہونٹوں کا احاطہ کیا۔

”بہت سال پہلے گیارہ اگست کو اس نے انہما کو فون پر بھی برتھ ڈے آذر“ کہتے سنا تھا۔ وہ دن اسے آج

بھی یاد تھا۔

”مجھے کیا پتا تیری پھپھو کے بچوں کی سالگرہیں کب ہوتی ہیں؟“ انہوں نے چڑ کر کہا۔ جہانگیر کے انتقال کے بعد اماں بی کا انہیں اپنے بیٹے کی موت کا ذمہ دار ٹھہرانا اور اس کا انتقام آذر کو ان سے چھین کر لینا ماضی کی ایک تلخ حقیقت تھی مگر یہ بھی سچ تھا کہ گزرتے ماہ و سال میں ان کے ذہن نے اس سچائی کو قبول کر لیا تھا کہ آذر اب صرف اور صرف عشرت جہاں کا بیٹا ہے۔



”آج کی شام کتنی ادا اس اور بے کیف سی ہے۔“ عفرانے چارپائی پہ لیٹے لیٹے آسمان کی زردیوں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

سامنے والی دیوار پہ کوئے منڈا رہے تھے اور چڑیاں پھدک رہی تھیں۔ اس نے چارپائی سے اٹھ کر منڈیر پہ جھک کر نیچے جھانکا۔ آنگن سونا بڑا تھا۔ ثروت بیگم اپنے تمام بچوں کو لے کر میکے گئی ہوئی تھیں۔ ان کے ایک بھائی جدہ میں ہوتے تھے۔ ان کے آنے کی خوشی میں ان کی والدہ نے اپنی تمام اولادوں کو ان کے بچوں سمیت رات کے کھانے پہ مدعو کیا تھا۔ ان سب کو دیکھ کر اکثر عفرانے دل میں بھی یہ کسک جاگتی تھی کہ کاش وہ بھی رشتوں کے ایسے محبت بھرے بندھن سے بندھی ہوتی۔

”اماں! کیا میرے ننھیال میں کوئی نہیں۔ نانا، نانی، ماموں یا خالہ؟“ ایک بار بچپن میں اس نے سوال کیا تھا۔

”ان سب رشتوں کی کمی تمہیں ہی نہیں مجھے بھی محسوس ہوتی ہے۔ میں اکلوتی تھی۔ چھوٹی تھی جب ابا کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ میری شادی کے بعد امی صرف دو سال ہی جی سکیں۔ جب تمہارے ابا کا ساتھ چھوٹا تو ایسا کوئی بھی مخلص نہیں تھا جس کے کندھے پہ سر رکھ کے میں رہ سکتی تھی۔“ انہوں نے بے حد الجھے ہوئے انداز میں نجانے یہ وضاحت اسے دی تھی یا خود کو۔

مغرب کی اذان کے بعد اماں بی نے اسے پکار لیا۔ ”اس کمبخت بلی کو یہاں سے بھگاؤ۔ کتنی دیر سے اپنی منحوس آواز میں روئے جا رہی ہے۔“ اماں بی کی پکار پہ عفرانے چلی آئی۔

ملکے اندھیرے میں وہ جامن کے درخت کے نیچے ڈنڈا پکڑے بچوں کی کہانیوں کی بوڑھی جڑیل کی طرح لگ رہی تھیں۔

”وہ اوپر والی ٹہنی پہ بیٹھی ہے منحوس۔ جلدی بھگا اسے۔“ ڈنڈا اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے انہوں نے ایک ٹہنی کی طرف اشارہ کیا۔

عفرانے کا درد مند دل اس کے لیے راضی نہیں تھا مگر اماں بی سے اختلاف کی گنجائش ماضی کے تلخ واقعات نے چھوڑی ہی کہاں تھی۔ ٹہنی پہ اندھا دھند ڈنڈا برساتے ہوئے اس نے جہاں بلی کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

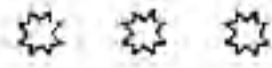
اماں بی مطمئن ہو کر نماز کے لیے نیت باندھنے لگیں۔ ”کیا مخلوق خدا سے نفرت کرنے والوں، ان پر ظلم ڈھانے والوں کی نمازیں قبولیت کا شرف حاصل کرتی ہوں گی؟“

اماں بی پر ایک نظر ڈالنے کے بعد اسے افسوس ہونے لگا۔

شاہ زیب کی واپسی ہو چکی تھی۔ اس کی یواگی ثروت بیگم کے لیے کسی صدمے سے کم نہ تھی کہ رائے اپنے بودے پن میں اسے اپنی کسی ایک بات سے بھی متاثر نہ کر سکی تھی۔

”کیوں میرے پیچھے بڑ گئی ہیں اماں! ایسے بڑے میاں بنے پھرتے لوگ مجھے قطعی پسند نہیں ہیں۔ کل میں نے ایک بار مسکرا کے ان کی طرف دیکھا تو جواباً ایسی نرمی و شفقت سے مسکرائے جیسے میں چار سال کی بچی ہوں۔ برائے مہربانی ایسے ابا ٹائپ لوگوں سے آپ مجھے دور ہی رکھا کریں۔“ اس نے کھٹاک سے کتاب بند کر کے جواب دیا تو ناجیہ اور انیقہ کی کھی کھی دیر تک سنائی دیتی رہی۔

”کم عقل پھوہڑ لڑکی۔“ ثروت جہاں نے اسے ان



کے ساتھ کہا تو انہوں نے اس کی جانب سے رخ پھیر لیا۔ انہیں جو خدشات لاحق تھے ان سے وہ اچھی طرح آشنا تھی۔ انہیں خوف تھا کہ وہ آذر کو حقیقت حال بتا کر اس کی اچھی خاصی زندگی میں طوفان کھڑا کر دے گی۔ جس کے بعد قیامت ایک بار پھر ان کے گھر کا رستہ دیکھ لے گی۔ عفرانے انہیں اس موضوع پر کسی قسم کی کوئی صفائی دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

کراچی اماں لی عالمگیر ثروت اور رائے ہی جارہے تھے۔ ناجیہ اور دانش سالانہ پیپرز کی وجہ سے گھر میں ہی تھے۔ ان کی سہولت کے لیے انہی کا خوشی ان کے ساتھ ٹھہرنے کے لیے راضی ہو گئی تھی۔ آسیہ بانو تو یوں بھی ان کے ساتھ ہی تھیں۔ رات کے لیے البتہ عالمگیر صاحب نے بطور خاص ان کے ماموں کو گھر پہنچوں کے ساتھ آکر ٹھہرنے کی درخواست کی تھی۔



کراچی پہنچ کر عفران کی تمام ترامیدوں پر پانی پھر گیا۔ کیونکہ آذر پاکستان نہیں آسکا تھا۔ اس کے ایم بی اے کے پیپرز ہو رہے تھے۔

اب اس کی سمجھ میں آرہا تھا کہ اماں لی نے اس کے جانے پر شدید مخالفت کے بجائے ہلکا سا احتجاج کیوں کیا تھا۔ پھپھو نے اسے پیار سے گلے لگایا۔ ان کی بیٹیاں بھی خوش رہی۔

نمرہ نے تو کسی حد تک پھپھو کے ہی نقش چرائے تھے۔ سدرہ اس سے مخالف تھی۔ بھورے۔ لے لے بل گوری رنگت اور نیلی آنکھوں کے ساتھ جینز اور لی شرٹ اسے مکمل طور پر مغربی بنارہا تھا۔

وائٹ پیلس کے تین پورشن تھے۔ ایک پورشن میں پھپھو کے بڑے جیٹھ و جاہت احمد اپنی فیملی سمیت رہتے تھے۔ دوسرا پورشن چھوٹے جیٹھ رضا احمد کا تھا۔ رضا احمد کی بیٹیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ بیٹے شاہ زیب نے سول انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ وہ اپنے دادا کی کنسٹرکشن کمپنی سنبھالتا تھا۔

تین ماہ کیسے گزر گئے اسے کچھ پتا ہی نہ چلا۔ اچانک اسے اڑتی اڑتی خبر ملی کہ پھپھو اپنی فیملی سمیت ایک ہفتے کے بعد کراچی آنے والی ہیں۔ نمرہ کی شادی کی تاریخ انہوں نے فون پر ہی طے کر لی تھی۔ ان کے آنے کے ایک ہفتے بعد شادی کے فنکشن شروع ہو جائیں گے۔ سب نے کراچی جانے کی تیاریاں پکڑیں تو عفران کے اندر بے چینیاں بھر گئیں۔ وہ بھی کراچی جانا چاہتی تھی مگر کسی نے اسے جھوٹے منہ بھی چلنے کو نہیں کہا تھا۔

آذر سے ملے گا۔ موقع وہ ہرگز گنونا نہیں چاہتی تھی۔ اسے لگ رہا تھا اگر اس بار وہ کراچی نہیں گئی تو شاید زندگی میں پھر بھی وہ اپنے بھائی سے نہ مل سکے گی۔

”تایا ابا! میں بھی کراچی جانا چاہتی ہوں۔ مجھے پھپھو سے ملنے کا بہت شوق ہے۔“ مایوسی کے اس گھپ اندھیرے میں تایا ابا کا وجود اس کے لیے امید کا چراغ بن کے سامنے آیا تھا۔ وہ جانتی تھی۔ اس کے تایا ابا کبھی بھی اس کی بات نہ ٹالیں گے۔

دوسرے دن تایا ابا نے اسے اپنا سامان پیک کرنے کے لیے کہا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اماں لی کو انہوں نے کیسے منایا ہو گا۔ اسے بس اتنی خبر تھی کہ وہ اس کے جانے سے خوش نہیں تھیں۔

”تم وہاں جا کر کیا کرو گی؟“ آسیہ بانو اسے کراچی بھیجنے کے حق میں نہ تھیں۔

”مجھے پھپھو سے ملنے اور کراچی دیکھنے کا بہت شوق ہے۔“ اس نے بیگ میں اپنے سوٹ رکھتے ہوئے مطمئن انداز میں جواب دیا۔

”تم سچ کہہ رہی ہو۔“ انہوں نے عفران کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جانب موڑا۔

”ہاں اماں! کیا آپ کو مجھ پر یقین نہیں ہے؟“ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس نے حد درجہ اعتماد

تیسرا پورشن عشرت جہاں کا تھا۔ وہ چونکہ مستقل طور پر امریکا میں سہل تھے۔ سو ان کا پورشن زیادہ تر بند ہی رہتا تھا اور صرف اسی وقت کھلتا جب وہ کچھ دنوں کے لیے پاکستان آتے۔ ان کی دونوں بڑی جھانیاں اچھی اور منسار تھیں۔

ہونٹوں پہ زبردستی مسکراہٹ سجائے عفر ابادل مانواستہ سب سے ملتی رہی۔ جب سب ادھر ادھر ہوئے تو وہ چپکے سے لان میں آگئی۔ گیندے کے پھولوں کی کیاری کے پاس باؤنڈری وال کی طرف منہ کیے وہ گئی اور تک آنسو چھپانے کی لا حاصل سعی کرتی رہی۔ اسے لگ رہا تھا کہ نمرہ کی شادی کی تاریخ بھی انہوں نے جان بوجھ کر ایسی رکھی تھی کہ آذر اپنے ایگزامز کی وجہ سے پاکستان نہ جاسکے۔ کیونکہ اماں بی سمیت پھپھو اور پھوپھا میں سے کوئی بھی نہیں چاہتا تھا کہ اسے حقیقت کا علم ہو۔ اماں بی تو ابھی تک حسد اور انتقام کی آگ میں جل رہی تھیں۔ عشرت جہاں اور اسرار احمد البتہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کا ہنسنا ہنسا ہر آگئی کے عذاب سے زہر آلود ہو جائے۔

”ایکسکیوز می“ اس کے پیچھے ایک بے حد جانی پہچانی آواز گونجی۔ انگلی کی پور سے آنسو صاف کر کے وہ فوراً ”سیدھی ہوئی تو سامنے شاہ زیب کو کھڑا پایا۔“ السلام علیکم۔“ شناسائی کا لحاظ کرتے ہوئے عفر نے سلام کیا۔ تین مہینے پہلے ہی تو وہ ان کے یہاں سے ہو کر گئے تھے۔

”وعلیکم السلام۔“ سلام کا جواب دے کر وہ اسے غور سے دیکھنے لگا۔

”آپ رو رہی ہیں؟“ اس کی نم آنکھیں دیکھ کر شاہ زیب نے کہا۔

”نہیں تو۔“ اس کی پلکیں پھڑپھڑا اٹھیں۔ ادھر ادھر دیکھ کر اس نے اپنی آنکھوں کے تاثر کو زائل کرنے کی کوشش کی تھی۔

”میں چلتی ہوں۔ اماں بی مجھے ڈھونڈ رہی ہوں گی۔“ اس کی کھوجتی آنکھوں کی تاب نہ لاتے ہوئے اس نے پھپھو کے پورشن کی طرف قدم موڑ دیے۔ شاہ

زیب نے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ عفر کی مضطرب آنکھیں اور پیشانی پر تفکر کی لکیر دیکھ کر وہ یہ سوچنے پر مجبور ضرور ہو گیا تھا کہ اس لڑکی کے ساتھ کوئی مسئلہ ضرور ہے۔



اس بار عشرت بڑے عرصے بعد پاکستان آئی تھیں۔ تمام افراد کے لیے انہوں نے بطور خاص بہت قیمتی کفٹنس کیے تھے۔ عفر کو بھی انہوں نے ایک بے حد نفیس گھڑی دی۔ اس کی پھپھو اماں بی کی نسبت کافی نرم دل تھیں۔ وہ ان سے پہلی بار مل رہی تھیں۔ لیکن انہوں نے ذرا احساس ہونے دیا تھا۔

”چل لڑکی! یوں بت بنی کا ہے کو بیٹھی ہے۔ تیری پھپھو نے دوبار کھانے کے لیے کھانا بھیجا ہے۔“ منگل بیڈ کی پٹی سے ٹیک لگائے وہ بہت دیر سے بظاہر سامنے والی دیوار پر لگی پینٹنگ کو دیکھ رہی تھی۔ مگر حقیقتاً اس کی سوچ کہیں اور ہی تھی۔

”جی اماں بی!“ اس نے آہستگی سے اٹھ کر اماں بی کا ہاتھ تھاما اور انہیں ڈانٹنگ ہال کی طرف لے جانے لگی۔ یکایک اماں بی کی چیخ نکل گئی۔

سیدہ اپنی گود میں ایک بھوری بلی کو بٹھا کر دودھ پلا رہی تھی۔ ساتھ ساتھ خوب پیار بھی کر رہی تھی۔ یہ دیکھ کر تو عفر ابھی سکتے کی سی کیفیت میں آگئی تھی۔

”کیا ہوا اماں بی! وہ اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے سخت نظروں سے عشرت جہاں کو دیکھ رہی تھیں۔ جیسے کہہ رہی ہوں یہ تربیت ہی ہے اپنی بچیوں کو۔“

اماں بی کی آنکھوں میں دکھتی واضح نفرت اور ناپسندیدگی عشرت کو سب کچھ سمجھا گئی۔

”سیدہ! اماں بی بلیوں سے الرجک ہیں۔ تم اپنی پلیٹ اور مانو کو لے کر اپنے روم میں چلی جاؤ۔“

”اوہ اچھا۔“ وہ فوراً اپنی پلیٹ اٹھائے بغل میں بلی کو دبائے اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ عشرت نے اٹھ کر فوراً ہی وہ جگہ جہاں بلی بیٹھی تھی صاف سے

صاف کر کے ایک دوسری کرسی کے آگے اماں بی کے لیے پلیٹ رکھی۔

”آئیں اماں بی۔ دیکھیں آپ کی پسند کے زرگسی کو فتنے بنائے ہیں۔“ عشرت اپنی آواز کو خوش گوار بناتے ہوئے بولیں۔

”مجھے بھوک نہیں ہے۔ عفر! مجھے میرے کمرے تک چھوڑ آؤ۔“ اماں بی کو راجواب دے کر اپنے کمرے کی طرف روانہ ہوئیں۔ عشرت سمجھ سکتی تھیں یہ ان کی ناراضی کا اظہار ہے۔ ورنہ رات کا کھانا تو وہ دوا میں لینے کی وجہ سے ضرور کھاتی تھیں اور آج تو انہوں نے خود کہہ کر زرگسی کو فتنے بھی بنوائے تھے وہ شرمندہ ہو رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ ہمت کر کے ان کے پاس پہنچیں۔ انہیں منانے کی کوشش کی مگر اماں بی بس سے مس نہ ہوئیں۔ بالآخر کافی منانے کے بعد وہ عفر! کے ہاتھ سے بنی پھڑی کھانے پر شکل رضامند ہوئیں۔



خوب صورت شام میں لان کا کونا کونا رنگ برنگے قہقہوں سے جگمگا رہا تھا۔ سج سجائے اسٹیج پر پھولوں سے لدی کرسی پہ بیٹھی نمرہ ابٹن کی رسم کروائے ہوئے شرم و حیا کے تمام رنگ چہرے پہ سموئے بہت پیاری لگ رہی تھی۔ اس کے پہلو میں بیٹھا وہاب چپکے چپکے نظر ڈال کے اس کے خیرہ کن حسن سے محفوظ ہو رہا تھا۔ عفر! ایک کرسی پہ بیٹھی اس منظر کو بہت پیار سے دیکھ رہی تھی۔

”اسے پکڑنا ذرا میرا فون آ رہا ہے۔“ دائیں کان سے سیل فون لگائے سدرہ نے مٹھالی کا بڑا سا ٹوکرا اسے تھامنے کو دیا تو اس نے فوراً ”وہ ٹوکرا اس سے لے کر دوسری خالی کرسی پہ منتقل کیا۔

”آج نمرہ کی مایوں ہے بھائی! وہ بہت خوب صورت لگ رہی ہے۔“ اسٹیج سے آنے والے شور سے بچنے کے لیے اس نے ذرا اونچی آواز میں کہا تھا۔ لفظ بھائی پہ عفر! کے کان کھڑے ہو گئے۔

”وہاب بھائی بھی بہت خوش ہیں۔ انہیں اتنا تنگ کیا مت پوچھیں کتنا مزا آ رہا تھا وہ بھی خوب چڑ رہے تھے۔“

وہ مزے لے لے کر اسے آج کی روداد سنار ہی تھی۔

”یہاں بھی سب لوگ بہت اچھے ہیں۔ لاہور سے اماں بی اور ماموں بھی آئے ہیں۔ فرسٹ ٹائم اپنی فیملی کے تمام افراد کے ساتھ کچھ دن گزارنے کا موقع ملا ہے۔ میں تو ہر چیز انجوائے کر رہی ہوں۔ کیا؟ نہیں لاہور جانے کا کوئی پروگرام نہیں۔ سب سے پیس مل لیے ہیں۔ پھپھو بھی آج آگئی ہیں۔ پھر وہاں جانے کی کیا ضرورت؟ اچھا بھائی! بعد میں فون کرنا۔ بہت شور ہو رہا ہے۔ ہاں نمرہ بارہ تک فارغ ہو جائے گی۔ پھر اس سے بات کر لیجئے گا۔ ابو کے میں بند کر رہی ہوں۔ اللہ حافظ ہاں ہاں بھئی میں ننھی بیٹی نہیں ہوں۔ اپنا خیال رکھوں گی۔“ ان کا رابطہ منقطع ہو گیا۔

عفر! کو یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ اس کا بھائی کتنا کیرنگ ہے۔ مغربی ماحول میں پرورش پانے کے باوجود بھی وہ مکمل طور سے ایک مشرقی بھائی تھا۔ بہنوں سے پیار کرنے والا ان کے متعلق فکر مند رہنے والا۔

اسے پیاری سی سدرہ پر بھی بے تحاشہ پیار آیا کہ جس کے ہر ہر انداز سے اسے آؤر کے لیے پیار جھلکتا محسوس ہوا۔

”میرے بھائی کا اتنا خیال رکھنے کے لیے میں تہ دل سے تمہاری مشکور ہوں۔“ مٹھالی کے ٹوکرے کو سنبھال کے اٹھاتی سدرہ کو دیکھتے ہوئے اس نے دل میں سوچا اور پھر اپنی بات پہ اسے خود ہی ہنسی آگئی۔

”عفر! پلیز میرا دوپٹا ٹھیک کرنا ذرا۔“ دونوں ہاتھوں میں مٹھالی کا ٹوکرا تھامے اس نے ملکی سی بے بسی کے ساتھ اپنے ڈھلکے آنچل کو دیکھا۔

”کیوں نہیں۔“ عفر! نے کھڑے ہو کر اس کا دوپٹا شانوں پہ ٹھیک کیا۔

”اٹکچو کلی مجھے دوپٹا لینے کی عادت نہیں نا۔ وہ تو نمرہ کا ابٹن ہے اس لیے سب کی دیکھا دیکھی میں نے

بھی یہ کچل سوت پسن لیا۔ ”عفرا ہنس پڑی۔  
 ”اس لیے مشکل ہے۔ اگر لیتی رہو گی تو عادت ہو جائے گی۔ ویسے اس سوت میں تم بہت پیاری لگ رہی ہو۔“ اس نے کوئی میالغہ آرائی نہیں کی تھی۔ وہ واقعی بہت پیاری لگ رہی تھی۔

”تھینک یو سوچ۔“ کم تو تم بھی نہیں لگ رہی ہیں۔ مگر ایک بات ہے جو میں نوٹ کر رہی ہوں۔ تم تھوڑا الگ تھلگ رہنا پسند کرتی ہو۔“ عفرانے اسے چونک کر دیکھا۔ اور دھیسے سے مسکرا دی۔

”ایسی کوئی بات نہیں۔ دراصل میرے لیے ماحول نیا ہے نا اور لوگ بھی انجان۔ اس لیے میں کسی سے ابھی تک فری نہیں ہو پائی۔“ اس نے سہولت سے بات بنائی۔

”یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ مجھے کچھ میرے لیے تو سرے سے یہ ماحول نیا ہے۔ پھر بھی میں کتنا گھل مل گئی ہوں۔ گھلنے ملنے کی آسانی ماحول فراہم نہیں کرتا بلکہ مزاج پیدا کر لیتا ہے۔“ وہ باتوں ہی تھی شاید مگر عفرانے اس کا بولنا اچھا لگ رہا تھا۔

”ایسا ہی ہو گا۔“ اس نے فوراً ”اس کے فلسفے سے اتفاق کیا۔ بحث کی عادت تو یوں بھی اس میں تھی نہیں۔

کچھ دیر کے بعد مٹھائی کاٹو کر مطلوبہ جگہ پر پہنچا کر وہ دوبارہ اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ عفرانے اس سے بات کر کے اچھا لگ رہا تھا۔ اس لیے کراچی آنے کے بعد وہ پہلی بار گھل کر مسکرا رہی تھی۔ بلکہ کتنی بار اس کی کسی بات پر وہ بے ساختہ ہنس گئی تھی۔ اسے بتا ہی نہیں تھا کہ اس کی بے ساختہ ہنسی کو وہ آنکھیں کتنی دیر سے تنک رہی تھیں۔

”کیا اس لڑکی کو ہنسنا بھی آتا ہے؟“

شاہ زیب حیرت سے سوچ رہا تھا۔



آج صبح سے ہی چہل پل شروع ہو چکی تھی۔ کیونکہ اگلے دن مندی کا فنکشن تھا۔ سدرہ اور

اس کی بڑی تائی (وہاب کی والدہ) راحیل کے ساتھ شاپنگ کے لیے نکلنے لگیں تو اچانک رائے کو بھی خیال آیا کہ اس کی کچھ جیولری ابھی رہتی ہے۔ ثروت بیگم نے جھٹ سے ہزار کے چند نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں دبا دیے۔ عفرانے دیکھ رہی تھی۔ رائے کچھ زیادہ ہی راحیل میں دلچسپی لے رہی تھی۔ ان کے جانے کے بعد اسما باجی، منزہ باجی اور ناہید بھابی نے ڈھونڈی سنبھالی۔ مایوں بیٹھی نمروہ کو بھی وہ کھینچ کر اپنے پاس لے آئیں۔ اوپر سے جہاں زیب بھائی کے بیٹے زوہیب نے جو ڈھولک کی تھاپ پر ڈانس کرنا شروع کیا تو سب کے منہ سے ہنسی کے فوارے پھوٹ پڑے۔

”بیٹا! تم اکیلی کیوں بیٹھی ہو؟“ چھوٹی تائی (شاہ زیب کی والدہ) کسی کام سے ادھر آئیں تو کمرے میں عفرانے کو اکیلے بیٹھے دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

”بس ایسے ہی چھوٹی تائی۔“ وہ گڑبڑا کر سیدھی ہو بیٹھی۔ نمروہ اور سدرہ کی دیکھا دیکھی وہ اور رائے بھی انہیں چھوٹی تائی بڑی تائی کہنے لگی تھیں۔

”بیٹا! خوشی کا موقع ہے سب کے ساتھ اٹھو بیٹھو، ہنس کھیلو۔“

اس نے جواب دینے کو منہ کھولا ہی تھا کہ شاہ زیب ان کے متائل آن کھڑا ہوا۔

”مما! کہاں نہیں ڈھونڈا میں نے آپ کو۔ بھابی بتا رہی ہیں آپ نے مجھے بلایا ہے۔“

”ہاں وہ مجھے بازار سے کچھ چیزیں منگوانی تھیں۔ پھر پتا چلا کہ سدرہ جا رہی ہے تو میں یہاں آگئی۔ لیکن وہ تو میرے پیچھے سے پہلے ہی نکل چکی تھی۔ تم یہ لو۔“ انہوں نے ٹسٹ اس کی طرف برہانی۔

”اب میں بازار جا کے یہ سامان کہاں سے ڈھونڈتا پھروں گا۔“ ٹسٹ دیکھ کر اس کی شکل پہ بارہ بچنے لگے۔

”کراچی کے ٹریفک اور دھو میں سے میرا دل بہت گھبراتا ہے۔ دیکھتی ہوں منزہ کو۔“ وہ جانے کے لیے مڑیں پھر دو قدم آگے بڑھ کر رک سی گئیں۔

”بیٹا! تم بھی تو فاسغ بیٹھی ہو۔ تم چلی جاؤ اس کے ساتھ۔ اسے تو واقعی اپنی شاپنگ کے لیے علاوہ الف

بے کا علم نہیں۔ اکیلا چلا گیا تو پتا نہیں کیا الم غلا اٹھا لائے گا۔“ چھوٹی تائی عفرات سے مخاطب ہوئیں تو وہ گھبرا کر وائیں بائیں دیکھنے لگی۔

”وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ اماں بی۔“ جانا تو وہ خود بھی نہیں چاہتی تھی۔ پر اماں بی کو ڈھال بنانا ضروری تھا۔

”ان سے میں بات کر لیتی ہوں۔ تم دونوں بس ابھی نکلو۔ ٹائم ضائع مت کرو۔“ اس کے ہاتھ میں فہرست تھما کے وہ اماں بی کی تلاش میں آگے بڑھ گئیں۔ یہ دیکھتے بغیر کہ اس کے چہرے پہ کیسی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”سیرے ساتھ جانے سے ڈرتی ہیں یا واقعی اماں بی کا خوف ہے۔“ اس کا سوال عفرات کو سر اٹھا کر دیکھنے پہ مجبور کر گیا۔

”کیا مطلب؟“ آنکھوں میں الجھن لیے وہ اتنی معصومیت سے بولی کہ شاہ زیب اسے دیکھ کر مسکرا دیا۔

”کچھ نہیں۔“ مسکراتے ہوئے اس نے سر نفی میں ہلایا۔

پھر جب وہ جانے لگا تو عفرات کو چھوٹی تائی کی لجاجت بھری درخواست یاد آگئی۔

”سنئے۔“ پیچھے سے آواز آئی۔

”جی کہئے۔“ وہ جھٹ پلٹ آیا۔

”میں چلتی ہوں آپ کے ساتھ۔“ وہ کچھ سوچ کر اس کے ساتھ ہوئی۔ مگر مارکیٹ پہنچنے پر عقدہ کھلا کہ شاپنگ کرنے کے سلسلے میں محترمہ اس سے بھی زیادہ کوری ہیں۔

”یہ سارا سامان مہندی کے فنکشن کا ہے۔ یہ موم بتیاں، یہ مہندی کی پلیٹیں، گہرے، مصنوعی پھول اور اسٹیج کی سجاوٹ کے لیے یہ سب۔ کیا فضولیات ہیں یہ۔ بلاوجہ کے خرچے اور نمائش۔“ فہرست پہ نظر ڈالتے ہی وہ سنجیدہ ہو گیا۔ عفرات کو اس کی سوچ اچھی لگی۔ وہ افسوس سے سر ہلاتا ہوا مطلوبہ چیزیں لینے لگا۔ عفرات تو بس نام کو اس کے ساتھ تھی۔ حقیقتاً ہر ایک چیز تو وہ خود پسند کر رہا تھا۔ عفرات سے اس نے ایک

دوبارہ ہی پوچھا جس پر اس نے جیسا آپ کی مرضی کہہ کر جان چھڑالی۔ ایک گھنٹے کے اندر ہی وہ تمام چیزیں پیک کروا کے گاڑی میں رکھ چکا تھا۔

”اگر آپ برا نہ مانیں تو یہاں سے مجھے ایک دو چیزیں لینی ہیں۔“ شاہ زیب نے گاڑی ایک شاپنگ مال کے سامنے روکتے ہوئے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”آپ بھی آئیں ناں۔“ اسے گاڑی میں ہی جے دیکھ کر وہ اس کی طرف کی کھڑکی پہ جھک گیا۔

”نہیں میں گاڑی میں ہی ٹھیک ہوں۔“ وہ ہنچکتے ہوئے بولی۔

”اس طرح مجھے اچھا نہیں لگے گا۔ چلیں چھوڑیں۔ میں آپ کو گھر چھوڑ آتا ہوں۔ اپنی چیزیں بعد میں لینے آجاؤں گا۔“ وہ سنجیدگی سے کہتے ہوئے دوبارہ گاڑی میں بیٹھنے لگا۔ تو عفرات اپنی جانب کا دروازہ کھول کر باہر آگئی۔

”میں چلتی ہوں۔“

دس منٹ میں وہ اپنا کرتا لے چکا تھا میچنگ کا کھسکہ بھی لیتا تھا۔ مگر عفرات کے خیال سے اس نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔



”توبہ ہے“ اللہ نے اچھی شکل کیا دے دی۔ لوگ تو آسمان پہ ہی اڑنے لگتے ہیں۔ پارک ٹاور کے ہر فلور کی ہر شاپ پر راجیل صاحب کی درودان مل جاتی تھی اور یہ بھی لہک لہک کر علیک سلک میں مصروف ہو جاتے۔ مجھے تو بہت ہی افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے کبھی ایسے شخص کے بارے میں کچھ اچھا بھی سوچا تھا۔“

رائے سخت تاؤ کھائے بیٹھی تھی۔ اماں بی پھپھو کے ساتھ ڈرائنگ روم میں تھیں۔ ایسے میں اسے کھل کر بھراس نکالنے کا موقع مل گیا تھا۔ ثروت بیگم کو بھی یہ جان کر بڑا افسوس ہوا تھا۔

”اور ان محترمہ کو دیکھو“ آج اکیلے شاہ زیب کے ساتھ فرنٹ سیٹ پہ بیٹھ کے سیر پالنے کو نکل

پڑیں۔ ”ثروت بیگم اپنا غصہ اس پہ اندھیلنے کے لیے تیار ہو گئیں۔

”میں اپنی مرضی سے تو نہیں گئی تھی۔ وہ تو چھوٹی تائی نے اصرار کیا تو مجھے مجبوراً۔“ حیرت سے آنکھیں پھیل کر وہ وضاحت دینے لگی تھی کہ انہوں نے درمیان سے ہی اس کی بات اچک لی۔

”بس بس بڑی چیتنی بنی پھرتی ہو چھوٹی تائی کی۔ کان کھول کر سن لو۔ مجھے دوبارہ تم شاہ زیب کے قریب نظر نہ آؤ۔ شاہ زیب کے لیے میں نے رائے کا سوچ رکھا ہے۔“ وہ کسی ناگن کی طرح پھنکار رہی تھیں۔ عفرہ کو ان کی سوچ پہ افسوس ہوا۔

”اسے کیوں ڈانٹ رہی ہیں امی! میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میرے اور اس کے بارے میں سوچنا بند کریں۔“ رائے سخت جھنجھلائی۔

”چپ کرو تم۔ بہتر کیا ہے۔ یہ میں جانتی ہوں۔“ وہ اسے ڈانٹ پلا کے باہر نکل گئیں۔ تو رائے نے جڑ کر ہاتھ روم کا رخ کیا۔

”یہ تائی اماں بھی ناں عجیب ہیں۔ پتا نہیں کون سی کھچڑی ان کے دماغ میں چلتی رہتی ہے۔ بھلا شاہ زیب اور میں کیسے؟“ ایک لمحے کو اس کی سوچ جیسے تھم سی گئی۔ اس کی آنکھوں میں شاہ زیب کا وجہہ سراپا نمودار ہوا۔ اس کے لبوں کی نرمی اور انداز کا اپنا پن بلا شبہ اس کی شخصیت کے دوا ہم پہلو تھے۔

عفرانے فوراً ہی سر جھٹکا۔ وہ اس کے بارے میں زیادہ نہیں سوچنا چاہتی تھی۔

”آپ یہاں بیٹھی ہیں اور میں پتا نہیں کہاں کہاں آپ کو ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔“ نٹ کھٹ سی سدرہ کو اس کی ذات سے ایک خاص لگاؤ ہو چکا تھا۔ وہ بھی اسے مایوس نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ پوچھنے لگی۔

”خیریت۔ مجھے کیوں ڈھونڈا جا رہا تھا؟“ لیکن اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر نیوی لافنج میں لے آئی۔ جہاں ساری خواتین بےح دھن کے موجود تھیں۔

”کتنے خوش لگ رہے ہیں سب اور نمروہ۔ اس کی آنکھوں میں کتنے جگنو چمک رہے ہیں۔ سب کے چہروں پہ آسودگی بکھر بکھر کے خوشیوں کی برسات کا اعلان کر رہی ہے۔ اور میری ماں۔“

سب کے چہروں کو کتنی عفرہ کی آنکھوں میں ماں کا سراپا اتر آیا۔ زرد رنگت اور یاسیت بھری آنکھیں، بکھرا حلیہ اور ٹوٹا دل جس کی کرسیاں نجانے کتنے سالوں سے ان کی روح کو لہو لہان کر رہی تھیں۔

بعض اوقات انسان کو اذیت اٹھا کر اپنی غلطیوں کا ہرجانہ بھرنا پڑتا ہے۔ آذر سے ایک دن کی علیحدگی نے انہیں کانٹوں پہ گھسیٹا تو ان پر اماں لی کا درد آشکار ہوا۔ انہوں نے یہ سوچ کر چپ سا دھلی کہ شاید یہی ان کی غلطی کی سزا ہے۔ مگر اپنی مامتا کو کیسے سمجھائیں۔ ان کی آنکھوں کا کرب چیخ چیخ کر ان کے دل پہ پڑے ہر زخم کا اعلان کرتا تھا۔

”آذر بھائی۔!“ اس کے خیالات کا تسلسل سدرہ کی چیخ سے ٹوٹا۔ سب کی نگاہیں دروازے پہ جم گئیں جہاں آذر ایک ہاتھ میں بیگ تھا۔ سب کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

”آذر!“ نمروہ روڑ کے اس کے سینے سے جا لگی۔ اس کے آنسو آذر کی شرٹ بھگور رہے تھے۔

”پاگل! اب تو میں آگیا۔ اب کیوں رو رہی ہو؟“ وہ اس کی ٹھوڑی اٹھا کر لولا۔ عفرہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی جو اس کا ماں جایا تھا۔ لیکن وہ اسے دیکھ پہلی بار رہی تھی۔

اسے لگا وقت ٹھہر گیا ہے۔ دنیا کی ہر چیز ٹھہر گئی ہے۔ بس اس کی آنکھوں کی توانائیاں باقی ہیں جو اس وقت اس کے بھائی کو دیکھ رہی ہیں۔

عفرانے دیکھا اماں لی کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ہونٹ بھنج گئے تھے۔

”تم اپنے اہم ایگزامز چھوڑ کے یہاں آ گئے بیٹا! تمہارے کیریئر کا سوال ہے اتنی محنت کی ہے تم نے۔“ عشرت ابھی تک اسی جھٹکے کی کیفیت سے نکل نہ پائی تھیں۔

”مما! ایگزامتو ہوتے رہتے ہیں۔ مگر بہن کی شادی صرف ایک بار ہوتی ہے میرا کیریئر میری بہن سے زیادہ اہم نہیں ہے۔“

”کمال کرتی ہو عشرت! بیٹا بہن کو رخصت کرنے آیا ہے۔ تم الناس پہ بگڑ رہی ہو۔“ بڑی تائی عشرت جہاں کو ٹوکتے ہوئے آذر کی طرف بڑھیں۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا بھابھی! میں تو اسی کی بھلائی کے لیے کہہ رہی تھی۔ میرے لیے اس سے بڑھ کر خوشی اور کیا ہوگی۔“ پھر عشرت جہاں نے اسے اماں بی کے سامنے کھڑا کیا۔

سائت کھڑی اماں بی اپنے سامنے اپنے جوان پوتے کو دیکھ رہی تھیں۔ جو دنیا کی نظروں میں ان کا نواسا تھا۔ اس نے ہر ہر نقش اپنے والد جہانگیر کا چرایا تھا۔ قد کاٹھ گندی رنگت سیاہ آنکھیں، انہیں لگا جہانگیر زندہ ہو کر ان کے سامنے آن کھڑا ہو۔ وہ بالکل اپنے باپ کا پرتو تھا۔

”جہانگیر!“ اماں بی نے زیر لب کہا اور لرزتے ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھاما۔

”اماں بی! پیٹا مجھے اکثر بتاتے ہیں کہ میری شکل میرے مرحوم ماموں سے ملتی ہے۔ کیا واقعی میں ان جیسا دکھتا ہوں۔“ وہ شکل سے ہی نہیں آواز سے بھی جہانگیر تھا۔ اماں بی کا دل ڈولنے لگا۔ دل کہہ رہا تھا وہ اپنا پوتا واپس لے لیں۔ لیکن یہ اتنا آسان کب تھا۔

عفرا دم ساوھے اسے دیکھتی رہی۔ وہ سب سے مل رہا تھا۔ کتنا خوش تھا۔ کتنا مسرور دکھائی دے رہا تھا۔ نرمہ اور سدرہ اس کے دائیں بائیں بیٹھی پتا نہیں کون کون سی باتیں کر رہی تھیں اور وہ ان کی ساری باتیں دلچسپی سے سن رہا تھا۔

”کتنا زندہ دل ہے آذر۔ کیا میں اسے اس کی زندگی کی تلخ سچائی بتا کر اس کی یہ زندہ دلی اور شوخی کا خون کرنے کی ہمت کر سکوں گی۔“ عفرا کی آنکھوں کے سامنے کئی سوالیہ نشان ناچنے لگے۔

آذر کو ان کے درمیان بیٹھے آدھا گھنٹہ بھی مشکل سے ہوا تھا جب اماں بی نے عفرا کو اپنے کمرے میں

بلوایا۔

”کچھ پتا ہے تمہیں وقت کیا ہو رہا ہے؟ بس جہاں دھماچو کڑی دیکھی منہ اٹھا کے دیں ہو لیں۔ اتنا جم کر نہ بیٹھ جایا کرو ہر جگہ۔“

اماں بی کا یوں غصہ کرنا اسے بہت کچھ جتا گیا تھا۔

”کس قدر کٹھولیں آپ اماں بی! مجھ سے میرے بھائی کو چھین لیا آپ نے اور اسے دو گھڑی دیکھنے کے حق سے بھی محروم کر دینا چاہتی ہیں۔“ وہ تاسف سے سوچنے لگی۔ اگلے دن بھی آذر سے اسے دور رکھنے کے لیے انہوں نے ایک نیا بہانہ گھڑ لیا۔

”اکیلے میں میرا جی گھبرا رہا ہے۔ تو بس بیٹھی رہ میرے پاس۔“ لوگ اپنا مقصد پورا کرنے کے لیے کیسی کیسی تاویلیں گھڑ لیتے ہیں۔ عفرا دل موس کر رہ گئی۔

وہ اپنے بھائی کو دیکھنا چاہتی تھی۔ اس سے بات کرنا چاہتی تھی۔ مگر اماں بی کو یہ بھی گوارا نہیں ہو رہا تھا۔

”اماں بی! مجھے پتا چلا آپ کے سر میں درد ہے۔“ دوپہر کے قریب وہ ان کے کمرے میں چلا آیا تو اماں بی بڑبڑا کے اٹھ بیٹھیں۔

سر مٹی تراؤڈر اور سفید شرٹ میں ہونٹوں پہ ایک دلکش مسکراہٹ سجائے آذر اس لمحے اسے دنیا کے سب مردوں سے زیادہ حسین لگا۔ ایک لمحے کے لیے اسے اماں بی کی آنکھوں میں چھتاوا نظر آیا کہ بہر حال وہ ان کا پوتا تھا۔ اس میں ان کے بیٹے جہانگیر کا عکس تھا۔

”ہاں بیٹا! ہلکا سا سر میں درد تھا۔ لیکن تم یہاں کیوں چلے آئے مجھے بلا لیتے۔ میں آجاتی باہر۔“ اماں بی نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے عفرا پہ نظر ڈالی تو وہ مسکرا اٹھا۔

”آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہیں اماں بی! میں آپ کو تکلیف کسے دے سکتا ہوں۔“ وہ ان کے ہاتھ تھام کر محبت سے کہنے لگا تو اماں بی سب کچھ بھول کر بس اسے دیکھ گئیں۔

”آپ ایک گلاس پانی لے آئیں گی؟“ پہلی بار وہ

عفرا سے مخاطب ہوا تھا۔ عفرا پہ شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ بھاگ کر وہ ایک گلاس پانی لے آئی۔  
 ”شکریہ۔“ پانی سے بھرا گلاس لے کر آذر نے خود اپنے ہاتھوں سے اماں بی کو درو کی گولی کھلائی۔ پھر اماں بی لیٹیں تو وہ ان کا سر دباٹے ہوئے عفرا سے مخاطب ہوا۔  
 ”لگتا ہے آپ کو اماں بی سے بہت پیار ہے۔ تب ہی تو صبح سے آپ ان کے ساتھ ہی ہیں۔“ وہ جب بھی کسی سے بات کرتا مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے الگ نہ ہوتی۔

”بی ہاں۔ میں اماں بی کا خیال رکھ رہی ہوں۔“ وہ جھٹ سے بولی۔

”آپ چھوٹے اسوں کی بیٹی ہیں ناں۔ جن سے میری شکل بہت ملتی ہے۔“ کتنی اپنائیت تھی اس کے لب و لہجے میں۔ کتنے پیار سے بات کرتا تھا وہ۔ عفرا کے لیے تو اتنا ہی کافی تھا کہ وہ اس سے بات کر رہا ہے۔  
 ”جی ہاں میں عفرا جہانگیر ہوں۔ خوش قسمتی سے آپ کی شکل میرے بابا سے بہت ملتی ہے۔ اگر میرا کوئی بھائی ہوتا تو وہ بالکل آپ ہی کی طرح ہوتا۔ کیا میں آپ کو آذر بھائی کہہ سکتی ہوں؟“ نجانے عفرا کو اس لمحے کیا ہو گیا۔ آنکھوں کے کناروں میں محلتے آنسوؤں کی تڑپ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی سب کچھ اگل دے پر

آذر ہولے سے ہنس دیا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

”میں آپ کا بھائی ضرور بن سکتا ہوں مگر آپ مجھے ”آذر بھائی“ نہیں کہہ سکتیں کیونکہ سدرہ کے ذریعے مجھے پتا چلا ہے کہ آپ مجھ سے بڑی ہیں۔“ جس انداز سے اس نے کہا۔ عفرا کی بے اختیار ہنسی چھوٹ گئی۔  
 اماں بی البتہ اس کی جرات پہ خوب چیخ و تاب کھا رہی تھیں۔ اس لیے اس کے جانے کے بعد فوراً ”اس پہ برس پڑیں۔“

”بہت پر پرزے نکل آئے ہیں تیرے۔ زبان کھنچ کر گردن سے پیٹ دوں گی جو آئندہ آذر کے سامنے پھینے کی کوشش کی تو۔ تیرا کوئی بھائی نہیں ہے۔“

سمجھی!“ وہ نفرت سے بولیں۔  
 پتا نہیں کیوں وہ کھل کر بات نہیں کر رہی تھیں۔ گو کہ انہیں اچھی طرح علم تھا کہ عفرا سب کچھ جانتی ہے۔ پھر بھی اپنی طرف سے وہ آج بھی اس راز پر وہ ڈالے ہوئی تھیں۔ یا شاید انہیں یہ خوف لاحق تھا کہ اگر انہوں نے صاف لفظوں میں عفرا سے سرزنش کی تو جواباً ”وہ بھی بغاوت پر اتر آئے گی۔“



آذر کے آنے سے لے کر شادی کے دن تک اماں بی کا یہی معمول رہا۔ وہ کسی نہ کسی بہانے اسے آذر کے پاس جانے سے روک دیتیں۔ برات والے دن اماں بی صرف اتنی سی بات پہ طیش میں آ گئیں کہ رخصتی کے بعد آذر کو بے حد تھکا ہوا دیکھ کر اس نے کافی بنا کے دی تھی۔

اماں بی نے وہ لے لے لیے کہ اس کی روح چھلتی ہو گئی۔ اس رات وہ سو نہ سکی۔ اشک ایک روانی سے اس کی آنکھوں سے نکل کر تکیے میں جذب ہو رہے تھے۔ کم مائیگی بے چارگی کا احساس اس کے دل پہ پتھر برسا رہا تھا۔

اگلے دن ولیمہ کی تقریب تھی۔ وہ تمام وقت میرج ہال کے ایک کونے میں بیٹھی رہی۔ آج اس کا آذر کو بھی دیکھنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ سرخ آنکھیں، متورم ہونٹے اور مسکراہٹ سے عاری ستا ہوا چہرہ اس کی اندرونی سوگوار کی آئینہ بن گیا تھا۔ کسی نے اس کے اس اجڑے روپ پہ توجہ دی ہو یا نہیں لیکن دو آنکھیں جو ہمہ وقت اس سے چھپ کر اس کی ذات میں اندر تک اتر جاتی تھیں عفرا کو دکھ کر ٹھٹھک گئیں۔

مسکرائی تو وہ پہلے بھی زیادہ نہ تھی۔ مگر اب تو لگ رہا تھا۔ کسی نے کبھی کبھی کی مسکراہٹ بھی اس کے ہونٹوں سے چھین لی ہو۔ اپنے ہی کسی خیال میں ڈوبی ہوئی وہ اپنے ارد گرد سے یکسر بے گانہ تھی۔ جب اس نے کھانا بھی نہ کھایا تو شاہ زیب کی فکر مندی تشویش

میں بدل گئی۔

”عفرا! سب ٹھیک تو ہے۔“ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ اس کے پاس جا کر پوچھنے لگا۔

”جی۔“ مختصر سا جواب دے کر عفرا نے منہ دوسری جانب موڑ لیا۔

”کچھ تو ہے جسے میرا دل محسوس کر رہا ہے۔ تم اتنی ادا اس کیوں ہو۔“ وہ ایک دم بے قرار ہو کر آپ سے تم پر اتر آیا۔ وہ گھبرا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”پلیز عفرا مجھے بتاؤ۔ تمہیں نہیں بتا سہارے آنسو صرف تمہیں ہی نہیں کسی اور کو بھی تکلیف دے رہے ہیں۔ مجھ پر اعتماد کرو۔“ شاہ زیب کے لفظوں کی گہرائی کو سمجھنا اس کے لیے مشکل نہیں تھا۔ محبت کا اظہار ”میں تم سے پیار کرتا ہوں“ کا محتاج نہیں۔ بعض اوقات بہت ہی سادہ عبارت بھی اس کو سمجھانے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ پھر یہاں تو دل کو چھو لینے والی دافقتی تھی۔ عفرا نے سم کے اسے دیکھا۔ جو آنکھوں میں بے پناہ التفات سمونے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مارے گھبراہٹ کے اس کا وہاں ٹھہرنا مشکل ہو گیا۔ اسے کوئی جواب دیے بغیر وہاں سے ہٹ گئی۔

گھر آ کے وہ بستر میں گھس کر اپنی بے بسی پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔

”بس بیٹا! دو دنوں کی بات ہے۔ اس کے بعد ہم اپنے گھر واپس چلے جائیں گے۔“ انہوں نے محبت سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ آذر کو دیکھ دیکھ کر جو اس کی آنکھوں میں یاسیت ابھرتی تھی وہ ان سے پوشیدہ نہیں تھی سو وہ جانتے تھا کہ آج کل اس کا دل کس تکلیف سے گزر رہا ہے۔

”لیکن مجھے ابھی جانا ہے تایا ابا! مجھے یہاں وحشت ہوتی ہے۔ مجھے یہاں سے لے چلیے تایا ابا! ورنہ میرا دم گھٹ جائے گا۔ مجھے اماں کے پاس لے چلیے۔“ تایا ابا کے کندھے پر سر رکھ کے وہ سسک پڑی۔

”نہ بیٹا ایسی باتیں نہیں کرتے۔“ تایا ابا کو وہ واقعی بہت پیاری تھی۔ اس لیے اس کا رونا انہیں تکلیف

پہنچا رہا تھا۔

”مجھے پتا ہے تایا ابا! کہ آذر میرا بھائی ہے۔ لیکن اماں بی نے اسے ہم سے چھین کر پھینکی گود میں دے دیا۔ موت کا وقت تو طے ہوتا ہے۔ مگر اماں بی نے تو اس موت کا ذمہ دار بھی میری امی کو ٹھہرا دیا۔ آذر کے لیے اماں کی مامتا کتنا تیز تہی ہے صرف میں جانتی ہوں۔ آنسو ان کے نکلتے ہیں مگر خنجر میرے سینے میں اترتے ہیں۔ کیا ان کا اتنا بھی حق نہیں کہ اسے ایک بار اپنے گلے سے لگا کر بیٹا کہہ سکیں۔“ اس کی آواز پھٹ پڑی۔ آج پہلی بار وہ اپنے تایا ابا کے سامنے کھلی تھی۔ ان کی آنکھوں میں تحیر ٹھہر گیا۔

”میں تمہارے اور بھابھی کے درد سے انجان نہیں مگر جو تم سوچ رہی ہو وہ ممکن نہیں۔ پھر تم نے غور کیا ہے؟ آذر کتنا خوش ہے عشرت اور اسرار کے ساتھ۔ وہ انہیں اپنا ماں باپ سمجھتا ہے۔ ان کے لیے بے حد محبت رکھتا ہے۔ اگر اسے آج اپنی حقیقت کے بارے میں علم ہوا تو کیسی وحشت اترے گی اس کی ذات میں یہ سوچا ہے تم نے آگہی کا تیز و تند طوفان اس کا تمام تر اعتماد چھین کر اس کی شخصیت کو توڑ پھوڑ کے رکھ دے گا۔ اس کی زندگی خراب ہو جائے گی۔ پھر نہ وہ یہاں کا رہے گا نہ وہاں کا۔ کیا تم چاہتی ہو کہ تمہارا بھائی زندگی بھر کے لیے زہرہ درگور ہو جائے۔“

”پھر میں کیا کروں تایا ابا! میں کیا کروں؟ میرا دل چاہتا ہے ابھی اسے سب کچھ بتا کر اماں کے پاس لے جاؤں۔ وہ تو ان زخموں کو شاربہ نہیں کر سکتا۔ جو اس کے نہ ہونے سے اماں کے وجود میں لگے ہیں۔ میں اس بتانا چاہتی ہوں کہ وہ میرا بھائی ہے۔ مجھے اور اماں کو اس کی مضبوط بانہوں کے سہارے کی ضرورت ہے۔ لیکن۔۔۔ اسی لیے تو میں کہہ رہی ہوں مجھے یہاں سے دور لے چلیں تایا ابا! میں اب ایک دن بھی یہاں ٹھہرنا نہیں چاہتی۔“ وہ ہچکیوں سے روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ سالگیر کے دل میں انی سی کھب گئی تھی۔

”اچھا تم فکر مت کرو۔ ہم آج رات ہی چلے جائیں گے۔ تم اب یہ آنسو پونچھ لو۔ تمہارا تایا ابا ابھی

زندہ ہے۔ تم بے سہارا نہیں ہو۔ آئندہ غلطی سے بھی تم خود کو اکیلا مت سمجھنا۔“ تایا ابا اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کے گلوگیر آواز میں بولے اور کمرے سے نکل گئے۔ جانے کی جلدی تو اماں بی کو بھی تھی۔ نمروہ کی رخصتی ہو گئی۔ دوسرا عفر ا کو آذر سے دور رکھنے کے لیے بھی یہ ضروری تھا۔ تایا ابا ٹکٹ لے آئے۔ اسٹیشن پہ انہیں شاہ زیب چھوڑنے آیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اپنی محبت کی قبولیت کے لیے التجائیں رزم تھیں مگر عفر ا نظر انداز کرتی رہی۔ وہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔

اگلی شام گھر پہنچ کر وہ سب سے پہلے آسیہ بانو کے محلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔ اس کے یہ آنسو اور تڑپ کا سبب ان کی سمجھ میں آ رہا تھا مگر انہوں نے کچھ پوچھنے کے بجائے اسے چپکیاں دے کر چپ کروایا کہ بعض باتیں ان کی ہی اچھی ہوتی ہیں۔ اگر انہیں اظہار کی روشنی سے گزارا جائے تو احساسات کی کئی تلخ سچائیاں بر نہ ہو کر ایک دوسرے سے نظر ملانے کے قابل نہیں چھوڑتیں۔



کراچی سے واپس آنے کے بعد عفر ا گم صم رہنے لگی۔ وہاں گزرے ہوئے پل یاد آتے تو بے اختیار دل میں درد کی لہریں دوڑ جاتیں۔ رہ رہ کر اسے آذر یاد آنے لگتا لیکن وہ دانستہ طور پر اسے بھولنے کی کوشش کرتی۔ گھر کا ماحول وہی تھا۔

وہی چیز جزی انیقہ وہی من موجی رائے وہی کاشف اور ناجیہ کی نوک جھونک اور تالی اماں کا جھنجھلا نا۔ البتہ اماں بی کے لیے اس کے احساسات پہلے جیسے نرم نہ رہے تھے۔ وہ ان کے پاس جانے سے احتراز برتی۔ ان کی پھٹکار اور بلا وجہ کی دھونس پہ اس کے ماتھے کے بل گہرے ہو جاتے۔

اب پہلے کی طرح وہ ان کے کام بھی نہ کر کے دیتی۔ اگر وہ آواز بھی دیتیں تو وہ ان سنی کر دیتی۔

”اماں بی کے ساتھ تمہارا رویہ خراب ہوتا جا رہا

ہے۔“ اس دن جب گھر میں کوئی نہیں تھا۔ اماں بی نے اپنے کسی کام سے صحن میں کھڑے ہو کر اسے آواز دی تو وہ ان سنی کر کے دانہ چلتی چڑیوں کو دیکھتی رہی۔

”اماں بی تمہیں بلا رہی ہیں عفر ا! جاؤ! ان سے پوچھو کہ کیا کام ہے۔“ ایک بار پھر آسیہ بانو نے اس کی توجہ اماں بی کی اور مبذول کروانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

”تم ایسی بے حس کیوں ہو گئی ہو؟“ اس بار آسیہ بانو نے سخت آواز میں اس سے استفسار کیا۔

”وہ ہم سے نفرت کرتی ہیں اور نفرت کا جواب نفرت سے ہی دینا چاہیے۔“ وہ مخنی سے کہہ کر کمرے میں چلی گئی۔

عفر ا اب نیچے کا چکر بھی کم ہی لگایا کرتی۔

”زہے نصیب! آج تو بڑے دنوں بعد چاند دکھائی دے رہا ہے۔“ دو تین دن بعد جب وہ نیچے جاتی تو انیقہ ایسے ہی جملوں سے طنز کرتی۔

”کراچی سے آنے کے بعد آپ کا رتبہ بھی کئی درجہ بلند ہو گیا ہے۔“ اس کا واضح اشارہ شاہ زیب کی طرف ہوتا تھا۔

ثروت بیگم نے واپس آنے کے بعد شاہ زیب کا اس پہ غریبہ ہونے کا ذکر کچھ اس طرح پر بھاڑھا کر کیا تھا کہ انیقہ بات بے بات چوٹ کرتے نہ تھکتی۔

وہ ایک حاسد لڑکی تھی۔ معاذ سے اسے محبت نہ تھی۔ بلکہ اس کی ذات میں دلچسپی کی واحد وجہ اس کا مال دار ہونا تھا۔ اب شاہ زیب جیسے دلکشنگ پر سنالشی اور روشن مستقبل رکھنے والے بندے کا اس کی محبت کا دم بھرنا اسے کلسانے لگا تھا۔

ثروت بیگم تو اپنا غم غلط کرنے کی کوشش میں شاہ زیب نامے کو اپنی ہی ایک خاص عادت سے عام کر چکی تھیں لیکن عالمگیر صاحب چونک گئے۔ عفر ا کے لیے شاہ زیب سے بہتر لڑکا اور کہاں مل سکتا تھا۔ ابھی وہ اس بارے میں سوچ بچار ہی کر رہے تھے کہ شاہ زیب کی ای کا فون بھی آگیا۔

”میں عفر ا کو اپنی سوینا چاہتی ہوں۔ یہ صرف شاہ

”اماں بی! مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“ اس رات جب اماں بی عشا کی نماز سے فارغ ہو کر بستر پر آئیں تو عالمگیر صاحب دستک دے کر ان کے کمرے میں چلے آئے۔

”ہاں کہو۔“ انہوں نے عالمگیر کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا تو انہوں نے عفرہ کے رشتے کی بات ان کے گوش گزار کر دی۔ وہ ان سے رائے لینے آئے تھے۔ کیونکہ ان کی منظوری کے بغیر وہ اتنا بڑا فیصلہ نہیں لے سکتے تھے۔ اماں بی نے لحظہ بھر کو سوچا۔ ان کا شاطر ذہن ایک بار پھر نئی سازشوں کے تانے بانے بننے لگا۔

”شاہ زیب بہت اچھا لڑکا ہے۔ تم جلد سے جلد عفرہ کو اس کے ساتھ وداع کر دو۔“ انہوں نے فوراً فیصلہ سنایا تو عالمگیر صاحب کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔

ایک عفرہ ہی تو تھی۔ جس کی وجہ سے اماں بی نے اتنے سال آسیہ بانو کو اس گھر میں برواشت کیا تھا۔ اب جبکہ وہ آذر کو واپس اس گھر میں لے آنا چاہتی تھیں تو عفرہ کی رخصتی سے بہتر اور کوئی راستہ نہیں تھا۔

”عفرہ کو رخصت کر کے اس منحوس کو دھکے مار مار کے گھر سے نکال دوں گی۔“ انتقام کی آگ انہیں کچھ بھی سوچنے کا موقع نہیں دے رہی تھی۔



عفرہ کے لیے شاہ زیب کے پروپوزل کی بات سب گھر والوں پہ مختلف انداز میں اثر انداز ہوئی تھی۔ جہاں عالمگیر اور آسیہ بانو کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا وہیں ثروت بیگم کی ناراضی کی کرنی حد نہیں۔

”آپ نے اوپر ہی اوپر تمام معاملات سیٹ کر دیے اور مجھ سے ایک بار بھی نہیں پوچھا۔ شاہ زیب کے لیے تو میں راستہ کا سوچے بیٹھی تھی۔ مگر آپ کو تو اولاد سے زیادہ ایروں غیروں کی فکر رہتی ہے۔“ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنا غصہ کیسے نکالیں۔

”تمہارے سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔ ان کی طرف سے عفرہ کا نام ہی لیا گیا تھا۔“ وہ اب ثروت بیگم کی ضدوں اور بے وقوفیوں سے عاجز آ گئے تھے۔ وہ منہ

زیب کی ہی خواہش نہیں بلکہ مجھے بھی آپ کی پچی دل سے پسند ہے۔“ انہوں نے اتنے پیار اور خلوص کے ساتھ عفرہ کو مانگا کہ خوشی سے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ جانتے تھے عفرہ نے زندگی میں بہت دکھ سے ہیں۔ اس سادہ فطرت لڑکی کے لیے وہ ایسی ہی پر خلوص سسرال کی خواہش رکھتے تھے۔ ماکہ آنے والی زندگی وہ سکون سے گزار سکے۔

”مجھے بہت خوشی ہوئی کہ آپ کو ہماری بیٹی اتنی پسند آئی۔ شاہ زیب بہت اچھا لڑکا ہے اور میں دل سے چاہتا ہوں کہ یہ رشتہ ہو جائے۔ مزید میں اماں بی سے بات کر کے آپ کو ان شاء اللہ مثبت جواب دوں گا۔“ عالمگیر نے بھاؤ سے جواب دیا۔

”بس آپ کی طرف سے ایک ہاں کی ضرورت ہے۔ ہم تو تمہیں لے کر لاہور آنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔“ وہ خوشی سے بولیں تو عالمگیر کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔



اماں بی جب سے کراچی سے آئی تھیں۔ ان کے اندر ایک جنگ سی چل رہی تھی۔ جو ان پوتے کو دیکھ کر ان کا دل جیسے بغاوت یہ اتر آیا تھا۔ آذر کی صورت میں جہانگیر کا عکس دیکھ کر ان کا دل پل پل ٹڑپ رہا تھا۔ لیکن اب یہ ممکن نہ تھا کہ آذر انہیں واپس مل جائے۔ اسے پال پوس کر عشرت نے بڑا کیا تھا۔ وہ ان کی بیٹیوں کا لاڈلا بھائی تھا۔ انہیں یہ بھی ڈر لاحق تھا کہ حقیقت کا ادراک ہونے کے بعد آذر ان سے نفرت نہ کرنے لگے۔

”نہیں نہیں آذر مجھ سے نفرت نہیں کر سکتا۔ میں نے جو بھی کیا اس کے بھلے کے لیے کیا۔ یہاں ہوتا تو آسیہ کی نحوست اسے بھی نکل جاتی اور نفرت تو وہ آسیہ سے کرے گا۔ جو اس کے باپ کی قاتلہ ہے۔ میں اسے پتاؤں گی کہ یہی وہ عورت ہے جس نے اس کے باپ کو قتل کیا۔“

وہ دل ہی دل میں خود کو تسلی دینے لگیں۔

پھلا کر اندر چلی گئیں اور دیر تک بیڑا تکی رہیں۔ عالمگیر نے بھی منانے کی کوشش نہیں کی۔

شاہ زیب کی والدہ کو فون کرنے سے قبل عالمگیر صاحب نے عفراسے خود جا کر اس کی رضامندی جاننا چاہی۔

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے تایا ابا! آپ نے میرے لیے بہتر ہی سوچا ہو گا۔“ اس کے لیے توانتا ہی کافی تھا کہ وہ اماں بی کے گھر سے اس ماحول سے دور چلی جائے گی۔

کچھ دن بعد ہی اس کا رشتہ پکا ہو گیا اور شادی کی تاریخ بھی طے پا گئی۔

”اس کے تو عیش ہو گئے۔ ملکوں ملکوں گھومے گی اس شاہ زیب کے ساتھ۔“ اندھا جل کر ثروت بیگم سے بولی۔

”اس منحوس کا میرے سامنے نام مت لے۔“ ثروت نے انتہائی حقارت سے کہا۔ ان سے عفراس کی خوشی برداشت نہ ہوئی تھی۔ خصوصاً اس صورت میں کہ اس کی شادی بھی جلدی ہو رہی تھی۔ جبکہ النہقا کے رشتے کو تین سال ہو گئے تھے۔ پھر بھی شادی کی ابھی تک بات نہ چلی تھی۔ جبکہ رائے کے لیے بھی وہ پریشان تھیں۔

ایک طرف ان کی یہ پریشانی تو دوسری طرف اماں بی کی دل ہی دل میں آذر کو واپس بلانے کی تدبیریں۔ وہ دل ہی دل میں تہیہ کر چکی تھیں کہ اس بار جب عشرت کا فون آیا تو وہ اس کے سامنے اپنا مدعا رکھیں گی۔

”عفراتم خوش تو ہونا بیٹا۔“ چارپائی پہ اوندھے منہ لیٹی عفراس کے پاس آکر آسیہ بانو نے پیار سے اس کی پیشانی کو چھوا۔ وہ دیکھ رہی تھیں وہ بھی سمجھتی سی رہتی ہے۔ اپنی شادی کی خبر سن کر بھی اس کے چہرے پر رونق نہ آئی تھی۔

”کیوں امی؟“ وہ سیدھی ہو کر ان کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

”میں دیکھ رہی ہوں تم کچھ دنوں سے سست سست سی دکھائی دے رہی ہو۔ اس رشتے پر اگر تمہیں کوئی

اعتراض ہے تو بتاؤ۔“

”ایسی کوئی بات نہیں جیسا آپ سوچ رہی ہیں۔“ وہ پرسکون آواز میں بولی۔

”پھر کیا بات ہے؟ کیوں اتنی خاموش اور بکھی بکھی رہتی ہو۔“

”آپ کو یہاں اکیلا چھوڑ کر جانے کے لیے میرا دل آمادہ نہیں ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے اماں بی آپ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کریں گی۔“

”یا گل ہو گئی ہو؟ کیسی باتیں کر رہی ہو۔ چلو اماں بی پر تمہیں اعتبار نہیں۔ لیکن اپنے تایا ابا پر تو بے تال۔ تمہیں لگتا ہے کہ وہ میرے ساتھ کوئی نا انصافی ہونے دیں گے؟“ وہ الٹا اسی سے پوچھنے لگیں۔

”لیکن پھر بھی اماں۔“ اس نے کہنا چاہا۔ لیکن آسیہ بانو نے ٹوک دیا۔

”بس اب فالتو باتیں سوچ سوچ کر اپنا دماغ خراب کرنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ سے بہتری کی دعا مانگو۔“

آسیہ بانو نے شفقت سے اسے سمجھایا تو وہ بولنے کے تمام راستے مسدود پا کر چپ ہو گئی۔



”یہ کیا کہہ رہی ہیں اماں بی؟“ اماں بی کی فرمائش سن کر عشرت جہاں کے تو پیروں تلے زمین کھسک گئی۔ ”مجھے میرا پوتا لوٹا دے عشرت! وہ میرے جہانگیر کا بیٹا ہے۔“ اماں بی دھیمی آواز میں رعب کے ساتھ بولیں تو عشرت جہاں کو حقیقتاً بہت غصہ آ گیا۔

”آذر آپ کے جہانگیر کا بیٹا اور آپ کا پوتا ضرور ہے اماں بی! پر اسے ماں بن کر میں پالا ہے۔ اس کی ضرورتوں کا خیال اسرار احمد نے رکھا ہے۔ وہ میرا اور اسرار احمد کا بیٹا بن کر بڑا ہوا ہے۔ میرے کلچے کا ٹکڑا ہے وہ۔ ان تیس سالوں میں تو میں بھول ہی چکی ہوں کہ میں نے اسے آپ سے گود لیا تھا۔ نمرہ اور سدرہ سے بھی زیادہ پیارا ہے ہمیں اور آپ کہہ رہی ہیں میں آپ کو لوٹا دوں۔“ عشرت روہا سی ہو گئیں۔ انہیں

اماں بی کی خود غرضی پہ تاسف ہونے لگا۔

”وہ میری نسل کا وارث ہے۔ میں نے بھی تو دل پہ پتھر رکھ کے آذر کو تمہارے حوالے کیا تھا۔ میں نے بھی تو برداشت کیا تھا۔ تم بھی کرو۔“ اماں بی کی بودی دلیل یہ عشرت کے ہونٹوں پہ طنزیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

”دل پہ پتھر آپ نے نہیں آسیہ نے رکھا تھا اماں بی! آذر اس کی اولاد ہے مگر سلام سے اس عورت کے صبر کو جس نے آج تک اف نہیں کیا۔ تکلیف آپ کو نہیں آسیہ کو ہوئی ہوگی۔ جب آپ نے اس کا بیٹا چھین کر میرے ساتھ سات سمندر پار بھیجا تھا۔ آپ نے تیس سال پہلے بھی ایک ماں سے اس کا بیٹا چھینا تھا اور آج پھر ایک ماں سے اس کے بیٹے کو جدا کرنے کی بات کر رہی ہیں۔ بہت افسوس ہو رہا ہے مجھے اماں بی! اتنی کنھور مت بنیں۔“

شدت جذبات میں ان کی آواز پھٹ پڑی اور وہ یہ بھی بھول گئیں کہ وہ اپنی ماں سے بات کر رہی ہیں۔

”بڑا اچھا صلہ دے رہی ہو ماں کی محبتوں کا۔ آج تمہیں ماں سے زیادہ اپنا اور اس منحوس کا درد یاد آ رہا ہے۔ میرا درد میری تڑپ تمہیں نظر نہیں آ رہی؟“ وہ جارحانہ انداز میں گویا ہوئیں۔

”اماں بی! سمجھنے کی کوشش کریں۔ آذر کوئی دو سال کا بچہ نہیں کہ میں اٹھا کے واپس آپ کی گود میں ڈال دوں۔ ذرا سوچیں اگر میں اسے بتاؤں گی کہ ہم اس کے ماں باپ نہیں تو وہ کتنا ٹوٹ جائے گا۔ اس کی زندگی اس کی شخصیت اور خود اعتمادی سب مٹی میں مل جائے گی۔“

وہ اب کی بار قتل سے سمجھانے لگیں۔ لیکن اماں بی ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ وہ کسی بھی قیمت پہ اپنی بات سے دستبردار نہیں ہونا چاہتی تھیں۔ عشرت جہاں نے عاجز ہو کر یہ کہہ کر فون بند کر دیا کہ انہیں سوچنے کے لیے وقت چاہیے۔



”اب آپ ہی سمجھائیے اماں بی کو بھائی جان! وہ تو

کچھ سننے کو تیار ہی نہیں۔“ جب اماں بی کو منانے کے تمام راستے بند ہو گئے تو عشرت جہاں کو اس اندھیرے میں عالمگیر کا خیال آیا۔

وہ بھی یہ سن کر خائف ہو گئے۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا“ اماں بی کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ ایسا سوچ بھی کیسے سکتی ہیں۔ پہلے انہوں نے آسیہ بانو کی گود اجاڑ کر ان کی زندگی ویران کر دی اور اب تمہاری۔۔۔ نہیں میں انہیں یوں آذر کی زندگی کے ساتھ کھیلنے نہیں دوں گا۔“

”خود آپ سوچیے بھائی جان! اس سے نہ صرف آذر کی بلکہ ہم سب کی زندگیوں پر اثر پڑے گا۔ اماں بی کا ساتھ دیتے ہوئے میں نے ہی نہیں اسرار نے بھی اپنے خاندان والوں سے جھوٹ بولا تھا کہ آذر ہماری اولاد ہے۔ اب جب اس حقیقت کا پردہ چاک ہو گا تو خاندان بھر میں ہماری عزت تو مٹی میں ملے گی ہی۔ ساتھ میں میری بیٹیاں بھی ہم سے متنفر ہو جائیں گی۔ وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کر پائیں گی کہ آذر ان کا رگ بھائی نہیں ہے۔ کچھ سمجھائیں۔ اماں بی کو ہمیں تو اس دن کو پچھتا رہی ہوں۔ جب نمرہ کی شادی یہاں آ کر کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔“

وہ بہت ہی الجھی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ تاہم عالمگیر صاحب نے انہیں دلاسا دیا کہ وہ کچھ سوچتے ہیں۔ لیکن ہر بار کی طرح اس بار بھی اماں بی کے آگے ان کی ایک نہ چلی۔

وہ اپنی بات پہ ایسی مصر رہیں کہ وہ کچھ بول ہی نہ پا رہے تھے اور پھر اماں بی کے آنسو۔۔۔ جو ہمیشہ سے ہی انہیں کمزور بنا دیتے تھے۔

”تم بھی عشرت کی ہی زبان بول رہے ہو۔ آذر میرے جہانگیر کا خون ہے۔ اس پہ میرا حق زیادہ ہے اور مجھ سے میرا حق کوئی نہیں چھین سکتا۔“ عالمگیر صاحب نے اماں بی کو تاسف سے دیکھا۔ انہیں اپنے حق تو یاد تھے۔ پر اس بد نصیب ماں کے نہیں جس نے آذر کو پیدا کیا تھا۔

اس وقت اماں بی کچھ بھی سمجھنے کے قابل نہیں

# Art With You

Paint with Water Color & Oil Colour

First Time in Pakistan  
a Complete Set of 6 Painting  
Books in English



Art With You

کی پانچوں کتابوں پر حیرت انگیز رعایت

Water Colour I & II  
Oil Colour  
Pastel Colour  
Pencil Colour

فی کتاب 150/- روپے

نیا ایڈیشن بذریعہ ڈاک منگوانے پر ڈاک خرچ  
200/- روپے

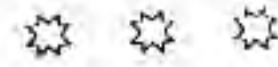


بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

تھیں اس لیے انہوں نے میں سوچا کہ عفر کی شادی  
کے بعد وہ ان سے تفصیل سے بات کریں گے۔



میرا نام آذر اسرار احمد ہے۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ  
میں آذر جہانگیر ہوں۔ لیکن میری مائی یعنی اماں نے  
مجھے اپنی بیٹی عشرت جہاں کے ہاتھوں میں سوپ کر آذر  
جہانگیر سے آذر اسرار احمد بنا دیا۔ ستم ظریفی تو یہ تھی کہ  
مجھے اس حقیقت سے مطلق انجان رکھا گیا اور میں  
ایک طویل عرصے تک اپنی پھیپھوں کو اپنی ماں سمجھتا رہا۔  
اسرار احمد جو کہ میرے پھوپھا لگتے تھے انہیں باپ کا  
درجہ دیا اور اپنی کزنز سرہ اور سدرہ کو سگے بھائیوں کی  
طرح چاہتا رہا۔

میری پرورش امریکا کے خوب صورت شہر نیو یارک  
میں ہوئی۔ مجھے ایسا لگتا تھا میں اپنی آذر اسرار احمد  
سوانح کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوا ہوں۔ اچھا گھر،  
اچھی تعلیم والدین کا لاڈ بہنوں کا پیار نیز ہر وہ آسائش  
جس کی خواہش دنیا میں آنے والے ہر انسان کو ہوتی  
ہے۔ قدرت نے مانگنے سے پہلے ہی میرے آگے ڈھیر  
کر دی تھیں۔ پایا مجھے بزنس لائن میں لانا چاہتے تھے  
اور خود میرا بھی یہی شوق تھا۔ اس لیے میں اس طرف  
چلا گیا۔

میں بچپن سے ہی ایک بات نوٹ کرتا تھا کہ بابا اور  
مما ہم تینوں کو ہی دانستہ پاکستان سے دور رکھنے کی  
کوشش کرتے تھے۔ وہ کبھی بھی ہمیں پاکستان لے کر  
نہیں آئے۔ ہم تینوں بھی ایک دوسرے کی کمپنی میں  
بہت خوش اور زندگیوں میں اتنے مگن تھے کہ کسی نے  
بھی جانے کی ضد نہ پکڑی۔ دوسرا یہ کہ دوھیال سے  
اکثر کسی نہ کسی کا امریکا آنا جانا لگتا تھا۔ چھوٹے تایا،  
وہاب بھائی، جہاں زیب بھائی اور شاہ زیب وہ لوگ تھے  
جو میرے لیے بالکل بھی اجنبی نہیں تھے۔

ان ہی دنوں وہاب بھائی کو میری پیاری بہن نمبر پند  
آگئی تو بڑوں کی مرضی سے انہوں نے کسی بڑی تقریب  
کے اہتمام کا تکلف کیے بغیر ہیروں سے جگمگاتی رنگ

اس کی انگلی میں پسنادی۔ ہم سب بہت خوش تھے کیونکہ نمرہ خوش تھی۔

ہم تینوں کی تربیت جس انداز میں ممالیا پالنے کی تھی اس کے بعد ہم مغرب میں رہنے کے باوجود بھی پوری طرح مشرقیت میں رنگے ہوئے تھے۔ ہمارے پسنادے بول چال بہنوں اور چھوٹوں کے ساتھ اخلاقی رویہ نیز ہر چیز میں ہمارے پاکستان اور پاکستانیت زندہ و جاوید تھی۔ باقی کی کمی اسلامک سینٹر نے پوری کر دی تھی۔ جہاں ہم تینوں باقاعدگی سے جاتے اور اپنے مذہب سے متعلق تعلیم حاصل کرتے۔

ان دنوں میرے ایم بی اے کے لاسٹ سیشن کے پیپر ہونے والے تھے جب مجھے نمرہ کی شادی کی خبر ملی۔ میں بہت خوش تھا اور دکھی بھی۔ خوش اس لیے کہ ایک طویل تاخیر کے بعد بالآخر بڑے تایا نے شادی کا فیصلہ لیا تھا اور دکھی اس لیے کہ اپنے ایگزیزمز کی وجہ سے میں وطن عزیز جا کر اپنی بہن کی شادی میں شرکت نہ کر سکتا تھا۔

میرے نہ جانے کا کوئی افسوس ان کے چہرے نہ دیکھ کر میرا سینہ فخر سے چوڑا ہو گیا کہ میری ماما آج بھی میرے کیریر کے ساتھ پر خلوص ہیں۔ مگر آج ادراک ہو رہا ہے کہ انہیں کوئی افسوس نہ تھا۔ بلکہ وہ خوش تھیں۔

ان سب کو ایرپورٹ پر سی آف کر کے میں گھر واپس آ گیا۔

لیکن میں اس دن جب نمرہ کی مایوں کی رسم تھی۔ میں نے اس سے رات کے بارہ بجے بات کی تو اس نے رو رو کر جس انداز میں مجھ سے وہاں آنے کی التجا کی اس نے میرا سکون و اطمینان مجھ سے چھین لیا۔

نمرہ اور سدرہ میرے لیے کیا تھیں یہ کوئی مجھ سے پوچھتا۔ ان کے ایک اشارے پر اگر مجھے اپنی جان بھی دینی پڑ جاتی تو میں خوشی خوشی اس عمل سے بھی گزر جاتا۔ میں نے نمرہ اور سدرہ کے علاوہ اور کسی کو نہیں بنایا کہ میں پاکستان آ رہا ہوں۔ شاید اسی لیے میرے وہاں

پہنچنے پر سب سے زیادہ دھچکا ماما کو لگا۔ وہ مجھے اپنے سامنے پا کر خوشی کا اظہار کرنے کے بجائے بے ربط سے اعتراض کرنے لگیں۔ وہ سخت گھبرائی ہوئی تھیں۔ لیکن میں انہیں مطمئن کرنے سے پہلے نمرہ کی آنکھوں میں خوشیوں کے رنگ بکھرتے دیکھ رہا تھا۔ میں جب وہاں کھڑا تھا تو میرے سامنے بہت سے چہرے تھے۔ ان میں سے کچھ شناسا تھے اور کچھ بالکل اجنبی۔ ان ہی چہروں کے بیچ ایک چہرہ میری بہن عفرہ کا بھی تھا۔ میری اصل بہن۔ میری سگی بہن۔ لیکن آہ! میری نظریں اسے پہچان ہی نہ سکیں۔ میں بذات خود اپنی ذات کی حقیقت سے انجان تھا۔

وہ تو مجھے کبھی پتا نہ چلا کہ میں کون ہوں؟ اگر اس دن میں نے ماما کو عالمگیر ماموں کے ساتھ فون پر بات کرنے نہ سنا ہوتا۔

آہ! کیسی آگئی تھی جس میں میں جل کر خاک ہو گیا۔

کاش کہ وہ لمحہ میری زندگی میں نہ آتا۔ میں اس بل وہاں موجود نہ ہوتا تو آج میرے اندر آگئی کے یہ طوفان نہ چل رہے ہوتے۔

میری زندگی تلپٹ ہو کر رہ گئی۔ سامانے مجھ سے معافی مانگی کہ انہوں نے اپنی ماں کا ساتھ دے کر میرے اور میری ماں کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ مجھے بے حد شرمندگی ہوئی تھی۔ انہوں نے مجھے بہت پیار دیا تھا مگر میں اپنے اندر ایک تشنگی سی محسوس کر رہا تھا۔ میں نے ان سے اجازت مانگی کہ میں اپنی اصل ماں سے مل لوں اور انہوں نے ہمیشہ کی طرح فرائض کا ثبوت دیا تھا۔



”تم خوش ہونا عفرہ!“ تجلہ عروسی میں داخل ہو کر شاہ زیب نے اپنی نئی نویلی دلہن کی تھوڑی پکڑ کر پوچھا۔ اس نے صرف گردن ہلانے سے اکتفا کیا۔ ”زندگی کا سب سے بڑا دن شادی کی پہلی رات اور دلہن کے چہرے پر اتنی اداسی۔ پوچھ سکتا ہوں کیا وجہ

ہے اس کی؟“ وہ اس کی آنکھوں میں تیرتی نمی کو دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”کچھ نہیں بس اماں کی وجہ سے پریشان ہوں۔“  
ٹپ ٹپ۔۔ نہ چاہتے ہوئے بھی دو آنسو شاہ زیب کے ہاتھ کی پشت پر گر پڑے۔ شاہ زیب نے ان نمکین دو بوندوں کو بڑے غور سے دیکھا۔

”تم بے شک مجھے کچھ نہ بتاؤ۔ لیکن میں جان گیا ہوں کہ تمہاری سنجیدگی اور آنسوؤں کی وجہ کیا ہے۔ آج آذر کا دن آیا تھا۔ اس نے تمہیں ڈھیروں دعائیں دی ہیں۔ اسے سب پتا چل گیا ہے۔ ہم اگلے ہفتے سعودی عرب جائیں گے عمرہ کرنے۔ آذر اپنی بہن اور ماں سے خانہ کعبہ کے سائے میں ملنا چاہتا ہے۔“

شاہ زیب کے الفاظ تھے یا خوشیوں کا سندیس۔ وہ تو سن کر ہی جیسے سکتے میں آگئی۔ شاہ زیب نے اسے قریب کر کے سینے سے لگا لیا۔ اسے لگا جیسے اس نے اپنی دنیا پالی ہو۔

آسیہ بانو کو پتا چلا تو وہ دم بخود رہ گئیں۔

وہ کچھ بھی بڑے عجیب تھے۔ جب ایک ماں کا اپنے بیٹے سے ملن ہوا۔ خانہ کعبہ کے احاطے میں وہ کتنی ہی دیر ماں کو سینے سے لگائے کھڑا رہا۔ آسیہ کو لگا ان کی دھڑکنیں رک گئی ہیں۔ وہ بس اپنے بیٹے کی تیز دھڑکنوں کو سن رہی تھیں۔

”اماں! میں آپ کا بیٹا ہوں؟“ ان کا چہرہ ہاتھوں کے پالے میں لیے وہ بے تابانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ آسیہ بانو سے کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔

ماں اور بیٹے کے اس ملن پر عفر اور شاہ زیب کی آنکھیں بھی چھلک پڑیں۔

آذر کے چہرے میں جمائگیر کا عکس دیکھ کر آسیہ کا دل عجیب انداز میں ڈولا تھا۔

اولاد اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے۔ جوان بیٹے کو ہاتھوں میں سمیٹے جیسے وہ خود کو دنیا کی امیر ترین عورت تصور کر رہی تھیں۔

”میری بہن کیسی ہے؟“ وہ عفر کی طرف مڑا۔

اسے ہاتھوں کے حلقے میں لے کر اتنے پیار سے پوچھا کہ عفر اکا دل بھر آیا۔

”تمہیں دیکھ کر لگتا ہے سب کچھ پالیا۔“ وہ بڑی محبت سے کہہ رہی تھی۔

اسے وہ دن یاد آ گیا۔ جب وہ عمرہ کی شادی میں شرکت کے لیے گئی تھی اور وہاں آذر کو عمرہ اور سدرہ سے پیار کرتا دیکھ کر اس کے دل نے کہا تھا کہ آذر کی بہن ہونے کے ناتے اس کی محبتوں پر صرف اس کا حق ہے۔ آج وہ حق پا کر اس کا دل بہار بہار ہو گیا تھا۔

”بھئی ہم بھی موجود ہیں یہاں۔“ شاہ زیب نے ہنکارا بھر کے کہا تو سب مسکرا دیے۔

”میری بہن کا ہمیشہ خیال رکھنا شاہ زیب!“ وہ اس کے گلے لگتے ہوئے بولا۔

”تم فکر مت کرو۔ جو ہماری ڈیوٹی ہے وہ ہم خوبی نبھائیں گے۔“ شاہ زیب نے اس شرارتی انداز میں کہا کہ عفر کے عارضوں پہ لالی اٹھ آئی۔

”اماں! مجھے پتا ہے ابا کی موت صرف ایک حادثہ تھی لیکن اماں بی کی تو ہم پرستی نے اسے آپ کے لیے سزا بنا دیا۔ آمین اللہ سے اماں بی کے لیے ہدایت مانگیں۔ وہ اپنے در سے کسی کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا۔“ خانہ کعبہ کی طرف رخ کر کے سب نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو سب کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔



”اماں! آپ سے ایک بات کہوں۔“ اس رات جب عفر اور شاہ زیب اپنے کمرے میں چلے گئے تو آسیہ بانو کی گود میں سر رکھے آذر نے بڑے پیار سے اجازت طلب انداز میں پوچھا۔

”ہاں بیٹا ضرور کہو۔“ آسیہ بانو نے فوراً اجازت دی۔

”اماں! میں ممایا کو نہیں چھوڑ سکتا۔ میں ان سے بہت پیار کرتا ہوں۔ وہ بھی میرے بغیر نہیں رہ سکتے۔ میں واپس نیویارک چلا جاؤں گا۔ لیکن میں بہت جلد

آپ کو اپنے پاس بلا لوں گا۔ جب میں سیٹل ہو جاؤں گا تو آپ خود اپنے ہاتھوں سے میری شادی کروائیے گا میرے بچوں کو پالے گا۔ آپ نے میرا بچپن نہیں دکھانا تو جو بھی آپ کے ارمان ہیں وہ میرے بچوں کے ساتھ پورے کیجئے گا۔ اماں آپ کو اعتراض تو نہیں ہے ناں۔ ”وہ اتنے پیار اور خلوص سے کہہ رہا تھا کہ آسیہ کو اس پر فخر محسوس ہونے لگا۔

”مجھے تم سے یہی امید تھی آذر! عشرت نے تمہیں اتنی اچھی تربیت دی ہے۔ اس کا تم پر مجھ سے زیادہ حق ہے۔“ آسیہ بانو نے اس کی پیشانی چوم کر گلے سے لگا لیا۔



اماں بی کو جب یہ خبر ہوئی کہ آسیہ بانو اپنے بیٹے آذر سے ملنے گئی ہیں تو ان کو جیسے چپ سی لگ گئی۔ ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ کسی آذر ان سے ملنے کی خواہش کرے گا۔

عشرت نے فون کر کے ان سے کہا۔

”اماں! ہمارے بچوں کی خوشی میں ہی ہماری خوشیاں پوشیدہ ہیں۔ آذر اگر اپنی ماں سے مل کر خوش ہوتا ہے تو اس کی خوشی میں ہی ہماری خوشی ہے۔ آسیہ نے بہت دکھ سے ہیں اماں بی! ہمیں مزید کسی کی آہ نہیں لینی چاہیے۔ آپ بھی سب بھول جائیں۔ معاف کر دیں آسیہ کو۔“

آج آذر نے مجھ سے بات کی۔ اس نے بتایا کہ آسیہ کو اس پر فخر ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کی اتنی عزت کرتا ہے۔ وہ چاہتی تو آذر کو ورغلا بھی سکتی تھی۔ ہم سے بدلہ لینے کے لیے ہمارے خلاف بھی کر سکتی تھی۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ بہت اچھے دل کی ہے۔ سوچیں اماں بی! وہ آج بھی اتنی عزت کرتی ہے ورنہ ثروت بھابھی بھی تو ہیں۔ ان کے دل میں کیا ہے۔ یہ آپ بھی جانتی ہیں اور میں بھی۔ آسیہ تو پھر بھی نیک ہے۔ بس اب اس کی سزا ختم کر دیں۔ اور اسے گلے

سے لگالیں۔“

عشرت نے بڑے تحمل سے اماں بی کو سمجھایا۔ وہ چپ تھیں۔ کوئی جواب نہ دیا۔ نہ ہی کسی رد عمل کا مظاہرہ کیا۔ ان کی چپ اس بات کا واضح اشارہ تھی کہ

عشرت کی باتیں ان کے دل کو لگی ہیں۔

اس صبح جب آسیہ بانو آذر کے ساتھ واپس آنے والی تھیں تو فجر کی نماز کے وقت اماں بی کا سجدہ طویل ہو گیا تھا۔

خانہ کعبہ میں اماں بی کے لیے مانگی گئی ہدایت قبول ہو گئی تھی۔ وہ روبرو کر اللہ سے معافی مانگ رہی تھیں۔ مگر معاف تو اللہ بھی اس وقت تک نہیں کرتا جب تک بندہ خود اس انسان سے معافی نہ مانگے جس کا دل وہ دکھاتا ہے۔

”مجھے معاف کرو آسیہ! میں نے تمہارا ساتھ بہت برا کیا۔“

آسیہ کو گلے سے لگا کر انہوں نے واقعی صدق دل سے اپنے گناہ کا اعتراف کیا تھا۔

عالمگیر صاحب کے دل میں سکون سا اتر آیا۔ جبکہ آسیہ شرمندہ شرمندہ سی ہو رہی تھیں۔

”ایسا کہہ کر مجھے گناہ گار مت کریں اماں بی! آپ ہماری بڑی ہیں۔ میں کل بھی آپ کی بہت عزت کرتی تھی اور آج بھی میرے دل میں آپ کی عزت کم نہیں ہوئی۔“

وہ ان کے گلے لگ کر زار و قطار رونے لگیں۔ آذر ان دونوں کو چپ کروا رہا تھا۔ جبکہ اپنی ماں کی یہ سرخروئی دیکھ کر غفر اکا دل اپنے رب کے سچے انصاف پر دل کی گہرائیوں سے شکر ادا کر رہا تھا۔



آسانتھ کنول

دستک



کبھی کبھی ایسے لوگ مل جاتے ہیں جو بڑے دوست لگتے ہیں دل چاہتا ہے کہ وہ ساری زندگی کے لیے دوست ہوں یہ خواب بھی روز میرا پیچھا کرتا ہے۔ آج بھی یہ خواب میری آنکھوں میں بسا ہے۔ میں جلدی سے کالم لکھ کر فارغ ہوئی کالم اخبار کے آفس بھیج کر کچھ ہی دیر میں سب کچھ بھول کر گھر کے کام کاج میں مصروف ہو گئی۔

ٹی وی دیکھنے کا موقع ملا تو ایک پروگرام میں ایک صاحب بڑے ہی اسارٹ اور بادقار لگے نہایت مہذب اور شاندار ہیں انہیں دیکھتی ہی رہ گئی ایسے خوب صورت لوگ بھی دنیا میں ہیں جو پہلی ہی نظر میں بھا جاتے ہیں کوئی دوست ہو تو ایسا ہو جس کی دوستی پر فخر محسوس ہونے لگے یوں خواب ایک کہانی کی صورت اختیار کر گئے۔

”الائیے یہ کوٹ مجھے دیجئے۔“

”ہاں یہ لو آج تو بہت تھک گیا ہوں۔ آج کام بھی بہت تھا۔ میں ایک دو گھنٹے کے لیے سونا چاہتا ہوں مجھے کوئی ڈسٹرب نہ کرے کیوں کہ رات کو میں نے کل صبح کے لیے مقدمے کی تیاری کرنی ہے۔ ٹھیک ہے۔“

”آپ کافی پی لیں اور پھر سو جائیں میں فون آف کر دوں گی۔“

”اف کس قدر تھکا دینے والا کام ہے مقدمہ لڑنا کتنی مغز ماری اور کتنی تیاری کرنی پڑتی ہے خیر میں یہ مقدمہ جیت کر رہوں گی۔“

کافی آٹمنی تھی کافی پی کر وہ پرسکون ہو گئے۔

”آپ آرام کیجئے میں کچن میں جا رہی ہوں۔“ کہتی ہوئی وہ کچن کی طرف بڑھ گئیں۔

جمیل خان آج سارا دن کی عدالتی تھکن اتارنا چاہتے تھے دو گھنٹے کا الارم لگایا اور سو گئے بیگم گھر پر کام کاج میں مصروف تھیں انہوں نے شوہر کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ٹھیک دو گھنٹے بعد جمیل خان اٹھ بیٹھے فریش ہوئے فائلیں سنبھالیں اور گھر ہی میں بنائے ہوئے آفس کی طرف چل دے۔

”زارا بیگم کافی کا ایک کپ بھجوادیں پلیز۔“ انہوں

نے نرمی سے کہا۔

”جی اچھا اور ہاں سنبھالے وہ نعمت اللہ خان کا فون آرہا ہے مسلسل ہمیں نے نمبر لے لیا ہے مناسب سمجھیں تو فون کر لیں۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“ وہ کہہ کر بیٹھے ہی تھے کہ فون پھر آگیا۔

”ہاں نعمت اللہ یار کیا بات ہے خیریت تو ہے۔“

”ایک خاص بات کرنی تھی۔“

”ایسی بھی کیا بات تھی کہ تم نے کافی دفعہ فون کیا۔“

”یار بس تم مصروف اتنے زیادہ ہو کہ بار بار کال کرنی پڑتی ہے۔“

”اچھا بتاؤ۔ کیا خاص بات تھی۔“

”تمہاری خیریت دریافت کرنا تھی اور ایک خاص بات تھی۔“

آج ایک مضمون اخبار میں چھپا ہے تمہاری بڑی تعریفیں ہیں اس میں کسی لڑکی نے لکھا ہے میں نے بڑھا تو مجھے یوں لگا جیسے وہ تمہیں پسند کرتی ہے۔ نعمت کا انداز معنی خیز تھا۔

”یار نعمت پسند کی بات کیا کرتے ہو بندے کی اہمیت کام سے ہے میرا کام ہی میری اہمیت کا باعث ہے۔ لوگ بہت محبت کرنے لگے ہیں بہت سے فون کال، اسی میل لٹریز ملتے ہیں کہیں چلا بھی جاؤں تو لوگ ایسے جمع ہو کر تعریفیں کرتے ہیں جیسے میں کوئی اداکار ہوں۔ حالانکہ ہوں تو ایک وکیل بس کوئی اہم مقدمہ آجائے تو لوگ پر جوش ہو جاتے ہیں۔“

”یار یہ ساری باتیں ٹھیک ہیں میں جانتا ہوں مگر یہ ذرا نئی طرز کی تعریف ہے تمہارے کام کو سراہنے والی بھی سراہے جانے کے قابل ہے۔“

”اچھا تو میری طرف سے اس کا شکریہ ادا کرو۔“

”بالکل بھی نہیں۔“ نعمت اللہ مکر گیا۔

”تم خود بات کرو گے۔ نمبر تمہیں میں دے دوں گا۔“

”اچھا یار ٹھیک ہے میں خود شکریہ ادا کروں گا اب

خوش۔“  
”ٹھیک ہے مضمون تمہیں بھجوا رہا ہوں پڑھ لیتا  
ٹھیک ہے۔“

فون رکھ کر جمیل خان اپنے کام میں مصروف ہو  
گئے۔ اس بات کو تقریباً وہ بھول چکے تھے جب ٹی سی  
ایس کے ذریعے ایک لفافہ انہیں موصول ہوا۔ انہوں  
نے لفافہ کھولا تو اس میں اخبار کی کٹنگ تھی وہی  
مضمون جس کا تذکرہ نعمت اللہ نے کیا تھا وہ اپنے  
کمرے میں اطمینان سے بیٹھ کر مضمون پڑھنے لگے۔  
مضمون پڑھتے گئے اور تحریر کے سحر میں ڈوبتے گئے  
عجیب تحریر تھی سا کر لے گئی۔

”آج تک کسی نے اس پہلو سے مجھے دیکھا ہی  
نہیں لوگ کتنی گہری نگاہ رکھتے ہیں۔“ وہ کتنی ہی دیر  
اس تحریر میں کھوئے رہے۔

”واقعی شکریہ ادا کرنا پڑے گا۔“ انہوں نے سوچا  
اور اسی وقت پھر اسی نعمت اللہ کا فون آیا۔  
”جی حضور مضمون یقیناً پڑھ لیا ہو گا اور متاثر بھی  
ہوئے ہوں گے۔“

”مضمون تو واقعی بہت اچھا ہے۔ لکھنے والی نے دل  
کھول کر رکھ دیا ہے۔ تم اس طرح کرو مجھے اس کا فون  
نمبر دے دو میں اس کا شکریہ ادا کروں گا۔“

”جمیل خان صاحب میں نے تو پہلے ہی کہا تھا اور  
نمبر دینے کے لیے ہی فون کیا ہے یہ لیں لکھ لیں۔“  
”بہت تیز جارہے ہو نعمت اللہ۔“

”بس یار تمہاری صحبت کا اثر ہے۔“  
”اچھا۔ اچھا زیادہ اسماٹ بننے کی ضرورت نہیں  
اوکے تم اس نامعلوم حسینہ سے گپ شپ کرو میں بعد  
میں معلومات کر لوں گا اوکے اللہ حافظ۔“

جمیل خان نے نمبر دیکھا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے  
اسٹڈی میں چلے آئے۔

”بیگم ایک کپ چائے بھجوا دیں میں ذرا مصروف  
ہوں۔“

”جی بہتر۔“ انہوں نے وہیں سے جواب دیا فون کی  
نیل مسلسل جا رہی تھی مگر کوئی اٹھا نہیں رہا تھا دوبارہ

کوشش کرنے پر نمبر مل گیا۔  
”ہیلو۔“ مودیانہ اور شیریں سی آواز سنائی دی۔  
”آداب!“

”تسلیم۔“ دوسری طرف سے آواز آئی انداز  
نہایت باادب اور مودیانہ تھا۔

”میں مس مہو سے بات کر سکتا ہوں جو اخبار میں  
مضامین لکھتی ہیں۔“

”جی میں مہر النساء ہی بات کر رہی ہوں آپ کون  
بات کر رہے ہیں۔“

”میں جمیل خان بات کر رہا ہوں۔ بیرسٹر جمیل  
خان۔“

”کیا۔؟ فون اس کے ہاتھ سے چھوٹے ہوئے بچا  
تھا۔“

”آپ نے میرے متعلق مضمون لکھا میں اس کا  
شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا آپ نے بہت اچھا لکھا ہے آپ  
کی تحریر بڑی مضبوط ہے اثر رکھتی ہے۔“

”جی بہت شکریہ میں تو بس یونٹی صفحوں پر قلم  
تھسیٹتی رہتی ہوں۔“

”اچھے اور برے کا فیصلہ ہم تو نہیں کر سکتے مگر کچھ  
اچھا کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا ہمارا حق بنتا  
ہے۔“

”میں نے کوشش کی اور میری کوشش میں ففٹی  
پر سنٹ ہاتھ آپ کی خوب صورت شخصیت کا ہے۔“

باقی ففٹی پر سنٹ آپ کا کام ہے میں نے ایسی کوئی  
خاص محنت نہیں کی۔“ وہ بولتی چلی گئی۔

”بہر حال آپ نے فون کیا۔ میں حیران بھی ہوں  
اور خوش بھی۔“

”حیران کیوں ہیں۔“ جمیل خان نے پوچھا۔  
”مجھے توقع نہیں تھی کہ آپ فون کر سکتے ہیں آپ  
جیسے مصروف لوگ صرف اپنے کام سے محبت رکھتے  
ہیں۔“

”بات تو آپ کی درست ہے مس مہو۔ مگر ہم ایسے  
خشک لوگ بھی نہیں زندگی میں کوئی متاثر کرنے والا  
مل جائے تو اس کی تعریف بھی کرتے ہیں اس شرط پر کہ

”بات تو آپ کی درست ہے مس مہو۔ مگر ہم ایسے  
خشک لوگ بھی نہیں زندگی میں کوئی متاثر کرنے والا  
مل جائے تو اس کی تعریف بھی کرتے ہیں اس شرط پر کہ

وہ برا نہ منا جائے۔" مہو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ہم تو ابھی اس کھٹیجوری میں نہیں آئے کہ متاثر کر سکیں پھر بھی آپ کی تعریف کا شکریہ۔ اوکے، پھر کبھی بات ہوگی اللہ حافظ۔"

"اللہ حافظ۔" مہو ریسور تھامے کتنی ہی دیر فون کے پاس کھڑی رہی۔

"پتا نہیں میں اس جذبے کو کیا نام دوں یہ محبت ہے یا پسندیدگی یا ویسے ہی اس سے متاثر ہوں، مگر کیا کروں اس کا باوقار چہرہ ذہن کی سختی پر نقش ہو گیا ہے۔ بھلائے نہیں بھولتا میں ان حالات کو کیسے قابو کروں میں اس کے لیے جذباتی تحریریں لکھنے لگی ہوں۔ جس سے میرا کبھی کوئی واسطہ نہیں اور واسطہ ہو بھی تو کیا میں اسے حاصل ہی نہیں کر سکتی۔ وہ ایک شادی شدہ اور بچوں کا باپ ہے۔ نہایت وفادار اور حسین بیوی کا شوہر ہے اور کہاں میں سانولی سام جس کا مقدر بھی اندھیروں میں ڈوبا رہتا ہے مقدر بنانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتی ہوں تک دو کرتی ہوں۔ شاید کسی میرے راستے بھی چمک اٹھیں میں بھی خوشبو بھری آزاد ہو اؤں میں سانس لے سکوں۔" کتنی ہی دیر بے دھیانی سے وہ سوچتی رہی۔

"مجھے کیا چاہیے میری خواہش کیا ہے جذبہ کیا ہے طلب کیا ہے ایک شخص جو ساری زندگی قریب رہے وجود کا حصہ رہے یا وہ جو سانس میں خوشبو بن کر مہکتا رہے۔ پروردگار کیسے اپنی دنیا میں مگن اور مست ہو جس کے لیے کوئی طلب اور خواہش نہ ہو اسے حاصل کر لینے کا جنون ہو نہ اس کی طلب ستائے نہ اس کی یاد رلائے لیکن وہ سراسر اپنا ہو مگر کیسے یہ تو عجیب فلسفہ ہے۔"

"میں مہر النساء عرف مہو جو کسی کی ادائے دلبری پر مر مٹی ہوں۔ صرف اتنی سی خواہش رکھتی ہوں کہ کسی کے اپنا ہونے کا یقین باقی زندگی کے لیے کافی ہے۔"

مہر النساء اپنے روم میں آگئی آج وہ بہت تھک گئی

تھی۔ دفتر میں کام ہی بہت تھا اخبار کے دفتر میں ویسے بھی بڑا کام ہوتا ہے اور لکھنے پڑھنے کا کام تو ویسے بھی نری سرکھپائی ہے۔ وہ بستر پر لیٹ گئی۔

"اماں چائے کا ایک کپ ملے گا آج تو کام بہت تھا تھک گئی ہوں۔" وہ لیٹے لیٹے بولی۔

"اچھا بیٹا لاتی ہوں چائے۔ کام بھی تو بہت کرتی ہو نا۔"

"اماں کام نہ کروں تو ہم دونوں کھائیں کہاں سے اب اس بزرگی میں آپ کچھ کرنے سے رہیں اب مجھے ہی تو کچھ کرنا ہے نا۔"

"اچھا بیٹا مگر اب جلدی سو جانا کتابیں پڑھنے میں نہ لگی رہنا۔"

"جی اماں بے فکر ہو کے سوئیں میں بھی اب آرام کروں گی۔"

حکایت فیض کو ہاتھ میں پکڑے وہ چائے کی چسکیاں لینے لگی۔ اچانک اسے پیرسٹر جمیل کا فون یاد آیا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

"کاش یہ شخص مجھے مل جاتا تو زندگی کے رنگ ڈھنگ اور سارے اطوار بدل جاتے پر اس کے لیے مجھے کسی بڑے گھر میں پیدا ہونا پڑتا یہاں اندرون لاہور کے محلوں میں کون آکے پوچھتا ہے کہ تم کون ہو۔"

ان تک تاریک افسردہ اور سال خورہ گلیوں اور عمارتوں سے بھاگ جانے کو دل کرتا ہے کیسی وحشت ہے یہاں سب کچھ آسیب زدہ سا لگتا ہے۔ "اس نے اپنا سو سال پرانا کمرہ دکھا تو لرز کر رہ گئی حالانکہ اس نے اسے ہر ممکن جدید بنانے کی کوشش کی تھی۔ پروے، فرنیچر، کارپٹ، ڈیکوریشن کی چیزیں، مگر پھر بھی بوسیدگی ہر ایک اینٹ سے جھانکتی تھی۔ اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

"ساڑھے دس بجے کس کا فون آگیا۔" اس نے سوچتے ہوئے فون اٹھایا۔

"ہیلو میں بات کر رہا ہوں۔"

"میں کون۔" مہو نے حیرت سے پوچھا حالانکہ آواز سنی سنی ہی لگ رہی تھی۔

”ہیر سٹر جمیل خان۔ میں نے وہ سہر کو بھی فون کیا تھا۔“

”آپ۔“ وہ پھر حیرت زدہ رہ گئی۔

”آپ اس وقت۔“

”ہاں اس وقت میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا۔“

”نہیں۔ نہیں۔“ اس نے جلدی سے کہا۔

”ابھی میں کچھ اہم دستاویزات دیکھ رہا تھا کہ آپ کا مضمون سامنے آگیا دوبارہ پڑھا۔ دل چاہا کہ دوبارہ بات کروں۔“

”بہت شکریہ۔“

”کیا کر رہی تھیں۔“

”میں سارا دن کی سٹھن اتار رہی تھی اور کلیات فیض کا مطالعہ کر رہی تھی۔“

”ہوں شاعری سے بھی دلچسپی ہے۔“

”جی بڑھنے کی حد تک۔“ مہو نے جواب دیا۔

”اور کیا کیا مشاغل ہیں۔“

”اخبار کی نوکری لکھتا پڑھنا گھرواری اور بس۔“

”گھرواری سے مراد شادی شدہ ہیں۔“

”جی نہیں ابھی تک تو یہ خوشگوار حادثہ نہیں ہوا، میرے ساتھ اماں ہیں بابا وفات پا چکے ہیں بس ہم ماں بیٹی ایک دوسرے کے ساتھ خوش ہیں۔“

”کیا مطلب اتنی خوب صورت زندگی ایسے ہی ضائع کیے چلی جا رہی ہیں۔“

”تنگ و تاریک گلیوں میں رہنے والوں کے مقدر بھی ان گلیوں کی مانند ہوتے ہیں جہاں صرف زندگی گزرتی ہے اور کچھ نہیں زندگی سے رنگ اور خوشبو کشید کرنے والے محلوں اور باغات میں رہتے ہیں جہاں چاروں طرف درختوں کی قطاریں اور پھلواوریاں ہوتی ہیں گندی نالیاں نہیں۔“ اس نے تلخی سے کہا۔

”لگتا ہے آپ صرف زندگی کا تاریک پہلو دیکھتی ہیں جمیل گویا ہوئے۔“

حقیقت ہم صرف خواب دیکھتے ہیں اس کی تعبیر تک کبھی نہیں پہنچتے۔“ لہجے میں جیسے کڑواہٹ کھل گئی تھی۔ آنکھوں میں نمی سی اترنے لگی بھیگے ہوئے لہجے کو جمیل خان نے بھی محسوس کیا۔

”آپ اتنا خوب صورت لکھتی ہیں کماتی ہیں تو اب کسی اچھے علاقے میں گھر کیوں نہیں لے لیتیں۔“

”اپنی حفاظت بھی تو کرنی ہے یہاں تو چاروں طرف محافظ نگاہیں بس ذرا سی تکلیف پر ہزاروں ہاتھ آگے بڑھتے ہیں کھلے علاقے میں تو دن و سہارے کسی کی عزت اغوا ہو جاتی ہے کوئی پوچھتا نہیں۔“ وہ تلخی سے بولی۔

”میرا کہنے کا مطلب ہے ہمارے ساتھ کوئی مرد نہیں ہے اس لیے کسی اور جگہ جانے کا رسک نہیں لیتے۔“ اس نے لہجے کو بدلتے کی کوشش کی۔

”ہوں۔“ جمیل خان نے لمبا سانس لیا۔

”آپ شادی کیوں نہیں کر لیتیں۔“

”شادی کر لوں تو اماں کو کون سنبھالے۔ اماں نے تو بہت دفعہ کہا مگر اس عمر میں میں انہیں تنہا نہیں چھوڑ سکتی مجھ سے یہ نہیں ہوتا اور پھر کسی ایسے ویسے بندے کے پلے پڑ جانے سے بہتر ہے کہ اکیلے جی لیا جائے۔“

”اف بھی آپ بہت تلخ باتیں کرتی ہیں۔“

”حقیقت پسند ہوں اور حقیقت نگار ہوں۔“

”جی واقعی میرے بارے میں تو پوری حقیقت بیان کر دی، آپ نے مجھے کہاں آبرو کیا ہو سکتا ہے میں ویسا نہ ہوں جیسا آپ نے لکھا میں اس سے مختلف بھی تو ہو سکتا ہوں۔“

”ہر ایک کا اپنا نقطہ نظر ہوتا ہے۔“ وہ گویا ہوئی۔

”میں نے جس پہلو سے آپ کی شخصیت کو دکھا مجھے وہ اچھی لگی تو میں نے لکھ دیا اس کے علاوہ آپ کیسے ہیں اس سے مجھے کوئی مطلب نہیں آپ کی اپنی شخصیت ہے اپنی زندگی ہے اپنی مصروفیات ہیں فیملی ہے۔“

”مہو میرا فون کرنا آپ کو کیسا لگا۔“ وہ ہنس پڑی۔

”ظاہر ہے اچھا لگا اسی لیے تو اتنی دیر سے باتیں کر رہی ہوں برا لگتا تو اب تک فون بند کر چکی ہوتی۔“  
 ”دلیل میں پھر بھی کبھی بات کرنا چاہوں تو آپ برا تو نہیں منائیں گی۔“  
 ”یہ اس بات پہ منحصر ہے کہ میری زندگی ڈسٹر ب نہ ہو۔“

”کیوں کیا زندگی ڈسٹر ب ہونے کا اندیشہ ہے۔“  
 جمیل خان نے پوچھا۔  
 ”ہونے کو کیا نہیں ہو سکتا میں بہت حقیقت پسند لڑکی ہوں اپنے انجام سے باخبر رہنا چاہتی ہوں۔“  
 ”ایک بات کہوں مس مہو۔“  
 ”جی فرمائیے۔“

”اب اپنی تمام تر تلخیوں اور حقیقتوں کے ساتھ مجھے اچھی لگی ہیں پھر بات ہوگی اللہ حافظ۔“ انہوں نے فون بند کر دیا۔

”یہ کیا کہہ دیا جمیل خان میں یہی تو سننا چاہتی تھی مدتوں سے کوئی تو مجھے میری تاریکیاں سیت پسند کرے، لیکن میں کبھی بھی کسی کو دکھ نہیں دینا چاہتی اور جمیل خان تمہیں تو بالکل بھی نہیں تمہیں شدت سے پسند کرنے کے باوجود میں تمہیں کبھی آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دوں گی۔“

نیند بھاگ چکی تھی کلیات فیض ایک طرف رکھ کر وہ سوچنے لگی ایک ہی شبیہ آنکھ کے پردوں پر رقصاں تھی۔ کیا میری دعائیں قبول ہو گئی ہیں۔  
 وہ جمیل خان کے خیال کو جھٹکتی رہی نجانے کب اسے نیند آگئی۔



”کیا بات ہے تم آج دیر سے اٹھیں۔“  
 ”بس اماں نیند ذرا دیر سے آئی۔“ وہ جلدی جلدی تیار ہوتے ہوئے بولی۔

جمیل خان کی آواز ان کے سوال سارا دن اس کا پیچھا کرتے رہے دفتر میں بھی کھوئی کھوئی رہی۔  
 ”میں کیوں یہ سوچ رہی ہوں۔ اپنی محرومیوں کا

ازالہ میں اس سے کیوں کرنا چاہتی ہوں۔ وہی کیوں کوئی اور کیوں نہیں مگر دل ہے کہ مانتا نہیں اسے کھیلنے کو چاند چاہیے جو دسترس سے کوسوں دور ہے۔ یہ میں کن راہوں پر سرپٹ دوڑ رہی ہوں ان میں سے کوئی راستہ بھی میرے گھر کی طرف نہیں جاتا۔“

دل کو دماغ نے دلیلوں سے قائل کرنا چاہا۔ عقل کو مشورے دیے آنکھوں کا دھیان بنایا پر بات نہیں بنی چاروں طرف جمیل خان رو سنی بن کر پھیلے ہوئے تھے۔ ہر دیوار پر ان کی شبیہ تھی ہر چہرے پر ان کا گمان گزرتا۔ وہ لاچار ہو گئی۔ خود کو سنبھالتے سنبھالتے وہ نڈھال ہو گئی۔ یوں لگا جیسے ساری زندگی گزیر گئی ہو۔ وہ تو صدیوں سے اس صحرا میں پیدل چل رہی تھی آبلہ پا، یہ تصویریں تو ازل سے اس کے ساتھ متحرک تھیں۔ کیا کروں میں ان کے سامنے کمزور نہیں پڑنا چاہتی۔ میں ایک مضبوط لڑکی ہوں یہ سوچ کر وہ ریت کی طرح ڈھے جاتی۔ اپنی ہی منہمی سے وہ ریزہ ریزہ پھسلنے لگتی۔ پھر ان کا ٹون آیا تو کیا کروں گی کیا کہوں گی۔ سارے بھرم کھل جائیں گے ٹوٹ جاؤں گی۔

”مہو تم خود کو کیوں برباد کر رہی ہو تمام کوششوں کے باوجود تم انہیں بھول نہیں پائیں۔ ان کی تصویر ذہن کے پردے سے جھٹک نہیں سکیں تسلیم کر لو کہ تم ان سے محبت کرتی ہو۔“

”نہیں ایسا نہیں ہو سکتا میں اس بات کو نہیں مانتی۔“ وہ خود سے لڑتے لڑتے ہار گئی تھی مگر یہ جنگ ختم ہی نہیں ہوتی تھی۔

وہ پوری توجہ سے اپنا کام کرتی۔ ماں کی خدمت گھر کے کام کاج وہ کسی کام میں فرق نہیں آنے دینا چاہتی تھی مگر دل کی اٹھل پٹھل اپنی جگہ قائم تھی۔

”میں انہیں اچھی لگی ہوں۔“ اس ایک پہلے نے اس کی ساری زندگی کی ریاضت سے وبالا کر دی تھی۔ خود تو وہ غالباً ”بھول بھی چکے تھے کہ بڑے لوگوں کا یہی شیوہ ہوتا ہے۔ اک شکوہ بھی تھا کہ ایک ہفتہ ہو گیا انہوں نے پوچھا تک نہیں ایک جملہ بول کر بھول گئے۔ تمام تر انکار کے باوجود وہ ان کے فون کا انتظار کرتی رہتی

تھی۔ سارا دن خیالوں میں جمیل خان سے نجانے وہ کتنی باتیں کرتی ہر وہ بات جو وہ کرنا چاہتی تھی۔ جو اس کا دل چاہتا تھا۔

بالآخر ان کا فون آہی گیا اور وہ گنگ سی ان کی آواز کے زیر و بم میں کھو گئی۔

”ہیلو مس مہو کیا حال ہے۔“ وہ زیر لب بڑبڑاتی۔

”ساری زندگی میں آگ لگا کر پوچھتے ہو کہ کیا حال ہے۔“

”جی ٹھیک ہوں آپ کئے کیسے ہیں۔ کام کیسا چل رہا ہے۔ ملی سی ہے۔“

”سب اللہ کا شکر میں دراصل ایک ہفتے کے لیے انگلینڈ چلا گیا تھا۔ کل رات واپس آیا ہوں۔“

”اچھا کیسا نور رہا آپ کا۔“

”بہت اچھا مگر اس وفد ایک تبدیلی بھی میرے ساتھ تھی۔“

”وہ کیا۔“ مہو کا دل دھڑکا۔

”آپ کی آواز میرے ساتھ رہی۔“ مہو کانپ کر رہ گئی۔

”یہ تو بہت برا ہوا؟“ وہ چپ سی ہو گئی۔

”کہاں کھو گئیں۔“

”نہیں کچھ نہیں۔“ مہو نے خود کو سنبھالا۔

”بھئی اس دن تو آپ بہت بول رہی تھیں مجھے

آپ کا بولنا اچھا لگا تھا اور آج آپ نے غالباً نہ بولنے کی قسم کھا رکھی ہے۔“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ بمشکل مسکرائی۔

”کوئی خاص بات ہوئی ہے کیا؟“ وہ کرید رہے تھے۔

”میرا فون کرنا برا لگا۔ معذرت چاہتا ہوں میں تو

سوچ رہا تھا کہ آپ نے یقیناً مجھے ناچیز کو یاد کیا ہو گا۔

میں اپنے ہی طور پر خوش فہمی میں مبتلا ہوتا رہا۔“

”دیکھیے جمیل صاحب اب بات نہ بڑھائیں تو

اچھا ہے میں شاید آپ کی توجہ افورڈ نہ کر سکوں۔“ وہ

خچی سے بولی۔

”کیوں آخر کیوں۔“ وہ لڑنے پر اتر آئے۔

”آپ کا کیا خیال ہے کہ میں اتنا فارغ بیٹھا ہوں کہ سب پر اپنی توجہ پھاور کرتا پھروں۔ میں بہت ریزرو قسم کا آدمی ہوں آپ کی گفتگو نے میری سوچ کو نیا رخ دیا اور پھر میں نے تو کچھ طلب بھی نہیں کیا آپ نہایت خود غرض خاتون ہیں مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو سمجھ نہیں پایا، فون کرنے کی معذرت اللہ حافظ۔“ انہوں نے فون رکھ دیا۔ آنسو اس کے اندر باہر کو بھگو رہے تھے۔

”میں اپنی ذات کی تلخیوں میں آپ کو شامل نہیں کر سکتی جمیل آپ کو اپنے ساتھ کانٹوں میں نہیں گھسیٹ سکتی۔ ایک ہستی بستی فیملی کو ڈسٹرب کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔“ کتنی ہی دیر وہ محبت کی مرگ پر آنسو بہاتی رہی۔

اک کک سی دل کو کاٹتی رہی لیکن وہ مطمئن تھی، اسے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ اس نے نئے سرے سے خود کو سنبھالا وہ ان حالات کو ڈھیل دیتی تو بات بڑھ جاتی اور پھر حالات بگڑ جاتے۔ اس نے خود کو مطمئن کیا اور نئے سرے سے اپنے کام میں جت گئی۔

مگر جمیل خان اس رنج سی لڑکی کی کڑوی باتیں بھلا نہیں سکے۔ آفس میں کتنی ہی دیر وہ خالی الذہن بیٹھے رہے۔

”مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں بیٹھے بیٹھائے کدھر کو چل نکلا ہوں کسی تاریک محلے میں رہنے والی ٹل کلاس لڑکی میرے حواسوں پر قابض ہونے لگی ہے اور کیسے اس نے مجھے ٹھکرا دیا ہے اور میں ہوں کہ اسے بھول ہی نہیں پا رہا نہ کبھی اسے ملانے اسے جانتا ہوں نعمت اللہ نے مجھے کس طرف لگا دیا ہے۔“

مرا النساء میں جانتا ہوں تم مجھ سے بچنا چاہتی ہو اور مجھے بھی بچانا چاہتی ہو۔ مگر تمہیں کیا معلوم کہ بات میرے بس سے باہر ہو گئی زندگی میں پہلی دفعہ تو ان جذلوں سے روشناس ہوا ہوں۔ ساری زندگی تو کام کرتے گزر گئی رو میں لائف جذلوں سے غاری لفظوں سے کھلتے حرفوں کا ہنر دکھاتے آواز اور علییت کا جادو جگاتے زندگی گزر گئی کہاں گئی پتا ہی نہیں چلا کوئی

جذبہ نہ خواہش نہ تڑپ نہ کک جیسی زندگی ہونی چاہیے ایک ہی ڈگر پہ چلتی زندگی 'شادی بیوی بچے' گھر نوکری۔

”کہیں انہیں پتہ نہ چل جائے۔“  
”مگر میں ڈرتی کیوں ہوں۔“ اس نے خود کو حوصلہ دیا۔

پر میں کہاں ہوں میرا اپنا آپ کہاں ہے میری ذات کہاں رہی میں تو سب کا ہوں مگر میرا کیا ہے کبھی کسی کو پسند نہیں کیا کبھی کسی سے محبت نہیں کی خود سے الگ ہو کے کبھی سوچا ہی نہیں تو پھر یہ تبدیلی کیوں۔ مہو کی آواز امرت بن کر کیوں میرے وجود میں اتر گئی۔ میرے پاس اتنا کچھ ہے۔ کیا ہے اگر میں مہو کی زندگی کی تاریکیاں دور کر سکتا، مگر اس نے تمام امکانات اور ممکنات کو رو کر دیا ہے۔ کیا کروں اس تھوڑے سے عرصے میں ہی اس سے بات کرنا اچھا لگنے لگا تھا۔

”ہمارے درمیان کون سے عہد و پیمان ہوئے تھے جو ٹوٹ گئے وہ ایک شاندار اور باوقار شخص میں تو ان کی دوستی کے لائق بھی نہیں ایسے خواب سجانے کا فائدہ کیا جن کی کوئی تعبیر ہی نہ ہو۔“ اس نے سر کو جھٹکا اور کام میں مصروف ہو گئی۔ ہلکے سے گلابی رنگ کے کاشن کے سوٹ میں عینک لگائے وہ اپنے لمبے سیاہ بالوں کو کھپ کے اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

مہو کاشن تم سمجھ سکتیں ہیں تمہیں کبھی پریشان نہ کرتا۔ میں تو تمہاری مدد کرنا چاہتا تھا۔ مگر تم نے پہلے ہی قدم پر روک دیا کاشن تم مجھے سمجھ سکتیں۔“ جمیل خان کتنی ہی دیر تصور میں اس کی تصویر بناتے رہے۔ وقت کو گزرتا ہے۔ گزر جاتا ہے۔ مہو کی زندگی میں اس تبدیلی کو آئے چار ماہ ہو گئے تھے اب وہ کافی حد تک سنبھل گئی تھی۔

”میں ان کے سامنے بھی رہوں تو وہ مجھے پہچان نہیں سکتے۔“ وہ دل کڑا کر کے تصاویر بنانے لگی کیمرے کی کلک کے ساتھ ہی اس نے سامنے دیکھا جمیل خان کی نگاہیں اس پر جمی تھیں اس کے اخبار کے نام کا ٹیک گلے میں لٹک رہا تھا وہ تھوڑا سا گھبرائی مگر ہمت کر کے مختلف پوز سے مطلوبہ تصاویر بنانے کے بعد وہ سامنے ہی ایک خالی کرسی پر بیٹھ کر کارروائی نوٹ کرنے لگی تقاریر ہوتی رہیں وہ اپنے چھوٹے سے ٹیپ ریکارڈ میں ریکارڈ بھی کرتی رہی نوٹس بھی لیتی رہی۔

کل ہی اسے اسلام آباد میں ایک سیمینار کا ایڈریس ملا تھا۔ عورتوں کے مسائل پر ایک بین الاقوامی مذاکرہ تھا اسے بھی پروگرام کی کوریج کرنے کی دعوت دی گئی تھی اپنے اخبار کی طرف سے اسے وہاں جانا تھا۔ وہ جانا تو نہیں چاہتی تھی مگر جانا ضروری تھا اماں کے لیے کھانا بنا کر فریج میں رکھا اور ماں کی فکر اور دعا کے سائے میں وہ سفر پر چل پڑی۔

اس کے لمبے بال سب کی توجہ کا مرکز بنے رہے سیمینار کے اختتام پر شاندار ڈنر تھا۔ وہ بیگ سنبھالتی دوسرے لوگوں کے ساتھ ڈائننگ ہال کی طرف چل دی۔

سیمینار میں پورے پاکستان سے سرکردہ خواتین آئی تھیں کئی واقف کار خواتین اور صحافی وہاں موجود تھیں اسٹیج سیکرٹری کی جانب سے بہود خواتین کی وزیر صاحبہ کو صدارت کے لیے بلایا گیا۔ مہمان خصوصی کے لیے جس کا نام پکارا گیا وہ نام سن کر وہ ساکت ہو گئی۔ ہیومن رائٹس کے حوالے سے بیرسٹر جمیل خان کو دعوت دی گئی تھی وہ مہمان خصوصی تھے وہ ہاتھ میں کاپی پٹل اور کیمرو پکڑے ساکت و جاہل بیٹھی تھی۔

پلیٹ میں تھوڑا سا کھانا اور سلاڈ ڈال کر وہ ہال کے ایک کونے میں چلی گئی سب سے الگ تھلگ اچانک کسی نے پیچھے سے پکارا۔

”آداب۔“ اس نے گھبرا کر پیچھے دیکھا جمیل خان اپنی تمام تر وجاہت سمیت کھڑے تھے۔ وہ چپ سی رہ گئی نگاہیں ان کے چہرے پر ٹک ہی نہیں رہی تھیں وہ چہرہ جسے اس نے بونے کی حد تک چاہا تھا اسے قریب سے دیکھنے کی تمنا کی تھی اور اب وہ اس قدر قریب تھا کہ اس کی سانسیں رکنے لگیں۔  
”پالی ڈیٹر مجھے پانی چاہیے۔“  
”لیس مس۔“ ڈیٹر نے کہا۔

”ہم کہیں بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں۔“  
 ”آپ کیا بات کرنا چاہتے ہیں؟“  
 ”یہاں کھڑے کھڑے تو نہیں بتا سکتا۔“  
 ”ابھی کیا مصروفیات ہیں۔“

”ہو مل جاؤں گی جہاں میرا کمرہ بک ہے اور کل واپس لاہور۔“

”چلیں کمرے میں جانے سے پہلے میری طرف سے آپ کے اعزاز میں چائے کا ایک کپ اور کچھ نہیں سنوں گا دس منٹ بعد باہر کے گیٹ پہ آجائے گا۔“ وہ اسے ہدایت دے کر چلے گئے۔

”کیا کروں نہ جاؤں تو نہایت بد اخلاق کہلاؤں گی پہلے ہی وہ مجھے خود غرض کہہ چکے ہیں۔ اچھا چلو دیکھا جائے گا۔ آج سن ہی لوں۔“

وہ ٹھیک دس منٹ بعد باہر گیٹ پر پہنچی تو سیاہ لینڈ کروزر کھڑی تھی دروازہ کھلا اور وہ چپ چاپ بیٹھ گئی۔ ایک دوسرے ہو مل میں ایک کوٹنے کی ٹیبل پر دونوں بیٹھ گئے چائے آگئی تھی۔

”تم مجھ سے اتنا ڈرتی کیوں ہو مجھ سے ڈر کے بھاگتی پھرتی ہو۔ بولو کیوں ڈرتی ہو۔“

”میں آپ سے نہیں اپنے آپ سے ڈرتی ہوں۔ اپنے آپ کو بچانا چاہتی ہوں؟“

”تم نے مجھے بہت غلط سمجھا ہے۔ میں عورتوں کو ایکسپلاٹ کرنے والا مرد نہیں ہوں کیونکہ تم سے پہلے میں نے کبھی کسی عورت کے لیے مختلف احساسات محسوس نہیں کیے۔“

”دیکھیے میں ایک مڈل کلاس لڑکی آپ کی نظر عنایت گئے لائق بھی نہیں میں آپ کی شاندار اور چمکیلی زندگی پر ایک دھبا نہیں بننا چاہتی۔“

”تم ایک بے وقوف لڑکی ہو۔“ وہ آپ سے تم پر اتر آئے وہ سر جھکائے چائے کے کپ سے کھیلتی رہی۔  
 ”کیا تم مجھے ایک بے وقوف یا ایک چغد سمجھتی ہو۔“

”ہرگز نہیں۔“ وہ جلدی سے بولی۔  
 ”یا تم خود کو انسان نہیں سمجھتی ہو مڈل کلاس ہونا

تمہارا جرم تو نہیں اور تمہارا اکیلا ہونا بھی گناہ نہیں تمہارا ایک برائے اور چھوٹے گھر میں رہنا بھی خرابی کی بات نہیں کیا تم کسی احساس کمتری میں مبتلا ہو۔“  
 ”ہرگز نہیں میں اپنے حالات میں خوش ہوں۔“ وہ بولی۔

”تو پھر میری پہلی فون کل پر تم نے اتنے کڑوے جواب کیوں دیے تھے اب تم خوش ہو بولو تمہارے کس جواب کو صحیح سمجھوں۔“

”کسی کو بھی نہیں۔“ وہ بے رخی سے بولی مہو اس سارے معاملے کو یہیں ختم کر دینا چاہتی تھی۔ اچانک ہی بالکل غیر متوقع طور پر جمیل خان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا وہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ کسی مرد کا لمس۔ عجیب احساس اس کے سارے ماسموں سے پسینہ پھوٹ نکلا پیشانی عرق آلود ہو گئی۔

”تم تو کانپ رہی ہو۔“ جمیل نے ہاتھ چھوڑ دیا یہ غیر ارادی طور پر انہوں نے کیا کیا تھا وہ خود بھی نہ سمجھے کہ یہ ان سے کیا ہوا لیکن کچھ ہوا ضرور تھا۔ وہ چپ سے ہو گئے کتنے ہی لمحے غیر محسوس طور پر ان کے درمیان سے سرک گئے۔

”میں جانا چاہتی ہوں۔“ وہ آہستہ سے بولی۔  
 ”ارے“ او میں تمہیں ڈراپ کروں۔“ وہ کسی نا معلوم احساس کے سائے تلے بو جھل قدم اٹھاتے چل پڑے۔

اسے سمجھاتے بہلاتے میں خود ہلک رہا ہوں۔ مہو تو بس بن کر پور پور میں اتر گئی تھی۔  
 ہو مل آگیا تھا وہ اتری۔

”معافی چاہتا ہوں“ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا میں نہیں جانتا یہ کیسے ہوا بس غیر ارادی طور پر آپ کا ہاتھ تھام لیا۔“ مہو نے سر اٹھایا آنسوؤں سے بھری آنکھیں موتی جو پلکوں پر چمک رہے تھے اس سے پہلے کہ سندوری گالوں پر پھسلنے جمیل کے رومال میں منتقل ہو گئے۔

”ریلیکس بے بی آئی لائیک یو بٹ آئی ڈونٹ ڈسٹرب اوکے صبح بات ہوگی گڈ نائٹ۔“ وہ چلے گئے

اس نے مڑ کر دیکھا جمیل خان جا چکے تھے وہ خود کو سنبھالتی ہوئی ہوٹل کے کمرے میں آگئی۔  
”یا خدا کیا کروں یہ تو نے مجھے کس امتحان میں ڈال دیا ہے۔“

وہ اسی ادھیڑ بن میں کتنی ہی دیر خود کو کستی رہی مجھے کیا حق ہے محبت کا وہ بھی ایک ایسے شخص سے جس کا اپنا ایک اسٹیٹس ہے نام اور عزت ہے میں جان بوجھ کر اپنی زندگی برباد کر رہی ہوں۔ مگر میں کیا کروں جس سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہوں اس کا ساتھ بھی چاہتی ہوں کہاں جاؤں کیا کروں، نہیں مجھے انہیں سختی سے منع کرنا پڑے گا۔“ وہ ابھی تک اپنے نازک سے ہاتھ پر اک سردانہ مضبوط ہاتھ کا لیس محسوس کر رہی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر آنسوؤں کو روکتی رہی۔

”میں انہیں کیسے روکوں۔“ وہ سوچتی رہی کہ اچانک فون کی کھنٹی بجی لائی بر جمیل خان تھے۔  
”سو تو نہیں رہی تھیں۔“  
”نہیں نیند نہیں آئی۔“

”میں بھی نہیں سو پایا۔ زندگی میں پہلی دفعہ ان تبدیلیوں نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ نجانے میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے دو سری طرف آپ میری وجہ سے پریشان ہیں، صرف ایک بات بتانا چاہتا ہوں کہ میں آپ کو پوری شدتوں سے چاہنے لگا ہوں۔ آئی لو یو اور یہ مقدر میں ہونا لکھا تھا، نہ میں قصور وار ہوں نہ آپ ہیں آپ خود کو الزام مت دیجیے، میں سچ میں آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا۔ ویسا ہی ہو گا جیسا آپ چاہیں گی۔ یہ بات ضرور ہے کہ میں آپ کو چاہتا رہوں گا ہو سکتا ہے یہ میرا وقتی جنون ہو خیر ان باتوں کو ثابت کرنے کے لیے تو لمحہ ہی کافی ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی دلوں کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے وقت کی ضرورت ہوتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ مجھے وقت کی ضرورت ہے تاکہ میں خود کو محبت کی اس کسوٹی پر پرکھ سکوں میں نے بات کو دکیل سے ثابت کرنا سیکھا ہے اور اس بات کو پہلے اپنے اندر ثابت کرنا چاہتا ہوں تاکہ میرا کہا ہوا ناقابل تردید ہو سکے۔ آئندہ آپ کو شکایت کا موقع

نہیں ملے گا۔“ جمیل خان ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گئے۔ دوسری طرف مکمل خاموشی تھی۔  
”مہمو آپ کچھ نہیں کہیں گی۔“  
”میں کیا کروں سارے فیصلے تو آپ نے خود کر لیے ہیں۔ میرے لیے تو کچھ بچا ہی نہیں۔“ اس کی آواز میں یاسیت تھی۔

”دیکھو مہمو میں چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی کا فیصلہ تم بہت سوچ سمجھ کر کرو تاکہ کل کو پچھتانا نہ پڑے میں خود کو بھی آزماؤں گا کہ کس حد تک مخلص ہوں۔ میں تم جیسی اچھی لڑکی کو دکھ نہیں دینا چاہتا۔ تم اپنے فیصلوں میں آزاد ہو۔ اللہ حافظ۔“

وہ کتنی ہی دیر فون پکڑ کر بیٹھی رہی اک تلخ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھر گئی۔

”واہ بیر مشر صاحب، محبت کا دعوا بھی کیا اور ہاتھ بھی چھڑا لیا۔ چلیے کوئی بات نہیں آپ کی بھی کوئی مجبوری ہوگی اور میں تو یہی چاہتی تھی کسی کا گھر اجاڑ کر اپنی خوشیوں کا محل میں خود نہیں بنا سکتی۔“

وہ سوچتے سوچتے سو گئی مگر یوں جیسے کچھ کھو گیا تھا اپنا آپ گویا کسی کا ہو گیا تھا خالی خالی سی وہ ابھی تیار ہوئی۔ ٹیکسی لے کر بس اسٹینڈ پر آگئی۔

وہ گھر آگئی تھی کچھ نہ کچھ ہوا ضرور تھا مہمو کی آنکھوں میں اک سنجیدگی اتر آئی تھی چہرے پہ میانت ٹھہر گئی۔ تمہاروں کی جگہ اک نامعلوم سی مسکان تھی جو بھد کو شش بکھرتی تھی۔ سب نے اس تبدیلی کو محسوس کیا سارے آفس میں اس کے متعلق چہ میگوئیاں ہوتیں ضرور مگر سب اس کی عزت کرتے تھے یوں کوئی کھل کر پوچھتا بھی نہیں تھا۔ مہمو نے اور لگن سے کام پر توجہ دینی شروع کر دی، افسران خوش تھے مگر مہمو خوشی کو کہیں رکھ کر بھول گئی تھی جمیل خان کا چہرہ اکثر اسے پریشان کرتا تو وہ اور کام میں مگن ہو جاتی اور تندہی سے اپنے فرائض سرانجام دیتی۔

بوڑھی ماں سارا دن بیٹی کی فکر میں گھلتی رہتی میرے بعد اس کا کیا بنے گا۔ یہی بات دل کا روک بن گئی تھی۔ بیٹی ماں کی خاطر شادی نہ کرتی تھی اور ماں

بیٹی کی گھلتی جوانی دیکھ دیکھ کر گھلتی جا رہی تھی اپنی جگہ  
دونوں ہی سکھی نہ تھیں۔  
اسلام آباد سے واپسی کو دو ماہ گزر گئے تھے اماں نے  
ایک دن بات چھیڑ دی۔  
”بیٹا تو شادی کر لے تاکہ میں سکون سے ابدی نیند  
سو سکوں۔“

”ماں میں تمہیں کس کے سہارے چھوڑ دوں  
شادی کر لی تو تم اکیلی رہ جاؤ گی۔“  
”تو میری فکر نہ کر۔“ اماں جلدی سے بولیں۔  
”اماں تم میری فکر نہ کرو قسمت میں ہو گی تو ہو  
جائے گی شادی کی مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔“ اور  
اماں چپ ہو گئیں۔ اس سے بحث کرنا فضول تھا۔  
”خدا کرے اسے کوئی ایسا شخص مل جائے جو  
ساری زندگی اس کی قدر کرے محبت کرے۔“ وہ اسے  
دعائیں دیتیں۔

وہ اچانک شدید بیمار ہو گئیں مہو نے چٹھی لے لی  
تھی ہسپتال میں وہ ماں کے ساتھ تھی دو دن بھی نہ  
گزرے کہ ماں اکیلا چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلی گئیں،  
مہو بے شک بہت بہادر لڑکی تھی پر یکدم اس حادثے  
نے اسے توڑ پھوڑ دیا۔ ماں کا بوڑھا وجود کتنا بڑا سہارا  
تھا۔ اب یکدم وہ خالی گھر کاٹنے کو دوڑتا۔ سارا محلہ  
تسلی دینے آیا اس بڑوس کی عورتیں سارا دن پاس  
رہتیں پر ماں تو ماں تھی اس کے دکھ سکھ کی ساٹھی،  
آنکھوں سے آنسو خشک ہو گئے تھے۔ زندگی کتنی بے  
دفا ہے۔ اسے جمیل خان بہت یاد آئے دو حرف تسلی  
کے کہہ دیتے شاید میری تنہائی کی اذیت کچھ کم ہو  
جاتی۔ رات کاٹنے کو دوڑتی۔ دن کا چین رخصت ہو گیا  
تھا کچھ ہی دنوں میں وہ آفس جانے لگی۔ سب لوگ  
اسے تسلی دیتے مدد کا یقین دلاتے پر وہ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر  
گئی تھی۔

ایک دن باس نے مہو کو اپنے آفس بلا لیا۔

”جی سر۔“ وہ اندر آئی۔

”بیٹھے مس مہر النساء میں آج آپ سے کچھ خاص  
بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”جی سر۔“

”دیکھیے آپ کی والدہ کا سہارا تو اٹھ گیا اب آپ  
بالکل اکیلی ہیں اور آپ جانتی ہیں کہ ہمارے معاشرے  
میں اکیلی جوان عورت کا زندگی گزارنا کتنا مشکل  
ہے۔“

”جی سر۔“ وہ سر جھکائے ناخن سے میز کریدتی  
رہی۔ آنسو پلکوں پر جھلملا رہے تھے۔  
”میں دراصل آپ کی اس مشکل کو حل کرنا چاہتا  
تھا آپ مجھے اپنا بزرگ ہی سمجھ لیجیے۔“  
”جی سر۔“ آنسو پلکوں کا بند توڑ کر بہہ نکلے۔  
”میں ایک رشتے سے متعلق بات کرنا چاہتا تھا بے  
شک آپ کی والدہ کی وفات کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا مگر  
آپ کا اکیلا پن بھی مناسب نہیں۔“  
”جی سر آپ کہئے۔“

”میرے جاننے والے ہیں غوری صاحب ان کا  
بھانجا ہے بہت پرہیزگار اور قابل انسان ہے۔ میں اسی  
اخبار میں اسے جاب دے رہا ہوں آپ اس سے مل  
لیں بات کر لیں پسند آئے تو مجھے بتا دیں باقی میرا کام  
ہے۔“

”جی بہتر۔“ وہ فرماں برداری سے جی کہہ کر اٹھ  
گئی۔

”پریشان نہیں ہونا میں ہوں نا۔“

”جی سر۔“ وہ آنسو صاف کرتی اپنے آفس میں آ  
گئی۔

”جمیل خان کاش تم میرا سہارا بن کر آجاتے مگر تم  
نے محبت کے دعوے کے باوجود پلٹ کر خبر بھی نہیں لی  
اور پھر تم اپنی دنیا میں مست ہو تم میرے لیے کربھی کیا  
سکتے تھے۔ میں تو ہمیشہ سے بد نصیب ہوں۔“

اگلے ہی دن وہ نعمان ظفر سے ملی تھی لمبا چوڑا  
خوب صورت وجیہ آدمی، بظاہر اس میں کوئی خرابی  
نہیں تھی باس کو اس نے اثبات میں جواب دے دیا۔  
ایک ہی ہفتے میں وہ سادگی سے مسز نعمان ظفر بن گئی۔  
نعمان کو کراچی برانچ میں ایڈیٹر انچارج بنا کر بھیج دیا گیا۔  
یوں مہر النساء نئی دنیا آباد کرنے کراچی چلی آئی لاہور کی

ساری یادیں وہ لاہور میں ہی دفن کر آئی تھی۔ اب وہاں رکھا ہی کیا تھا۔

چودھری حمید اللہ صاحب کا یہ احسان کیا کم تھا کہ انہوں نے ایک اکیلی بے سہارا لڑکی کو اپنی عافیت میں لے کر اس کا گھر بسا دیا تھا اور نعمان بے حد اچھا شوہر ثابت ہو رہا تھا وہ مہر النساء کے سارے جذبات و احساسات کا خیال رکھتا تھا مہو نعمان کی خوب صورت رفاقت میں جمیل خان کو بھولنے لگی جمیل خان جو اس کی پہلی محبت تھے اور جنہیں بھلا نا اتنا آسان نہ تھا وہ گھر بنا کے انہیں بھولنے لگی بھی ماں کی جدائی کا زخم بھی بھرنے لگا۔

جہ عینے یوں گزرے جیسے وہ ہوا پہ پاؤں رکھ کر گزرتی رہی تھی نعمان کی قربت اسے بے حد اس آئی صحت بھی ملنے لگی تھی وہ گئی تھی وہ نعمان کا بے حد خیال رکھتی لیکن اچانک بد قسمتی کہیں سے نکل کر اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔ نعمان کو اچانک اخباری کام کے سلسلے میں شہر سے دور جانا پڑا۔ واپسی پر شدید قسم کے حادثے نے نعمان کے ساتھ پانچ اور لوگوں کی جان بھی لے لی۔

اتنی بھیانک خبر اس نے کیسے سنی کتنے ہی دن وہ ہسپتال میں داخل رہی۔ اس حادثے نے اس کا بچہ دنیا میں آنے سے پہلے ہی اس سے چھین لیا۔ حادثوں نے اسے پاگل کر کے رکھ دیا۔ ساری دنیا تاریک ہو گئی تھی کہیں روشنی نظر نہیں آتی تھی۔

میں کس لیے زندہ ہوں۔ مریکوں نہیں گئی۔ جدائیاں اور صدمے حادثے میری ہی زندگی میں آنے لگے۔ ہسپتال کے کمرے میں لیٹی وہ چھت کو گھورتی رہتی۔ چودھری حمید اللہ اور غوری صاحب نے اس کو ہر ممکن تسلی دی مگر وقتی تسلیاں اس کے اتنے گہرے زخم کیسے بھرتیں۔

ڈاکٹر ز اور نرسوں نے بڑی کوشش سے اسے زندگی گزارنے کے قابل کیا، خالی گھر خالی دیواریں اسے کاٹنے کو دوڑتیں۔ نعمان کی رفاقتیں اسے رہ رہ کر یاد آتیں اپنی خالی کوکھ کو دیکھ کر وہ دکھی ہوتی نعمان کی نشانی

بھی زندہ نہ رہی میری بد قسمتی نعمان کو کھا گئی۔ سوچوں کے بھیانک چہرے اسے ڈراتے رہتے۔

ایک دن حمید اللہ صاحب کا فون آیا انہوں نے عورتوں کی ایک این جی او میں اسے کام پر لگا دیا تھا عورتوں کے لیے کام کرنے والی اس تنظیم میں عورتوں کو مختلف کام کرتے دیکھ کر وہ ذہنی طور پر مصروف ہونے لگی این جی او کے آفس میں ہی اسے ایک کمرہ رہائش کے لیے دے دیا گیا۔ کام بھی مہر النساء کی پسند کا تھا اسے عورتوں کے لیے ایک ماہنامہ ”بے داری“ کے نام سے نکالنے کی ذمہ داری دی گئی۔ وہ سارا وقت مصروف رہتی۔ یوں وقت کا پہرہ ایک دفعہ پھر چل پڑا۔ وہ اپنا کام بڑی دلچسپی سے کرتی سب لوگ اس سے خوش تھے چودھری حمید اللہ صاحب نے اس کا ہر ساتھ دیا اسے دوبارہ زندگی میں داخل کرنے میں ان ہی کا ہاتھ تھا وہ اسے زمانے کی اونچ نیچ سمجھاتے رہتے تھے۔

وہ ان کی بڑی قابل ور کر رہی تھی جسے وہ بیٹیوں کی طرح چاہتے تھے اس اثناء میں وہ جمیل خان کو بالکل بھول چکی تھی اب یاد کرنے کے لیے اس کے پاس بہت کچھ تھا ایسے میں کبھی کبھار اک شہناشا چہرہ اپنی جھلک دکھلا کر غائب ہو جاتا اک کسک سی دل میں اٹھتی مگر وہ یہ سوچ کر چپ ہو جاتی اچھا ہے میری بد قسمتی ان کے راستے میں نہیں آئی۔ اپنے ہی اندر رہا ہر آدمی کے سمندر میں ڈوبتی ابھرتی وہ زندگی کے دن پورے کرنے لگی اب زندگی میں رکھا ہی کیا تھا۔

اس این جی او میں آئے اسے ایک سال ہو گیا تھا عورتوں کے رسالے بے داری کی سالگرہ کی تقریب تھی اور یہ تقریب ادارے کے ہیڈ آفس اسلام آباد میں ہونی تھی۔ اسلام آباد سے کتنی یادیں وابستہ تھیں ایک چہرہ جو کبھی نہ کبھی سامنے آ جاتا اور وہ بے دردی سے اسے بھولنے لگتی۔

این جی او کے تمام ممبرز کے ساتھ وہ اسلام آباد آ گئی۔ اگلے دن شام کو چار بجے ایک بڑے ہوٹل میں تقریب تھی۔ اسے بھی اسٹیج پر آکر گفتگو کرنا تھی۔ گلابی بارڈر والی سیاہ ساڑھی پہنے میک اپ سے بے نیاز

چہرہ نہایت لمبے بالوں کی اس نے چوٹی بنا رکھی تھی۔  
سیاہ آنکھوں میں سوگواری اور سنجیدگی رچی بسی تھی  
چہرے پر بے حد متانت انداز میں ٹھہراؤ کم گوئی اور کچھ  
سوچتے رہنا اس کی زندگی کا خاصہ بن گیا تھا اس کا نام  
پکارا گیا تھا وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اسٹیج کی طرف آ  
رہی تھی اسٹیج پکڑی اس کے بارے میں تعریفی  
کلمات کہہ رہی تھی اچانک ہی وہ رک گئی بالکل سامنے  
جمیل خان کھڑے تھے بالکل غیر یقینی صورت حال تھی  
جمیل خان کے ساتھ ان کی بیگم بھی تھیں جو غالباً  
نشست سنبھال چکی تھیں چند ثانیہ اسی طرح گزر  
گئے۔ وہ بغیر کچھ کہے اسٹیج کی طرف چل پڑی۔

مائیک کے سامنے کھڑی ہوئی تو غیر ارادی طور پر اس  
کی نظریں جمیل خان کو ڈھونڈنے لگیں وہ وہیں کھڑے  
تھے حیران مہنگ مائیک پر اس کی آواز ابھرنے لگی۔  
جس میں واضح ارتعاش تھا کچھ زیادہ نہ کہہ سکی۔  
اس کا اعتماد بکھر رہا تھا زخم ہرے ہو رہے تھے اس سے  
پہلے کہ خود اعتمادی کا بھرم کھتا وہ جلدی سے اسٹیج سے  
نیچے چلی گئی۔ این جی او کی ڈائریکٹر بیگم فرحت نواز آگے  
برہمیں۔

”مہو تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔ تم روم میں  
چلی جاؤ میں سنبھال لوں گی۔“ انہوں نے مہر النساء کو  
تسلی دی۔ وہ خود کو سنبھالتی منظر سے غائب ہو گئی۔ پر  
جمیل خان کی نظروں سے نہیں چھپ سکی۔ بیگم جمیل  
دوسری خواتین سے باتوں میں مصروف تھیں۔ جمیل  
خان چپکے سے اٹھے اور بیگم فرحت نواز کے پاس آکر  
بیٹھ گئے۔

”جمیل خان صاحب پروگرام کیسا لگا۔“

”بہت اچھا ہے میں محترمہ مہر النساء کے بارے  
میں جانتا چاہتا ہوں وہ گفتگو کرتے کرتے اچانک چلی  
گئیں کسی مدد کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔“  
”بہت شکریہ میرا صاحب آپ جو ہماری قانونی  
امداد کرتے ہیں وہی بہت کافی ہے ہمارے لیے ہم  
بڑے احسان مند ہیں دراصل مہر النساء بڑی ہی دھمی  
خاتون ہیں۔ بے چاری، پچھلے ڈیڑھ دو سالوں میں

پیارے بچوں کے لئے

## قصص الانبیاء



تمام انبیاء علیہ السلام کے بارے میں مشتمل  
ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے آپ  
اپنے بچوں کو پڑھانا چاہیں گے۔

قیمت - 300/- روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے پر ڈاک خرچ - 50/- روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

انہوں نے بہت بھیاںک صدقات سے ہیں۔ بڑی مشکل سے سنبھلی ہیں اور انہیں سنبھالنے میں ان کے اخبار کے مالک چودھری حمید اللہ صاحب نے بڑی مدد کی ہے ورنہ یہ تو شاید مر ہی جاتیں۔ ”جیل خان حیرت زدہ سے یہ سب کچھ سن رہے تھے۔“  
”ہوا کیا تھا مجھے تفصیل سے بتائیے۔“ انہوں نے پوچھا۔

”پہلے ان کی والدہ وفات پا گئیں۔ یہ دنیا میں بالکل اکیلی رہ گئیں تو چودھری حمید اللہ صاحب نے انہیں سنبھال کر اپنے ایک اچھے جاننے والے صاحب کے بھانجے سے ان کی شادی کرادی شادی کے بعد یہ کراچی آ گئیں۔ ان کے شریک حیات بہت عمدہ شخص تھے۔ انہوں نے ان کی ساری محرومیوں کو ختم کر دیا تھا پھر اک دن ایک اور حادثہ ہوا ان کے شوہر ایک بس حادثے میں ہلاک ہو گئے یہ ان دنوں شوہر کے حادثے کی خبر نے انہیں ایسا شاک دیا کہ ان کا بے چارے بھی نہیں بچ سکا بڑی مشکل سے بچایا گیا یہ تقریباً ایک مہینہ ہسپتال میں رہیں۔ نفسیاتی مریض بن گئی تھیں۔ ہر حال ڈاکٹروں کی دن رات کی محنت انہیں زندگی کی طرف واپس لائی۔ ان کو سمجھانے اور سنبھالنے میں چودھری حمید اللہ صاحب کا بڑا ہاتھ ہے وہ انہیں بیٹیوں کی طرح چاہتے ہیں۔ کچھ سنبھالنے پر انہیں پھر مصروف کرنے کے لیے ہماری این جی او کو درخواست کی کہ انہیں ایڈجسٹ کیا جائے ہم سب نے انہیں زندگی سے پیار کرنا سکھایا اب آہستہ آہستہ انہوں نے سارا کلم سنبھال لیا ہے۔ ہمارے پرچے کے لیے انہوں نے بڑا کام کیا ہے۔ بہت دیکھی ہیں بڑی چپ سی ہو گئی ہیں بس کام سے کام رکھتی ہیں۔ ہم انہیں زیادہ ڈسٹرب نہیں کرتے کہ وہ ڈیپریشن کا شکار نہ ہو جائیں باقی کام کے معاملے میں وہ رلیکٹ ہیں۔“ جیل خان گنگ بیٹھے تھے۔ ”ہستی کھیلی زندگی سے بھرپور لڑکی اتنے تھوڑے سے عرصے میں کہاں سے کہاں جا چکی اور میں نے اس سے محبت کا دعوا کرنے کے باوجود ایسی کوئی

خبری نہیں رکھی اپنی ہی دنیا میں مست اور مشغول رہا۔ کبھی بھول کر بھی اسے یاد نہ کیا یہ کیسی بے حسی ہے۔“ جیل خان اتنے شرمندہ تھے کہ خود سے نظریں نہ ملا پارہے تھے ضمیر انہیں ملامت کر رہا تھا۔

”مجھے معاف کر دینا مہو میں تمہارا گناہ گار ہوں میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے راستے کا ایک ایک کانچا چن لوں گا۔“ وہ کتنی ہی دیر خود سے وعدے کرتے رہے پروگرام ختم ہو گیا تھا لوگ واپس جا رہے تھے آنکھوں میں تانف لیے وہ بھی واپس چل پڑے سارے راستے وہ خاموش رہے۔ عجیب سی اداسی نے انہیں گھیر رکھا تھا۔

”کیا بات ہے خان صاحب آپ پروگرام کے بعد سے بڑے چپ اور اداس ہیں کوئی خاص بات۔“ گھر آ کر بیگم نے پوچھا۔

”مہو خاص۔ خاص تو ہے تم سنو گی۔“

”خاص ہے تو پھر ضرور سنوں گی۔“

اور یوں جیل خان نے مہو کے ٹیلی فون سے لے کر اب تک کی ساری کہانی بیگم کو سنا دی وہ بالکل سن بیٹھی اس حقیقی کہانی کو سنتی رہی تھیں۔  
”اب تم بتاؤ کہ میں اس دیکھی لڑکی کے لیے کیا کروں؟“

”آپ اب بھی اسے چاہتے ہیں۔“ بیگم جیل نے پوچھا۔

”میں سے محبت یا چاہتا نہیں کہتے کیونکہ اگر مجھے اس سے محبت ہوتی تو میں اس کی خبر نہ لیتا لیکن اب اس کی داستان سن کر واقعی دیکھی ہوا ہوں اور میں اس کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔“

”مثلاً کیا۔“ بیگم نے پوچھا۔

”تم بتاؤ میں کیا کروں۔ وہ اتنی دیکھی ہے کہ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ اس کے لیے کیا کروں۔“

”آپ اس سے شادی کر لیں۔“ بیگم جیل نے اچانک ٹھہرے پانی میں پتھر پھینک دیا اک پچھل سی برپا ہوئی۔

”یہ تم کہہ رہی ہو زارا بیگم جانتی ہو کیا کہہ رہی ہو“  
 ”اچھی طرح جانتی ہوں اور اس سے بہتر مدد اور  
 کوئی ہو نہیں سکتی اسے آپ جیسے کسی شخص کے  
 سارے کی ضرورت ہے۔“

”تم نے بڑی آسانی سے اتنی بڑی بات کہہ دی۔  
 اس کے اثرات کے بارے میں بھی سوچو۔ بچے  
 جوان ہیں رشتہ داریاں ہیں تمہارا مستقبل ہے۔  
 مسائل بڑھ جائیں گے۔“

”دیکھیے جمیل اگر آپ صدق دل سے اس کی مدد  
 کرنا چاہتے ہیں تو آپ کی دوسری شادی میرے لیے  
 کوئی مسئلہ نہیں میں سب کی سب کو صرف اتنا  
 کہیں گے گا کہ ہمارا حق ہمیں ملتا ہے باقی اللہ آپ کو اس  
 نیکی کی جزا دے آپ سوچیں میں جائے بنا کر لاتی  
 ہوں۔“

”چلو مان لیا کہ ہم اسے اپنا فیملی ممبر بنا لیتے ہیں پر  
 اگر وہ راضی نہ ہوئی تو۔“

”یہ کام میں کر لوں گی اس لیے کہ میں آپ کو دکھی  
 اداس اور پریشان نہیں دیکھ سکتی۔“ وہ چلی گئیں۔  
 ”یہ عورت بھی عجیب چیز ہوتی ہے۔ کبھی سمجھ میں  
 نہ آنے والی ایک اس لیے آگے نہ بڑھی کہ میری  
 زندگی ڈسٹرب ہوگی اور دوسری اسے میری زندگی میں  
 لانا چاہتی ہے تاکہ میں پریشان نہ رہوں۔ اے عورت  
 تیرے ہزار روپ اور ہر روپ انوکھا، مہو۔ مجھے  
 معاف کر دینا۔ میں تمہارا مجرم ہوں۔ اب مجھ پر  
 انکشاف ہوا ہے کہ میں تم سے بے پناہ محبت کرتا ہوں  
 اور تم میری زندگی کا حصہ ہو۔“

”مہم سات دن جاری رہی۔ بیگم فرحت نواز پیش  
 پیش تھیں بیگم جمیل خان خود مہو سے ملیں مہو نے  
 سختی سے انکار کر دیا تھا میں اپنی بد نصیبی کے سائے  
 کسی ہنستے بستے گھر پر نہیں ڈال سکتی۔“

”مہو تم غلط مت سمجھو میں خود تمہیں دلہن بناؤں  
 گی۔ جمیل خان تمہیں تمام حقوق دیں گے۔ میں اس  
 کا وعدہ کرتی ہوں۔“

”مہو منکر تھی مگر جمیل خان خود اس سے ملے  
 وہ تھوڑا سا گھبرائی تو بھی پھر سنبھل گئی۔“

”مہو مجھ پر شک مت کرو۔ میں تمہارے سارے  
 دکھ لے لینا چاہتا ہوں۔ مجھ پر اعتبار کرو۔“ مہو نے  
 آنکھیں اٹھا کر جمیل خان کو دیکھا وہ اپنی شرمیلی آنکھوں  
 میں امید کے سارے دے روشن کیے بیٹھے تھے۔  
 ”آپ کو دینے کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہیں  
 جمیل خان۔“

”تم ہونا بس مجھے صرف میری مہو چاہیے۔ زندگی  
 سے بھرپور ہنسی کھیلتی مہو۔“ انہوں نے اس کے  
 کانٹے کنزور ہاتھ تھام لیے۔

”مہو میری طرف دیکھو۔“ اس نے بمشکل پلکیں  
 اٹھائیں آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھری تھیں۔  
 ”تو تو یہ آنسو اب کبھی نہیں بہیں گے تم ضرورت  
 سے زیادہ آنسو بہا چکی ہو۔“ سارے آنسو جمیل کے  
 روال میں منتقل ہو گئے۔ مہو کو یقین آ گیا تھا۔ وہ  
 قدرت کے ان فیصلوں پر حیران تھی آگ کی بھٹی میں  
 سے گزار کر وہ اسے گلزار میں لے آیا تھا مہو نے  
 آنکھیں بند کر لیں اور اپنا سر جمیل خان کے بازو پر رکھ  
 دیا۔ صدیوں کی مسافت کے بعد اسے آسودگی نصیب  
 ہوئی تھی۔



شازیہ چوہدری

قیمت - 300 روپے

فون نمبر:  
32735021

مکتبہ عمران ڈائجسٹ  
37، اردو بازار، کراچی

# شُعاعِ عَمیر

## کرنی کے لئے

### فرمان الہی

”بے شک جو لوگ اللہ کی کتاب پڑھتے ہیں اور انہوں نے نماز قائم کی اور جو کچھ ہم نے دیا اس میں سے پوشیدہ اور ظاہر خرچ کرتے رہے۔ ایسی تجارت کی امید رکھتے ہیں جو کبھی ہر باد نہ ہوگی۔ مگر وہ ان کا اجر پورا پورا دے اور اپنے فضل سے زیادہ بھی دے۔ بلاشبہ وہ بے حد بخشش والا نہایت قادر ہے۔“  
(سورۃ فاطر ترجمہ آیت نمبر 29، 30)

### ذکر اللہ کی ترغیب

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ”اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کی ایک جماعت مقرر ہے جو ذکر الہی میں مشغول رہنے والوں کی تلاش و جستجو میں زمین پر پھرتی رہتی ہے۔ جب وہ ان کو پالیتے ہیں تو ایک دوسرے کو پکارتے ہیں کہ آجاؤ تمہارا مقصد حاصل ہو گیا ہے پھر وہ ان کو اپنے پروں سے ڈھانپ لیتے ہیں۔ اس وقت اللہ تعالیٰ ان فرشتوں سے جاننے کے باوجود پوچھتا ہے کہ میرے بندے کیا کر رہے تھے؟ فرشتے جواب دیتے ہیں تیری تسبیح، تکبیر، تحمید اور تمجید میں لگے ہوئے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتا ہے کہ کیا انہوں نے مجھے دیکھا ہے؟ فرشتے کہتے ہیں اللہ کی قسم! انہوں نے آپ کو نہیں دیکھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر وہ مجھے دیکھ لیتے تو؟ فرشتے کہتے ہیں اگر دیکھ لیتے تو وہ عبادت میں اور بھی زیادہ مصروف ہو جاتے اور زیادہ ذکر کرنے لگ جاتے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ کیا چیز طلب کر رہے تھے؟ فرشتے کہتے ہیں جنت کا سوال کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ

فرماتا ہے کہ کیا انہوں نے جنت کو دیکھا ہے؟ فرشتے کہتے ہیں نہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر وہ اسے دیکھ لیتے تو فرشتے عرض کرتے ہیں کہ اگر دیکھ لیتے تو ان کی طلب اور رغبت میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ پھر اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے کہ وہ کس چیز سے پناہ مانگ رہے تھے؟ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ جہنم سے پناہ مانگ رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے کہ کیا انہوں نے اسے دیکھا ہے؟ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ دیکھا تو نہیں ہے، لیکن اگر دیکھ لیتے تو اور بھی زیادہ ڈرنے لگ جاتے اور پناہ مانگتے۔ پھر اللہ تبارک و تعالیٰ فرشتوں کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ اے فرشتو! گواہ ہو جاؤ میں نے ان تمام ذکر کرنے والوں کو بخش دیا ہے۔ ان میں سے ایک فرشتہ عرض کرتا ہے کہ اے اللہ! اس مجلس میں فلاں شخص اپنے کسی کام کے لیے آیا تھا اور یوں ہی بیٹھ گیا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ وہ مجلس ہے کہ ان کے ساتھ بیٹھنے والا بھی محروم نہیں رہتا۔“

صحیح بخاری

امینہ ملک۔ کراچی

### حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا عدل و انصاف

حضرت علی بن ربیعہ کہتے ہیں۔ حضرت جعدہ بن بسرہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں آکر کہا۔ ”اے امیر المومنین! آپ کے پاس دو آدمی آئیں گے ان میں سے ایک کو تو اپنی جان سے بھی زیادہ آپ سے محبت ہے یا یوں کہیے اپنے اہل و عیال اور مال و دولت سے بھی زیادہ آپ سے محبت ہے جبکہ دوسرے کا بس چلے تو آپ کو فسخ کر دے۔ (نعوذ باللہ) اس لیے آپ دوسرے کے خلاف پہلے کے حق

میں فیصلہ کروں۔“ اس پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جعدہ کے سینے پر مکا مارا اور فرمایا۔ ”اگر یہ فیصلے اپنے آپ کو راضی کرنے کے لیے ہوتے تو میں ضرور ایسا کرتا، لیکن یہ فیصلے تو اللہ کو راضی کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ (اس لیے میں تو حق کے مطابق فیصلہ کروں گا۔) بے شک وہ فیصلہ کسی کے بھی حق میں ہو جائے۔“

امبر گل۔ جھنڈو (سندھ)

### اتوال علی المرتضیٰ

○ تنہائیوں میں اللہ تعالیٰ کی مخالفت کرنے سے ڈرو کیونکہ جو گواہ ہے وہی حاکم ہے۔  
○ ظالم کے لیے انصاف کا دن اس سے زیادہ سخت ہو گا جتنا مظلوم پر ظلم کا دن۔  
○ حضرت علیؑ سے کہا گیا کہ اگر کسی شخص کو گھر میں چھوڑ کر اس کا دروازہ بند کر دیا جائے تو اس کی روزی کدھر سے آئے گی؟ فرمایا۔ ”جدھر سے اس کی موت آئے گی۔“

○ اللہ سبحانہ نے اپنی اطاعت پر ثواب اور اپنی معصیت پر سزا اس لیے رکھی ہے کہ اپنے بندوں کو عذاب سے دور کر لے اور جنت کی طرف گھیر لے۔

(سبح ابلاغہ سے انتخاب)

کنول شاہین۔ جلال پور خٹاں

### جبرائیل علیہ السلام کی مشقت

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرت جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا۔ ”اے جبرائیل علیہ السلام! کبھی تجھے آسمان سے بڑی مشقت اور تیزی سے زمین پر اترنا پڑا۔“

جبرائیل علیہ السلام نے جواب دیا۔ ”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چار مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ مجھے فی الفور بڑی سرعت سے زمین پر آنا پڑا۔“

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”کس کس موقع پر؟“ جبرائیل علیہ السلام نے عرض کیا۔

”ایک تو جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تو میں اس وقت عرش الہی کے نیچے تھا۔ مجھے حکم ہوا کہ خلیل کے آگ میں پہنچنے سے پہلے ہی خلیل کے پاس پہنچوں۔ چنانچہ میں بڑی سرعت سے خلیل کے پاس پہنچا۔“

دوسری بار جب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی گردن اطہر پر چھری رکھی گئی تو مجھے حکم ہوا کہ چھری چلنے سے پہلے زمین پر پہنچوں۔ چنانچہ میں نے چھری چلنے سے پہلے زمین پر قدم رکھا اور چھری کو نہ چلنے دیا۔ تیسری بار جب حضرت یوسف علیہ السلام کو بھائیوں نے کنویں میں گرایا تو مجھے حکم ملا کہ کنویں کی تہ تک پہنچنے سے پہلے زمین پر پہنچوں اور کنویں سے پتھر نکال کر حضرت یوسف علیہ السلام کو اس پر بٹھا دوں۔ چنانچہ میں نے ایسے ہی کیا۔

اور چوتھی مرتبہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! جب کافروں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے واپس مہارک کو شہید کیا تو مجھے حکم ہوا کہ میں فوراً زمین پر پہنچ جاؤں اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے واپس مہارک سے گرنے والا خون زمین پر گرنے سے قبل اپنے ہاتھ بر لے لوں۔

یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اللہ نے مجھ سے فرمایا۔ جبرائیل علیہ السلام! میرے محبوب کا یہ خون اگر زمین پر گر گیا تو قیامت تک نہ کوئی سبزی اگے گی اور نہ درخت۔ چنانچہ میں بڑی سرعت سے زمین پر پہنچا اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خون مبارک اپنے ہاتھوں میں سمیٹ لیا۔

کنول شاہین۔ جلال پور خٹاں

### قسمت

چیزیں ہمیشہ ویسی نہیں ہوتیں جیسی وہ نظر آتی ہیں۔

ام موسیٰ سے اپنے بیٹے کو دریا میں پھینکنے کا کہا گیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں مرنے کے لیے

چھوڑ دیا گیا۔ حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی نے۔  
 نکل لیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینک  
 دیا گیا، مگر دیکھیں آخر میں چیزیں ان کے لیے کیسے بدل  
 دی گئیں؟ اللہ نے ہمیشہ ہمارے لیے اچھا رکھا ہوتا  
 ہے۔ شروعات میں شاید اچھا نہ ہو یا شاید ہمیں اچھا ہی  
 نہ لگے مگر اختتام ہمیشہ ہماری توقعات سے برہ کر اچھا  
 ہوتا ہے۔

اگر آج آپ کو بہت سی مشکلات کا سامنا ہے تو  
 یقین رکھیے اور آنے والے کل کی بہتری کے لیے  
 دعا گو رہیں۔ معجزات تب ہی رونما ہوتے ہیں  
 جب آپ اللہ تبارک تعالیٰ سے رہنمائی لیتے ہیں۔  
 تمام طاقت، تمام حکمت، تمام دانائی اسی ایک پروردگار  
 کے لیے ہے۔ نسیم فاروقی علامہ

### باتوں سے خوشبو آئے

☆ اللہ عزوجل نے ہمارے لیے جو قسمت میں  
 کر دیا اس پر راضی رہو۔

سیدنا امام صادق جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ  
 ☆ صبر ایسی سواری ہے جو کبھی ٹھوکر نہیں کھاتی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ  
 ☆ اللہ عزوجل کا ذکر کرنے والوں کی ارواح کے سوا  
 تمام روحوں دنیا سے پیاسی نکلتی ہیں۔

سیدنا داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ  
 ☆ جو جنت کی محبت کا دعویٰ کرے، مگر عبادت نہ  
 کرے وہ جھوٹا ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ  
 ☆ جنت الفردوس خاص اس کے لیے ہے جو نیکی کا  
 حکم کرے اور برائی سے منع کرے۔

سیدنا کعب الاحبار رضی اللہ عنہ  
 ☆ محبت دور کے خاندانوں کو قریب کر دیتی ہے اور  
 عداوت قریبی خاندانوں کو دور کر دیتی ہے۔

سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ  
 ☆ غازی کے سامنے سے گزرنے والا جانتا کہ اس پر  
 کیا گناہ ہے تو زمین میں دھنس جانے کو بہتر جانتا  
 گزرنے سے۔

سیدنا کعب الاحبار رضی اللہ عنہ  
 ☆ دنیا کی فکر دل کا اندھیرا ہے اور آخرت کی فکر دل کا  
 نور ہے۔

سیدنا عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ  
 ☆ جس طرح جنت میں رونا عجیب بات ہے اسی  
 طرح دنیا میں ہنسنا بھی تعجب انگیز ہے۔

حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ  
 نشو و نما گدو بیراج

### ”کام کی بات“

ایک بار ایک شخص ایک بزرگ کی خدمت میں  
 حاضر ہوا تاکہ اپنی بیوی کی بد مزاجی کی شکایت کر سکے، مگر  
 جب وہ آپ کے مکان پر پہنچا تو آپ کی بیوی کے  
 گرجنے برسنے کی آواز سنائی دی جب آپ کے گھر میں  
 وہی حال دیکھا تو مایوس ہو کر لوٹنے لگا۔ بزرگ نے

اسے دیکھ لیا۔ آواز دے کر بلایا۔ وہ شخص قریب آیا تو  
 دریافت فرمایا کہ۔ ”اے شخص! تم کیوں آئے تھے اگر  
 ہم سے ملنے آئے تھے تو کیوں جا رہے ہو۔“

اس شخص نے عرض کیا۔ ”حضرت! میں اپنی زوجہ  
 کی تنگ مزاجی کی وجہ سے آیا تھا، مگر آپ کے گھر کا  
 حال بھی وہی دیکھا تو واپس چلے گیا۔“

آپ مسکرا دیے اور تحمل مزاجی سے فرمایا اے  
 شخص! میری بیوی نے مجھے چار باتوں سے بے نیاز کر دیا  
 ہے پہلی یہ کہ اس نے اللہ کے حکم سے مجھے اولاد کی  
 دولت سے نوازا اور پھر ان کی پرورش کی ذمہ داری  
 اٹھائی اور مجھے یہ خوشی دی اور اس ذمہ داری سے بے  
 نیاز کر دیا۔

دوسری یہ کہ اس نے میرے دکھ سکھ بانٹے اور  
 تسلی اور ہمدردی کے بولوں سے پریشانی سے بے نیاز  
 کر دیا۔

تیسری یہ کہ اس نے میری عزت و حرمت کی  
 حفاظت کی اور میرے نام کی لاج رکھی، مجھے خوف و  
 کھٹکے سے بے نیاز کر دیا۔

چوتھی یہ کہ اس نے مجھے زنا جیسے حرام فعل سے

بے نیاز کرویا۔  
اب اگر اس کے بدلے یہ کبھی کبھار مجھے سخت  
سٹ کمہ لے تو کیا عجیب ہے۔  
اس شخص پر آپ کے فرمانے کا گہرا اثر ہوا اور وہ  
خوشی خوشی گھر لوٹ گیا۔

صائمہ گل۔ سکھر

## دوستی

☆ لاکھوں کو دوست بنانا کوئی بڑی بات نہیں بڑی  
بات یہ ہے کہ ایسا دوست بناؤ جو تمہارا اس وقت ساتھ  
دے جب لاکھوں تمہارے مخالف ہوں۔  
☆ اچھا دوست چاہے جتنا بھی برا بن جائے، کبھی اس  
سے دوستی مت توڑنا، کیونکہ پانی چاہے جتنا بھی گندا  
ہو جائے آگ بجھانے کے کام آتا ہے۔  
☆ کامیابی حوصلوں سے ملتی ہے اور حوصلے دوستوں  
سے ملتے ہیں۔ دوست مقدروں سے ملتے ہیں اور  
مقدر انسان خود بناتا ہے۔

☆ دشمن سے بچو اور دوست سے اس وقت جب وہ  
تمہاری تعریف کرنے لگے۔  
☆ دوست جو صرف تمہاری اچھی حالت کا دوست  
ہو اور آڑے وقت کام نہ آئے اس سے بچنا چاہیے  
کیونکہ وہ سب سے بڑا دشمن ہے۔

آمنہ ولید۔ لاہور

## ”بند مٹھی“

نواب شفیع علی خان عرف نواب بدھن صاحب  
کے والد مرحوم کے ایک خدمت گار کی لڑکی کی شادی  
ہوئی، بہت مناسب اور اچھی نسبت تھی۔ ادھر سے فی  
الفور نکاح اور رخصتی کا تقاضا تھا۔ اس آدمی نے اپنے  
آقا سے سارا حال بیان کر کے دو سو روپے کی رقم کی  
استدعا کی، آقا انہوں نے فی الفور حکم صادر کرویا، لیکن  
خزانچی کی تحویل میں اتنی رقم نہ تھی۔ انہوں نے ترش  
روئی کے ساتھ اس غریب کو ٹال دیا۔ صاحب حاجت  
باؤلا ہوتا ہے۔ اس نے اسی روز شام کو سارا ماجرا نواب

کو سنا دیا۔ انہوں نے کچھ سوچا، پھر محل میں تشریف  
لے گئے۔ ان کی تین بیگمات تھیں انہوں نے عینوں کو  
یکجا کر کے اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بند کر کے  
فرمایا کہ ہم ایک چیز بیچتے ہیں، تم لوگ بولی بولو، لیکن ہر  
ایک کی رقم فل الفور جمع ہو جائے گی اور کسی کی کوئی  
رقم واپس نہ ہوگی۔ بولیاں بولی گئیں، چھ سو روپے جمع  
ہونے کے بعد انہوں نے مٹھیاں کھول دیں اور فرمایا  
کہ ”تم سب کے ہاتھ ثواب بچا اور وہ چھ سو روپے کی  
رقم لا کر اس حاجت مند کو پیش کر دی۔“

مرزا جعفر حسین کی کتاب ”مقدم لکھنؤ کی آخری  
بہار کا ایک ورق“

حمدا واجد۔ کراچی

## باتیں ہیں خوشبو جیسی

☆ ہلکی سی رنجش خونی رشتوں کو ختم نہیں کر سکتی،  
بالکل اسی طرح جیسے تیز دھوپ سحر کو جھلسا دے، مگر

اس کی جڑیں محفوظ رہتی ہیں۔  
☆ محبت اظہار نہیں مانتی، مگر کبھی کبھی اظہار کرونا  
چاہیے دوسروں کو مطمئن کرنے کے لیے۔

☆ جنہیں ہم کم تر اور حقیر بنائے رکھتے ہیں وہ بھی  
رفتہ رفتہ ہمیں ایسا ہی بنادیتے ہیں۔

☆ زندگی کی سب سے بڑی فتح نفس پر قابو پانا ہے، اگر  
نفس نے دل پر فتح پالی تو سمجھو کہ وہ دل مرہ ہو گیا ہے۔

☆ دل کی سلیٹ پر لکھنے سے پہلے سوچ لیں کہ یہ  
نقش مٹائے نہیں مٹتے۔

طاہرہ ملک، رضوانہ ملک، جلال پور، بیروالا

## محبت

☆ محبت مرد کے لیے ایک شغل ہے اور عورت کے  
لیے ایک زندگی، جذبہ محبت کی ترجمانی کرنے والی اگر  
کوئی چیز ہے تو وہ صرف آہ۔

☆ محبت ہستی کی وہ جیتی جاگتی تصویر ہے جس میں  
انسان کا ماضی اور مستقبل جھلکتا ہے۔

☆ ☆

# کچھ موتی چنے ہیں

ادارہ

مطالعہ کرتے ہوئے ہم مختلف احساسات سے دوچار ہوتے ہیں۔ کچھ جملے ہمارے فکر و احساس کے دریچوں پر دستک دیتے ہیں۔ کچھ تحریروں میں الفاظ کی خوب صورتی، تشبیہ اور استعارے سحر طاری کر دیتے ہیں اور کچھ تحریروں پڑھتے ہوئے مسکراہٹ لبوں سے جدا نہیں ہوتی۔

کچھ موتی چنے ہیں۔ یہ سلسلہ ایسی ہی تحریروں کے لیے شروع کیا جا رہا ہے۔ ہم اپنی قارئین سے درخواست کریں گے کہ وہ اس سلسلے میں حصہ لیں اور اپنی پسندیدہ تحریروں سے اقتباس ہمیں ارسال کریں۔

## صادق اور امین

”میرا ایک کونسنجن ہے سر۔“ ایک نو عمر لمبا سا لڑکا مائیک پر آیا۔

”میں نے آپ کے پچھلے لیکچر سے متاثر ہو کر قرآن سیکھنا شروع کیا تھا۔ مگر قرآن پڑھتے اب مجھ پر پہلے والی کیفیت طاری نہیں ہوئی، دل میں گداز نہیں پیدا ہوتا۔ میں قرآن پڑھتا ہوں تو میرا ذہن بھٹک رہا ہوتا ہے۔“

تیمور نے مائیک قریب کیا پھر بغور اس لڑکے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ کہیں جھوٹ تو نہیں بولتے؟“

”جی! وہ بھونچکا رہ گیا۔“

”ایک بات یاد رکھیے گا، قرآن صرف صادق اور امین کے دل میں اترتا ہے۔“

(مسلم۔ نمرہ احمد)

## ایک جیسی دلہنیں

بیوٹی پارلرز دلہنوں کا عروسی میک اپ چھ ایسے پر سرار اور طے شدہ تکنیک اور فارمولے کے مطابق کرتے ہیں کہ سب دلہنوں کی صورت باخدا بالکل ایک جیسی لگتی ہے۔ میرا یہ تاثر یسین کی حد تک پہنچ گیا ہے

## یورپ کی ایمان داری

ایک بڑے میاں بندوق لیے اپنے خریوزوں کے گھیت پر پہرہ دے رہے تھے۔ ایک راہ گیر نے کہا کیسے ہیں یہاں کے لوگ؟ بڑے میاں بولے بڑے ایمان دار ہیں۔ کیا مجال جو میرے خریوزوں کو ہاتھ لگائیں؟

راہ گیر نے کہا یہ بندوق آپ نے کیوں سنبھال رکھی ہے؟ بڑے میاں بولے ان کو ایمان دار رکھنے کے لیے۔“

اس ایک جواب میں یورپ والوں کی ایمان داری کی فلاسفی آجاتی ہے پوری نہیں تو بڑی حد تک۔

(آوارہ گرد کی ڈائری۔ ابن انشا)

## ایک شخص کی محبت

ایک شخص سے محبت انسان کو کتنا مجبور کر دیتی ہے۔ میں نے زندگی میں کسی کی پروا ہی نہیں کی اور اب اس شخص کی پروا کی ہے تو مجھے احساس ہوا ہے کہ محبت کرنے کے بعد بندے کو کتنا جھکنا پڑتا ہے۔ صرف اس خوف سے کہ کہیں دوسرا آپ کو چھوڑ نہ دے۔

(شہزاد۔ عمیرہ احمد)

کہ اگر لو میرج تک کی ایسی بیس میک اپ شدہ دلہنوں کو ایک کمرے میں بیٹھا دیا جائے تو کوئی دلہا اپنی متعلقہ دلہن کو نہ پہچان پائے گا۔ اور کسی اور کی دلہن کو ہمراہ لے جائے گا۔

"and they Lived Happily After"

(مشتاق احمد یوسفی)

### فلموں میں برسات

برسات کا موسم دراصل ”برساتھ کا موسم ہوتا ہے اور ہماری فلموں میں بھی بارش کے گیت یوں فلمائے جاتے ہیں فلمیں بھی ”بارش“ یعنی رش والی ہوں۔ پہلے ہیروئن کو بارش میں بھگوانے کا رواج کم تھا جس کی وجہ سے شاید یہ ہو کہ ہیروئن اتنی بڑی بلکہ بوڑھی ہوتی تھیں کہ مصنوعی بارش میں انہیں بھگوانے پر بڑا خرچ آتا تھا۔ بندہ ان دنوں ”بھیکے بدن“ کہتا تو لگتا ”دو نیلے بدن کہہ رہا ہو۔

(مزاحیات۔ ڈاکٹر یونس بٹ)

### عورت کی منطق

عورت کے ساتھ کتنی بھی عقل و دانش کی بات کریں، کیسے بھی دلائل کیوں نہ دیں، اگر اس کی مرضی نہیں ہے تو وہ اس منطق کو کبھی نہیں سمجھے گی۔

اس کے اندر اپنی منطق کا ایک ڈرائنگ روم ہوتا ہے جسے اپنی مرضی سے سجانا ہے اور وہ اسے روشن کرنے کے لیے باہر کی روشنی کی محتاج نہیں ہوتی۔ کسی عقل و دانش اور دلائل کے معاملے میں مانگے کی روشنی پر ایمان نہیں رکھتی اس نے جو فیصلہ کر لیا ہوتا ہے وہی اس مسئلے کا واحد اور آخری حل ہوتا ہے۔

(اشفاق احمد)

### ایک حکایت ایک سبق

کسی شخص نے ایک طوطے کو کوئے کے ساتھ پنجرے میں بند کر دیا۔ طوطا گھبرا گیا۔ وہ نفرت سے بار بار کہتا ”الہی یہ کیسی کالی کلوٹی بھدی شکل“ بھونڈی صورت اور سر یا نفرت مورت ہے۔“

یہ تو طوطے کا حال تھا۔ مگر عجیب بات ہے کہ ”کو“ بھی طوطے کی ہم نشینی سے سخت تنگ آیا ہوا تھا۔ لا حول پرہتا اور زمانے کی گردش پر حسرت، افسوس سے ہاتھ ملتے ہوئے کہہ رہا تھا ”خدا یا مجھ سے ایسا کیا گناہ ہوا ہے، جس کے بدلے میں ایسے نابکار بے وقوف اور بے ہودہ جنس کی صحبت میں قید کر دیا گیا ہوں۔ میرے مناسب حال تو یہ تھا کہ کسی چمن کی دیوار یا منڈیر پر اپنے ہم جنسوں کے ساتھ سیر کرتا پھرتا۔“ یہ حکایت اس لیے بیان کی گئی ہے کہ جس قدر دانا کو نادانی سے نفرت ہے اس قدر نادان کو داناؤں سے وحشت ہوا کرتی ہے۔

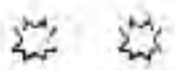
(شیخ سعدی)

### جینے کا جواز

آدی جب ”غر کرتے کرتے عمر گزاروے“ صدیاں گزر جائیں عرصے بیت جائیں اور اسے محسوس ہو کہ چلتے چلتے عمر کٹ جانے کے بعد بھی سفر نہیں کٹا۔ وقت کٹ جائے اور فاصلہ نہ کٹے تو زندہ رہنے کا کیا جواز ہو سکتا ہے۔

چلتے چلیں منزلیں خود سلام کریں گی۔ دنیا کے خلاف فریاد نہ کریں، کوشش کریں کہ کوئی آپ کے خلاف فریاد نہ کرے۔ دوسروں کو خوش کریں خوش خود مل جائے گی اور یہی جینے کا جواز ہے۔

(واصف علی واصف)





کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب  
شرمِ تم کو مگر نہیں آتی

نازیہ ناز، کی ڈاٹری میں تحریر  
نوشی گیلانی کی نظم

سنا ہے اس محبت میں  
بہت نقصان ہوتا ہے  
مہکتا جھومتا جیون  
عمیوں کے نام ہوتا ہے

سنا ہے جن کھو کر وہ  
صبح و شام روتا ہے  
محبت جو بھی کرتا ہے  
بہت بد نام ہوتا ہے

سنا ہے اس محبت میں  
کہیں بھی دل نہیں لگتا  
بنا اس کے نگاہوں میں  
کوئی موسم نہیں چمکتا

خفا جس سے محبت ہو  
وہ جیون بھر نہیں ہنستا  
سنا ہے اس محبت میں  
بہت نقصان ہوتا ہے

رفعت جیس، کی ڈاٹری میں تحریر  
سلیم کوثر کی نظم

بڑا دشوار ہوتا ہے  
ذرا سا فیصلہ کرنا  
کہ جیون کی کہانی کو  
بیاں بے زبانی کو  
کہاں سے یاد رکھنا ہے  
کہاں سے بھول جانا ہے  
اس سے کتنا چھپانا ہے  
کہاں رو رو کے ہنسنا ہے  
کہاں ہنس ہنس کے رونا ہے

بیبا اسامہ انجم، کی ڈاٹری میں تحریر  
مرزا غالب کی غزل

کوئی امید بر نہیں آتی  
کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معین ہے  
نیںد کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پر ہنسی  
اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد  
پر طبیعت ادھر نہیں جاتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں  
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

کیوں نہ چنوں کہ یاد کرتے ہیں  
میری آواز گر نہیں آتی

داعِ دل گر نظر نہیں آتا  
بو بھی اسے چارہ گر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی  
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

موتے ہیں آرزو میں مرنے کی  
موت آتی ہے پر نہیں آتی

کہاں آواز دی ہے  
کہاں خاموش رہتا ہے  
کہاں رستہ بدلنا ہے  
کہاں سے لوٹ آنا ہے

مرے مولا نے مجھ کو چاہتوں کی سلطنت دی  
مگر پہلی محبت کا خسارہ ساتھ رہتا ہے  
اگر وہی، مرے لب پر محبت ہی محبت ہے  
تو پھر یہ کس کیے نفرت کا دھارا ساتھ رہتا ہے

نزدہت جبین ضیاء کی ڈائری میں تحریر  
امجد اسلام امجد کی غزل  
جو آنسو دل پر گرتے ہیں وہ آنکھوں میں نہیں رہتے  
بہت سے حرف ایسے ہیں، جو لفظوں میں نہیں رہتے

مومنہ مصطفیٰ کی ڈائری میں تحریر  
قتیل شفائی کی غزل  
وہ دل ہی کیا جو تیرے ملنے کی دعا نہ کرے  
میں تجھے بھول کر زندہ رہوں، غدا نہ کرے

کتابوں میں لکھے جاتے ہیں، دنیا بھر کے افسانے  
مگر جن میں حقیقت ہو، کتابوں میں نہیں رہتے

رہے گا ساتھ تیرا پیار زندگی بن کر  
یہ اور بات کہ میری زندگی وفا نہ کرے

بہار آئے تو ہر اک پھول پر ایک ساتھ آتی ہے  
ہوا جن کا مقدر ہو، وہ شاخوں میں نہیں رہتے

یہ ٹھیک ہے نہیں مرنے کوئی جلدی میں  
غدا کسی کو کسی سے جدا نہ کرے

لیے پھرتے ہیں کچھ احباب ایسے مضطرب بہت  
جہاں دریا مل جائے، جینوں میں نہیں رہتے

اگر وفا پر بھروسہ رہے نہ دنیا کو  
تو کوئی شخص محبت کا حوصلہ نہ کرے

مہک اور تسلی کا نام بھونرے سے جدا کیوں ہے  
کہ یہ بھی تو خزاں آنے پر بھولیں میں نہیں رہتے

سنا ہے اس کو محبت دعا میں دتی ہے  
جو دل پر جوٹ کھائے مگر گلو نہ کرے

بچھا دیا ہے نصیبوں نے میرے پیار کا چاند  
کوئی دیا میری پلکوں پر اب جلا نہ کرے

نوشابہ منظور کی ڈائری میں تحریر  
وہی شاہ کی غزل

بھنور کی گود میں جیسے کنارہ ساتھ رہتا ہے  
کچھ ایسے ہی تمہارا اور ہمارا ساتھ رہتا ہے

زمانہ دیکھ چکا ہے، پرکھ چکا ہے اسے  
قتیل جان سے جائے یہ التجا نہ کرے

محبت ہو کہ نفرت ہو اسی سے مشورہ ہوگا  
مری ہر کیفیت میں استخارہ ساتھ رہتا ہے

سفر میں عین ممکن ہے میں خود کو چھوڑ دوں لیکن  
دعا میں کرے والوں کا سہارا ساتھ رہتا ہے



نفسہ محراب پودہ  
دلائل میرے پاس بھی ہوتے ہیں مگر !  
تیرے دعوے جانے کا خوف لا جواب کرتا ہے

نڈا لاہور  
کسی کے ساتھ پیار سے مذاق ضرور کرنا  
مگر کبھی کسی کے ساتھ مذاق سے پیار نہ کرنا

غذلیب ڈلوال  
میری دعا ہے تو سب سے نیک میرت ہو  
تیری طرح تیرا دل بھی خوبصورت ہو  
دعا سے قبل ملے تجھ کو جو تو چاہے  
کہ خود دعا کو تیرے ہاتھوں کی ضرورت ہو

عذرا ناصر کراچی  
دوستی ان سے ہو گئی ہے عدم  
جن کی ہر بات کا روبرو ہے  
فرحت عالم نیازی دریا خان

مغرور سی سی، مجھے اچھا بہت لگا  
وہ ابھی تو تھا مگر اپنا بہت لگا  
لیٹا ہوا کبریا جیسے خزاں کا چاند  
نیلے لباس میں بھی وہ پیارا بہت لگا

نوا سحر گڈو بیرون  
کتنا دیران سا ہو گیا ہے میرے دل کا مکان بھی  
کبھی کبھی تو اذیت دیتا ہے مجھے میرا مہربان بھی  
سیدہ تسکین زہرا ڈیرہ اسماعیل خان

آنے والا آ گیا ہے اور گہری ہو رہی ہے شام  
بے خودی کی انتہا ہے اور گہری ہو رہی ہے شام  
تن بدن اپنا سمیٹ اس طرح تو، بکھرے نہیں خوشبو  
شام کی پاتھل ہو رہی ہے اور گہری ہو رہی ہے شام

کراچی  
نہ وفا کا ذکر ہو گا نہ وفا کی بات ہو گی  
اب محنت جس سے بھی ہو گی مطلب کے ساتھ ہو گی  
عائشہ گوجرہ

دعوے جانے کی ادا ہم کو بھی آ ہی جاتی  
منانے والا کاش کوئی ہمیں بھی ملتا  
تحریم فیصل آباد

برباد کرنے کے اندھ بھی راستے تھے فراز  
سنجانے انہیں محنت کا ہی خیال کیوں آیا  
اقصی ناصر کراچی

اب اس کی ہر ادا سے ٹپکنے لگا خلوص  
جب ہم کو اعتبار کی عادت نہیں رہی  
لاشبہ ایمین منظر آباد

یہ سوچ کر اس کو میں نے روکا ہی نہیں  
دور جاتا ہی کیوں اگر وہ ہمارا ہوتا  
صائمہ جمی کے ڈی اے

بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں  
تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں  
طبیعت اپنی گھبراہٹ ہے جب سنسان مائدوں میں  
ہم ایسے میں تیری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں

ناہید راشد کراچی  
یہ عجیب حس قیاس ہے کہ جو دعوے وہی پاس ہے  
یہ تصورات کے دلہے میرے دشتِ غم کے غزال ہے

رضیہ طاہر کراچی  
مجھے زندگی کی دعا نہ دے  
میری زندگی سے بنی نہیں  
کوئی زندگی پہ کرے یقین  
مجھے زندگی پہ یقین نہیں

شازیہ اعجاز فیصل آباد

نہیں فرصت یقین مانو ہمیں کچھ ادا کرنے کی  
تیری باتیں، تیری یادیں بہت معروف رکھتی ہیں  
شیعہ بتوں کراچی

سمو لیے ہیں زمانے کے غم تبسم میں  
زمانہ اس پر بھی برہم ہے کیا کیا جلے  
عظیم تر ہے عبادت شباب کی لیکن  
ہی گناہ کا موسم ہے کیا کیا جلے

سیکنہ بلوچ لارکانہ

جو آج مجھ سے بچھڑ کر بڑے سکون میں ہے  
کبھی وہ شخص بڑے واسطے عذاب میں تھا  
اسی نے مجھ کو غم سوز عارداں بسخشا  
وہ ایک چاند کا کھڑا سما جو انتخاب میں تھا  
فوزِ ثمریٹ کجرات

بس بھی اک سبب نہیں اداسی کا  
طرح طرح کے دلوں میں ملال ہوا کرتے ہیں  
سیاہ رات میں جلتے ہیں جگنوؤں کی طرح  
دلوں کے زخم بھی کمال ہوا کرتے ہیں  
سدہ وزیر خرماب (ویل)

آج ایک حاسد کو راز دار کرنا ہے  
کرتے ہیں گلے اس سے نہیں بھی رکھتی ہیں  
اصل میں محبت کی صورتیں یہی دو ہیں  
بے قرار ہونا ہے ادبے قرار کرنا ہے

امبر گل جھڑو (سندھ)

اسی میں خوشی ہوں، مراد کھ کوئی تو سہتا ہے  
جلی جلوں گی جہاں تک یہ ساتھ رہتا ہے  
مرے بدن کو نمی کھا گئی ہے اسٹکوں کی  
بھی بہار میں کیسا مکان دھتا ہے

مدحہ فہمید کراچی

سنیچے جو سر عرش تو نادار بہت تھے  
دنیا کی محبت میں گرفتار بہت تھے  
آسائش دنیا کا سنو اپنی جگہ ہے  
اس دکھ میں مگر درد کے آثار بہت تھے

آسمیہ جاوید علی پور چٹھہ

سب کو سراپ و فا کرنا خود کو پیاسا رکھتا  
مجھ کو کھلے دے گا اسے دل اتیرا دیا ہونا  
صدف عمران کراچی

رو کھوا کر مجھ سے تو ذہن میں رکھتا تم  
منانا عادت نہیں ہے ہماری اور جد ہم رہ چکے

طاہرہ ملک، رضوانہ ملک جلال پور بیٹالا

ہم عشق کے اس مقام پر آ سنیچے ہیں  
جہاں دل کسی اور کو چاہے تو گناہ لگتا ہے

انوشہ طارق لاہور

محبتوں کا حساب تھا، عداوتوں کا شمار تھا  
کبھی رات اس کی عذاب تھی کبھی روح کا وہ قرار تھا  
تو بھی دودھ ہے میں بھی دودھ ہیں کیوں الگ ہوئے رستے  
میری چاہتوں کا گریز تھا یا میری انا کا حصار تھا

شہناز لاہور

دو قدم کا فاصلہ تھا دودھوں کے دو میاں  
ایک منزل تھی ہماری جس کو سر اس نے کیا

لاڈیہ، امین مظہر آباد آزاد کشمیر

اب بھی او جھل ہے لگا ہوں سے نشان منزل  
ایک منزل تھی ہماری جس کو سر اس نے کیا

عالیہ نارتھ کراچی

ہمارے شہر کے لوگوں کا اب احوال اتنا ہے  
کبھی اخبار پڑھ لینا، کبھی اخبار ہوتا نا

ماہ نور کراچی

بھول سا جسم لیے شہر تمازت میں نہ جا  
لوگ کہتے ہیں وہاں سنگ بھی پگھل جاتے ہیں

کرن، بینش کراچی

ہم شہر بے وفائی و فادہ ہونڈتے رہے  
حیرت میں اک جہاں ہے کہ کیا ڈھونڈتے رہے  
لمحوں میں مگر گیا تھا جو بہرہ باد بستیاں  
ہم مدقوں وہ دستِ قضا ڈھونڈتے رہے

# کرن کا دسترخوان

## خالہ جیلانی

پسا ہوا گرم مسالا اور ہرا دھنیا ڈال کر اتار لیں اور گرم گرم نان کے ساتھ پیش کریں۔

اسپانسی مسالا دوسہ

بکرے کے پائے

اشیاء :

بکرے کے پائے

ایک درجن درمیانہ سائز

ایک پاؤ (پسی ہوئی)

ایک دو ٹکڑے

ایک چائے کا چمچ

ایک پاؤ

بارہ عدد

نمک سرخ سرچ پسی ہوئی حسب ذائقہ

دو چائے کے چمچ

آدھی گھی

پیاز

دار چینی

گرم مسالا (پسا ہوا)

گھی

لونگ

اورک لسن پسا ہوا

ہرا دھنیا

ترکیب :

پیلے پائے کو خوب اچھی طرح دھولیں اور پھر ان کو

بڑے دیچے میں ڈال کر دو تین کلو پانی ڈال دیجئے۔ اس

میں لسن پیاز اورک لونگ دار چینی اور نمک ڈال کر

چولہے پر چڑھا دیں۔ ایک ابال آنے کا بعد آنچ دھیمی

کروں اور ڈھکن پر کچھ وزن رکھ دیں کہ بھاپ باہر نہ

نکلے اور اس کو کم از کم چار گھنٹے پکنے دیں۔ چار گھنٹے بعد

ڈھکن کھول کر دیکھیں اگر پائے گل گئے ہوں تو ایک

دیچہ میں گھی کڑکڑائیں اور اس میں ذرا سی پیاز کاٹ

کر ڈال لیں۔ پیاز اتنی بھونیں کہ بادامی ہو جائے پھر

سرخ مرچ اور چٹنی بھر ہلدی ڈال کر بھونیں ساتھ ساتھ

پائے کی یخنی کا ایک ایک چمچ ڈالتے جائیں۔ جب

مسالا بھن جائے تو اس میں پائے نکال کر ڈال دیں اور

تھوڑا بھونیں اور اس میں ساری یخنی الٹ دیں۔ چند

منٹ پکائیں جب شور بہ حسب پسند رہ جائے تو ہلکی

آنچ پر دم دے دیں تاکہ گھی اوپر آجائے اب اس میں

اشیاء :

دو سے کے لیے:

چاول

مینھا سوڈا

ہری مرچیں

کوئنگ آئل

ماش کی دال

نمک

پانی

ترکیب :

چاول اور دال کو صاف کر کے آٹھ سے دس گھنٹے

کے لیے بھگو دیں۔ پھر اس میں ایک کپ پانی ڈالیں اور

بلینڈر میں پیس لیں۔ پھر اس کو مزید دو گھنٹے کے لیے

چھوڑ دیں۔ اس کے بعد نمک ہری مرچیں سوڈا

ملائیں۔ توے پر تھوڑا سا آئل لگا میں جب گرم

ہو جائے تو چمچے کی مدد سے دوسے تلمیں یہ پسا ہوا پتلا

آمیزہ ہے اس لیے آہستہ آہستہ چمچے کی مدد سے

پھیلا میں۔ مناسب سائز کم از کم چائے کی طشتری جتنا

ہو جائے تو تھوڑا سا آئل ڈال کر مل لیں۔

دوسہ فلنگ

اشیاء :

آلو

نمک ہلدی

آدھا کلو ابال کر میش کر لیں

آدھا چائے کا چمچ

مرچیں، ہر ادھنیا، پودینہ اور وہی ایک ساتھ پیش لیں۔  
چٹنی کے بگھار کے لیے

ماش کی دال (بھگو کر توے پر بھون لیں)  
ایک کھانے کا چمچ

اشیاء :  
لسن کے جوے  
کڑی پتا  
ہری مرچیں  
رائی  
آئل  
دو عدد باریک کٹے ہوئے  
چھ عدد  
تین عدد  
آدھا چائے کا چمچ  
دو کھانے کے چمچ

ایک چائے کا چمچ  
آٹھ عدد  
تین عدد (باریک کٹی ہوئی)  
ایک کھانے کا چمچ  
ایک کھانے کا چمچ  
ایک عدد باریک کٹی ہوئی  
دو کھانے کے چمچ

رائی  
کڑی پتا  
ہری مرچ  
چنے کی دال  
لسن اور ک پیسٹ  
پیاز درمیانے سائز کی  
ٹھگی یا آئل

ترکیب :

پین میں آئل گرم کریں۔ اس میں لسن اور ہری  
مرچیں فرائی کریں پھر اس میں رائی، کڑی پتا ڈال کر  
کچھ سیکنڈ فرائی کر کے چٹنی پر بگھار دیں دوسے کے  
ساتھ پیش کریں۔

چنے کی دال اور ماش کی دال کو تقریباً "آٹھ دس گھنٹے  
کے لیے بھگو دیں۔ پھر اس کو تیل ہر گھی میں ڈال کر  
فرائی کریں۔ جب دونوں دالیں گولڈن براؤن ہو جائیں تو  
اس میں کڑی پتا اور رائی ڈال کر ہلکا سا فرائی کریں۔  
اس کے بعد ہری مرچیں، نمک، ہلدی، لسن اور ک  
پیسٹ، پیاز ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں پانچ منٹ  
دے کر رول کر لیں اور توے سے اتار کر گرم گرم دوسرے  
چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

دوسے کی چٹنی



چکن فیجیہ اپزا

اشیاء :  
چکن (دون لیس، کیوبز میں کٹی ہوئی) آدھا کلو  
چلی ساس  
کالی مرچ (پسی ہوئی)  
نمک  
سرکہ  
سویا ساس  
لسن پیسٹ  
ٹاپنگ کے لیے

آدھا چائے کا چمچ  
آدھا کپ پیسا ہوا  
تین کھانے کے چمچ  
آدھی گٹھی  
آدھا کپ  
آدھا کپ بھنے ہوئے پیس لیں  
چار عدد  
آٹھ عدد  
چند پتے

اشیاء :  
نمک  
ٹارمل  
املی کا گودا  
ہر ادھنیا  
وہی  
چنے  
لسن کے جوے  
ہری مرچیں  
پودینہ  
ترکیب :

املی کو پانی میں بھگو کر بیج نکال دیں نمک، چنے (بھنے  
ہوئے) ٹارمل، لسن کے جوے، املی کا گودا، ہری



پراساس  
موزر ملایا چیلر چیز  
اور یگانو  
مشروم  
ٹماٹر کیوبز میں کٹے ہوئے  
ڈوبانے کے لیے:

میدہ  
خمیر  
(خمیر کو نیم گرم پانی میں ایک کھانے کا چمچہ چینی کے  
ساتھ ملا لیں)

نمک  
اندھا  
آئل  
آدھا چائے کا چمچہ  
ایک عدد  
دو کھانے کے چمچے

ترکیب :

ایک پیالے میں چکن میں چلی ساس، کالی مرچ،  
نمک، سرکہ اور لہسن ڈال کر اچھی طرح تمام اجزا  
ملا لیں اور بیس سے پینچیس منٹ کے لیے رکھ دیں۔  
اب کڑاہی میں چکن کو درمیانی آنچ پر ہلکا سے گلائیں۔  
میدہ میں نمک، اندھا اور چینی ملا خمیر ڈال کر نیم گرم پانی  
کے ساتھ ڈوکے تمام اجزا کو نرم گوندھ لیں اوون کو  
180 ڈگری سینٹی گریڈ پر گرم کر لیں۔ اب ڈوکو  
تھوڑی دیر کے لیے اوون میں رکھ کر گرم کر لیں تاکہ وہ  
پھول جائے اب ڈوکو نیل لیں پھر اسے پیکنگ ٹری  
میں رکھ کر ہلکا سا آئل لگائیں اور تھپچے کی مدد سے  
چھوٹے چھوٹے سوراخ کرویں چکن کیوبز، چیز، مشروم،  
ٹماٹر، شملہ مرچ اور اور یگانو سے ٹاپنگ کر کے بیک  
کر لیں۔

سانبل (اندونیشین ڈش)

اشیا :  
گوشت  
پیاز ایک کلو (ہلکی براؤن)  
سبز مرچ  
ایک کلو  
ایک پیاز

ایک پیاز (باریک کٹی ہوئی)  
حسب ضرورت  
ایک چٹکی  
حسب خواہش  
حسب ضرورت

اورک  
نمک  
ہلدی  
اٹلی  
کوکنگ آئل

ترکیب :

پہلے گوشت کو دھو کر حسب ضرورت نمک اور  
تھوڑا سا پانی ڈال کر گلنے کے لیے رکھ دیں جب پانی  
خشک ہو جائے تو الگ برتن میں کوکنگ آئل میں  
گوشت اچھی طرح بھونیں ایک الگ برتن میں آئل  
ڈال کر پیاز کو ہلکا براؤن کر لیں اور سبز مرچ، اورک کو  
بھی مل لیں۔ تیلے ہوئے گوشت میں ان سب چیزوں  
کو ملا دیں۔ اٹلی کے بھگوئے ہوں دانوں کو مل کر  
گھلیاں نکال کر چھان لیں اور تیار شدہ گوشت میں  
ڈال کر دس منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔ مزے دار  
سانبل تیار ہے۔

کرٹھی

اشیا :

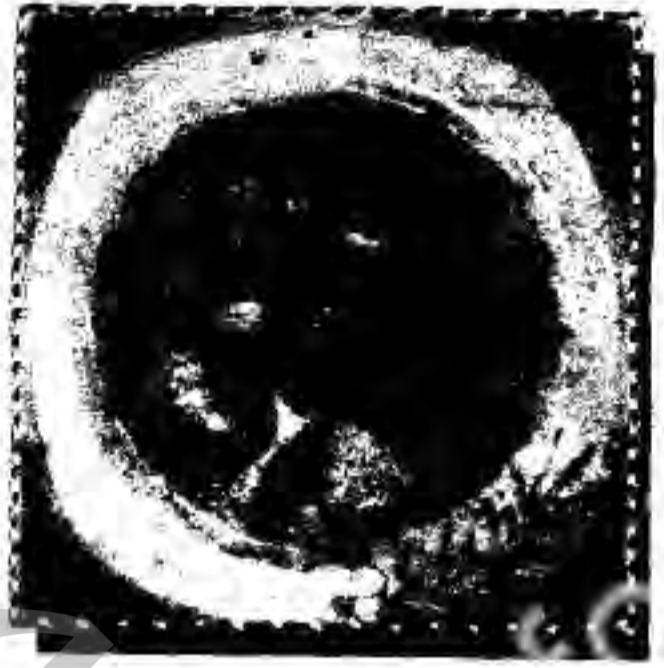
آدھا کلو  
دہی کو کھٹا کرنے کے لیے دو لیٹروں کا رس ملا دیں  
بیسن  
لال مرچ پاؤڈر  
اورک، لہسن، پیاز ہوا  
آدھی پیالی  
ایک کھانے کا چمچہ  
ایک کھانے کا چمچہ

ڈال دیں، جب مرچیں ابھی طرح گل جائیں تو چولہا آہستہ گروں۔

پکوڑوں کے مسالوں کو اچھی طرح ملا لیں اور کڑا سی میں تیل ڈال کر خوب گرم کر لیں، پکوڑے تل تل کر کڑھی میں ڈالتے جائیں۔

بگھار کے مسالے تیل میں ڈال کر سیاہ کر لیں، جب سیاہ ہو جائیں تو کڑھی میں ڈال دیں ڈھکن ڈھانپ دیں۔ سادے چاول کے ساتھ پیش کریں۔

چٹ پٹے کر لیے



لیموں  
نمک

ہری مرچ  
ہرا دھنیا  
کڑی پتا

پیاز  
بگھار کے لیے

ثابت دھنیا

سفید زیرہ  
میتھی دانہ

لسن کے چھلے جوئے

لال مرچ ثابت

کڑی پتا

تیل

پکوڑوں کے لیے

بیسن

میٹھا سوڈا

نمک

لال مرچ

پیاز

ترکیب :

دہی، مرچ، دھنیا، اور ک، لسن، بیسن اور چار پیالی پانی ملا کر ایک دیکھی میں چھان لیں۔ پھر پیاز، ہری مرچ، کڑی پتا وغیرہ ڈال کر پلٹنے دیں دس منٹ بعد نمک

دو عدد

حسب ذائقہ

چار عدد

ایک گھنٹی باریک کٹا ہوا

چھ عدد

ایک ڈلی باریک کٹی ہوئی

بھون لیں ایک چائے کا چمچ

ایک چائے کا چمچ

چھ عدد

چار عدد باریک کٹے ہوئے

چھ عدد

چار عدد

ایک پیالی

ایک پیالی

آدھا چائے کا چمچ

حسب ذائقہ

تین عدد باریک کٹی ہوئی

ایک ڈلی باریک کٹی ہوئی

اشیاء :

کر لیے

پیاز

نمائر

سفید زیرہ

لال مرچ (پسی ہوئی)

ہلدی

لیموں کارس

تیل

ترکیب :

کرلیوں کو چھیل کر کرلیوں کے بیچ میں کٹ لگائیں اور اس کے بیچ نکال کر الگ رکھ دیں۔ پھر کرلیوں کو گول باریک کاٹ لیں۔ اب اس میں تین چار چمچے نمک

ایک کلو

ڈیڑھ پاؤ

ڈیڑھ پاؤ

ایک چائے کا چمچ

ایک چائے کا چمچ

آدھا چائے کا چمچ

دو کھانے کے چمچے

ایک کپ



ایک چائے کا چمچ  
دو کھانے کے چمچے  
فرائی کے لیے  
دو کھانے کے چمچے  
آدھا چائے کا چمچ

خمیر  
چینی  
تیل  
دودھ کا پاؤڈر  
نمک

ترکیب :

مدے میں خمیر، دودھ کا پاؤڈر، انڈہ، چینی، نمک اور گھی یا مکھن ڈال کر نیم گرم پانی سے گوندھ لیں اور تقریباً "ایک گھنٹہ کے لیے رکھ دیں تاکہ آٹا پھول کر سائز میں ڈبل ہو جائے۔ اگر آپ کے پاس دودھ کا پاؤڈر دستیاب نہ ہو تو پانی کے بجائے آٹے کو نیم گرم دودھ سے گوندھ لیں۔ جب آٹا پھول جائے تو چھ عدد پیڑے بنالیں اور دوبارہ ڈھک کر رکھ دیں تاکہ مزید پھول جائیں۔ اب یا تو ڈیڑھ انچ کی موٹائی کی روٹی تیل کر وٹ کٹر سے کاٹ لیں یا پھر پیڑوں کو ذرا سادبا کر درمیان سے کسی بوتل کے ڈھکن سے یا کوئی کٹر سے کاٹ لیں۔ پھر مزید تھوڑی دیر کے لیے ڈھک کر رکھ دیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کریں اور ہلکی آنچ پہ گولڈن براؤن ہونے تک فرائی کر کے نکال لیں اور پھر چاکلیٹ فراسٹنگ ساتھ کھانے کے لیے پیش کریں۔

چاکلیٹ فراسٹنگ ساس

ایک کپ  
دو کھانے کے چمچے  
ایک چائے کا چمچ

اشیاء :  
آئسنگ شوگر  
کو کو پاؤڈر  
مکھن

ترکیب :

ایک عین میں آئسنگ شوگر کو کو پاؤڈر اور مکھن ڈال کر تھوڑا سا پانی ڈال کر اتنا پکالیں کہ گاڑھی ساس بن جائے ڈوٹس اس ساس میں ایک سائیڈ سے ڈپ کر کے رکھ دیں تاکہ ساس سیٹ ہو جائے۔

لگائیں اور دھوپ میں رکھ دیں، دو تین گھنٹوں کے لیے اب ان کو اچھی طرح دھولیں اور کسی کپڑے میں رکھ کر نچوڑ لیں اس طرح بیجوں کو بھی کریں اب کریلوں کو درمیانی آنچ پر فرائی کریں جب کرلیے براؤن ہو جائیں تو نمائز زیرہ ہری مرچ باریک کاٹ لیں اور انہیں بھون لیں۔ ساتھ ہی لال مرچ ہلدی بھی ڈال دیں جب نمائز بھن جانے تو اس میں فرائی کرلیے، بیج، لیموں کا رس ڈال کر پکائیں اور اتار لیں۔

انڈوں کی مٹھائی

تین عدد  
ایک کپ  
آدھا کپ  
آدھا کپ  
چند عدد دانے

اشیاء :  
انڈے  
خشک دودھ  
چینی  
گھی  
سبز الائچی

ترکیب :

پہلے انڈے خوب اچھی طرح پھیٹ لیں اس کے بعد گھی میں الائچی کے دانے ڈال کر گرم کریں پھر اسے چولہے سے اتار کر ٹھنڈا کر لیں۔ اب اس میں خشک دودھ، انڈے اور چینی ڈال کر چمچے سے اچھی طرح ہلائیں اور ہلکی آنچ پہ رکھ دیں۔ چمچے سے برابر ہلاتی رہیں۔ آہستہ آہستہ یہ خشک ہونے لگے گا جب اس کا رنگ براؤن ہو جائے اور یہ گھی چھوڑنے لگے تو اتار کر کسی پلیٹ میں جمادیں۔ ٹھنڈا ہونے پر اس کی ٹکڑیاں کاٹ لیں اور چاندی کے ورق سجادیں۔ مزے دار مٹھائی تیار ہے نہایت فخر سے مہمانوں کو پیش کریں۔

ڈوٹس

250 گرام  
ایک عدد  
دو کھانے کے چمچے

اشیاء :  
مدہ  
انڈہ  
مکھن یا گھی

### مشورہ

ایک لڑکی پولیس اسٹیشن گئی اور بولی ”سر میرا شوہر دو دن پہلے آلوٹے لے گیا تھا۔ ابھی تک واپس نہیں آیا۔“ انسپکٹر۔ ”تو آپ کچھ اور پکالو۔“

و شیخ زمرہ۔ سمندری

### آخری خواہش

ایک دفعہ تین آدمیوں کو سزائے موت سنائی گئی تینوں کو تختہ دار پر لے جایا گیا سب سے پہلے مسلمان سے اس کی آخری خواہش پوچھی گئی۔

اس نے کہا کہ وہ دو رکعت نفل ادا کرنا چاہتا ہے لہذا اس کی خواہش پوری کرنے کے بعد اسے تختہ دار پر چڑھایا گیا لیکن تختہ خراب ہو گیا اور اس کی جان خلاصی ہو گئی۔

اس کے بعد بیٹے سے اس کی آخری خواہش پوچھ کر پوری کی گئی اور اسے تختہ دار پر چڑھادیا مگر خراب تختے نے اس کی بھی جان بچائی اب سردار جی کی باری آئی اس کی آخری خواہش پوچھی گئی سردار جی نے جھنجھاکر کہا۔

”تاہنجاروں۔ خواہش کو مارو گولی، پہلے تختہ ٹھیک تو کراؤ۔“

رضوانہ ملک، طاہرہ ملک۔ جلال پور پیروالا

### میں الو ہوں

مالک (نوکر سے) ”بچاس بار کان پکڑ کر اٹھو اور بیٹھو اور کہو میں الو ہوں۔ ورنہ آج تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔“

نوکر۔ ”جناب بچاس بار تو کیا میں سو بار کان پکڑ کر اٹھ بیٹھ سکتا ہوں مگر آپ کو الو کیسے کہہ سکتا ہوں۔“

مدیحہ نورین مہک۔ برنالی

### زخمی

ایک لال بیگ زخمی حالت میں پڑا تھا۔ دوسرا لال بیگ۔ ”کیا ہوا“ ہٹ لگی ہے یا چپل پڑی۔“

پہلا۔ ”نہیں یاریہ لڑکیاں دیکھ کر اتنا چلاتی ہیں کہ دل کا دورہ پڑ گیا۔“

### بہن بھائی

شوہر بیوی آپس میں لڑ رہے تھے۔ لڑاکا بیوی کا پارا بہت ہائی ہو گیا اور اس نے اپنے شوہر کو کہا۔

”تم سے تو اچھا تھا کہ میں کسی شیطان سے شادی کر لیتی۔“

شوہر نے حیرانگی سے لباسا نس لیتے ہوئے کہا۔ ”توبہ توبہ۔ استغفار۔ بھلا بہن بھائی کی بھی شادی ہو سکتی ہے؟“

حما واچا۔ کراچی

### فیصلہ

مولوی صاحب میٹرو بس پر اچھرہ سے شاہد رہے جارہے تھے۔

پچھلی سیٹ پر ایک عورت بار بار اپنے بچے سے کہہ رہی تھی۔

”بیٹا! یہ سوہن حلوہ کھاؤ ورنہ میں ان مولوی انکل

آں۔

نرہت بانو۔ اسلام آباد

کو دے دوں گی۔“  
جب خاتون نے چوتھی مرتبہ بھی یہی کہا تو مولوی صاحب بولے۔

”بہن جی، جلد فیصلہ کر لو! آپ کی وجہ سے میں پہلے ہی چار اشاپ آگے آچکا ہوں۔“  
فرح بشیر۔ بھاول نگر

### دوباتیں

بیوی۔ ”تم مجھے ایسی دوباتیں بولو کہ ایک سے میں خوش ہو جاؤں اور دوسری سے مجھے غصہ آجائے۔“  
شوہر۔ 1۔ تم میری زندگی ہو۔  
2۔ اور لعنت ہے ایسی زندگی پر۔

### سودا

ایک بندے نے کلا شکوف کا سودا کیا۔  
دکان دار۔ ”یہیں پر لٹی ہے تو چالیس ہزار اور اگر گھر پہنچوانی ہے تو ایک لاکھ۔“  
گاہک۔ یہ تو ایک لاکھ اور لاہور پہنچا دو۔“  
دکان دار۔ ”ٹھیک ہے گھر پہنچ کر فون کرنا۔“  
گاہک نے گھر پہنچ کر فون کیا گھر پہنچ گیا ہوں۔“  
دکان دار۔ ”ٹھیک ہے کلا شکوف تمہاری گاڑی کے نیچے بندھی ہوئی ہے۔“

نسرین نانہ۔ گوجرانوالا

### ٹیکنالوجی کی جنگ

Google نے کہا ”ایک لفظ لکھو ہزاروں رزلٹ دیں گا۔“  
Wikipedia بولا۔ ”ایک لفظ لکھو ہزاروں Pages دیں گا۔“  
Internet بولا۔ ”میرے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔“

Computer بولا۔ ”تو کون سا میرے بغیر چل سکتا ہے۔“  
یہ سن کر بجلی ہنسی اور بولی۔ ”بولے جاؤ میں چلی

### ایمپائر

میرے عشق کی باؤ لنگ نے  
اس کے دل کی وکٹ تو گرا دی  
لیکن  
میری تقدیر تو دیکھو! اس کا باپ  
ایمپائر نکلا۔

ارشد محمود۔ فیصل آباد

### امت مسلمہ

ایک لڑکا اپنے دوست سے  
”یونیورسٹی میں میرا رزلٹ چیک کر کے بتانا۔  
میرے ساتھ ابو ہوں گے۔ اگر ایک مضمون میں فیل  
ہوں تو کہنا۔ مسلمان کی طرف سے سلام۔ اگر دو میں  
فیل ہوں تو کہنا۔ مسلمانوں کی طرف سے سلام۔  
دوست رزلٹ دیکھ کر آیا اور کہا۔  
”پوری امت مسلمہ کی طرف سے سلام۔“  
عائشہ بشیر۔ بھائی پیرو

### رشتہ

مرغی کا رشتہ کوئے سے ہو گیا۔ جب مرغی کو پتا چلا  
تو وہ مرغی کے پاس گیا اور بولا۔  
”میری آواز پورے شہر میں گونجتی ہے، مرغیوں کی  
یونین کا پریذیڈنٹ بھی ہوں۔“  
مرغی۔ ”میں تمہارے جذبات کی قدر کرتی ہوں  
لیکن امی ابو کی خواہش ہے کہ  
لڑکا اچھے فوٹس میں ہو۔!“

اریبہ خان۔ نواب شاہ

### خطا

ایک نئے قیدی نے اپنے ساتھی کو بتایا۔  
”میں چوری کے جرم میں پکڑا گیا ہوں، ویسے خطا

میری ہی تھی۔“  
 ”وہ کیسے؟“ دوسرے قیدی نے پوچھا۔  
 ”وہ ایسے کہ میں نے اس کو ٹھہری کے کتے سے دوستی کرنے میں پورا ایک مہینہ لگا دیا مگر چوری کی رات میرا پاؤں کو ٹھہری کی پٹی پر جا پڑا۔“

عورت ”جی ہاں تھی تو لیکن اب وہ سب خرچ ہو چکی ہے۔“

ہانیہ ایانہ۔ کراچی

### تیز ترین

ایک امریکی اور پاکستانی بچے کے درمیان لفظی جنگ ہو رہی تھی۔ دونوں کا خیال تھا کہ اس کا باپ دنیا کا تیز ترین آدمی ہے۔  
 ”دیکھو! امریکی بچے نے کہا میرا باپ 500 گز دور نشانے پر فائر کرتا ہے اور اس کے ساتھ دوڑ پڑتا ہے۔ گولی کے نشانے تک پہنچنے سے پہلے وہ نشانے تک جا پہنچتا ہے۔“

”بس۔! پاکستانی بچے نے کہا۔“ میرا باپ سرکاری ملازم ہے۔ دفتر سے ان کی چھٹی چار بجے ہوتی ہے چھٹی کرتے ہی وہ گھر لوٹتے ہیں اور ساڑھے تین بجے گھر پہنچ جاتے ہیں۔“

مول آفتاب۔ کراچی

### گیس کا بل

ایک بوڑھی عورت کا گیس کا بل 50 ہزار آگیا۔ بوڑھی عورت بل لے کر گیس کے دفتر پہنچی اور بولی۔

”اوائے بے غیرتوں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ جہنم کی آگ کے لیے گیس کا پائپ کیا میرے گھر سے جا رہا ہے۔“

### حصہ

طلاق کے مقدمے میں مجسٹریٹ نے عورت سے سوال کیا۔  
 ”مجسٹریٹ۔ اس آدمی میں ضرور کوئی خاصیت رہی ہوگی جس کی وجہ سے تمہارے اس سے شادی کی تھی؟“

ایک مولوی صاحب گاؤں کی مسجد میں درس رہے تھے۔

”روزوں کے بدلے جنت میں آپ کو اپنی ہی بیوی حوروں کی سردار بن کر ملے گی۔“  
 یہ سن کر ایک دیہاتی نے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی کو کہنی ماری اور آہستہ سے اس کے کان میں سرگوشی کی۔  
 ”بترہ روزے رکھ!“

رفعت جبین۔ ملتان

### شبہ

ایک صاحب بہت غصے میں پولیس اسٹیشن پہنچے اور اس ایچ او سے بولے۔  
 ”میں بے حد پریشان ہوں مجھے دھمکی آمیز خطوط مل رہے ہیں۔“  
 ”یہ تو بڑا جرم ہے آپ کو کسی پر شبہ ہے؟“ ایس

ایچ او نے دریافت کیا۔  
 ”شبہ کیسا؟ مجھے یقین ہے کہ یہ خطوط انکم ٹیکس والے بھیج رہے ہیں۔“ انہوں نے جواب دیا۔  
 سچا مسلمان انیلا۔ قصور

ایک آدمی تلوار لیے مسجد میں گیا اور آواز لگائی۔  
 ”آپ میں کوئی سچا مسلمان ہے۔“ ایک بزرگ بولے  
 ”میں ہوں۔“

آدمی ان کو باہر لے گیا اور ان کے قدموں میں بکرا فنج کیا پھر مسجد میں گیا تلوار سے خون نچک رہا تھا۔  
 لوگ گھبرا گئے وہ بولا ”اور کوئی سچا مسلمان ہے۔“  
 کسی نے آواز لگائی ”مولوی صاحب ہیں۔“  
 مولوی غصے سے بولے۔ ”بکو اس کر رہا ہے یہ میں تو

اعلان کروانے آیا تھا کہ پرسوں سے کیبل نہیں آرہی ہے۔“

حنا کرن۔ پتو کی

### اچھی بیوی

اچھی بیوی دنیا کے ہر کونے میں مل جاتی ہے۔

مگر مسئلہ یہ ہے کہ۔

دنیا گول ہے اور کونا نہیں ملتا!!!

### دھمکی

ہر بیوی اپنے شوہر کو اکثر یہ دھمکی ضرور دیتی ہے۔  
”میں تو بچوں کی وجہ سے رکی ہوئی ہوں ورنہ تمہیں کب کی چھوڑ جاتی۔“  
شادی کے دس سال بعد یہ دھمکی سن کر ایک شوہر بولا۔

”دیکھو! سب بچوں کی شادی ہو گئی ہے اب تو اپنا وعدہ پورا کر لو۔“

بیوی۔ ”میں ذرا پوتے کی شادی تو دیکھ لوں۔“

حنا فرحان۔ راجن پور

### احتیاط

نئے پروفیسر نے بوڑھے پروفیسر سے پوچھا۔  
”کلاس کو لیکچر کیسے دیا جاتا ہے؟“

”بہت آسان ہے۔ کلاس میں جا کر کھڑے ہو کر آہستہ سے لیکچر شروع کرو۔ جب لیکچر ختم ہو تو احتیاط سے چلتے ہوئے کلاس سے نکل جانا۔“

”احتیاط سے کیوں؟“

”اس لیے کہ کلاس تمہارے پاؤں کی آواز سے جاگ نہ جائے۔“

فرزانہ جاوید۔ کراچی

### بیگم کی ہنسی

کل میں نے اپنی بیگم سے فخریہ انداز میں کہا ”تم نے دیکھا کل رات پارٹی میں ایک عورت مجھے دیکھ کر

مسکرائی تھی۔“

بیگم نے قطعی برا نہیں منایا اور بولیں۔ ”یہ میرے لیے کوئی نئی بات نہیں، جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تو میری ہنسی بھٹوٹ گئی تھی!“

### صحت مند پاگل

ڈاکٹر نے پاگل خانے میں نئے آنے والے ایک مریض کا معائنہ کیا تو وہ اسے دماغی لحاظ سے صحت مند دکھائی دیا۔ ڈاکٹر نے اس سے پوچھا۔ ”کیوں میاں، یہاں کیسے پہنچے؟“ مریض نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا ”دراصل کچھ عرصے پہلے میں نے ایک بیوہ عورت سے شادی کر لی تھی۔ اس عورت کی ایک جوان بیٹی تھی۔ وہ لڑکی میرے باپ کو پسند آگئی اور اس نے اس سے نکاح کر لیا۔ یوں میری بیوی، میرے باپ کی ساس بن گئی۔ کچھ عرصے بعد میرے باپ کے گھر بچی پیدا ہوئی۔ یہ رشتے میں میری بہن ہوئی، کیوں کہ میں اس کے باپ کا بیٹا تھا۔ دوسری طرف وہ میری نواسی بھی لگتی تھی، کیوں کہ میں اس کی نالی کا خاوند تھا۔ گویا میں اپنی بہن کا نانا بن گیا۔ پھر کچھ مدت بعد میرے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ ایک طرف وہ لڑکی میرے بیٹے کی سوتیلی بہن لگتی تھی، کیوں کہ وہ بچہ اس کی ماں کا بیٹا تھا اور دوسری طرف وہ اس کی دادی بھی لگتی تھی، کیوں کہ وہ میری سوتیلی ماں تھی۔ چنانچہ میرا بیٹا اپنی دادی کا بھائی بن گیا اور میں اپنے بیٹے کا بھانجا۔“

ڈاکٹر صاحب نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا اور چیخ کر کہا۔ ”چپ ہو جاؤ ورنہ میں بھی پاگل ہو جاؤں گا۔“

بیاسام۔ فیصل آباد

☆ ☆

# حُسن وِصِیَّت

ادارہ

انسانی صحت کے لیے قدرت کا حسین تحفہ



## ناریل

قدرت نے ہمیں بات سی نعمتیں عطا کی ہیں۔ ان ہی نعمتوں میں پھل اور سبزیاں بھی شامل ہیں جو ہماری صحت کے لیے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ہر پھل اور سبزی میں کوئی نہ کوئی ایسی خاصیت ضرور ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ انسانی زندگی کے لیے لازمی بن جاتی ہے۔ ڈاکٹر زبھی اس بات پر متفق ہیں کہ اپنی صحت اور فٹنس کے لیے زیادہ سے زیادہ سبزیوں اور پھلوں پر انحصار کیا جائے۔ آج ہم آپ کے لیے جس پھل کا تذکرہ کر رہے ہیں اسے ناریل (کھوپرا) کہتے ہیں۔ ناریل انتہائی خوش ذائقہ اور میٹھا پھل ہوتا ہے جو بہت شوق سے کھایا جاتا ہے اس کا پانی خاص طور پر بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔

کھانوں میں بہتر ذائقہ کے لیے ناریل کا استعمال کیا جاتا ہے ناریل کے استعمال سے نہ صرف کھانوں میں ذائقہ برہ جاتا ہے بلکہ یہ ہاضمہ کے نظام کو درست کرنے میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے اس کے استعمال سے آنتوں اور جگر کے افعال میں بھی بہتری پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ بات ہم سب ہی جانتے ہیں کہ ناریل کے پانی کو دنیا کے محفوظ ترین پانی کی حیثیت دی جاتی ہے اس کا پانی بہت شوق سے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے پانی کو استعمال کرنے سے جگر کی گرمی، تلوؤں اور ہتھیلیوں کی گرماہٹ کو کم کیا جاتا ہے یہ جگر، تلوؤں اور ہتھیلیوں کو ٹھنڈک پہنچانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

ناریل وہ پھل ہے جس نے صدیوں سے انسانوں پر اپنی افادیت ثابت کر رکھی ہے۔ بے شمار فوائد رکھنے والے اس پھل کا درخت بھی اپنی مثال آپ ہوتا ہے۔

اسے جنت کا تحفہ بھی کہا جاتا ہے جبکہ بغض لوگ اسے فطرت کی سپر مارکیٹ بھی پکارتے ہیں۔ یہ پھل زیادہ تر مرطوب ممالک میں پایا جاتا ہے اور ان ممالک میں اس پھل کو بطور خوراک، مشروب اور صحت بخش چکنائی کے استعمال کیا جاتا ہے اس کے گودے خاص طور پر فائبر سے بھرپور ہوتے ہیں۔ جس طرح قدرت نے ہر پھل اور سبزی میں کوئی نہ کوئی خاصیت رکھنی ہے اسی طرح ناریل بھی اپنی بہت سی خصوصیات کی وجہ سے قدرت کا ایک ایسا بہترین اور نایاب تحفہ ہے جو مجموعی طور پر آپ کے پورے جسم کی حفاظت کے لیے بے حد مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ روغن ناریل کے علاوہ ناریل کا پانی اور گودا نہ صرف آپ کی صحت کے لیے ایک انمول تحفہ ہے بلکہ اس سے تیار کی گئی کریم کو آپ کی خوب صورتی کی ضمانت سمجھا جاتا ہے۔

## ناریل کے چند فوائد

☆ ناریل کے پانی کو خاص طور پر گرمی میں باقاعدگی سے استعمال کرنا چاہئے کیونکہ اس کے استعمال کرنے

سے پورے دن آپ کو گرمی کا احساس نہیں ہوتا یہ پورے دن آپ کے لیے پریکلی ہیٹ کا کام کرتا ہے۔

☆ ناریل کی یہ خوبی ہے کہ یہ آپ کی جلد کو نہ صرف ٹھنڈک کا احساس دلاتا ہے بلکہ جسم کے داغ دھبوں کے نشانات کو بھی صاف کرنے میں بھرپور مددگار ثابت ہوتا ہے۔

☆ ناریل کے تیل کو صدیوں سے بالوں کی نشوونما اور صحت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

☆ اب چونکہ زمانہ نے ترقی کر لی ہے لہذا مختلف قسم کے شیموز اور ہینو کنڈیشنرز مارکیٹ میں دستیاب ہیں لیکن ان شیموز اور ہینو کنڈیشنرز کی تیاری میں بھی ناریل کے تیل کو استعمال کیا جاتا ہے۔

☆ ناریل کے تیل میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہے کہ یہ آپ کے بے جان اور خشک بالوں میں نہ صرف جان دلاتا ہے بلکہ ان کی نشوونما میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔

☆ بہت سے لوگوں کا تو یہاں تک خیال ہے کہ ناریل کا تیل بالوں کے ہر مسئلہ کے لیے مفید ثابت ہوتا ہے۔

☆ ناریل کے پانی کو دنیا کا سب سے محفوظ اور صحت بخش مشروب کہا جاتا ہے۔

☆ ناریل کے تیل کی افادیت پر دنیا بھر میں تحقیقات ہو رہی ہیں اور ہر نئے دن اس کی کوئی نہ کوئی خوبی سامنے آتی ہے۔

☆ اس میں شامل Kasha کو بالوں کی نشوونما کے لیے لاجواب قرار دیا گیا ہے۔

○ مشرقی خواتین زیادہ تر اپنے بالوں کی نشوونما کے لیے ناریل کا تیل ہی استعمال کرتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ان کے بال مغربی خواتین کے مقابلے میں زیادہ دلکش دکھائی دیتے ہیں۔

○ ناریل کی یہ بھی خوبی ہے کہ اس کے استعمال سے نہ صرف آپ کی رنگت میں نکھار پیدا ہوتا ہے بلکہ اس کے استعمال سے آپ کا نظام ہاضمہ بھی درست رہتا ہے۔

○ ناریل کی یہ خوبی ہے کہ یہ نہ صرف چربی کو پکھلاتا ہے بلکہ ویسٹروول کو بھی کنٹرول کرتا ہے۔ یہ جسم کے گوشت کے اندر پوشیدہ زہریلے جراثیم کو بھی ختم کرتا ہے۔

○ ناریل کی پسندیدگی کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ یہ پھل کھانے میں بہت مزے دار ثابت ہوتا ہے۔

ناریل کی مندرجہ بالا خوبیوں کے علاوہ یہ مختلف قسم کی مصنوعات کی تیاری میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے مثلاً "صابن"، "لوشن"، "کریم"، "ہونٹوں پر لگانے والا بام" وغیرہ کے لیے ناریل سے نکالے جانے والا تیل انتہائی اہم کردار ادا کرتا ہے۔

ناریل کے پھل سے دو طرح کے تیل نکالے جاتے ہیں

Virglincoconut Oil Vco 1

2 - دوسرا خشک کھوپرے سے نکالا جانے والا تیل جس میں وٹامن "ای" کی خاصی مقدار موجود ہوتی ہے۔

ناریل کے تیل اور کڑی پتا میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ یہ سفید ہوتے ہوئے بالوں کے لیے بے حد مفید ثابت ہوتے ہیں ان دونوں کا ملاپ بالوں کے لیے کرشماتی ثابت ہوتا ہے۔

تھوڑے سے کڑی پتے لے کر گرائنڈر میں تھوڑا سا پانی ڈال کر پیسٹ تیار کر لیں پھر اس میں دو کپ ناریل کا تیل ملا کر گرم کر لیں۔ اس وقت تک گرم کرنا ہے جب تک اس سے بھانپ نہ اٹھنے لگے۔ اس کے بعد اسے ٹھنڈا کر کے کسی بوتل میں محفوظ کر لیں اور سفید ہوتے ہوئے بالوں میں لگائی رہیں اور دیکھیں کہ قدرت نے ان چیزوں میں کیا خوبیاں چھپا رکھی ہیں۔

بہر حال اس بات میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ ناریل ایک انتہائی صحت بخش اور سودمند پھل ہے جو کسی بھی موسم میں صحت اور تندرستی کے لیے کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ ۱۹۷۸ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں  
یہ سوال و جواب شائع کیے جا رہے ہیں۔



ذوالقرنین



عین طفیل۔ کراچی

س اگر یہ صحیح ہے کہ صحت کا اثر ہوتا ہے تو کیا وجہ  
ہے کہ کانٹوں پر پھول کی صحت کا اثر نہیں ہوتا؟  
ج دونوں میں ضد چل رہی ہے۔ بالکل اگرچہ زور  
دار ہیں لیکن نہ پھول کانٹوں کا اثر لینے پر رضامند ہیں  
اور نہ ہی کانٹے۔

منصوری۔ کمرشل سینٹر

س آپ اتنے خوب صورت کیسے ہو گئے۔ کیسے یہ  
سب فیشن اینڈ لولی کا کمال تو نہیں ذوالقرنین جی؟  
ج فیشن اینڈ لولی کا اشتہار دیکھ کر تو کسی سیاہ ترین جلد  
کے مالک کا بھی دل ایسی کریم استعمال کرنے کو نہیں  
چاہے گالی بی۔

فرح دیبا۔ کراچی

س کہیں الو بولتے تو جگہ ویران ہو جاتی ہے۔ اگر  
ذوالقرنین بولے تو جگہ کا کیا حال ہوتا ہے؟  
ج احباب کو گمان ہوتا ہے کہ جشن بہاراں کا سماں  
ہے۔

شہناز اختر۔ ڈلوال

س آہستہ سے بتادیں۔ جو ناول آپ کے نام سے آ  
رہا ہے۔ وہ آپ کس سے لکھوا رہے ہیں؟  
ج ایک بے مکر نام ہم تمہیں کیوں بتائیں اس کا۔  
شبانہ عینی۔ کراچی

س فوٹی بھیا! اتنے اہتمام سے تیار ہو کر کیوں بیٹھے  
ہو کیا بھابھی کا انتظار۔؟  
ج بات یہ نہیں بلکہ معاملہ یوں ہے کہ تمہاری  
بھابھی کو ہمارا انتظار ہے۔

رضیہ حمید۔ شکار پور

س آسمان پر چمکتی کمکشاں اور دلہن کی جھلملاتی  
مانگ میں سے آپ کو کون سی چیز پسند ہے؟  
ج دونوں بہت دور ہیں مجھ سے۔

ثمینہ کوثر۔ ملتان

س نہیں بھیا! آپ کے ہر ناول کا ہیرو سگریٹ پیاسگار  
ہی کیوں پیتا ہے۔ کچھ اور کیوں نہیں؟  
ج پاکستان میں ان دو چیزوں کے ساتھ صرف چائے  
پینے کی اجازت ہے۔

اس ماہ کا بہترین خط

افشاں سمیع۔ گھونکی

فیض احمد فیض نے کہا تھا نہ حکایتیں نہ شکایتیں، لیکن ہمارے پاس تو حکایتیں بھی ہیں اور شکایتیں بھی ہیں۔ شکایتیں کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں، لیکن شکایتیں ضرور بیان کریں گے۔ کیونکہ شکایتیں اپنوں سے ہی بیان کی جاتی ہیں اور آپ ہمارے اپنے ہی تو ہیں۔ سب سے پہلے تو بہن حاصل کرنے کا مرحلہ ہی آسان نہیں ہوتا۔ بک اشال کے چکر کاگا کر تھک جاتے ہیں تب کہیں کرن کا دیدار نصیب ہوتا ہے چکر کا مطلب شاید آپ نہ سمجھ پائیں کہ آپ بڑے شہر میں رہتی ہیں جہاں ہم رہتے ہیں وہاں چکر کا مطلب 40 کلومیٹر جی ہاں 20 کلو میٹر دور سے رسالہ ملتا ہے۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم پہنچتے ہیں تو رسالہ ختم ہو چکا ہوتا ہے۔

کرن ہاتھ میں آتا ہے تو دل چاہتا ہے جلدی سے بڑھ لیں، لیکن افسوس کہ وصال یا فقط آرزو کی بات نہیں چھ میں ہمارے ذمے جو کام ہیں وہ تو ہمیں کرنا ہی ہوتے ہیں۔ صبح آنا گوندھ کر پرانے پکانا پھر گھر کی صفائی پھر یونٹن کے لیے بچے آجاتے ہیں پھر دوپہر کا کھانا کھا کر نماز اور شام کی چائے تک ہمارا اور کرن کا ساتھ ہوتا ہے۔

غم جاناں اور غم دوراں سے نظر بچا کر کچھ مل کرن کے ساتھ گزارتے ہیں۔ کہیں اشک، کہیں تبسم۔ سچ بات یہ ہے کہ کرن ہمیں اس لیے پسند ہے کہ اس میں ہلکی پھلکی تحریریں ہوتی ہیں، لیکن اب کچھلے چند ماہ سے کچھ تبدیلی محسوس ہوتی ہے۔ اشک زیادہ ہیں۔ تبسم کم ہے۔

کچھ اپریل کے کرن پر بھی اپنی رائے کا اظہار کردوں۔ سرورق بہت زبردست تھا۔ لینا شاہ، عمران رضوی اور صنم جنگ سے ملاقات اچھی رہی۔ لینا شاہ کا انٹرویو بڑھ کر احساس ہوا کہ پاکستان کی خواتین بھی کسی سے کم نہیں

ہیں۔ ایسی خواتین کو دیکھ کر ہم لوگوں کا حوصلہ بلند ہوتا ہے۔ حسن و صحت میں مینی کیور کا طریقہ جس طرح سے اسٹیب بائے اسٹیب اتنی تفصیل سے دیا گیا ہے کہ اس کی اہمیت ہم چھوٹے شہروں میں رہنے والوں سے پوچھیں جہاں پارلر جانا بھی ایک دشوار مرحلہ ہوتا ہے۔ "مقابلہ ہے آئینہ" میں روبینہ لیاقت کے جواب اچھے تھے، لیکن اس کو ذرا اور دلچسپ بنائیں۔

"میں گمان نہیں یقین ہوں" نمیلہ ایر راجہ کی قسط شاندار تھی۔ امیر علی بے شک معذور ہیں، لیکن ان کا دماغ تو کام کر رہا ہے وہ اپنی مینی کے بارے میں تو درست فیصلہ کر سکتے ہیں یا بیوی کے ساتھ مینی کو بھی بھول گئے۔

فرحین اظفر کا ناول "ردائے وفا" ایک دلچسپ موڑ پر آگیا ہے پر میری اتنی گزارش ہے کہ ہر کردار اس ناول میں پریشان ہے کسی کے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہو رہا۔ ایک بابا خوش تھی تو حبیب کا بیٹا آگیا۔ دنیا میں اب سارے لوگ پریشان نہیں ہیں جہاں کچھ غم ہیں وہاں خوشیاں بھی ہیں۔ "ایک ساگر ہے زندگی" میں کردار اب کچھ واضح ہوئے ہیں کہانی آگے بڑھی ہے یہ قسط اچھی لگی گزشتہ اقساط میں کہانی ست روی کا شکار تھی۔

پلیز میرا یہ پیغام فاخرہ گل تک ضرور پہنچا دیں کہ خدارا اگر ان کے پاس کوئی کہانی ہے تو آگے بڑھا میں نہیں تو ختم کر دیں۔

صائمہ اکرم کی تحریر اثر انگیز تھی "منتہا" بھی اپنے ماں باپ کی طرح خود غرض تھی، اسے اپنے والدین سے سبق سیکھنا چاہیے تھا اور لوگوں کے طعنوں کا منفی اثر لینے کے بجائے مثبت اثر لیتی، لیکن خوش نصیب تھی کہ اس کا واسطہ اچھے لوگوں سے رہا۔

در ثمن، شہناز صدیق اور شبانہ شوکت کی ہلکی پھلکی رومانوی کہانیوں نے پرچے کو چار چاند لگا دیے۔ عتیقہ ملک نے "دیا" میں حقیقت کی صحیح تصویر کھینچی

ہے۔ ایک غلط عورت کیسے پورے گھر کو تباہ کر دیتی۔ میرا کا انجام اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ لیکن ارباز درانی کا انجام بھی دکھانا چاہیے تھا۔ میرا کو گمراہی کی طرف لے جانے والا وہی تھا، صائم کو اپنے والدین کی نافرمانی کی سزا ملی، لیکن عرفان کا کیا قصور تھا؟

”صلہ“ بڑھ کر احساس ہوا عورت اولاد کی خاطر بدترین مرد کو بھی جھیلنے پر مجبور ہوتی ہے چاہے اس کا تعلق کسی بھی طبقے سے ہو۔

”یادوں کے درتپے میں نئے شعرا کی غزلیات بھی شامل کیجئے۔“

”کرن کا دسترخوان“ دیکھ کر منہ میں پانی آگیا۔ گرمی کی مناسبت سے دال اور سبزیوں کی مختلف ترکیبیں دیں کیوں کہ گھر والے ایک ڈالنے اور ایک جیسے کھانے کھا کر اب جاتے ہیں۔

ج۔ پیاری انشاں! آپ نے کہا کہ ہر کہانی ناول ناولٹ پر تفصیل سے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ بہت اچھا خط لکھا آپ نے.... آپ ہمیں باقاعدگی سے ہر ماہ خط لکھیں تاکہ ہم آپ کی رائے سے آگاہ ہو سکیں۔

### شگفتہ مسکان

آج ہم نے بہت کر کے اپنی خاموشی توڑ دی کیونکہ محبت کو ہمیشہ اظہار کی ضرورت پڑتی ہے۔

ہمیں کرن سارے کا سارا بہت پسند ہے۔ سارے سلسلے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ ہم سب سے پہلے ”حمد اور نعت“ کے بعد ”نامے میرے نام“ میں چھلانگ لگا دیتے ہیں کیوں کہ ہمیں شائندہ اور نوزیہ شمر کا بصرہ جو پڑھنا ہوتا ہے، میں ”میری بہنیں اور میری خالہ بہت شوق سے کرن پڑھتے ہیں اب تو ہم کرن کی مستقل قاری بن گئی ہیں۔ ہمیں آپ سے یہ پوچھنا تھا کہ کیا ”شام آرزو“ دوبارہ شائع ہو گا یا نہیں۔ کیونکہ وہ ہمارا فرسٹ فیورٹ ناول تھا۔ ”فرحانہ ناز ملک“ کی موت کا سن کر دل دکھ سے بھر گیا۔ اللہ انہیں جنت میں جگہ دے۔

ج۔ اچھی شگفتہ! آپ نے اپنے خط میں صرف محبتوں کا اظہار کیا، کرن کی کسی تحریر، ناول، انساں پر اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا۔

فرحانہ ناز ملک کی المناک موت پر ہمیں بھی بہت دکھ ہے۔ ان کا ناول دوبارہ کیسے شروع کر سکتے ہیں۔ وہ تو دنیا سے

رخصت ہو چکی ہیں انہوں نے صرف ناول ہی ادھورا نہیں چھوڑا اور بھی بہت سے کام ادھورے رہ گئے ہیں۔ ابھی تو انہوں نے اپنے بچوں کو پروان چڑھانا تھا، ان کی خوشیاں دیکھنا تھیں۔ مشیت ایزدی کے سامنے صبر کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔

### فائزہ بھٹی۔ چٹوکی

ہمارے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ خط کو شہر جا کر ڈاک خانے میں ڈالنا پڑتا ہے شہر کافی دور پڑتا ہے۔ خود جانے کی اجازت نہیں ہے اور دوسروں کی منتیں کرنے میں دو دو ماہ گزر جاتے ہیں۔ اب جبکہ امتحانوں کی وجہ سے ایک موقع میسر آیا ہے تو ہم نے پھر دن دیکھنا ڈیٹ دماغ کی بھی ہزار دلیلیوں کو رد کرتے ہوئے قلم اٹھایا اور اب ہم ہیں اور آپ اور ہمارے قلم کی روانی۔

یہ جی آپ کی رائے میں نا، فرحین اظفر بہت باکمال معلوم ہوتی ہیں۔ قارئین کو کس طرح پکڑ کر رکھنا ہے، خوب جانتی ہیں ان کا ناول ابھی سے معلوم ہوتا ہے خوب چلے گا۔ ناول میں سوہا کے دیور صاحب ہمارے فیورٹ کردار بنتے جا رہے ہیں۔ ان کی جو ”خاموشیاں“ ہیں نا بہت متاثر کن ہیں۔

دوسرا سلسلہ دار ناول بھی اچھا جا رہا ہے۔ آپ جو مکمل ناول دیتے ہیں نا، بہت خوب صورت ہوتے ہیں۔ ناولٹ بھی خوب ہوتے ہیں، قصہ مختصر ہر چیز ہی زبردست ہوتی ہے، مگر سب سے زیادہ ”آر جے“ لوگوں کے انٹرویو دل کو بھاتے ہیں۔

اتنی تعریفوں کے بعد اب ایک شکایت بھی سنئیے میں پہلے بھی تین چار خط آپ کو بھیج چکی ہوں جن میں سے دو خط سامنے آئے اور اب ایک درخواست، ایک محبت بھرا مکمل ناول نبیلہ عزیز سے بھی لکھوائیں جو کہ صرف مکمل ناول پر مشتمل ہو۔

ج۔ پیاری بہن! ہمیں اندازہ ہے کہ ہماری جو قارئین دیہی علاقوں میں رہتی ہیں۔ خط پوسٹ کرنا ان کے لیے اتنا مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ آپ کی کرن سے محبت کی ہم دل سے قدر کرتے ہیں۔ خط شائع نہ ہو سکے۔ آپ کی اس شکایت پر ہمیں حیرانی ہوئی۔ ہمیں آپ کے خط موصول ہی نہیں ہوئے۔ موصول ہوتے تو ضرور شائع کرتے۔

نبیلہ عزیز اپنی پھوپھی کی بیماری کی وجہ سے یریشان

ہیں۔ ان کا ناول شعلہ میں چل رہا ہے، وہ اس کی قسط بھی نہیں لکھ پارہی ہیں۔ آپ دعا کریں کہ ان کی پھوپھی ٹھیک ہو جائیں۔ پھر وہ آپ کے لیے ناول لکھ سکیں گی۔

عائشہ خان۔ ٹنڈو محمد خان، سندھ

اپریل کا کرن تھوڑا لیٹ ملا، اس لیے تبصرہ بھی تاخیر سے جھیتج رہی ہوں۔ شائع ضرور کیجئے گا، مہربانی ہوگی۔ سب سے پہلے ٹائٹل کی بات ہو جائے بہت ہی اعلیٰ ماڈل کے ڈریس کا کلر تو زبردست ہے۔ میک اپ مہندی... ایوری تھنگ سب ہی پاری لگی۔

انٹرویوز میں ختم جنگ اور عمران رضوی کا اچھا لگا۔ لینا شاہ مجھے بالکل بھی پسند نہیں۔

"انسانوں میں" "صلہ" بیسٹ رہا۔ صلہ کہانی ان مردوں کی ہے جو عورت کی خدمت گزاری اپنا حق سمجھتے ہیں۔ جبکہ اگر یہی صورت حال عورت کو درپیش ہو تو مرد نگاہ حیرانے لگتا ہے۔ بھلا ہو نگلیں کے بچوں کا... جو ماں کا خیال کیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی اولاد کو نیک اور صالح بنائے۔ آمین۔ سویرا فلک اس بار بہت اچھی تحریر لائیں۔ کیپ اٹ اپ۔

در تمن بلال کا "پچھڑنے کے دن" ایک پرسوز ملال سے بھرپور و اسٹوری تھی جس کا اینڈ بیسی تھا۔ بہت خوب در تمن بلال۔

"مقابل ہے آئینہ میں" روینہ لیاقت سے مل کر خوشی ہوئی۔

ج۔ بہت شکریہ عائشا

رضوانہ ملک۔ جلالپور پیر والا

اپریل کا شمارہ حسب معمول 12 کو ملا، خوب صورت، نئی ماڈل کو دیکھ کر دل خوش ہو گیا، عمران رضوی، صنم جنگ اور لینا شاہ سے ملاقات اچھی رہی۔ "مقابل ہے آئینہ" میں روینہ لیاقت کے جوابات اچھے لگے۔

ام طیفور کا افسانہ "کتھا" پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا کہ مہرا النساء اپنے بیٹوں کے ہوتے ہوئے بھی تنہا ہی رہیں ماں باپ تو اپنے بچوں کے لیے بہت کچھ کرتے ہیں، لیکن پھر بھی اولاد کی طرف سے صلہ نہیں ملتا۔

شبانہ شوکت کا افسانہ بھی بہت اچھا تھا اس میں ذونا عائشہ نامی پیرا لگا اور ہمایوں کی نوک جھونک بھی اچھی لگی۔

در تمن بلال اور سویرا فلک کے افسانے بھی اچھے تھے۔ "ردائے وفا" میں ناملہ کی شادی حدید سے نہیں ہوئی چاہیے تھی اب جب اس کی شادی ہو ہی گئی ہے اور اس کا راز بھی نہیں کھلا تو اسے اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہونا چاہیے تھا کہ جس نے اسے دو مردوں کی نظروں میں گرنے سے بچایا، بجائے اس کے کہ وہ اس اور سوہا میں لڑائیاں کروانے میں لگی ہوئی ہے۔ "اک ساگر ہے زندگی" میں تھینکس گاڈ کہ نفیسہ سعید نے ماضی سے پردہ اٹھایا۔ نبیلہ ابر راجہ کا ناول "میں گمان نہیں یقین ہوں" بہت اچھا ہے، زیان، ایک کی کزن ہے اور لگتا ہے کہ وہ ہی اس کی بے سفر بنے گی۔ شناز صدیق کا ناول "آؤں بہار" بھی اچھا تھا اس میں شاذ کی صبا پر کتنی کچھ زیادہ تھی۔ عتیقہ ملک کے ناول میں "دیا" کے ساتھ کافی برا ہوا۔ وہ بے چاری تو بہت معصوم تھی، لیکن اسے دردناک موت ملی۔ سمیرا کی حقیقت صائم پر آشکار ہوئی چاہیے تھی اس نے اپنی ساری زندگی تو عیش میں گزاری، لیکن اس کے کیے کی سزا عرفان کو ملی صائمہ اکرم کا ناول بھی بہت اچھا تھا۔ منتہا نے عنایہ کے ساتھ بہت برا کیا اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، وہ تو اس کے ساتھ بہت مخلص تھی اسے اپنی بیسٹ فرینڈ سمجھتی تھی، لیکن منتہا نے تو عنایہ سے اس کی محبت بھی چھین لی۔ "کرن کا دسترخوان" میں ساری دشمن زبردست تھیں۔ شبنم اکرم کے تبصرے بہت اچھے ہوتے ہیں۔

ج۔ بہت شکریہ رضوانہ

وٹیکہ زمرہ۔ سمندری

ماڈل بہت ہی پاری لگے، عمران رضوی اور صنم جنگ کے انٹرویوز پسند آئے۔ لینا شاہ کو پہلی بار دیکھا ہے اچھی لگی، لیکن میں ریڈیو نہیں سنتی۔ "اک ساگر ہے زندگی" اچھا جا رہا یہ پہلے تو نازیہ کے ماں بننے کا ذکر تو کہیں نہیں آیا کہیں صباحت بھابھی نے تو اپنا بیٹا نہیں دیا اور جھوٹ بولا نازیہ کا بیٹا ہے۔ "ردائے وفا" ناملہ بہت ہی بے وقوف ہے۔ کبھی نہ کبھی تو یہ راز کھلے گا، اپنے انجام کا سوچ لے جو اس اور سوہا کے درمیان دوریاں پیدا کر رہی ہیں۔ صائمہ اکرم کا "منتہا" ساری زندگی اداکاری کر کے جیتنے والی آخر حسنا سے ہار گئی۔ اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی اولاد جیسی نعمت سے محروم رہ کر اپنی غلطی مان ہی گئی کہ وہ غلط تھی۔ "دیا" صائمہ تو مر گیا

لیکن نمبر کو سخت سزا ملنی چاہیے تھی ساری غلطیاں تو اسی کی تھیں، تصور تو اس کا تھا اور سزا عرفان کو ملی، ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ نبیلہ ابرار راجہ کی تو کیا ہی بات ہے ابھی تک تو ہٹ جا رہا ہے۔ ناولٹ ”سالا خالہ اور اوپر والا“ فاخرہ جی اب اسے ختم کر دیں۔ ”اذن بہار“ شاذور کی پابندیاں بے جا نہیں تھیں۔

”تیری غفلتوں کو خبر کہاں“ ڈونائش اور ہمایوں کی نوک جھونک اچھی لگی۔ درخشن کا ”پچھڑنے کے دن“ زرش پر بہت ترس آیا ہے چارے چھ سال ظلم سہتی رہی باقی دونوں افسانے بھی پسند آئے۔ ”مقابلہ ہے آئینہ“ روینہ لیاقت سے ملاقات اچھی رہی۔ مستقل سلسلے بھی پسند آئے۔ اچھا جی اب اجازت پھر حاضر ہوں گے ابھی تو ہم گندم کی کٹائی میں مصروف ہونے لگے ہیں۔

ج - پیاری وثیقہ! آپ گندم کی کٹائی کرتی ہیں؟ اتنی کری میں اتنی محنت کا کام۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے دیہی ملاقوں کی خواتین بہت جفاکش اور مخنتی ہوتی ہیں۔ ہمارے کسان محنت کر کے پورے ملک کو اناج سپلا کرتے ہیں پھر بھی انہیں ان کی محنت کا صلہ نہیں ملتا۔ کرن کی پسندیدگی کے لیے ممنون ہیں۔

صدرہ وزیر۔ (پبل) خوشاب

اس بار کرن 12 کول گیا۔ ”میری بھی سنیے“ میں صنم جنگ کا انٹرویو بہت پسند آیا۔ اس ماہ شہناز صدیق کا ناولٹ اچھا لگا۔ نبیلہ ابرار راجہ آپ کی تو کیا بات ہے۔ ”میں گمان نہیں یقین ہوں“ کا اگلے ماہ بے چینی سے انتظار رہے گا۔ درخشن معذرت کے ساتھ آپ کا افسانہ کچھ دل کو نہیں لگا۔ مستقل سلسلے اچھے تھے۔ ”یادوں کے درتکے“ میں اپنا نام پا کر بہت خوشی ہوئی، جن رائٹرز کی مٹی میں سالگرہ ہے ان کو بہت بہت سالگرہ مبارک ہو۔ فرحت اشتیاق صاحبہ سے ریکوسٹ ہے کہ پلیز کرن کے لیے کوئی ناول لکھیں نی وی ڈرامے تو ان کے چل رہے

ہیں۔ پلیز 101 اسلام آباد کے ڈی جے حسین رضا کا انٹرویو شامل کریں۔ پلیز۔۔۔

ج - پیاری صدرہ! بہت شکریہ آپ نے ہمیں خط لکھا، آپ کی فرمائش فرحت اشتیاق تک پہنچا رہے ہیں۔

ثناء شہزاد۔ کراچی

میں اتنی بے زار ہو رہی تھی، مگر کرن کو دیکھ کر میری ساری کوفت رنو چکر ہو گئی۔ جلدی سے ”نامے میرے نام“ پڑھا، سب کے تبصرے لاجواب تھے، بعد شہزاد کے (بابا) کچھ بہنوں نے میرے تبصرے کی تعریف کی ان کا بہت بہت شکریہ۔ یہ آپ لوگوں کی محبت ہے ورنہ میں اس قابل کہاں۔

سرورق اچھا لگا ماڈل کا ڈریس اور مہندی بہت اچھی لگی۔ انٹرویوز اس بار اچھے نہیں لگے بس ٹھیک تھے، افسانے چاروں ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ ”تیری غفلتوں کو خبر کہاں“ میں جہاں ہمایوں کی محبت نے ہنسایا وہیں ام طیفور صاحبہ کی ”کتھا“ نے بہت رلایا۔ ”پچھڑنے کے دن نہیں“ اور ”صلہ“ بھی اچھے موضوع پر لکھے گئے افسانے تھے۔ راہم کی محبت کو ملا کر اچھا اختتام کیا۔ ”صلہ“ میں شوہر کی بے بسی پر غصہ آیا ایک بیوی اپنے شوہر کے ہر سکھ دکھ میں جب اس کا ساتھ دیتی ہے اس کا خیال رکھتی ہے تو شوہر کیوں اپنی بیوی کو اکیلا چھوڑ دیتا ہے۔

”اذن بہار“ شہناز صدیق نے بھی اچھا لکھا۔ شاذور صبا سے اتنی محبت کرتا تھا کہ اس کے انکار نے اس سخت جاں کو توڑ کے رکھ دیا ویسے صبا نے صحیح فیصلہ کر کے اسے برباد ہونے سے بچالیا۔ ویلڈن شہناز صاحبہ۔

سلسلے دار ناول ”ردائے وفا“ بہت اچھے سے آگے کا سفر طے کر رہا ہے یہ ناول بالکل سادہ ہے اس میں کوئی بھی بات ذہن کو الجھا نہیں رہی۔ نفیسہ سعید کا ”ایک ساگر ہے زندگی“ بھی بہت زیادہ اچھا ہے، مگر اس کہانی میں ذہن

### اعتذار

فاخرہ گل کا ناولٹ ”خالہ، سالا اور اوپر والا“ کی قسط تاخیر سے موصول ہونے کی بنا پر اس ماہ شامل اشاعت نہ ہو سکی۔ اس کے لیے ہم قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔ ان شاء اللہ آئندہ ماہ آپ یہ قسط پڑھ سکیں گی۔

بعض جگہوں پر آکر الجھ جاتا ہے جیسے کہ اب ہوا ہے۔  
ایشال سالار کا بیٹا ہے تو پھر شاہ زین کون سے اور ابھی پچھلی  
اقساط میں شاہ زین کی ماں حبیبہ کو دیکھ کر چونکی کیوں تھیں  
اور اس کا پورا بائوڈیٹا بھی شاہ زین سے بوجھ رہی تھی آگے  
جا کر یہ کہانی بہت دلچسپ موڑ لے گی، مجھے ابھی سے اندازہ  
ہے۔ مکمل ناول زیادہ متاثر نہ کر سکے بس صحیح لگے اور نبیلہ  
ابراہیم نے بھی ویسا نہیں لکھا جو ان کا خاصہ تھا۔ ابھی تو اتنا  
خاص نہیں لگ رہا۔ دیکھتے ہیں آگے چل کر کیا رنگ لائے  
گا۔ "مقابل ہے آمینہ" میں روینہ لیاقت کے جوابات  
اچھے لگے۔ کیا میرے جوابات آپ کو پسند نہیں آئے جو  
مجھے اس سلسلے میں جگہ نہیں مل رہی۔  
ج۔ پیاری ثنا! آپ کو ضرور جگہ ملی گی۔ تھوڑا انتظار  
کریں۔

ہیں کہ ہیروئین یا اس کی اماں سب کام چھوڑ کر نماز پڑھنے  
لگیں تو یقیناً کرس خود بہ خود اپنے اور شرمندگی سی ہونے  
لگتی ہے فوراً "ڈائجسٹ چھوڑ کر نماز کے لیے اٹھتی ہوں۔  
ہم لوگ رائٹر کے پھیلائے ہوئے ماحول میں اپنے آپ کو  
بھی فٹ کر لیتے ہیں۔

"مسکراتی کرئیں" مسکراتے پر مجبور کر دیتی ہیں۔  
"کرن کا دسترخوان" مزادے جاتا ہے۔ اب دیکھیں  
"نامے میرے نام" میں ہمارا نام بھی ہوتا ہے کہ نہیں۔  
ج۔ پیاری آسیہ ہم تو آپ لوگوں کے خطوط کے منتظر  
رہتے ہیں۔ یہ سلسلہ آپ بہنوں کے خطوط کے لیے ہی  
شروع کیا ہے۔ بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے خط لکھا۔ آپ  
کی تعریف و تحقید مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

امبر گل۔ جھڈو سندھ

آسیہ ارم۔ ملیر کراچی

کرن ڈائجسٹ 14 تاریخ کو شوہر صاحب نے لا کر  
دیا۔ صنم جنگ کا انٹرویو اچھا تھا، معلومات میں اضافہ ہوا۔  
صنم جی میک اپ کے بغیر زیادہ اچھی لگتی ہیں۔ "حسن و  
صحت" میں مینی کیور سے بہت ساری چیزیں سیکھنے کو ملیں۔  
اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف "اک ساگر ہے  
زندگی" میں زینب والی کہانی بہت پسند ہے۔ فرما پر بہت  
غصہ آتا ہے بہن کے لیے اتنا شاہ خرچ اور بیوی بچوں کے  
لیے تنگ دل۔ حبیبہ کا کردار سمجھ نہیں آیا کہ عورت تو  
بھرے بازار میں سمجھ جاتی ہے کہ کوئی ہے جو مسلسل دیکھ  
رہا ہے اللہ نے یہ حس رکھی ہے عورت میں، مگر محترمہ اتنی  
معصوم ہیں کہ شاہ زین کے التفات کو سمجھ کر ہی نہیں دے  
رہیں۔ "ردائے وفا" میں بھی اس دفعہ مزا نہیں آیا اور  
معاف کیجئے گا رائٹر صاحب آپ نے جو حدید کے بارے میں  
اس دفعہ یہ بتایا ہے کہ نائلہ اور اس میں ازدواجی تعلقات نہ  
ہونے کے برابر ہوتے ہیں مجھے تو آج تک ایسا کبھی بھی نظر  
نہیں آیا کہ بیوی بھلے سے پسند نہیں، مگر اپنا حق لینا کبھی  
بھی نہیں بھوتا مرد۔ فخرہ گل کی اچھی کاوش ہے ایسی مزا  
دیتی کہانیاں ماحول کو ہلکا پھلکا کر دیتی ہیں۔ باقی تمام کہانیاں  
اچھی ہیں۔ آپ سب رائٹر سے گزارش ہے کہ نماز کی  
طرف زیادہ سے زیادہ مائل دکھایا کریں اپنے کرداروں کو۔  
میں پرسنل آپ لوگوں کو بتا رہی ہوں کہ پڑھنے والوں پر اس  
کا بہت اثر ہوتا ہے جب وہ بار بار نماز کے بارے میں پڑھتی

گرمیوں کی آمد ہو چکی ہے تو لاسٹ کلرزا اگر ماڈلز نے پنہ  
ہوں تو پھر نائٹل + نائٹل گرل دونوں ہی آنکھوں کو بھاتے  
ہیں قصہ مختصر نائٹل اچھا تھا۔ فہرست کو دیکھا تو کافی  
زبردست رائٹر کے نام جگہ گار ہے تھے جن میں سرفہرست تو  
میری بہت پیاری اور عزیز از جان دوست رائٹر "ام  
طیفور" کا نام تھا۔ جتنا اچھا نام اتنا ہی اچھا کام "کتھا" نے  
تو سیدھا زخم، جگر، دل، گردے، کلیجے سب کو چھو لیا  
گویا "حقیقتاً" بہت زبردست لکھا ہے اسپیشلی نظم  
بہت زبردست لگی اور حقیقتاً مجھے تعلیم کی کہانی نے  
زار زار رلا ڈالا اللہ تعالیٰ کریں زور قلم اور زیادہ۔  
(آمین)

"تیری غلطیوں کو خبر کہاں" شبانہ شوکت نے بھی اچھا  
لکھا ہلکی پھلکی سی تحریر کو پڑھ کر مزا آیا۔ سوہرا فلک نے بھی  
"صلہ" تو بہت ہی خوب لکھا، عورت کا اصلی روپ یہی ہے۔

سلسلے وار ناولز میں صرف "ایک ساگر ہے زندگی" پڑھا  
باقی ابھی کرن تقریباً "سارا ہی پڑھنے والا رہتا ہے۔  
انٹرویوز میں سے صنم جنگ کا انٹرویو اس لیے اچھا لگا  
مجھے شاید کہ وہ خود بہت اچھی لگتی ہیں اور کافی جی اور مخلص  
قسم کی ویسے ان کی باتیں بھی مزے دار تھیں۔ "مقابل  
ہے آمینہ" میں روینہ لیاقت کے جوابات بھی اچھے تھے۔  
"حسن و صحت" کا سلسلہ ادارے کی جانب سے ایک اچھا  
تحفہ ہے "نامے میرے نام میں" تقریباً "سب کے بھرے

ہی زبردست تھے مجھے شکایت ہے۔ اگر کوئی مستقل قاری کافی عرصے سے تبصرہ نہ کر رہا ہو تو کوئی تو ہو جو حال چال پوچھ لے اس کا۔ اور اسپیشلسی و یکم بیک تو میں ”در ضمن بلاں“ کو کرنا چاہوں گی کہ چلو جیسے بھی سہی آپ کی واپسی واپسی تو ہوئی ہماری دنیا میں اور اب ہماری دو عدد بہت پیاری تبصرہ نگار اور میری پیاری دوستوں سدرہ سحر عمران اور ثمرین حبیب آپ دونوں کو اپنی زندگی کا نیا سفر شروع کرنے پر بے حد مبارکباد۔

ج۔ سدرہ سحر عمران اور ثمرین حبیب کو ہماری طرف سے بھی مبارکباد اور دعائیں پیاری امیر! آپ کے تبصرے تو ہمیشہ ہی بہت اچھے ہوتے ہیں۔ اس بار بھی بہت اچھا تبصرہ کیا۔ خوش رہیں۔

فوزیہ ثمرین، ام ہانیہ عمران۔ گجرات

اپریل کا کرن چودہ تاریخ کو ملا۔ کچھ کچھ دیکھا ہوا تھا۔ اس لیے مجھے کچھ خاص نہیں لگا۔ کرن کا پہلا اسٹیج اچھا تھا۔ لڑکی کی شرٹ ڈیزائن خوب صورت تھا۔

سب سے پہلے حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول قبول سے دل و ذہن کو معطر و شاد کیا۔ شاہین صاحبہ اب اچھے اچھے لوگ سے متعارف کروا رہی ہیں۔ ”میری سنیہ“ میں صنم جنگ سے ملاقات مزے کی رہی۔ یہ تو میرے پیارے بھائی (عمران صاحب) کی فیورٹ اداکارہ ہے۔

”مقابل ہے آئینہ میں“ روینہ لیاقت کا دوسرا سوال کا جواب بہت اچھا تھا۔

ایسا آئینہ کہاں سے خریدا جو آپ کو کھری کھری سنا رہا ہے۔ باقی کے جوابات بھی اچھے تھے۔ کیا میں ہانیہ عمران کے جوابات اس میں شامل کر سکتی ہوں۔ آپ شائع کر دیں گی۔ ”حسن و صحت“ سلسلہ ہمیشہ کی طرح اچھا تھا۔

سلسلہ وار ناول۔ ”اک ساگر ہے زندگی“ کو سب سے پہلا پڑھا۔ اس بار کی قسط دلچسپ رہی۔ جب فریاد زینب سے نمس لی ہو کر آتا ہے تو سخت غصہ آتا ہے۔ زینب کی بے بسی پر کہاں تک میرے خیال ہے۔ حبیب زینب کی تیسری بیٹی ہے اور آنے والا شخص سالار جو ہے وہ زینب کے پاس آیا ہے۔ آئندہ قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ میرے خیال کہاں تک درست ہے۔ زین شاہ یا تو سالار کا بیٹا ہے جو اس نے ایڈاپٹ کیا تھا۔

”روائے وفا۔“ ناول کو شرم نہیں آئی ایسی حرکتیں کرتے ہوئے۔ خدا نے اگر اس کے گناہ کا پردہ رکھا ہے تو اسے خود کو سنبھالنا چاہیے یہ کیا بات ہوئی۔ وہ پھر سے کھوئی محبت کو پانے کے چکروں میں پڑ گئی ہے۔

اور یہ کیا بابے چاری سے اتنا دھوکا ہوا ہے بہار میں خزاں کا موڑ آگیا۔ کیا دونوں بہنوں کو شادی کے بعد مشکلات ہی مشکلات ہیں۔ وہاں ناول نے سوبا سے ہر باندھا لیا ہے اللہ ہی حافظ ہے دونوں بہنوں کا۔ قتل کردار اپنی اپنی جگہ مس فٹ ہیں۔ پتا نہیں کیوں کبھی کبھی اللہ پاک بھی ایسی مس فٹ جوڑیاں کیوں بنا دیتا ہے کہ ساری زندگی ڈر ڈر کے گزرتی ہے۔

مکمل ناول صائمہ اکرم کا ”منتہا“ پڑھا۔ سپر سپر ہٹ تحریر تھی۔ میری یادداشت کے مطابق یہ کافی عرصہ بعد آئی ہیں۔ آئیں اور چھاسی گئیں۔ صائمہ کی تحریریں۔ خوب صورت۔ اور دل و دماغ میں نقش رہ جانے والی ہوتی ہیں۔

”دیا“ عتیقہ ملک کا ناول بھی اچھا تھا۔ بلکہ عبرت ناک تھا۔ صائمہ کے ایک غلط فیصلے سے کتنی زندگیوں کو خوشیاں نہ ملیں۔

آئیں گمان نہیں یقین ہوں ”باقی آئندہ یہ رکھ چھوڑا۔ کیوں کہ دو تین اکٹھی اقساط پڑھ کر ہی کچھ کہانی کا سر پیر پتا چلے گا۔

ناولٹ ”سالا خالا اور اوپر والا۔“ مزاحیہ جملوں اور فقروں کی بھرمار تھی۔ نہیں نہیں تو دل کھول کر سننا چاہتا ہے۔ اور کہیں یہ دل سے پوچھنا پڑتا ہے۔ کیا (ایہ گل تے ہنسنا سی) کیا اس بات پہ ہنسنا تھا۔

خالہ کو تو آپ نے ایویں ہی اولا رکھا ہے۔ اب جن لوگوں کی شادیاں نہیں ہوئیں کیا وہ عقل سے فارغ ہو جاتے ہیں۔

میرے خیال میں علی اور چندا کی شادی کروا کے چین کا شادی دفتر بھی بند کروائیں اور اس تحریر کو بھی۔ مجھے ہنس تپ چڑھتی ہے خالی کی حرکتوں سے۔

”اذن بہار“ یہ تحریر بس سو سو ہی رہی۔ کوئی خاص متاثر نہیں کر سکی۔

بس وہی پرانا شکوہ۔ کہ رائٹر صاحبہ کو ایسے دل لٹانے والے ہیروز کہاں سے مل جاتے ہیں۔

افسانے سب ہی اچھے تھے پہلے آپ کو ”کتھا“ کے بارے میں بتائی ہوں۔ ام طیفور۔ آپ نے تو بس رلاتے کاٹھیکا لے رکھا ہے۔ قسم سے جب بھی آپ کی تحریر کو پڑھا ہے۔ آپ تحریر سمیت دل میں نقش ہو جاتی ہیں۔ آپ کی تعریف کرتے کرتے یوں ہی ایک خیال آیا ہے۔ کیا آپ کوئی کامیڈی مزاحیہ سی تحریر لکھ سکتی ہیں ہمارے لیے۔ ایسی تحریر جس میں دکھوں کے نوحے نہ ہوں۔ بلکہ زندگی کی خوشیاں۔ مسرتیں ہوں۔

”پچھڑنے کے دن“ در شمن جی واہ جی واہ خوش کیستا

افسانہ ”تیری غفلتوں کی خبر کہاں“ یہاں ایک باوفا باکردار، بیرو صاحب تھے۔ جو اپنی ہیروئن کو خوشی خوشی اپنے دل اور اپنے گھر میں بسا کے لے گئے۔

”صلہ“ بھی اچھا تھا محنت اور محبت بھی رائیگاں نہیں جانی چاہیے عورت کی ہر بیا مرد کی۔

لو جی چودہ تاریخ کو کرنا ملا تھا۔ جسے چار دن میں مکاؤ والا ہے۔ ہے ناں ہمت کی بات۔ مستقل سلسلے اچھے تھے۔

”نامے میرے نام“ ہمیشہ کی طرح سدا کی دلچسپی کا سلسلہ ہے۔ حرا قریشی۔ نشا نورین کا تبصرہ ہمیشہ اچھا لگتا ہے پڑھنا۔ رضوانہ ملک کا یہ کہنا کہ پورا کرنا سات آٹھ گھنٹوں میں پڑھ ڈالا بڑی حیرت ہوئی۔ امیر گل کرن سے اپنی ناراضی چھوڑو اور حاضری دو۔ تمہیں سویرا یاد کرتی ہے۔

ج۔ پیاری فوزیہ! آپ کرن کی مستقل تبصرہ نگار ہیں اور ہمیشہ ہی آپ کے تبصرے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ ہانیہ عمران کے جوابات ضرور لکھیں۔ ہم شائع کریں گے۔

طاہرہ ملک، رضوانہ ملک۔ جلال پور پیر والا

میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ آپ نے میری پہلی کاوش کو کرن کی زینت بنایا۔

کرن 14 تاریخ کو مائٹل گرل نے فوراً ہی توجہ سمیٹ لی مائٹل گرل سے ہیلو ہائے کے بعد عمران رضوی، صنم جنگ، لینا شاہ، اور روبینہ لیاقت سے ملاقات کی اور ہمیشہ کی طرح شاہین رشید کے چمکتے ستاروں سے مل کر بہت اچھا لگا، روبینہ لیاقت آپ کی خوبیاں خامیاں مجھ سے ملتی ہیں ”حسن و صحت“ ویلڈن جی آپ نے گھر بیٹھے مینی کیور

کرادیا۔

”اک ساگر ہے زندگی“ نفیسہ سعید شکر کہ آپ ماضی سے پردہ اٹھانے کے لیے تیار ہو گئی ہیں۔ زینب بے چاری بہت ترس آتا ہے فریاد جیسے مرد عورتوں کی زندگی خراب کرتے ہیں۔ بیوی سے 50 روپے کے لیے تفتیش اور بھائی کے لیے یعنی جانے کی کوششیں، شاہ زین کافی اچھا لڑکا ہے حبیب کا صحیح حقہ اردو ہی ہے ”تیری غفلتوں کو خبر کہاں“ شاہ شوکت بہت اچھا لکھا آپ نے شروع میں ہی لگ رہا تھا کہ ہمایوں ہی ذونا کشہ کا ہم سفر بنے گا، ان کی نوک جھونک کافی اچھی لگی ”منتہا“ بہت ہی زبردست ناول تھا۔ میں تو پڑھ کے حیران رہ گئی کہ منتہا جیسی سوچ رکھنے والے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ کتنی بد قسمت بھی جسے اتنے پیارے لوگ ملے اور وہ ان کی قدر نہ کر سکی ”ام طیفور“ جی بہت اچھے موضوع پر لکھا آپ نے۔ آج کل کی تو المیہ ہے ہمارے معاشرے کا۔

”روائے وفا“ فرحین جی یہ کیا کیا۔ انس، سوبا اور حدید جیسے سلیج ہوئے اور اچھے لوگوں میں ناملہ جیسی بلا بھیج دی، حدید جیسا لڑکا ناملہ کو تو نہیں ڈرو کرتا تھا اور ناملہ کو تو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اللہ نے اس کا عیب چھپا لیا مگر وہ تو اوروں کی زندگی کو عذاب بنانے پر تلی ہوئی ہے ”میں گمان نہیں یقین ہوں“ بہت زبردست ناول ہے ”دیا“ میں بے چاری دیا کے بارے میں پڑھ کر بہت افسوس ہوا معصوم سی بڑی بیہوش کی خواہشات کی بھینٹ چڑھ گئی لیکن صائم کو سمیرا کی حقیقت اس کی زندگی میں ضرور پتا چلنی چاہیے تھی۔ عرفان کی حالت یہ بہت افسوس ہوا ماں کے لیے گناہوں کی سزا اسے مل گئی۔ صلہ ”سویرا فلک“ آپ نے عورت کی خود سے منسلک رشتوں کے بارے میں محبت بہت اچھے انداز میں دکھائی۔

ج۔ طاہرہ اور رضوانہ کرن کی ہر تحریر کے بارے میں آپ نے تفصیلی رائے دی۔ بہت شکریہ۔ سندھ بھی خط

لکھتی رہیے گا۔





دھنیا پسا ہوا  
سرکہ  
دو کھانے کے چمچے  
سو گرام  
دو کھانے کے چمچے  
دو چائے کے چمچے  
دو کھانے کے چمچے  
دو سو پچاس گرام  
ایک چائے کا چمچہ  
ترکیب :

### اچار، چٹنیاں، سلاد اور رائتے

اچار، چٹنیاں، سلاد اور رائتہ دسترخوان کا دل پسند  
جزو ہیں ان کے بغیر دسترخوان ادھورا ادھورا سا لگتا  
ہے۔ کھانے میں کچھ کمی رہ جائے تو یہ چیزیں ان کمی کو  
کو بڑی عمدگی سے پورا کرتی ہیں اور دسترخوان کی زینت  
برہانے میں بہترین معاون ہوتی ہیں۔

اچار

### کیری کا اچار

ایک کلو  
دو سو گرام  
ایک کھانے کا چمچہ  
ایک کھانے کا چمچہ  
ایک چائے کا چمچہ

اشیاء :  
کیری  
لسن پسا ہوا  
نمک  
رائی پاؤڈر  
کلو بجی

کیروں کو ٹکڑوں میں کاٹ لیں اس میں نمک اور  
سرکہ ملا کر دو تین دن کے لیے دھوپ میں رکھ دیں۔  
دو یا تین دن کے بعد جب کیریاں نرم پڑ جائیں تو اس  
میں لسن پسا ہوا، پسا ہوا زیرہ، ہلدی پاؤڈر، رائی پاؤڈر،  
سرخ مرچ پاؤڈر، میٹھی پسلی ہوئی، دھنیا پسا ہوا اور کلو بجی  
اچھی طرح مکس کر لیں تیل گرم کریں اس میں آدھا  
چائے کا چمچہ میٹھی دانہ آدھا چائے کا چمچہ رائی، آدھا  
چائے کا چمچہ کلو بجی ایک چائے کا چمچہ ثابت زیرہ  
، تھوڑی سی ثابت سرخ مرچیں۔ چھ یا سات لسن کے

# چٹخارے

کر رکھ دیا جائے اور اگلے دن اس کا پانی کسی چھاننے میں ڈال کر نچوڑ لیں۔ سارے مسالے تھوڑے سے تیل میں ملا کر آموں پر اچھی طرح لگا دیں اور پھر باقی بچا ہوا مسالا بھی آموں کے ساتھ ہی مرتبان میں ڈال کر تیل شامل کر دیں۔ آم تیل میں اچھی طرح ڈوبے ہوئے ہونے چاہئیں۔ پندرہ بیس دن میں بہترین اچار تیار ہو جائے گا۔ لذیذ ترین اچار ہے۔

## اچار آم نمبر 2

اڑھائی کلو  
ایک پاؤ  
آدھا چھٹانک  
ایک چھٹانک  
ایک چھٹانک  
آدھا چھٹانک  
حسب ضرورت  
آدھا چھٹانک

اشیاء :  
کچے آم  
نمک  
سونف  
پیتھی کے بیج  
سرخ مرچ  
رائی  
تیل  
کلو بجی

جوے ڈال کر بگھار لیں۔ تیل کو ہلکا ٹھنڈا کریں اس میں مسالا ملی ہوئی کیریاں ڈال دیں اور ایک ٹیپے کے یا چینی کے مرتبان میں محفوظ کر لیں۔ عرصے تک خراب نہیں ہوگا۔

## اچار آم نمبر 1

اڑھائی کلو گرام  
75 گرام  
ایک پاؤ  
50 گرام (پسی ہوئی)  
ایک کلو  
75 گرام  
75 گرام  
حسب پسند (پسی ہوئی)

اشیاء :  
آم (اچاری)  
کلو بجی  
نمک  
ہلدی  
سرسوں کا تیل  
سونف  
متبھرے  
سرخ مرچ  
ترکیب :

آموں کو کاٹ کر ایک پاؤ نمک خوب اچھی طرح لگا





ہندی  
ہینگ  
سونٹھ

ایک چھٹانک (پسی ہوئی)  
آدھا چھٹانک  
آدھا چھٹانک

ترکیب :

میں رکھ دیا جائے تاکہ پانی اچھی طرح سے خشک ہو جائے۔ روزانہ اس کو ہل کر دیکھتے رہیں اور کم از کم چار دن تک اسے دھوپ میں رکھیں اور جب پانی اچھی طرح سے خشک ہو جائے تو سرسوں کا تیل ڈال دیں۔ تیل اتنی مقدار میں ڈالیں کہ تمام تر آم اس میں اچھی طرح سے ڈوب جانے چاہئیں۔ چار پانچ دن میں یہ لذیذ ترین اچار تیار ہو جائے گا۔ مزے مزے سے تناول فرمائیں۔

گاجر کا اچار

اشیاء :

گاجر

ایک کلو

لال مرچ پسی ہوئی

دو چائے کے چمچے

لہسن کے جوئے کٹے ہوئے 135 گرام

(چھوٹے جوئے ثابت رہنے دیں اور بڑے جوئے کاٹ لیں)

ہری مرچ لمبی والی

250 گرام

سب سے پہلے تمام مسالاجات کو اچھی طرح سے کوٹ لیا جائے، لیکن میتھی کے بیج الگ رکھ لیے جائیں۔ انہیں مسالاجات میں شامل نہ کریں۔ کوٹے ہوئے مسالوں میں تھوڑا سا سرسوں کا تیل ملا کر ان کا ملیدہ سا بنا لیا جائے۔ آموں کو اچھی طرح سے دھو کر ان کی چار چار عدد پھانکیں اس طریقے سے کاٹ لیں کہ وہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں۔ اس کے بعد پھانکوں میں سے گٹھلیاں نکال کر پھینک دیں اور ان کی جگہ تیل ملا ہوا مسالا بھر دیا جائے۔ انہیں کسی برتن میں رکھتے جائیں۔ اب جس برتن میں اچار ڈالنا چاہتے ہیں مسالا بھرے ہوئے آم اس میں ڈال دیے جائیں اور باقی مسالا اور میتھی کے بیج بھی مرتبان میں ڈال کر ڈھکن بند کر کے اس کے منہ پر کپڑا باندھ کر دھوپ

# چٹخارے

دیں۔ 'آج درمیانی رکھیں۔ ابال آجائے تو چولہا بند کر دیں۔ اچار تیار ہے۔ ٹھنڈا ہو جائے تو کھا کر دیکھیں۔

## کھٹائیٹھا لیموں اچار

لال سرکہ پھلوں کا  
ہلدی  
تیل  
نمک  
نمک  
135 ملی لیٹر  
ایک چائے کا چمچ  
225 ملی گرام  
حسب ذائقہ  
گاجر کو لگانے کے لیے

ترکیب :

اشیاء :  
لیموں۔ پتلے چھلکے کے  
اجوائن  
کالا نمک  
چینی  
نمک  
سرخ مرچ پاؤڈر  
ترکیب :  
ایک کلو  
پندرہ گرام  
ایک چائے کا چمچ  
دو سو پچاس گرام  
دو سو پچاس گرام  
کھانے کا ایک چمچ

گاجروں کو پھیل کر لمبائی میں کاٹ لیں پھر ان میں نمک لگا کر رکھ دیں۔ آدھے گھنٹے کے بعد گاجروں کو دھو دیں۔ ہری مرچیں لمبائی میں کاٹ کر بیج نکال لیں۔ انہیں گاجر میں شامل کر دیں اور ساتھ ہی نمک ہلدی لال مرچ اور لہسن شامل کر کے اچھی طرح ملا لیں۔ اب اس میں سرکہ اور بغیر گرم کیا ہوا تیل ملا لیں۔ استعمال کرنے سے پہلے اسے چوبیس گھنٹے کے لیے فریج میں رکھیں۔

## کھیرے کا اچار

اشیاء :

نمک، اجوائن، سرخ مرچ پاؤڈر، کالا نمک اور چینی کو مکس کر لیں۔ ہر لیموں کے چار ٹکڑے کاٹ لیں۔ اس میں مسالا بھر دیں۔ انہیں ٹیشے کے خشک مرتبان میں ڈال دیں اور دس دن کے لیے دھوپ میں چھوڑ دیں۔ ایک ماہ کے اندر یہ براؤن رنگت اختیار کر لے گا۔  
نوٹ : آپ اسے دو سے تین سال تک کے لیے اسٹور کر سکتے ہیں۔

## مکس اچار

اشیاء :  
گاجر  
مولی  
مٹر  
لیموں  
(برائے لیمن جوس)  
نمک اور پانی  
شالجم  
سو گرام  
سو گرام  
سو گرام  
پانچ سے چھ عدد یا زیادہ  
حسب ضرورت  
سو گرام

کھیرا  
اورک، لہسن پسا ہوا  
رائی  
لال مرچ  
ہلدی  
شکر  
سرکہ  
تیل  
پیاز  
آدھا کلو  
کھانے کا ایک ایک چمچ  
چائے کا ایک چمچ  
کھانے کا ایک چمچ  
چائے کا ایک چمچ  
کھانے کے دو چمچ  
ایک پیالی  
کھانے کا ایک چمچ  
ایک عدد

ترکیب :

تیل گرم کر کے رائی، اورک، لہسن اور پیاز باریک کاٹ کر ڈالیں۔ پیاز سنہری ہو جائے تو دیگر مسالے اور کھیرا باریک کاٹ کر شامل کر دیں، ساتھ سرکہ بھی ڈال



اچھی طرح سے ملا دیں اور دھوپ میں سلھائے ہوئے  
صاف مرتبان میں منتقل کر کے اسے سیل کر دیں یہ اچار  
لگی ماہ تک خراب نہیں ہوتا۔

### بڑے لیموں کا اچار

ایک کلو  
دو چائے کے چمچے  
دو چائے کے چمچے  
دو کھانے کے چمچے  
ایک چائے کا چمچ  
ایک کھانے کا چمچ  
آدھا چائے کا چمچ  
دو کھانے کے چمچے

اشیاء :  
بڑے لیموں  
سرخ مرچ پاؤڈر  
کلوچی  
سرسوں کا تیل  
ہلدی پاؤڈر  
رائی پاؤڈر  
ہنگ  
نمک

### ترکیب :

بڑے لیموں کی قاشیں کاٹ لیں۔ تمام مصالحے  
اور تیل ملا دیں۔ اچھی طرح مکس کریں۔ کسی مرتبان

سو گرام  
سو گرام

پھول گو بھی  
آم کا اچار کا مسالا  
برائے ترکا

تیل  
ہنگ  
رائی

### ترکیب :

سبز یوں کو صاف کر کے دھولیں۔ اور برابر سائز میں  
کاٹ لیں۔ نمک کے پانی میں چوبیس گھنٹے کے لیے  
بھگو دیں۔ اچھی طرح پانی نھاریں۔ کسی کپڑے پر  
پھیلا دیں۔ اور ایک دن ہوا میں خشک ہونے کے لیے  
رکھ دیں۔ ایک برتن میں مسالا، لیموں جوس اور سبز یوں  
کو مکس کر لیں تیل گرم کریں۔ اس میں رائی اور ہنگ  
ڈال کر کڑکڑائیں۔ سبز یوں میں ڈال دیں۔ اور نمک  
ڈال کر اچھی طرح سے مکس کر لیں۔ حسب ذائقہ  
نمک چکھ لیں۔ اگر کم ہو تو اور نمک ملا دیں۔ دو دن بعد

# چٹخارے

میں منتقل کرویں۔ اور دھوپ میں رکھ دیں۔

## اچار اہلی

اشیاء :

اہلی  
مقوف آم

زیرہ  
خشک کھجور

مغز پستہ  
سرخ شکر

ایک چھٹانک

چار چائے کے چمچے

نصف چائے کا چمچ

دو عدد

دس عدد

دو کھانے کا چمچے

اشیاء :

پھول گو بھی

آلو

میں زیرہ شامل کر دیا جائے اور جب کھی کر کڑانا بند کر دے تو باقی کے تمام مسالاجات ڈال کر خوب اچھی طرح سے پکائیں اور پھر اتار کر ٹھنڈا کر لیا جائے۔ سات دن کے بعد یہ مزے دار اچار تیار ہو گا۔ لذت اور ذائقے میں نہایت ہی لاجواب اچار ہے۔

## سبز یوں کا اچار

ایک عدد۔ پھول الگ کر لیں  
تین عدد۔ چھیل کر چھ ٹکڑے



چینی

اورک

سبز مرچ

ترکیب :

دو کھانے کے چمچے

ایک انچ کا ٹکڑا

دو عدد

ہری مرچ ثابت

سیم کی پھلی

منر

اچار میں ڈالنے والے مسالے

کٹی ہوئی لال مرچ

رائی

باریک پیس لیں

سرکہ

آٹھ عدد

دس عدد۔ تین ٹکڑے کر لیں

دس عدد۔ چھلے ہوئے

ایک چائے کا چمچ

آدھا چائے کا چمچ

ایک چھوٹی بوتل

اہلی میں دو کپ پانی کے ڈال دیے جائیں اور کچھ دن تک بھیگی رہنے کے بعد ہاتھ سے مل کر جوس بنالیا جائے۔ دو چمچے کھی اچھی طرح سے گرم کر لیں اور اس



بلدی نمک تیل ترکیب : ایک چائے کا چمچ حسب ذائقہ حسب ضرورت سرسوں کا تیل ثابت و ضیا رائی سوئف املی کا گڑھا گاڑھا رس ایک پیالی تین کھانے کے چمچے ایک کھانے کا چمچ آوھا کھانے کا چمچ چار کھانے کے چمچے

ایک دیگچی میں پانی گرم کریں۔ جب جوش آجائے تو سبزیاں ڈال دیں۔ تین منٹ بعد نکال کر چھلنی میں رکھ لیں۔ تاکہ پانی خشک ہو جائے پھر املی ہوئی سبز یوں میں سارا مسالا ملا دیں۔ ایک دیگچی میں تیل گرم کریں۔

اس میں سبزیاں ڈال کر سرکہ ڈال دیں۔ دس منٹ تک پکا کر اٹار لیں۔ اچار تیار ہے۔ ٹھنڈا ہو جائے تو کسی جار میں بند کر کے رکھ دیں۔

مسالا بھری دیگی مرچوں کا اچار

اشیاء : لال دیگی (کشمیری) مرچ بارہ عدد ایک چائے کا چمچ حسب ذائقہ نمک کلونجی

اچار بھنڈی

ایک گد

اشیاء : بھنڈی

# چٹخارے

گاجروں کو نکال کر ایک ٹرے میں پھیلا کر اوپر دیا گیا  
آدھا مسالا ملاویں۔ پانی میں آدھا مسالا ڈال کر پانچ سے  
دس منٹ تک پکالیں۔ دونوں چیزوں کو تقریباً "دو دن  
الگ الگ دھوپ میں رکھیں۔ دو دن بعد پانی میں رانی  
کی کھناس آجائے گی تو مسالا لگی گاجریں مسالے  
والے پانی میں ڈال کر اچھی طرح ہلایں۔ دوبارہ دھوپ  
میں رکھیں دھیان رکھیں، مٹی کے برتن میں یہ اجار  
ڈالیں تو مزے دار بھی ہوگا اور زیادہ دن تک رہے گا۔  
نکڑی کا چمچ استعمال کریں۔ چوتھے دن مزے دار گاجر  
کا پانی والا اجار تیار ہے۔ اسی طریقے سے آپ شلجم کا  
اجار بھی بنا سکتے ہیں۔

## سبز مرچ کا اجار

اشیاء :  
مسٹرڈ (ثابت)  
پسا ہوا سفید زیرہ  
ہلدی  
لہسن کے دوئے (کچلے ہوئے) ایک چھٹانک  
ایک چھٹانک  
ایک چھٹانک  
ایک کھانے کا چمچ



نمک  
مرچ  
رانی  
ہلدی  
گرم مسالا  
ترکیب :  
دس گرام  
5 گرام  
5 گرام  
5 گرام  
10 گرام

بھنڈیاں بہت نرم ہونی چاہئیں۔ انہیں اچھی طرح  
سے صاف کر لیا جائے اور پھر پانی میں ابال لیا جائے۔  
اس کے بعد پانی میں سے نکال کر بھنڈیاں ایک برتن  
میں ڈالیں اور ان میں نمک، رانی اور ہلدی بھی ملا دی  
جائے اور پھر اس برتن کو خوب اچھی طرح سے ہلایا  
جائے۔ اس کے بعد تھوڑا سا گرم مسالا بھی ملا لیا  
جائے۔ تین چار دن تک اسی طرح پڑا رہنے دیں۔  
نہایت ہی عمدہ اور ذائقے دار اجار تیار ہوگا۔ محفوظ  
کریں اور حسب خواہش استعمال کرتے رہیں۔

## گاجر کا پانی والا اجار

اشیاء :  
گاجر  
رانی کٹی ہوئی  
سفید سرکہ  
بغیر چھلا ہوا لہسن  
لال مرچ کٹی ہوئی  
یا حسب ذائقہ  
نمک  
گڑ  
پانی  
ترکیب :  
ایک کلو  
چار کھانے کے چمچے  
دو کھانے کے چمچے  
دو ڈلی۔ (باریک کچل لیں)  
چار کھانے کے چمچے  
حسب ذائقہ  
ایک کھانے کا چمچ  
تین سے چار لیٹر

گاجروں کو چھیل کر بڑے بڑے ٹکڑے کر لیں  
درمیان میں سے آدھا کر لیں ایک دیکھی میں گاجروں کو  
پانی میں ڈال کر ہلکی سی بھاپ دے لیں بھاپ لگی

# چٹخارے

لیے فریج میں رکھ دیں۔ ایک فرانک پیپ میں تیل گرم کریں پھر اس میں ان چیزوں کو ہلکی آنچ میں ہلکا سا فرائی کر لیں ٹھنڈا ہونے پر صاف اور خشک بوتل میں بند کر کے رکھ لیں۔ دھیان رکھیں گیلا چمچ نہ استعمال کریں۔

سرکہ  
چینی  
نمک  
لسن کے جوئے  
سبز مرچ  
دو تہائی پیالی  
ایک تہائی پیالی  
دو چائے کے چمچے  
20 عدد  
آدھ کلو

ترکیب :

مولی کا اچار

اشیاء :

مولی

لسن

ہری مرچ

زیرہ

سرکہ

پیاز

کالی مرچ

نمک

ترکیب :

دو کلو  
آدھ پاؤ  
آدھ پاؤ  
ایک تولہ  
ایک کلو  
ایک پاؤ  
آدھ اچھٹانک  
ایک پاؤ یا حسب ذائقہ

مسٹرڈ اور زیرہ ملائیں۔ سبز مرچ کو لمبائی میں دو حصے کر کے بیچ نکال دیں۔ ہلدی پگھلا ہوا لسن، سرکہ، چینی اور نمک اچھی طرح مکس ہو جائیں۔ فرانک پیپ میں تیل گرم کریں اور سالامکس جو کو 5 منٹ کے لیے ہلکی آنچ پر فرائی کریں۔ لسن کے جوئے شامل کریں اور 5 منٹ کے لیے فرائی کریں۔ سبز مرچ ڈالیں اور ان کے گلے تک پکائیں لیکن رنگ نہ بدلے۔ ہلکی آنچ پر 30 منٹ کے لیے پکائیں۔ جب اچار ٹھنڈا ہو جائے تو صاف اور ابالے ہوئے جار میں بھر لیں۔ اچار ایک ہفتہ بعد استعمال کریں۔

ہری مرچ اور کلو نجی کا اچار

اشیاء :

ہری مرچ

ہلدی

نمک

تیل

کلو نجی

لسن کے جوئے

(بغیر چھلے باریک کٹے ہوئے)

سفید زیرہ

(گدرا گدرا پیس لیں)

لیموں

ترکیب :

ایک پاؤ (باریک کٹی ہوئی)  
ایک چائے کا چمچ  
حسب ذائقہ  
چار کھانے کے چمچے  
ایک چائے کا چمچ  
آٹھ عدد

ایک چائے کا چمچ

تین عدد

پیاز کو چھیل کر کاٹ لیں۔ لسن چھیل لیں اور مولیاں چھیل کر ان کے گول گول ٹکڑے کر لیں۔ ان ٹکڑوں کو نمک لگا کر رکھیں۔ اور تھوڑی دیر بعد ہاتھوں سے مل کر پانی پتھر دیں۔ پھر صاف پانی سے دھو کر خشک کر لیں۔ اس کے بعد ایک اچار کے مرتبان میں سرکہ ڈال لیں اور اس میں زیرہ کالی مرچ (آدھی پیسی ہوئی اور آدھی ثابت ہو) اور نمک ڈالیں۔ پھر پیاز اور مولی کے ٹکڑے ڈال کر اچھی طرح ہلائیں۔ ساتھ ہی لسن ایک کپڑے میں باندھ کر ڈال دیں۔ اور اچار کے مرتبان کا منہ بند کر دیں۔ چھ دن بعد اس مرتبان کو دھوپ میں رکھیں۔ چھ دن بعد دیکھیں۔ اگر مولی گلی گئی ہو تو اچار تیار ہے۔

پھول گو بھی کا اچار

اشیاء :

ان سب چیزوں کو اچھی طرح ملا کر دو تین گھنٹے کے

# چٹخارے

|                |                 |                  |                  |
|----------------|-----------------|------------------|------------------|
| گو بھی         | ایک کلو         | لسن کے جوے       | ایک کھانے کا چمچ |
| چینی           | ایک چائے کا چمچ | (بایک کٹے ہوئے)  |                  |
| کالی مرچ باؤڈر | ایک چائے کا چمچ | ادرک             | ایک کھانے کا چمچ |
| سرکہ           | تین سے چار کپ   | (باریک کٹی ہوئی) |                  |
| ترکیب :        |                 | ترکیب :          |                  |

گو بھی کا پھول والا حصہ کاٹ لیں۔ اور ڈنٹھل علیحدہ کر لیں۔ ایک دیکھی میں اتنا پانی بیجیے کہ تمام پھول ڈوب جائیں۔ اب اس میں چھ کھانے کے چمچے نمک ڈال دیں۔ اور چوبیس گھنٹے کے لیے بھگوئے رکھیں۔ دوسرے دن گو بھی کو پانی سے نکال کر ٹھنڈے پانی سے دھو لیں سرکہ کے میں تمام خشک اشیاء کو مکس کر لیں۔ اب مریٹان میں پہلے گو بھی ڈالیں اور پھر سرکہ ڈال دیں۔ تین سے چار روز تک اندھیری اور خشک جگہ رکھیں۔

## بیگن کا چار

|  |                              |                             |
|--|------------------------------|-----------------------------|
| اشیاء :  | ایک کلو                      | ایک کھانے کا چمچ (پسی ہوئی) |
| بیٹنگن   |                              |                             |
| ادرک   |                              |                             |
| (نمک، سرکہ، اورک، لسن کا پیسٹ بنا کر مریچوں میں چیرا لگا کر بھر دیں) |                              |                             |
| چینی   | دو کھانے کے چمچ              |                             |
| نمک  | حسب ذائقہ                    |                             |
| سرکہ   | ایک چھوٹی بوتل               |                             |
| لسن  | ایک کھانے کا چمچ (پسا ہوا)   |                             |
| ہری مرچ  | دس عدد                       |                             |
| لال مرچ  | ڈیڑھ کھانے کا چمچ (پسی ہوئی) |                             |
| ہلدی   | ڈیڑھ چائے کا چمچ             |                             |
| کوکنگ آئل  | دو پیالی                     |                             |
| بگھار کے لیے   |                              |                             |

## چٹنیاں

### چٹنی ٹماٹر سادہ

|         |              |           |           |       |         |         |      |           |              |
|---------|--------------|-----------|-----------|-------|---------|---------|------|-----------|--------------|
| اشیاء : | ٹماٹر        | سرخ مرچ   | نمک       | لسن   | ہری مرچ | لال مرچ | ہلدی | کوکنگ آئل | بگھار کے لیے |
| 1/2     | 2 عدد (ثابت) | حسب ذائقہ | 2 عدد جوے | 3 عدد |         |         |      |           |              |
| ترکیب : |              |           |           |       |         |         |      |           |              |

سب سے پہلے ٹماٹروں کو اچھی طرح سے دھو کر کاٹ لیا جائے اور پھر لسن، مرچ، سرخ مرچ، نمک ان تمام اشیاء کو باریک پیس لیں اور پھر ٹماٹر بھی ڈال کر

ایک چائے کا چمچ  
آٹھ عدد پتے

سفید زیرہ  
کڑی پتا

# چٹخارے

(چھیل کر بالکل باریک کاٹ لیں یا کدو کش کر لیں)  
 گڑیا چٹنی  
 ڈیڑھ پیالی  
 کشمش  
 پندرہ عدد (گر مہانی میں بھگو دیں)  
 اور کد (بسی باریک کٹی ہوئی) ڈیڑھ کھانے کا چمچ  
 نمک  
 سفید سرکہ  
 کلو نجی  
 لال مرچ ثابت  
 لیموں  
 ترکیب :  
 ایک اسٹین لیس اسٹیل کی دینگھی میں سوائے لیموں  
 کے باقی تمام مسالاجات ایک ساتھ ڈال کر لکڑی کے  
 پیچھے کے ساتھ ہلکی آنچ میں پکالیں۔ جب چٹنی یا گڑ کا  
 شیرا بن جائے تو امار کر ٹھنڈا کر لیں۔ جب ٹھنڈی  
 ہو جائے تو لیموں کا رس ڈال دیں۔ مرتان میں رکھ لیں  
 لیموں سے چٹنی محفوظ ہو جاتی ہے۔ اس چٹنی میں کبھی  
 بھی گیلایا جھوٹا چمچ نہ ڈالیں۔

پشاور چٹنی

2 عدد

اشیاء :  
 سبز مرچیں

پس لیں۔ ساوہ چٹنی تیار ہے۔ یہ بہت ہی مزے دار  
 چٹنی تیار ہوگی اور صرف دو منٹ کے مختصر ترین وقت  
 میں آپ یہ نمائش کی ساوہ چٹنی تیار کر سکتے ہیں جو کہ وال  
 چاول وغیرہ کے ساتھ بہت ہی لذت بخش اور ذائقے  
 سے بھرپور ثابت ہوتی ہے۔

لہسن کی چٹنی

4 تولے

1 تولہ

4 ماشہ

حسب ذائقہ

تھوڑا سا

اشیاء :

لہسن

خشک کٹا ہوا دھنیا

اچھور

نمک مرچ

سرکہ

ترکیب :

لہسن چھیل کر اس میں خشک کٹا ہوا دھنیا اور اچھور  
 نمک مرچ کے ساتھ ڈال کر اچھی طرح پیس لیں تھوڑا  
 سا سرکہ بھی ڈال لیں اور مکس کر کے چٹنی تیار کر لیں۔  
 یہ چٹنی دل کی خرابی کے لیے نہایت مفید ہے۔

کیری کی میٹھی چٹنی

اشیاء :  
 کیری

آدھا کلو



# چٹخارے

آوہا چائے کا چمچ  
بیس عدد ثابت

نمک  
سرخ مرچ  
ترکیب :

مندرجہ بالا تمام اشیاء کو کوٹ لیں۔ اور فرائی میں  
میں تیل ڈال کر بھون لیں۔ لیکن آٹھ ہلکی رہے۔ جب  
تیل اوپر آجائے تو استعمال کریں۔

کیری کی میٹھی چٹنی

اشیاء :

آوہا کلو  
(پھیل کر باریک کاٹ لیں یا کدو کش کر لیں)

گڑر چٹنی  
کشمش  
اور کس (بسی باریک کٹی ہوئی) ڈیڑھ کھانے کا چمچ

نمک

سب ذائقہ

آوہی پیالی

ایک چائے کا چمچ

دس عدد

دو عدد

سفید سرکہ

کلو نجی

لال مرچ ثابت

لیموں

ترکیب :

تازہ پودینے کے پتے 10 عدد  
نمک حسب ذائقہ

سبز دھنیا 4 کھانے کے چمچ

1 عدد

1 عدد

1 کھانے کا چمچ

3 عدد

2 کھانے کے چمچ

حسب ضرورت

پیاز

نمک

لیسن جوس

لیسن کے جوس

اپنی کارس

پانی

ترکیب :

اوپر دی ہوئی تمام چیزوں کو ہاون دستہ میں موٹا موٹا  
کوٹ لیں دھیان رہے کہ چار میں ڈال کر بھی موٹا  
موٹا پیسٹا ہے بہت باریک پیسٹ نہیں بنانی۔ مزے دار  
سی چٹنی کسی بھی اسٹیک کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔

سرخ مرچ کی چٹنی

اشیاء :

سفید زیرہ

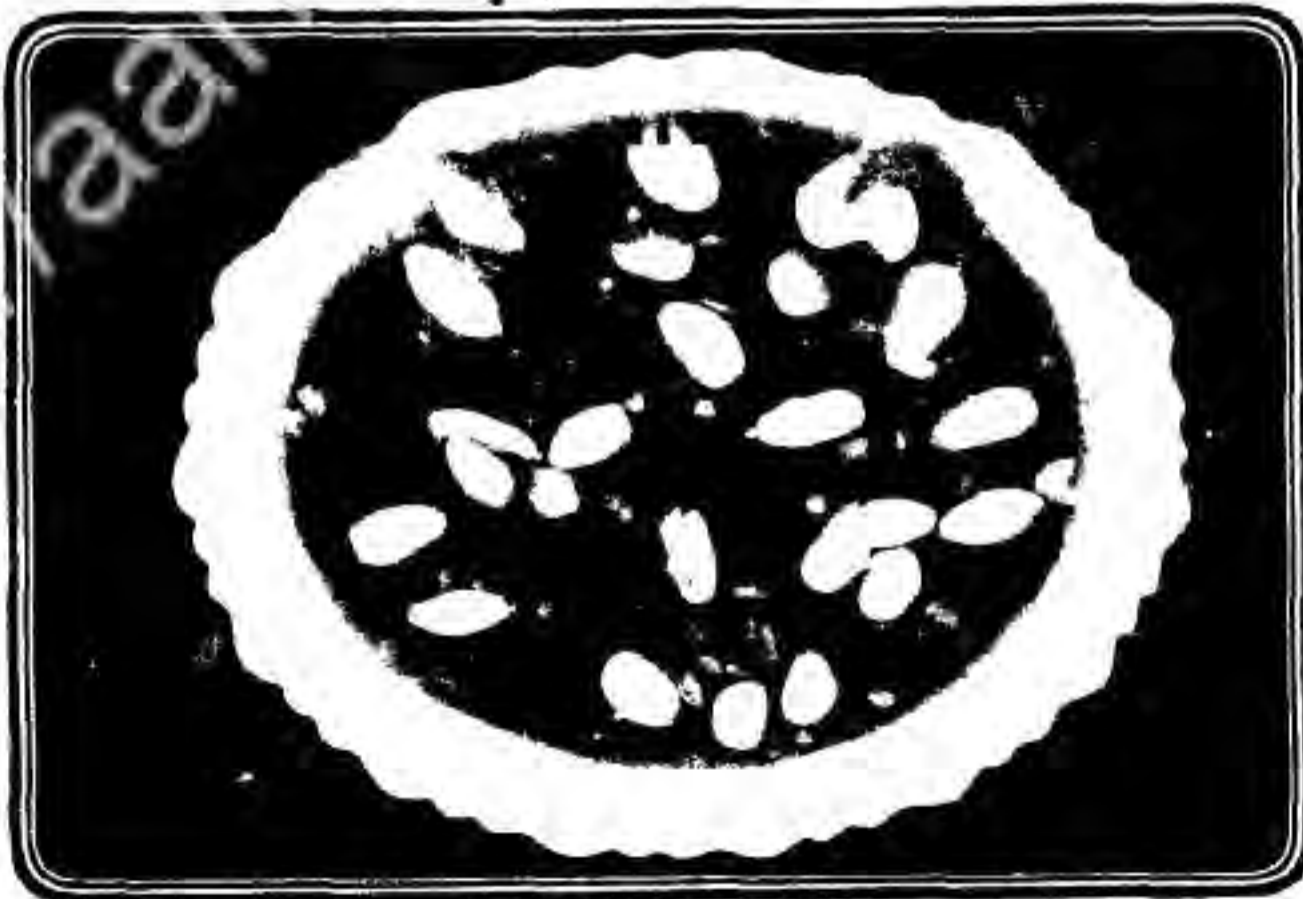
لیسن

کوکنگ آئل

دو چائے کے چمچ

ایک کھانے کا چمچ

چار چائے کے چمچ



# چٹخارے

پانی میں بھگو کر چھان لیں۔ اب ساری چیزیں بلینڈر میں ڈال کر گرائینڈ کریں اور اس آمیزے کو پین میں ڈال کر اتنا پکالیں کہ تھوڑا گاڑھا ہو جائے تو جو لمبے سے اتار لیں۔

## خوبانی کی چٹنی

ایک کلو  
حسب ضرورت  
تیس گرام  
سات سو پچاس گرام  
سات سو پچاس گرام  
بیس گرام

اشیاء :  
خشک خوبانی  
نمک  
ادرک  
چٹنی  
سرکہ  
سرخ مرچ  
ترکیب :

خشک خوبانی کو اچھی طرح دھو لیں۔ اب ان خوبانیوں کو رات بھر کے لیے بھگو دیں۔ اب صبح خوبانی ہال کر اچھی طرح گلا لیں۔ پھر اس میں نمک، مرچ، ادرک اور چٹنی ڈال دیں۔ اور اتنا پکائیں کہ گاڑھا ہو جائے۔ آخر میں سرکہ ملا کر مزید پانچ سے دس منٹ تک پکائیں۔ ٹھنڈا ہونے پر مرتبان یا تیشی میں بھر کر رکھ لیں۔

## انار دانہ کی چٹنی

1 کپ (رات بھر بھیکا ہوا)  
2 کھانے کے چمچے (پسا ہوا)  
1 کھانے کا چمچ  
1 کھانے کا چمچ  
حسب ذائقہ  
ایک چائے کا چمچ

اشیاء :  
انار دانہ  
پودینہ  
سرکہ  
کشمش  
نمک  
سیاہ مرچ  
ترکیب :

ایک اسٹین لیس اسٹیل کی دیگی میں سوائے لیموں کے باقی تمام مسالا جات ایک ساتھ ڈال کر لکڑی کے چمچے کے ساتھ ہلکی آنچ میں پکالیں۔ جب چٹنی یا گڑ کا شیرابن جائے تو اتار کر ٹھنڈا کر لیں۔ جب ٹھنڈی ہو جائے تو لیموں کا رس ڈال دیں۔ مرتبان میں رکھ لیں لیموں سے چٹنی محفوظ ہو جاتی ہے۔ اس چٹنی میں کبھی بھی گھیلا یا جھوٹا چمچ نہ ڈالیں۔

## آلو بخارے کی چٹنی

اشیاء :  
خشک آلو بخارا  
پودینہ  
نمک  
سیاہ مرچ  
ترکیب :

آلو بخارے کو پانی میں بھگو دیں۔ نرم ہو جائے تو پیس لیں۔ پھر اسے ایک پیالی پانی میں پکالیں۔ ساتھ ہی اس میں پودینہ ڈال دیں اور مزید پیس لیں۔ پانی ملا کر چٹنی کو پتلا کریں۔ پھر نمک اور سیاہ مرچ ملا لیں۔ چٹنی تیار ہے۔

## میٹھی چٹنی بنانے کے لیے

کھجوریں  
گڑ  
لال مرچ جاؤڈر  
پانی  
چاٹ مسالا  
نمک  
املی  
کالا نمک  
ثابت لال مرچیں  
ثابت لال مرچوں کو ہلکا سا بھون لیں، املی کو 2/1 کپ

# چٹخارے

3-4 عدد بری مرچ اور 1/4 کپ اہلی کا ہلپ ڈال  
مکس کر کے گرائنڈ کر لیں۔ مزے دار چٹنی تیار ہے۔  
اہلی اور ٹماٹر کی چٹنی

اشیاء :  
ٹماٹر

4 عدد  
2 کھانے کے چمچے  
2/1 چائے کا چمچ  
2 کھانے کا چمچ  
ایک کپ  
1 کھانے کا چمچ  
1 کھانے کا چمچ  
بھون کر پسا ہوا خشک دھنیا 1 کھانے کا چمچ  
ترکیب

ٹماٹر ابلے ہوئے پانی میں ڈال کر چھلکا اتار لیں  
اور چاب کر کے ایک پین میں ڈال دیں ساتھ میں اہلی  
کارس تلہار مرچ کا پیسٹ چٹنی نمک زیرہ لال  
مرچ پاؤڈر سوکھا دھنیا اور تھوڑا سا پانی ڈال کر اچھی  
طرح پکالیں۔ جب آمیزہ گاڑھا ہو جائے تو ٹھنڈا کر کے  
بلینڈر میں ڈال کر پیس لیں۔ چٹھنی اور مزے دار چٹنی  
تیار ہے۔

## شملہ مرچوں کی چٹنی

اشیاء :

2 عدد  
1 چائے کا چمچ  
2/1 کپ  
2/1 کپ  
2/1 چائے کا چمچ  
حسب ذائقہ  
2 چائے کے چمچے  
1 چائے کا چمچ

شملہ مرچ  
دھنیا پاؤڈر  
اہلی کا پیسٹ  
گڑ  
ہلدی  
نمک  
سونف  
لال مرچ پاؤڈر

پہلے انار دانہ کو گرائنڈ کریں۔ پھر اس میں پودینہ پسا  
ہوا ڈال دیں۔ ساتھ ہی سرکہ کشمش نمک اور سیاہ  
مرچ ڈال کر ایک بار پھر گرائنڈ کریں۔ تھوڑا سا پانی ملا  
کر آمیزہ کو پتلا کر لیں۔ لیجیے انار دانہ کی لذیز چٹنی تیار  
ہے۔

## کھٹی میٹھی چٹنی

اشیاء :

1 کپ  
2/1 کپ  
2/1 چائے کا چمچ  
2/1 چائے کا چمچ  
2/1 چائے کا چمچ  
2/1 چائے کا چمچ  
ترکیب :

1 کپ اہلی کا گاڑھا گودا  
2/1 کپ چٹنی  
2/1 چائے کا چمچ  
2/1 چائے کا چمچ  
2/1 چائے کا چمچ  
2/1 چائے کا چمچ  
ترکیب :

## پیاز کی چٹنی

اشیاء :

1 کپ  
4/1 کپ  
1 چائے کا چمچ  
1 چائے کا چمچ  
1 جوا  
3-4 عدد  
4/1 کپ

ترکیب :  
پیانے میں 1 کپ پیاز 4/1 کپ ہرا دھنیا 1  
چائے کا چمچ نمک 1 چائے کا چمچ زیرہ 1 جوا لہسن

# چٹخارے

چٹنی مزے سے کھائیں۔ لسی صاف جار میں محفوظ کر لیں۔

## آم کی چٹنی

اشیاء :

آدھا کلو  
ایک کھانے کا چمچ  
حسب ضرورت  
ایک پاؤ

آم  
سرخ مرچ  
نمک  
چٹنی

چٹنی بنانے کے لیے پکے ہوئے اور میٹھے آم کا رس نکال لیں۔ اس میں سرخ مرچیں، چٹنی اور نمک ملا لیں نہایت لذیذ اور چٹ پٹی چٹنی تیار ہے۔  
کچے آموں کی چٹنی

اشیاء :

1 کلو  
حسب ذائقہ  
1 کھانے کا چمچ

کچے آم (کیریاں)  
نمک  
پسی ہوئی کالی مرچ



1, 2 کپ

تیل

ترکیب :

شملہ مرچوں کو آگ پر رکھ کر تھوڑا سا اتنا پکائیں کہ مرچیں اوپر سے ہلکی سی جل جائیں۔ تھوڑی دیر کے لیے فوائل میں لپیٹ کر رکھ دیں۔ اب مرچوں کو اوپر سے صاف کر کے جلی ہوئی جلد اور بیج نکال دیں۔ مرچوں اور اہلی کے پیسٹ کو بلینڈر میں ڈال کر بلینڈ کریں۔ ایک پین میں تیل اور سونف ڈال کر دوسکینڈ کے لیے فرائی کریں پھر گڑ ڈال کر اچھی طرح مکس کریں اور بلینڈ کیا ہوا مرچوں اور اہلی کا مکسچر ڈال دیں ساتھ ہی دھنیا پاؤڈر اور نمک ڈال کر ایک منٹ تک فرائی کریں پھر لال مرچ پاؤڈر ڈال کر مکس کریں اور آمیزہ گاڑھا ہونے تک پکائیں۔ پھر ہلدی ڈال کر اچھی طرح مکس کریں اور پھر چولہے سے اتار کر دوبارہ بلینڈر میں ڈال کر بلینڈ کریں۔ مزے دار اور منفرد سی



# چٹخارے

پندرہ سے بیس پتے  
ایک چٹکی

بودینہ  
نمک

ترکیب :

2 کپ

پسی ہوئی سرخ مرچ 1 چائے کا چمچہ

1 کپ

سفید سرکہ

ترکیب :

پیاز اور ک اور بودینے کو باریک کتر لیں۔ اس  
میں نمک اور لیموں کا عرق شامل کر کے سب چنے کو  
اچھی طرح ملا لیں۔ ذائقے میں لذیز ہاضمے کے لیے  
بہترین چٹنی ہے۔

آم چھیل کر باریک باریک کاٹ لیں۔ چٹنی، سرکہ  
اور 2 کپ پانی ڈال کر پکالیں۔ آم نرم ہو جائیں تو  
کالی مرچ، سرخ مرچ اور نمک ڈال کر اتار لیں۔ چٹنی  
تیار ہے۔

دہی کی چٹنی

گانڈیا کی چٹنی

اشیاء :

اشیاء :

ایک کپ

گانڈھا دہی

1/4 کپ

بھنا کٹا زیرہ

1/2 چائے کا چمچہ

چاٹ مسالا

1/4 چائے کا چمچہ

نمک

1/4 چائے کا چمچہ

کٹی لال مرچ

1/4 چائے کا چمچہ

ترکیب :

1 کپ

گانڈیا

1/2 کپ

پانی

حسب ذائقہ

نمک

1 چائے کا چمچہ

لسن کا پیسٹ

4 عدد

ہری مرچ

1/2 گٹھی

دھنیا

2 کھانے کے چمچے

لیموں کا رس

ترکیب :

دہی میں نمک، زیرہ، کٹی لال مرچیں اور چاٹ مسالا  
ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں۔ مزے دار چٹنی تیار  
ہے۔

بلینڈر میں 1 کپ گانڈیا، 1/2 کپ پانی، حسب  
ذائقہ نمک، 1 چائے کا چمچہ، لسن کا پیسٹ 4 عدد ہری  
مرچ، 1/2 گٹھی دھنیا اور 2 کھانے کے چمچے لیموں کا  
رس ڈال کر بلینڈ کر لیں۔  
مزے دار چٹنی تیار ہے۔

ناریل کی چٹنی

شاہجہانی چٹنی

اشیاء :

اشیاء :

ناریل کدو کش کیا ہوا

چار چار عدد

سرخ و سبز مرچیں

رانی

ایک عدد

پیاز۔ درمیانہ سائز

زیرہ

ایک عدد

لیموں

کڑی پتا

آدھا انچ کا ٹکڑا

اورک

ہر اودھنیا پورے

لسن

لیموں کا عرق

تیل

ترکیب :

ڈیڑھ سیالی

چائے کا ایک چمچہ

چائے کا ایک چمچہ

ایک عدد

باریک کٹا ہوا ایک پیاز

چند جوے

حسب منشا

کھانے کا ایک چمچہ

# چٹخارے

پودینے کو پیس لیں اور اس میں تمام اشیاء ملا کر ایک ہفتہ دھوپ میں رکھیں۔ پھر استعمال کریں۔

## املی کی چٹنی

اشیاء :  
املی  
سرخ مرچ پاؤڈر  
نمک  
کالی مرچ پاؤڈر  
ترکیب :  
املی، سرخ مرچ پاؤڈر، نمک اور کالی مرچ پاؤڈر ملا کر پیس لیں۔ چند دانے کشمش بھی شامل کر لیں پھر ذرا سا پانی ڈال کر نکال لیں اور استعمال کریں۔

## تل کی چٹنی

اشیاء :  
سفید تل  
(توڑے کے اوپر ہلکا سا بھون لیں)  
ہری مرچ  
لہسن کے ہوئے  
اوپر ڈالنے کے لیے پیاز  
ہرا دھنیا  
نمک  
املی کا گڑھا رس  
ترکیب :  
ایک پیالی  
چھ عدد (بغیر چھلے ہوئے)  
ایک ڈلی (باریک کٹی ہوئی)  
ایک بڑی گٹھی  
حسب ضرورت  
ایک پیالی

سب سے پہلے ہرا دھنیا، ہری مرچ، لہسن اور نمک ملا کر باریک چٹنی پیس لیں۔ بھنے ہوئے تل الگ سے باریک پیس لیں۔ ایک پیالے میں پسی ہوئی چٹنی بے ہوئے تل اور املی کا رس ملائیں۔ چٹنی تیار۔ پیش کرتے وقت پیاز ڈال دیں۔

تاریل سمیت تمام مسالے پیس لیں۔ دیکھی میں تیل گرم کر کے پسے ہوئے مسالے ڈال کر چند سیکنڈ پکائیں۔ اب اس میں کڑی پتے کا بگھار دے دیں۔ آخر میں لیموں کا عرق اور نمک ڈال کر ملا لیں۔

## دیگی مرچوں کی چٹنی

اشیاء :  
دیگی لال مرچیں  
زیرہ  
لہسن کے جوئے  
دیگی  
نمک  
لیموں جوس 4 کھانے کے چمچے  
ترکیب :  
دیگی مرچوں کو تھوڑی دیر کے لیے پانی میں بھگو دیں تاکہ تھوڑی نرم ہو جائیں۔ پھر مرچیں اور باقی تمام چیزیں بلینڈر میں ڈال کر اچھی طرح بلینڈ کر لیں۔ مزے دار چٹنی تیار ہے۔

## نورتن چٹنی

اشیاء :  
سرکہ  
شکر  
پودینہ  
پسا ہوا اورک  
املی کا گودا  
لہسن  
کلو بچی  
سیاہ مرچ  
نمک  
ترکیب :  
ایک کلو  
ایک پیالی  
ایک گٹھی  
دو کھانے کے چمچے  
ایک پیالی  
دو کھانے کے چمچے (پسا ہوا)  
دو کھانے کے چمچے  
دو کھانے کے چمچے  
ایک کھانے کا چمچ



سلاو

### ایہل سلاو

اس میں وہی، کریم، نمک، کالی مرچ، سفید مرچ، لیموں کا رس، اخروٹ اور کشمش شامل کریں۔ ٹھنڈا کر کے سرو کریں۔ ایہل سلاو تیار ہے۔

### میکسیکن سلاو

اشیاء :

سات سو پچاس گرام

ایک عدد

ایک عدد

ایک کپ

ایک پیکٹ

ایک چوتھائی چائے کا چمچ

ایک چوتھائی چائے کا چمچ

ایک چوتھائی چائے کا چمچ

تین ماچار کھانے کے چمچے

ایک چوتھائی کپ

ایک چوتھائی کپ

سیب

بند گو بھی

کھیرا

وہی

کریم

نمک

کالی مرچ

سفید مرچ

لیموں کا رس

اخروٹ

کشمش

ترکیب :

سیب، بند گو بھی اور کھیرا باریک کاٹ لیں۔ اب

ترکیب :

اشیاء :

آٹو

کھیرے

ٹماٹر

مکئی

پیاز

چکن

سجاوٹ کے لیے اشیاء

ماونیز

سرکہ

نمک آدھا کھانے کا چمچ

سیاہ مرچ

ترکیب :

پانچ سے چھ عدد

دو عدد

تین عدد

ایک کپ (بھنی ہوئی)

ایک عدد (ٹی ہوئی)

ایک کپ

ایک کھانے کا چمچ

دو کھانے کے چمچے

تین چوتھائی چائے کا چمچ (پسی ہوئی)

# چٹخارے

چٹنی بھر  
چار کھانے کے چمچے

نمک  
دودھ

ترکیب :

کیلا، سیب، ناشپاتی اور آڑو باریک باریک کاٹ لیں اور انہیں کسی پیالے میں ڈال دیں، گرائنڈر میں فریش کریم، چٹنی، نمک اور دودھ ڈالیں اور اسے اچھی طرح مکس کر لیں، جب چٹنی اور نمک کریم میں اچھی

مائیونیز، سرکہ، نمک اور سیاہ مرچ کو باہم ملا لیں اور تمام سبزیوں کو کاٹ کر ایک بڑے پیالے میں مکس کر لیں اور ڈریسنگ سجاوٹ کے اشیاء ان پر ڈال دی جائے اور انہیں مکس کر لیں۔ چاروں طرف آڑو سے سجالیں اور پھر مسمانوں کے سامنے پیش کریں۔ بہت ہی عمدہ اور ذائقوں سے بھرا ہوا سلاد ہے جو کہ میکسیکو کی ایک اہم ڈش سمجھی جاتی ہے۔



طرح مل جائیں تو اس آمیزے کو پیالے میں ڈال دیں، اس میں اتار، انگور اور چھ کور شکل میں کٹے ہوئے آم ڈال کر ملا لیں اور فریج میں رکھ کر سٹنڈا کریں۔

چکن میکرونی سلاد

کریمی فروٹ سلاد

اشیاء :

کیلا

سیب

ناشپاتی

آڑو

انگور

اتار کے دانے

آم

فریش کریم

چٹنی

چار عدد

دو عدد

دو عدد

ایک عدد

آدھا کپ

آدھا کپ

ایک عدد

ایک کپ

چار کھانے کے چمچے

اشیاء :

شیل میکرونی

چکن فلی

پائن اپیل

کھیرے

سیب

مائیونیز

آدھا پیکٹ

دو عدد ابے اور ٹکڑے کیے ہوئے

ایک ٹن

دو عدد باریک کٹے ہوئے

دو عدد باریک کٹے ہوئے

ایک بوتل

# چٹخارے

تمام چیزوں کو اچھی طرح مکس کر کے سلاڈ باؤل میں ڈال کر فریج میں رکھ دیں، جب اچھی طرح ٹھنڈا ہو جائے تو کھانے کے لیے پیش کریں۔ نہایت سادہ اور مزے دار سلاڈ آپ کو یقیناً پسند آئے گا۔

## کول سلاڈ

1/4 پھول  
ایک عدد  
دو چمچے  
دو چمچے  
دو چمچے  
دو چمچے  
حسب ذائقہ  
1/4 چائے کا چمچ  
ایک کھانے کا چمچ

اشیاء :

بند گو بھی  
گاجر  
کشمش  
اخروٹ  
مایونیز  
نمک  
کالی مرچ  
چینی

ترکیب :

بند گو بھی کو باریک کاٹ لیں۔ ایک عدد گاجر بھی باریک لہائی میں کاٹ لیں۔ اس کے بعد دو چمچے مکشمش پانی میں بھگو کر نرم کر لیں۔

یہ مکشمش سبزی میں شامل کریں اور اس کے ساتھ دو کھانے کے چمچے اخروٹ چورا کر کے شامل کر لیں پھر ان سب کو مکس کر لیں اور اس کے ساتھ دو کھانے کے چمچے مایونیز کریم نمک کالی مرچ پس ہوئی اور ایک چائے کے چمچے کے برابر چینی شامل کریں۔ یہ ساری چیزیں مکس کریں اور ٹھنڈی ہونے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔

## کول سلو سلاڈ

ایک کپ  
آدھا کپ  
آدھا چائے کا چمچ

اشیاء :

بند گو بھی  
میونیز  
سفید مرچ

ایک چائے کا چمچ  
حسب ذائقہ  
ایک کھانے کا چمچ  
دو عدد

بارہ عدد ابے اور کٹے ہوئے  
ایک پکٹ  
ایک پکٹ

مسٹرڈ پاؤڈر  
نمک  
چینی  
لیموں  
بادام  
فریش کریم  
کشمش

ترکیب :

ایک دیگی میں پانی کو خوب گرم کر کے اس میں شیل میکرونیز ڈالیں۔ ساتھ میں تیل شامل کر کے ابال لیں۔ جب میکرونیز گل جائیں تو پانی نتھار کر ٹھنڈے پانی سے دھولیں اور دوبارہ ذرا سی چکائی لگائیں۔ پھر ایک خوب صورت سے پیالے میں ابے ہوئے میکرونیز، ابے چکن فلی کے چھوٹے ٹکڑے، پائن اہیل کیوبز اور جوس ڈال دیں۔ اس کے بعد باریک کٹے کھیرے، باریک کٹے سیب، مایونیز، مسٹرڈ پاؤڈر، نمک، چینی، لیموں کا رس اور بادام ملا دیں۔ آخر میں فریش کریم اور مکشمش ڈال کر ٹھنڈا سرو کریں۔

## چکو مر سلاڈ

1/2 چھیل کر چپ کر لیں  
دو عدد چاؤ  
ایک چائے کا چمچ  
دو چائے کے چمچے  
1/4 چائے کا چمچ  
دو عدد چاؤ  
ایک کپ چاؤ  
1/4 چائے کا چمچ  
آدھی چائے کا چمچ

اشیاء :  
کھیرا  
ٹماٹر  
سرکہ  
لیمن جوس  
لال مرچ پاؤڈر  
پیاز  
سلاڈ کے پتے  
کالی مرچ کٹی ہوئی  
نمک  
ترکیب :

# چٹخارے

سبز یوں کو چاب کر لیں اور اچھی طرح مکس کر کے  
کھانے کے لیے پیش کریں۔  
پکھی سبز یوں کا سلاد

نمک  
باریک کٹی ہوئی پیاز  
گاجر  
آئسنگ شوگر  
کریم  
کشمش

حسب ذائقہ  
ایک کھانے کا چمچہ  
ایک عدد  
ایک کھانے کا چمچہ  
آوہا کپ  
دو کھانے کے چمچے

اشیاء :  
گاجریں  
ٹماٹر  
سبز دھنیا  
سلاد کے پتے  
سبز مرچ  
مولی  
کھیرا  
پیاز  
ترکیب :

ایک پاؤ  
ایک پاؤ  
تھوڑا سا  
چند عدد  
دو عدد  
ایک عدد (درمیانہ سائز)  
ایک عدد  
ایک عدد

ترکیب :  
بند گو بھی اور گاجر کو باریک لہبائی میں کاٹ لیں  
مونیز، آئسنگ شوگر، سفید مرچ، کریم، نمک، پیاز اور  
کشمش ڈال کر اچھی طرح مکس کر کے کٹی ہوئی سبزی  
ڈال کر مکس کریں اور سلاد باؤل میں ڈال کر فریج میں  
رکھ دیں جب اچھی طرح ٹھنڈا ہو جائے تو کھانے کے  
لیے پیش کریں۔

مکس سبز یوں کا سلاد

مذکورہ بالا تمام سبز یوں کو کاٹ کر مکس کر لیں۔  
گاجروں کو لہبائی کے رخ میں ٹماٹروں کے سلائس،  
مولی اور کھیرے کے بھی سلائس پیاز کو لچھے دار کاٹیں  
اور سبز دھنیا، سلاد کے پتے، سبز مرچ باریک کاٹ کر  
اس کے اوپر چھڑک دیں۔ یہ پکھی سبز یوں کا سلاد ہر قسم  
کے کھانوں کے ساتھ تناول فرمائیں۔ صحت کے لیے  
بہت ہی مفید ترین سلاد ہے۔

سلاد مع فروٹ اسٹیک

اشیاء :  
مکئی کے دانے  
املی ہوئی گاجر  
پودینہ  
مٹر  
لال لوبیا  
ٹماٹر  
دھنیا  
دہی  
شملہ مرچ  
سبز مرچ  
نمک  
لیمن جوس  
ترکیب :

آوہا کپ  
ایک عدد کٹی ہوئی  
دو کھانے کے چمچے چائڈ  
آوہا کپ (اے لے ہوئے)  
ایک کپ (وائٹل)  
ایک عدد  
دو کھانے کے چمچے چائڈ  
آوہا کپ  
ایک عدد  
دو عدد چائڈ  
حسب ذائقہ  
ایک عدد لیمن کا

اشیاء :  
مایونیز  
گاجر  
لال سیب  
کریم  
بند گو بھی  
کشمش  
ترکیب :

تین چائے کے چمچے  
چار کھانے کے چمچے  
ایک عدد چوکور ٹکڑے  
حسب ذائقہ  
ایک کپ باریک کٹی ہوئی  
ایک چائے کا چمچہ

ایک پیالے میں تمام چیزیں ڈال کر مکس کر لیں۔

## ملی جلی سبزیوں کا سلاد

اشیاء :  
کھیرا چھوٹا  
وینچی ٹیبل آئل  
مشروم  
ٹاریل کا دودھ  
سبز تازہ لوبیا کٹا ہوا  
گاجر درمیانہ سائز  
سرخ تازہ مرچ کٹی ہوئی  
بند گو بھی کے پتے کٹے ہوئے  
آدھا کپ  
لیسن کا خشک پتا  
ایک عدد  
ایک عدد  
دو کھانے کے چمچے  
245 گرام  
آدھا کپ  
100 گرام  
ایک عدد  
تین عدد چھوٹی  
ایک عدد

### ترکیب :

کھیرے اور گاجر کو پتلے ٹکڑوں میں کاٹ لیں، ایک کڑا ہی میں تیل گرم کریں۔ اس میں مرچیں ڈال کر دو منٹ تک فرائی کریں۔ جب تک اس کی خوشبو نہ آئے فرائی کرتے رہیں۔ پھر اس میں ٹاریل کا دودھ اور لیموں کا پکا ڈال کر ہلائیں۔ ایک منٹ تک حرارت دیں۔

اب اس میں لوبیا، مرچ، کھیرا، گاجر اور گو بھی ملائیں اور ہلکی آگ پر فرائی کرے۔ رہیں پھر مشروم شامل کر دیں۔

سفید پلیٹ میں بند گو بھی کے پتوں کو بچھا کر باقی سبزیاں ڈال دیں۔ سلاد تیار ہے۔

## گرین سلاد

اشیاء :  
بند گو بھی  
پیاز، چوکور کٹا ہوا  
سبز ہری مرچ، چوکور کٹی ہوئی  
سلاد کے پتے  
دُرینگ کے لیے اشیاء  
پتے باریک، کٹے ہوئے  
تین عدد  
ایک عدد  
ایک گٹھی

تمام اشیاء باریک کاٹ کر مایونیز میں ملا دیں۔ تین کھانے کے چمچے کریم بھی ملا دیں۔ اور فریج میں رکھ دیں۔ جب سیٹ ہو جائے تو ایک پلیٹ میں ایک طرف سلاد اور (ایک اسٹک میں موسم کے کوئی بھی فروٹ چکور ٹکڑے کیے ہوئے، پیتا، آم، سیب، انگور، چیری، اورنج، پائسن اہل، اسٹرابیری، ایک ایک کر کے پرو دیں) سائڈ میں رکھ دیں۔ سلاد دو فروٹ اسٹک تیار ہے۔

## چکن اور میکرونی سلاد

اشیاء :  
چکن بریسٹ پیس  
چکن کر چھوٹی چھوٹی بونی کر لیں  
دو عدد

پائسن اہل کیوز  
نمک  
چینی  
بادام چھلے ہوئے  
(دو دو ٹکڑے کر لیں)  
ٹیل (shell) میکرونی اپیکٹ  
سفید سرکہ  
سفید مرچ پیسی ہوئی  
سلاد آئل  
لیموں  
ایک چھوٹا ٹن  
حسب ذائقہ  
ایک کھانے کا چمچ  
آدھی پیالی  
دو عدد  
دو کھانے کے چمچے  
آدھا چائے کا چمچ  
ایک کھانے کا چمچ  
دو عدد

### ترکیب :

ترکیب میکرونی کو ابال کر پانی نکال کر ٹھنڈے پانی کے ساتھ دھوئیں۔ ایک گہرے خوب صورت پیالے میں میکرونی، زڈال، کرپائن اہل جوس اور کیوز ڈال دیں پھر اشیاء میں دی گئی اشیاء ڈال کر مکس کریں اور ٹھنڈا کرنے پر فریج میں رکھ دیں۔ یہ سلاد جتنا ٹھنڈا کر کے کھائیں گے اتنا ہی مزے دار ہوگا۔

# چٹخارے

جائیں تو پانی سے نکال کر باؤل میں رکھ دیں۔ ڈریسنگ کے تمام اشیاء کو اکٹھا ملا لیں اور آلوؤں پر ڈال دیں۔ سلاڈ کو ٹھنڈا ہونے دیں۔ جب مکمل ٹھنڈا ہو جائیں تو سلاڈ کے باقی اشیاء بھی ملا دیں۔

## سبز یوں کی سلاڈ

اشیاء :

گاجر  
نمٹاؤ دو درمیانے سائز کے  
اندھا بلا ہوا  
ایک عدد  
لیموں کارس  
دو کھانے کے چمچے  
دھنیا پودہ نہ  
تھوڑا سا  
کھیرا  
ایک  
شمسہ مرچ  
ایک  
نمک اور کالی مرچ  
حسب ذائقہ  
لسن  
تین جوئے کٹے ہوئے

ترکیب :

گاجر، کھیرا، نمٹاؤ، آلو، شمسہ مرچ کو جو کور کاٹ لیں۔ اندھے کے سلائس کر لیں۔ سلاڈ کی ڈش میں تمام اشیاء ڈال کر اچھی طرح مکس کریں۔ اوپر دھنیا اور پودہ نہ چھڑک دیں۔

## نمٹاؤ اور کھیرے کا سلاڈ

اشیاء :  
کھیرا، پتلے سلائس میں  
وہجی ٹیبل آئل  
280 گرام  
لسن پکلا ہوا  
دو کھانے کے چمچے  
ایک جوا  
ایک کھانے کا چمچ  
سرخ نمٹاؤ پتلے سلائس میں  
300 گرام  
ایک کھانے کا چمچ  
لیسن جوس  
تازہ سلاڈ کٹے ہوئے پتے  
ایک کھانے کا ایک چمچ  
پودہ نہ تازہ باریک کٹا ہوا  
ایک کھانے کا چمچ

اندھوں کی کریم 45 ملی گرام  
اور نیچ جوس 15 ملی گرام

نمک  
حسب ذائقہ  
30 ملی گرام  
پانچ ملی گرام  
حسب ذائقہ

وہجی  
مالٹے کا چھلکا  
کالی مرچ  
ترکیب :

ایک برے باؤل میں ساری سبزیاں تیار کر کے ڈال دیں اور اچھی طرح مکس کر لیں۔ ڈریسنگ کے تمام اشیاء ملا کر پتلی کریم تیار کریں۔ سلاڈ پر ڈریسنگ کے اشیاء سے تیار کی گئی کریم پھیلا دیں اس سلاڈ میں دو گرام پروٹین، دو گرام فائبر، تین گرام چکنائی اور وٹامن سی کے اشیاء پائے جاتے ہیں۔ اس میں 100 کیلوریز موجود ہوتی ہیں۔

## آلو کا سلاڈ

اشیاء :

آلو  
450 گرام  
پیاز تازہ چو کور کٹا ہوا  
تین عدد  
اجوائن کے پتے  
پانچ ملی گرام  
کھیرا  
سلائس میں  
سورج مکھی کے بیج  
سلاڈ کے پتے کٹے ہوئے  
ڈریسنگ کے لیے اشیاء  
اندھوں کی کریم  
لیسن جوس  
دہی  
نمک  
حسب ضرورت

ترکیب :

آلوؤں کو چھیل کر کیوب میں کاٹ لیں۔ برے ساس پین میں پانی ڈال کر آلو ابال لیں۔ جب ابل

# چٹخارے

ترکیب :

ایک ڈش میں کھیرے اور نمائے کے سلائس کو اس طرح رکھیں کہ ایک سلائس کھیرا اور دوسرا سلائس نمائے کا ہو۔ اسی ترتیب سے سلاؤ کی ڈش میں سجائیں۔ ٹیٹھے کے ایک مرتبان میں تیل، لیمن جوس، لہسن اور ساد کے کٹے ہوئے پتے ڈال کر اس کا ڈھکن مضبوطی سے بند کر دیں اور اسے زور سے ہلائیں۔ پھر اسے کھول کر کھیرے اور نمائے کے سلائس ڈش پر بکھیر دیں۔ پھر اس پر پیئر پھیلا دیں۔ سلاؤ کا سارا سامان ایک اسمیل کی ٹرے یا مضبوط چائے کرگری کی ٹرے میں رکھیں۔ جب سلاؤ پر پیئر بکھیر دیں تو سلاؤ کی ٹرے کو تین منٹ کے لیے گرل پر رکھیں تاکہ پیئر پھل جائے۔ پھر اس پر پودینہ بکھیر دیں سلاؤ تیار ہے۔

آلو، مشروم کا سلاؤ

اشیاء :

آلو 400 گرام

مشروم (درمیانہ سائز)

200 گرام

حسب ضرورت

سلاؤ کے پتے

شکر قندی (زرد)

500 گرام

250 گرام

حسب ضرورت

وہجی نیبل آئل اسپرے

ڈرائنگ کے لیے سامان

پندرہ گرام

خشک نمائے

لہسن، کچلا ہوا ایک جوا

135 ملی گرام

کھٹی کریم

135 ملی گرام

دودھ

دو چائے کے چمچے

سرکہ سفید

ترکیب :

آلو اور شکر قندی کو ایک سینٹی میٹر کے ٹکڑوں میں کاٹ لیں۔ انہیں ابال لیں جب گل جائیں تو انہیں

ایک پلیٹ میں رکھ کر نشو و نما سے خشک کر لیں۔ آلو، شکر قندی اور مشروم وہجی نیبل آئل کا اسپرے کریں۔ ان تینوں سبزیوں کو اوون میں ڈال کر گرل کریں۔ الگ الگ رکھیں۔ جب ان کا رنگ براؤن ہو جائے تو اوون سے نکال کر سلاؤ کی ٹرے میں پھیلا دیں۔ اس پر ڈرائنگ کے اشیاء پھیلا دیں جو کریم کی شکل میں تیار ہوئے ہوں۔

ڈرائنگ

ایک چھوٹے باؤل میں پانی ابال لیں۔ ابلتے ہوئے پانی میں خشک نمائے ڈال دیں۔ بیس منٹ تک ہلکی آنچ پر پکے دیں۔ جب نرم ہو جائیں تو گرم پانی سے نکال کر نچوڑ لیں۔ ایک باؤل میں دودھ اور کٹی کریم ملا کر پھینٹیں پھر اس میں سلاؤ کے پتے اور سرکہ ملا دیں۔ اس مکمل ڈرائنگ کو سلاؤ پر بکھیر دیں۔

پھول گو بھی کا سلاؤ

اشیاء :

پھول گو بھی

500 گرام

کٹے ہوئے

دو کھانے کے چمچے

ایک کھانے کا چمچ

دو کھانے کے چمچے

پارسلے سلاؤ پتے

لیمن جوس

نازہ پودینہ کٹا ہوا

اورنج جوس

ترکیب :

پھول گو بھی کے چھوٹے چھوٹے پھول ڈنٹھل نما ٹکڑوں میں کاٹ لیں۔ گرم پانی سے ابال لیں۔ جب پک جائیں تو گرم پانی سے نکال لیں۔ پانی نچوڑ لیں اور ٹھنڈا ہونے دیں۔ اب پھول گو بھی، پودینہ اور کٹی ہوئی پارسلے کو ایک باؤل میں ڈال دیں۔ استعمال کرنے سے پہلے اس پر جوس پھیلا دیں۔



### مکس فروٹ سلاڈ

اشیاء :

بند گو بھی

چیریز

نمک

کریم

مکس فروٹ

چینی

میونیز

کالی مرچ

ترکیب :

1/2 باریک کٹی ہوئی

10 عدد

1 چٹلی

آدھا کپ

ایک عدد

2 کھانے کے چمچے

1/2 کپ

1 چائے کا چمچ

اشیاء :

کھیرا

نماڑ

گاجر

سب

بند گو بھی

کیلا

نمائو کیچپ

لیموں کا عرق

نمک اور کالی مرچ

چینی

ترکیب :

ایک عدد

ایک عدد

ایک عدد

ایک عدد

ایک عدد

ایک عدد

آدھی پیالی

آدھی پیالی

حسب ذائقہ

ایک چمچ

ایک پیالے میں کریم، میونیز چینی، کالی مرچ اور نمک ڈال کر مکس کریں۔ پھر اس میں بند گو بھی، مکس فروٹ ڈال کر اچھی طرح مکس کریں۔ سلاڈ ڈش میں ڈال کر اوپر سے چیریز سے سجا کر کھانے کے لیے پیش کریں۔

### رومن سلاڈ

تمام پھل اور سبزیوں کو باریک کاٹ لیں۔ پھر اس میں نمائو کیچپ ملائیں۔ پھر اس میں لیموں کا عرق ملائیں۔ اب آخر میں نمک اور کالی مرچ ملا کر نوش فرمائیں۔

نوٹ:- یہ سلاڈ فوراً تیار کر کے نوش فرمائیں، زیادہ دیر رکھنے سے اس سلاڈ کے غذائی اشیاء ختم ہونے لگتے

# چٹخارے

ہیں۔

## ٹوڈلز اور میکرونی کا سلاد

اشیاء :

1 پکٹ (وائٹل)

1 عدد

2/1 کپ

1 چائے کا چمچ

1 کپ (وائٹل)

1 عدد (صرف سبز حصہ)

2/1 کپ

سب ذائقہ

1 عدد

1 عدد (جج کے بغیر)

4/1 کپ

ٹوڈلز

پیاز

پائین اہل

چینی

میکرونی

ہری پیاز

میونیز

نمک

شمہ مرج

ٹماٹر

ٹماٹو کیچپ

ترکیب :

ایک پیالے میں تمام چیزیں ڈال کر مکس کر لیں۔ سبزیوں کو چاب کر لیں اور اچھی طرح مکس کر کے کھانے کے لیے پیش کریں۔ یہ سلاد پہنچنے کے ساتھ بہت مزادے گا۔

## کریبی فروٹ سلاد

اشیاء :

آم، کیلا، انگور، آڑو

3 کپ (مکس)

ایک کپ

آدھا کپ

ڈیڑھ کپ

3 کھانے کے چمچے

آدھا چمچ

گارنش کے لیے

ڈیڑھ کپ

سب پسند

کریم

میکرونی

شکر

وائٹ مرج

سلاد پتا، ٹماٹر، کھیرا

میکرونی

نمک

میکرونی ابا لیں۔ تمام فروٹ کیوز میں کاٹ لیں۔ اب ایک الگ باؤل میں مایونیز، کریم، شکر، وائٹ مرج ملائیں۔ میکرونی شامل کریں، مکس کریں۔ اب آہستہ آہستہ چمچے سے فروٹ کو ڈال کر مکس کریں۔ ایک پلیٹ میں سلاد، ٹماٹر، کھیرا لگائیں درمیان میں کریبی فروٹ سلاد ڈالیں۔ اوپر آم یا آڑو سے گارنش دیں۔

بھٹ پٹ اور آسمان فروٹ پاشا سلاد

اشیاء :

1 ٹن

2 عدد

4/1 گڈی

ڈیڑھ کھانے کا چمچ

1 چائے کا چمچ

2 عدد

2 عدد

1 ٹن

3 کھانے کے چمچے

آدھا کپ

2/1 باریک کاٹ لیں

5 سے 6 عدد

4/1 پکٹ

سب ذائقہ

1 پکٹ

مکس فروٹ کا کھیل

اگلے ہوئے آلو

سبز دھنیا

لیمن جوس

کٹی ہوئی کالی مرچیں

پائین اہل کے سلائس

باریک کٹی سبز مرج

مکس کے دانے

کیچپ

میونیز

آٹس برگ

انجیر کے دانے

ابلی ہوئی میکرونی

نمک

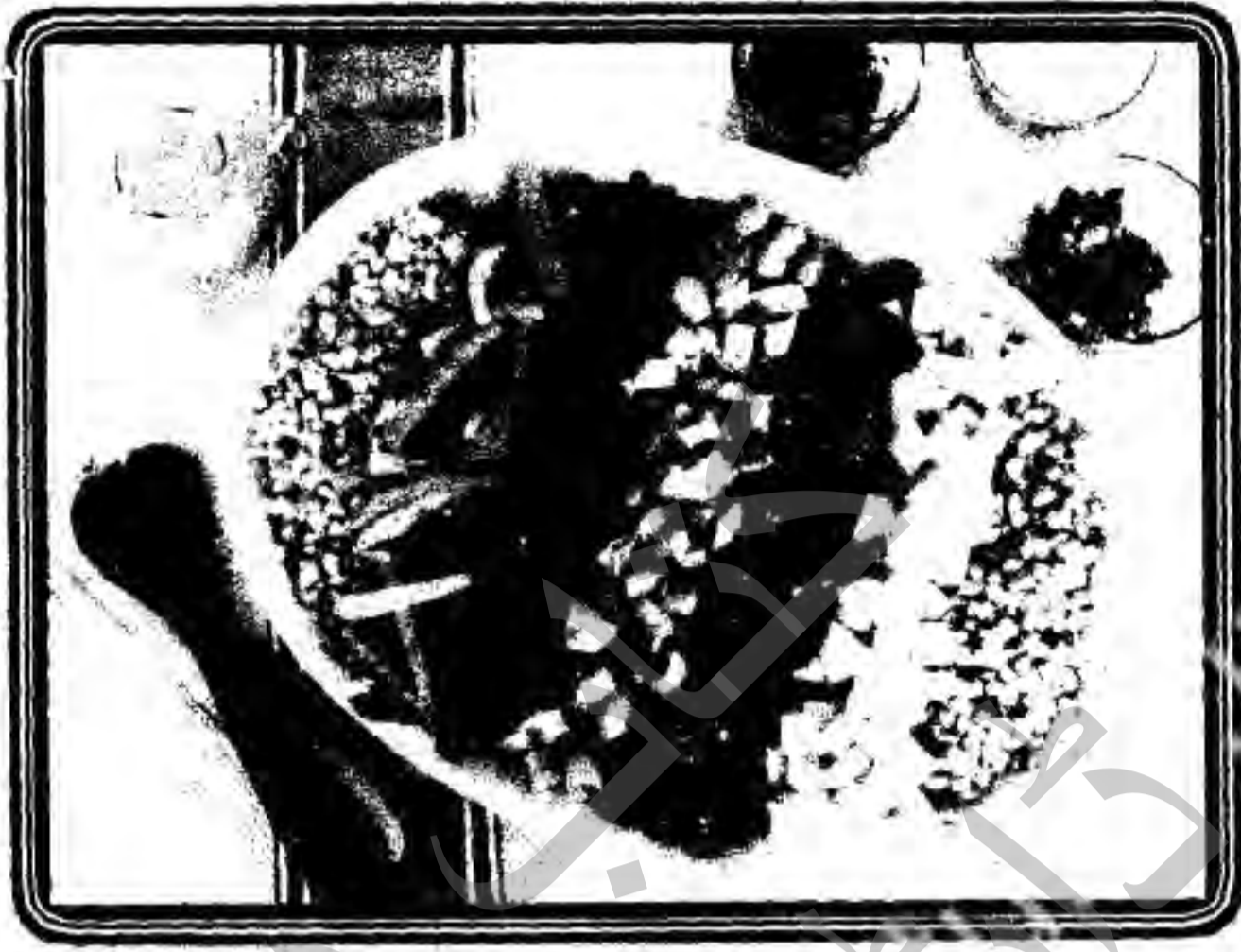
کر کرے

ترکیب :

اوپر دی ہوئی تمام چیزیں ایک پیالے میں ڈال کر اچھی طرح مکس کریں۔ اب سلاد والی ڈش میں ڈال کر اوپر کر کرے ڈال کر مزے دار فروٹ پاشا سلاد کھانے کے لیے پیش کریں۔

## گریک سلاد

اشیاء :



2 عدد  
2 عدد  
1 عدد  
50 گرام  
50 گرام  
2 کپ  
4 کپ  
حسب ذائقہ  
4 چمچے

آلو  
گاجر  
سیب  
اخروٹ  
کشمش  
اونیز  
کالی مرچ  
نمک  
کریم

ترکیب :

سیب، گاجر اور آلو اہل کر کیوب بنالیں۔ ایک پیالے میں اہلی ہوئی گاجر، ابلے ہوئے آلو، سیب، اخروٹ، کشمش، نمک، کالی مرچ، کریم اور سلاڈ پٹا ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں۔ مزیدار رشین سلاڈ چرنے اور زیرہ پلاؤ کے ساتھ پیش کریں۔

مکسڈ سبز یوں کارائتہ

اشیاء :

چیز (Greek Feta Cheese) 300 گرام  
کھیرے (کیوب کر لیں) 150 گرام  
چیری نمائو (آوھے کر لیں) 3 عدد  
پیاز (پھلے کر لیں) 3 عدد  
زیتون 24  
لیمن جوس 20 ملی لیٹر  
زیتون کا تیل 50 ملی لیٹر  
نمک اور کالی مرچ حسب ذائقہ  
پارسلے گارنش کے لیے

ترکیب :

ایک پیالے میں چیز، نمائو، کھیرے، پیاز اور زیتون مکس کر لیں۔ پھر ان پر زیتون مکس کر لیں۔ پھر ان زیتون کا تیل اور لیمن جوس چھڑکیں، مکس کریں، نمک مرچ بھی ڈال لیں، ہلائیں اور پارسلے سے گارنش کر کے سرو کریں۔

رشین سلاڈ

اشیاء :

# چٹخارے

|                          |                 |                     |                  |
|--------------------------|-----------------|---------------------|------------------|
| تازہ دہی                 | دو کپ           | دہی                 | دو کپ            |
| گاجر                     | ایک چوتھائی کپ  | کھیرا               | ایک عدد          |
| چھیل کر چوپ کر لیں       |                 | ہری پیاز            | ایک عدد          |
| منر۔ چھلے ہوئے           | ایک چوتھائی کپ  | پودینے کے تازہ پتے  | ایک چائے کا چمچ  |
| آلو                      | آدھا کپ         | حشیش                | دو کھانے کے چمچے |
| چھلکا اتار کر چوپ کر لیں |                 | موٹے لیے ہوئے اخروٹ | دو کھانے کے چمچے |
| نمک کالی مرچ             | حسب ذائقہ       | نمک سیاہ مرچ        | حسب ذائقہ        |
| زیرہ پاؤڈر               | ایک چائے کا چمچ | کالی تلسی           | ایک چائے کا چمچ  |
| اوپر چھڑکنے کے لیے       |                 | ترکیب :             |                  |
| لوہیا                    | ایک چوتھائی کپ  |                     |                  |
| ترکیب :                  |                 |                     |                  |

کھیرے کو چھیل کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹ لیں۔ ہری پیاز کو باریک کاٹ لیں۔ پودینے کے پتے بھی باریک کاٹ لیں اور کالی تلسی بھی صاف کر کے کاٹ لیں۔ دہی کو پھینٹ کر اس میں نمک، سیاہ مرچ، موٹے کوٹے ہوئے اخروٹ، پودینہ، ہری پیاز، کالی تلسی اور کھیرے کے ٹکڑے ملا کر مکس کریں اور کچھ دیر اسے ٹھنڈا ہونے کو رکھ دیں۔ بے حد لذیذ ایرانی راستہ آپ کے کھانے کی لذت میں اضافہ کرے گا۔

سب سے پہلے تمام سبزیوں کو بغیر پانی ڈالے ہلکی نرم ہونے تک ابال لیں۔ ابالنے کے بعد اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے رکھ دیں۔ دہی کو پھینٹ کر اس میں تمام اہلی ہوئی سبزیاں، نمک اور کالی مرچ ڈال کر ٹھنڈا کرنے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ اور زیرہ پاؤڈر ڈال کر پیش کریں۔

## ہرے مسالے کا راستہ

### آلو کا راستہ

|   |                  |           |                 |
|---|------------------|-----------|-----------------|
| اشیاء :   | آدھا کلو         | اجزاء :   | آدھا کلو گرام   |
| دہی   | دس سے بارہ پتے   | آلو       | ایک کلو گرام    |
| پودینہ  | دو عدد           | دہی       | حسب ذائقہ پسند  |
| چھوٹی ہری مرچ   | ایک عدد          | نمک و مرچ | ایک چائے کا چمچ |
| لسن کاجوا   | آدھا چائے کا چمچ | گرم مسالا |                 |
| نمک   | ایک چائے کا چمچ  | (پسا ہوا) |                 |
| زیرہ  |                  | پودینہ    |                 |
| ترکیب :   |                  | سبز دھنیا |                 |
| تمام اشیاء کو بلینڈر میں ڈال کر پیس لیں۔ راستہ تیار ہے۔ |                  | سبز مرچ   |                 |
|   |                  | ترکیب :   |                 |

## ایرانی راستہ

آلوؤں کو اچھی طرح سے ابال کر چھیل لیا جائے

اشیاء :

# چٹخارے

اور گلاس کے پیندے کی مدد سے باریک پس لیا جائے۔ اس کے بعد وہی کو خوب اچھی طرح سے پھینٹ لیں اور پھر اس میں تمام مسالا جات پس کر اچھی طرح سے ملا لیے جائیں۔ اس کے بعد آلو بھی شامل کر لیں اور پھر خوب اچھی طرح سے مکس کر لیں۔ نہایت ہی عمدہ اور لذیذ ترین آلوؤں کا راستہ تیار ہو چکا ہے۔

1 عدد چائڈ  
1 چٹکی  
1/4 چائے کا چمچ  
2 چائے کے چمچے

نمک  
بھنا زیرہ  
ترکیب :

ایک پیالے میں بیسن، نمک، زیرہ، لال مرچ پاؤڈر اور پیکنگ سوڈا ڈال کر اچھی طرح مکس کریں اور یہانی



## وہی پھلکی راستہ

اشیاء :

وہی

ابلا ہوا آلو

بیسن

سفید زیرہ

پودینہ

پیاز

سبز مرچیں

کٹی کالی مرچ

لال مرچ پاؤڈر

تیل

1/2 کلو

1 عدد چائڈ

1/2 کپ

1/2 چائے کا چمچ

2 کھانے کا چمچ

1 عدد چائڈ

2 عدد باریک کٹی ہوئیں

1 چائے کا چمچ

1/2 چائے کا چمچ

فرائی کے لیے

سے بہت بنا کر درمیانی آنچ پر گرم تھی میں پکوڑیوں کی طرح ہلکے براؤن ہونے تک فرائی کر کے نکال لیں، پھلکی تیار ہیں۔

ایک علیحدہ برتن میں وہی، نمک، بھنا زیرہ، سبز مرچیں، آلو، پیاز، پھلکیاں اور نمک ڈال کر مکس کریں۔ سرونگ ڈش میں ڈال کر اوپر پودینہ ڈال کر چائے کے ساتھ چاولوں کے ساتھ یہ راستہ بہت مزہ دے گا۔

## کھیرے کا راستہ

اشیاء :

پھینٹا ہوا وہی

زیرہ پاؤڈر

250 گرام

1/4 چائے کا چمچ

# چٹخارے

کریں اور نمائش کا آمیزہ بھی ڈال کر مکس کریں۔ کسی بھی قسم کے چاولوں کے ساتھ یہ راستہ بہت مزادے گا۔

## کدو کا راستہ

اشیاء :

کدو

دہی

نمک و مرچ

گرم مسالا

ترکیب :

ایک کدو  
آدھا کلو گرام  
حسب ذائقہ  
حسب خواہش (پسا ہوا)

مذکورہ بالا اشیاء کے علاوہ پورے نمبر مرچ اور سبز دھنیا بھی لے لیں جو کہ باریک پیسے ہوئے ہوں اور پھر کدو کو چھیل کر اچھی طرح سے کدو کش کر لیا جائے اور اس کے بعد ابال لیں۔ ابالنے کے بعد اچھی طرح نچوڑ کر ٹھنڈا کر لیا جائے اور دہی کو خوب اچھی طرح سے پھینٹ لیا جائے اور تمام مسالا جات باریک پیس کر اس میں شامل کر لیے جائیں۔ اس کے بعد اس میں ابلا ہوا کدو اچھی طرح سے ملا لیں۔ پیچھے کدو کا خوش ذائقہ راستہ تیار ہو چکا ہے۔

## پھول گو بھی کا راستہ

اشیاء :

پھول گو بھی

دہی

بنک

لال مرچ پاؤڈر

ہری مرچ

نمک اور کالی مرچ پاؤڈر

ثابت زیرہ

تیل

ترکیب :

دو سو گرام (جو پ کی ہوئی)  
ڈیڑھ کپ  
ایک چٹکی  
آدھا چائے کا چمچ پاؤڈر  
ایک عدد  
حسب ذائقہ  
آدھا چائے کا چمچ  
ایک چائے کا چمچ

کالی مرچ کٹی ہوئی 1/4 چائے کا چمچ

ایک چٹکی

1/2 کپ (چھیل کر باریک چا پ کریں)

حسب ذائقہ

1/2 چائے کا چمچ

1 کھانے کا چمچ

ترکیب :

دہی کو اچھی طرح پھینٹ لیں، اگر ضرورت سمجھیں تو تھوڑا سا پانی بھی ڈال لیں۔ پھر کھیرا، زیرہ پاؤڈر، نمک، کالی مرچ اور چٹنی ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں۔ سرونگ پیالے میں ڈال کر اوپر پیریکا پاؤڈر چھڑکیں اور سبز دھنیا ڈال کر چاولوں کے ساتھ کھانے کے لیے پیش کریں۔

## نمائش کا راستہ

اشیاء :

نمائش

4 عدد

پیاز

1 عدد

نمک

حسب ذائقہ

دہی

2 کپ

لسن کے جوے

2 عدد

سبز مرچیں

6 عدد

زیرہ بھنا ہوا

1 کھانے کا چمچ

ترکیب :

ایک پین میں دو کھانے کے چمچے تیل ڈال کر لسن کو چا پ کر کے ہلکا سا فرائی کریں اور ساتھ ہی کٹی ہوئے نمائش بھی ڈال دیں، نمائشوں کو اتنا پکائیں کہ اچھی طرح پیسٹ بن جائے اور پانی خشک ہو جائے۔ چولے سے اتار لیں۔ اب ایک پیالے میں دہی کو ہلکا سا پھینٹ کر اس میں باریک کٹے ہوئے پیاز، باریک کٹی ہوئی سبز مرچیں، زیرہ اور نمک ڈال کر اچھی طرح مکس

# چٹخارے

بند گو بھی  
ایک چوتھائی کپ  
دہی  
نمک کالی مرچ  
ترکیب :

دہی کو اچھی طرح پھینٹ لیں۔ پھر اس میں شملہ  
مرچ پیاز، بند گو بھی، نمک اور کالی مرچ ڈال کر اچھی  
طرح مکس کر لیں۔ اور ٹھنڈا کر کے سرو کریں۔  
بینگن کا راستہ

سب سے پہلے دہی کو پھینٹ لیں۔ پھر پھول گو بھی  
کو نرم ہونے تک ابا لیں اور ٹھنڈا کرنے کے لیے  
رکھ دیں۔ جب پھول گو بھی ٹھنڈی ہو جائے تو اس میں  
دہی ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں۔ اب ایک فرانک  
پین میں تیل گرم کر کے اس میں ہنگ زیرہ، نمک کالی  
مرچ اور لال مرچ پاؤڈر ڈال کر فرامی کر لیں۔ اس کو دہی  
کے اوپر ڈال کر پوری طرح کو ر کر دیں۔ دو سے تین  
منٹ کے بعد اچھی طرح مکس کر لیں۔ اور سرونگ  
باؤل میں ڈال دیں۔ ٹھنڈا کر کے پیش کریں۔

## مولی کا راستہ

اشیاء :  
بینگن  
نمک  
سفیدہ زیرہ  
(بھنا ہوا اور سیا ہوا)  
دو عدد (باریک قتلے کاٹ لیں)  
حسب ذائقہ  
ایک چائے کاجیچہ

ہری مرچ  
لال مرچ  
(پسی ہوئی بگھار کے لیے)  
ایک عدد (پسی ہوئی)  
آدھا چائے کاجیچہ  
سفیدہ زیرہ ثابت + لال مرچ (چار عدد)

دہی  
پودینہ کترا ہوا  
گوگنگ آئل  
ڈیڑھ پاؤ  
ایک چائے کاجیچہ  
تلنے کے لیے

ترکیب :

ایک فرائی پین میں تیل گرم کر لیں۔ اس میں  
بینگن کے ٹکڑے، ہلکی آنچ پر سرخ کر کے نکال لیں۔  
دہی میں نمک، سفیدہ زیرہ لال مرچ پودینہ اور ہری مرچ  
ڈال کر خوب پھینٹیں اب اس میں تلے ہوئے بینگن  
کے قتلے ڈال دیں۔ فرائی پین کے بچے ہوئے تیل میں  
ثابت زیرہ اور لال مرچ سرخ کر کے رانتے پر بگھار  
دیں۔ بینگن کا راستہ تیار ہے۔

اشیاء :  
دہی  
ہری مرچ  
سجاوٹ کے لیے پودینے کے پتے  
مولی چھوٹے سائز کی  
چینی  
نمک اور کالی مرچ پاؤڈر  
ترکیب :

دہی کو پھینٹ کر اس میں نمک اور چینی شامل  
کر دیں۔ مولی کو چھیل کر کدو کش کر لیں۔ اور ہاتھوں  
کے درمیان میں دبا کر اس کا جوس نکال دیں۔ پھر دہی  
میں مولی، نمک، کالی مرچ، چینی، ہرا دھنیا، ہری مرچ  
شامل کر دیں۔ اچھی طرح مکس کر کے سرونگ باؤل  
میں ڈال دیں۔ ٹھنڈا کر کے پودینے کے پتے چھڑک کر  
پیش کریں۔

## چائیز راستہ

اشیاء :  
شملہ مرچ  
پیاز  
آدھی سلائس میں کٹی ہوئی  
ایک عدد۔ سلائس میں کٹی ہوئی